www.Paksociety.com
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اپریل 2012
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
نگران اعلیٰ
معراج رسول
www.paksociety.com
عزم کی پیکر ایوارڈ حاصل کرنے والی دوشیزہ کا زندگی نامہ
عکس ماضی: درد کے سمندر میں ڈوب کے ابھرنے والی لڑکی کی سچ بیانی
www.Paksociety.com

15 — غالب بنگالہ
مدیر اعلیٰ — سرگزشت

ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

16 — شہر خیال
ادارہ

آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

24 — بازی دل
محمد اختر

اس کے حسن فسوں خیز نے پوری دنیا میں اپنا مقام بنا کر نوجوان نسل کو پاگل کر دیا تھا

61 — سفید سرزمین
طارق عزیز خان

ایک ایسی سرزمین، جس پر اگر دھماکا ہوا تو پوری دنیا بہہ جائے گی

68 — نیا جنم
محمد عفان آزاد

کیا یہ جعلسازی ہے یا واقعی وہ کئی صدی قبل کے مصور کا شاہکار ہے

85 — قوالی
مختار آزاد

فن موسیقی وہ قسم کی جس نے عرب میں جنم لیا اور برصغیر پہنچ کر شباب حاصل کیا

94 — ہنر کی پیکر
زین مہدی

بغیر کسی تجربے کے اس نے فن کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور سب سے بڑا ایوارڈ حاصل کر لیا

105 — بدقسمت
ابن کبیر — زندگی نامہ

وہ دنیا کا مشہور ترین ناول نگار تھا مگر پھر بھی اسے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا پڑا

123 — زرد آندھی
مریم کے خان — تاریخ

آدھی دنیا میں خون کی ندیاں بہانے والے ظالم و جابر چروا ہے کیسے ابھرے؟

14 — بھگوان شکاری
مسعود کھدر پوش — شکار کتھا

ایک بڑے عہدے دار کے شکار کھیلنے کی دلچسپ روداد

155 — دوسری زندگی
ظفر سعید — پُراسرار

انسان سے عفریت بن جانے والے نوجوان کی کتھا

169 — ٹوپی نامہ
محمد ایاز راہی — معلومات

دنیا بھر میں مقبول و مشہور اقسام کی ٹوپیاں اور کہاوتیں

173 — ہمت مرداں
صبا شفیق — عزم و حوصلہ

ایک بچے کے عزم و حوصلے کی داستان جس نے معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا

176 — سراب
کاشف زبیر — معاشرتی

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

218 — عکس ماضی
منیر مشہور یوسفی

دل میں درد کا سمندر اٹھا دینے والی ایک دکھی آپ بیتی

233 — بزنس از بزنس
ارشاد حسین انصاری

اسے کراہیت بھرے کاروبار سے تائب کرنے میں لڑکی کا ایک جملہ کافی تھا

243 — خالہ روشنا
حامد تابانی — تحفتن سچ بیانی

خیبر پختونخواہ میں جاری جنگ و جدل سے ابھری ایک دکھ بھری کتھا

246 — سفید کوا
محمد منور — تحفتن سچ بیانی

جعلسازی کے لیے اس نے کیسے کیسے دلچسپ طریقے استعمال کیے تھے

255 — بے امان
فراز خان

وہ بھی قسمت سے پنجہ لڑانے میں بری طرح ناکام رہا

267 — ہتھیلی پر انگارہ
انور فرہاد — تحفتن سچ بیانی

میاں کے لیے بیوی قہر بھی ثابت ہوتی ہے کہ اسکی زندگی جہنم بن گئی

273 — بانجھ
نوشاد عادل — تحفتن سچ بیانی

اس کے اندر آگہی کمی نے اسے ظالم ترین عورت بنا دیا تھا

283 — کاش
عرفان رضا

بدروح کا وجود ہے تبھی تو ایک اندھیری رات میں وہ اسے ملی تھی

289 — جدائی
اختر قزلباش

دل میں درد کی کسک پیدا کر دینے والی ایک دلچسپ سچ بیانی

000 — سیپارچے
قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات یک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 22 ❖ شمارہ 06 ❖ اپریل 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

ناصر حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فرزانہ علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 50 روپے ❖ زرِ سالانہ 600 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C' فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

جمہوری سیاست عوامی جذبات واحساسات کی ترجمانی کا نام ہے جس کا واحد مقصد عوامی فلاح اور عوامی مسائل کا حل ہے۔ یہ ارفع واعلیٰ مقاصد صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں، جب سیاست دانوں کا کردار ہر قسم کی خود غرضی، انا پرستی، حرص ولالچ اور بدکرداری کے الزام سے پاک ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود کو بھی ملک کے ایک عام شہری کی طرح ملکی قوانین کا پابند ثابت کرے مگر آزادی کے اتنے ڈھیر سارے سال گزارنے کے بعد بھی ہم گنتی کے باکردار سیاست داں حاصل کر سکے ہیں۔ اس بدقسمتی کا ادراک بر وقت شعور کو ہے۔ اس قوت ادراک میں میڈیا کی آزادی نے اضافہ کیا ہے اور عوام کے شعور وحقائق تک پہنچنے کی استطاعت میں بھی بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اب تو لوگ ماضی کی فراموش کردہ داستانوں کو بھی نئے شعور کی روشنی میں پرکھنے لگے ہیں۔ آج کل تو عدالت عظمیٰ میں بھی ہوش ربا بیانات کی گونج سنائی دے رہی ہے کہ امانت داروں نے قوم کے سرمائے کو بے دردی سے لوٹا اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے لیے استعمال کیا۔ سبھی ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کر رہے ہیں۔ عوام خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی کا دامن صاف نہیں ہے یہاں تک کہ ہم جیسے عام شہری بھی سوچنے پر مجبور ہیں کہ ایک ایسے وقت میں جب ملک میں افراتفری پھیلانے کی سازش عروج پر ہے، ٹارگٹ کلنگ، بم دھماکے، مہنگائی جس کا ذکر اسٹیٹ بینک کی رپورٹ میں بھی آیا ہے کہ معاشی استحکام کو لاحق خطرات میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومت اپنی حد پر قائم نہیں رہ سکی ہے، بھاری قرضوں کی وجہ سے مہنگائی میں مزید اضافہ ہوا ہے پھر بے روزگاری ہے اور دیگر بہت سارے مسائل بھی منہ کھولے عوام کو نگلتے جا رہے ہیں، ان مسائل پر کسی کی توجہ نہیں اور نہ تدارک کی کوئی عملی کوشش ہے۔ اس کی جگہ نت نئے شوشے چھوڑ کر عوام کے ذہن کو الجھانے اور توجہ ہٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ حزب اختلاف ہو یا حزب اقتدار کسی کی بھی توجہ عوامی مسائل پر نہیں ہے۔ ایسا کیوں؟ اس لیے کہ جو لوگ سیاست میں ہیں، ان میں عوامی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کیا ہمارا خیال غلط ہے؟

معراج رسول

غالب بنگالہ

سرگزشت

وہ آٹھ نومبر 1881ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوا۔ اس وقت یہ شہر عالم میں انتخاب کہلاتا تھا کیونکہ دہلی کے حسن کو انگریزوں نے پامال کر دیا تھا۔ بار بار اجڑنے والی دلی اس بار غدر کے نام سے بُری طرح اُجڑ گئی تھی۔ جبکہ کلکتہ جو برصغیر میں انگریزوں کا مستقر تھا اس لیے یہاں کا حسن روز افزوں ترقی پہ تھا۔ تاج برطانیہ سے جڑا ہوا شہر تھا، اسی لیے یہاں ترقی کی رفتار بھی تیز تھی۔ اس شہر کی کشش لوگوں کو کھینچے لا رہی تھی۔ اسی کشش میں اس کے دادا بھی یہاں آئے تھے۔ اپنے دور میں اس کے دادا حکیم غالب علی بہت مشہور تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے پاس پہنچ کر مردہ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ شہرت انہیں دلی سے کلکتہ آنے کے بعد ملی تھی۔ ابتدا میں انہوں نے اپنا مطب نواب سراج الدولہ کے شہر علی پور میں کھولا تھا مگر علی پور کے مقابلے میں کلکتہ زیادہ ترقی یافتہ تھا اس لیے یہ درمیانی چھ میل کا فاصلہ طے کر کے وہ کلکتہ منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں آتے ہی ان کی قسمت کھل گئی تھی۔ شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور دولت برسنے لگی تھی۔ ایسے امیر گھرانے میں اس نے جنم لیا تھا اس لیے باپ اور دادا دونوں کا چہیتا تھا۔ اس کے والد مولوی شمشاد علی نے طب کے بجائے تعلیم کا میدان پسند کیا تھا۔ وہ انگریزی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ اسے یتیم کر گئے۔ ابھی اس کا لڑکپن تھا۔ اس کم عمری میں اس نے یتیمی کا داغ سہا تھا مگر غریبی تو تھی نہیں کہ کوئی پریشانی پیش آتی۔ وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ مگر زیادہ پڑھ نہ سکا کیونکہ جائداد آہستہ آہستہ بکتی جا رہی تھی۔ 1898ء میں اس نے انٹرنس پاس کیا پھر 1903ء میں امپریل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گیا۔ اس کے ذمے ترجمے کا کام لگا دیا گیا تھا۔ وہ فارسی مکتوبات کا ترجمہ انگریزی میں کرتا تھا۔ یہ وہ درخواستیں ہوتی تھیں جو برصغیر کے کونے کونے سے تاج برطانیہ کو بھیجی جاتی تھیں۔ دن بھر بیٹھے بیٹھے قلم گھسیٹتے رہو، یہ کام اسے ذرا بھی پسند نہ تھا مگر مجبوری تھی اس لیے کیے جا رہا تھا۔ اس دوران حکومت انگلشیہ نے اسے 1921ء میں خان صاحب کا خطاب عطا کیا۔ یوں بھی 1910ء میں "دیوانِ وحشت" کے عنوان سے اس کا مجموعہ کلام آ چکا تھا۔ 1926ء میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج کی بنیاد پڑی تو اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اس کالج میں اردو لیکچرر کی حیثیت سے آ گیا۔ اس کی شاعری کی دھوم پورے کلکتہ میں مچی ہوئی تھی۔ ہر مشاعرے کی وہ ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ مرشد آباد، عظیم آباد، ڈھاکا، ہُوگلی جیسے بڑے بڑے شہروں میں اس کے شاگردوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا تھا۔ اردو ادب کی خدمات پر اسے حکومت برطانیہ نے خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ اب وہ بہت زیادہ معتبر مانے جانے لگے تھے، ان کی شہرت بھی مزید وسعت اختیار کر چکی تھی۔ شہر میں بصد ادب یاد کیے جانے لگے تھے۔ 1936ء میں وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج سے ریٹائر ہو گئے۔ اب فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ وہ سارا سارا دن فکر وفن کی حسین دنیا میں گم رہتے۔ 5 سال علم وادب کی خدمت میں گزارنے کے بعد ایک بار پھر انہوں نے نوکری کرنے پر کمر کس لی کیونکہ جائداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ افتادِ زمانہ نے، وقت کے ساتھ چلنے کی چاہ نے سب کچھ بکوا دیا تھا۔ 1941ء میں لیڈی برے برن کالج کلکتہ میں لیکچررشپ کی نوکری کر لی۔ ایک سال تک اردو پڑھاتے رہے پھر انہیں فارسی کا شعبہ دے دیا گیا۔ یوں بھی وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ 1948ء تک وہاں تدریسی عمل انجام دیتے رہے پھر اس ملازمت سے بھی سبکدوش ہو گئے۔ پاکستان کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ کلکتہ، بہار و مشرقی یوپی کے مسلمان بڑی تعداد میں مشرقی پاکستان منتقل ہو چکے تھے۔ ان میں ان کے شاگردوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ وہ سب مسلسل اصرار کر رہے تھے کہ آپ بھی پاکستان آ جائیں۔ بہت غور وفکر کے بعد انہوں نے بھی ہجرت کی ٹھان لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے صاحب زادے ذہنی معذور ہو گئے تھے جنہیں زنجیروں سے جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔ اس کے انتقال نے انہیں توڑ دیا تھا۔ بیٹے کی موت نے دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ بالآخر 1950ء میں وہ کلکتہ سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کے مرکزی شہر ڈھاکا آ گئے۔ مگر یہ شہر راس نہ آیا۔ زندگی کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ 1952ء میں انہوں نے زندگی [illegible] بعد از مرگ شاگردوں نے دوسرا دیوان "ترانہ وحشت" شائع کرایا۔ انہیں بنگال کا غالب کہا جاتا تھا اور یہ لقب [illegible] ان کا پورا نام رضا علی وحشت کلکتوی تھا۔ ڈھاکا کے عظیم پورہ قبرستان میں ان کی قبر ہے۔

www.Paksociety.com

شہرِ خیال

✉ **رانا محمد سجاد** کی نوائِ شہر مظفر گڑھ سے آمد "مارچ کا سرگزشت خلافِ معمول 24 کو مل گیا۔ جیسے ہی اوراق پلٹے، خصوصی نمبر کا اشتہار نظر آیا۔ "عشقِ ناکام نمبر" بہت منفرد موضوع لیے ہوئے تھا۔ اگر تاریخ کا بھی اعلان کردیا جاتا تو اور خوشی ہوتی۔ اداریہ میں انکل معراج نازک مسئلے پر گفتگو کررہے تھے۔ حکومت توجہ تو کیا دیتی، گزشتہ حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک کی یونیورسٹیوں کو اپنی شاخیں کھولنے کا معاہدہ کیا تھا، وہ بھی منسوخ کردیا۔ نہ جانے حکمرانوں کو تعلیم سے اتنی چڑ کیوں ہے؟ یک علمی سرگزشت میں کرشن چندر کے بارے میں بتایا گیا۔ شہرِ خیال میں ایم اے خالق بھٹی صاحب کا بھرپور خط پڑھا، بہت اچھا تبصرہ تھا۔ ساگر کھوکر پہلی بار حاضر ہوئے ہیں۔ اب ہو لیے کامت۔ اعجاز حسین سحار صاحب اگر سرگزشت سے آغاز ہی سے رفاقت میسر تھی تو خطوط کیوں نہیں لکھے؟ ہمارے علاقے کی نمائندگی کرتے ہوئے جوریہ قاضی آئیں، تبصرہ پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری، راجا ثاقب نواز، محمد عزیز ترین، ثاقب شاہ خولی ایڈووکیٹ، علی مغل، تفسیر عباس کے تبصرے پسند آئے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب صاحبہ بڑے غصے کے ساتھ آئیں۔ جناب، اب آپ بھی تو کبھی کبھار حاضر ہوتی ہیں۔ خط کے آخر میں انکل آفاقی کے بارے میں پڑھ کر پریشانی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت کاملہ سے نوازے (آمین) محترم انور اعجاز صاحب، عبدالرؤف عدم صاحب بھی کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں۔ ان کے بارے میں بھی اطلاع دیجیے گا۔ قرۃ العین زینب ایڈووکیٹ، وہ تو سرگزشت کا راستہ ہی بھول گئی ہیں (ہم آپ سب سے درخواست کرتے ہیں کہ جلد اپنی خیریت سے آگاہ کریں) سوز و ساز ڈاکٹر ساجد امجد کا ایک اور کارنامہ، ادب کے طالب علموں کے لیے ایک خاص تحفہ۔ مریم کے خان جب بھی آتی ہیں تو خوبصورت کہانی کے ساتھ آتی ہیں، ہمیشہ کی روایت کو برقرار رکھا۔ سربلند بہت پسند آئی۔ کوہ پیمائی میں میسنر کا نام ایک ماورائی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ شمی کپور کے بارے میں ایک خوبصورت تحریر چلبلا، شوبز کی دنیا کا ہی ایک اور ناقابلِ فراموش کتھا کے ساتھ یعقوب جمیل حاضر ہوئے۔ کافی دیر تک تو یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہوتا ہے؟ پردہ سیمیں پر مہاراجا کا رول کرنے والا بھوک سے بے حال ہے (ہمارے ملک میں بھی ایسے فنکاروں کی کمی نہیں جو آج اپنے ایوارڈ بیچ کر گزارا کرتے ہیں تاکہ بیوی بچوں کی کھانے کا انتظام کرسکیں) عنوان بھی خوبصورت تھا۔ قلمی الف لیلہ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ کیو بار پر بیچارہ آزاد ایک اچھی تحریر لے کر آئے۔ کیوبا میں ہمارے کلاس فیلو طاہر عباس میڈیکل کی تعلیم کے لیے گئے ہوئے ہیں اس لیے کافی دلچسپی اور غور سے پڑھا۔ وہ لوگ اپنے ... کے بارے میں کتنی محنت کرتے ہیں اور سمندروں کی تہ کو کھنگال رہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ زمین پر موجود اپنے ثقافتی ورثے کو غرق کرنے پر تلے ہیں۔ پراسراریت نمبر کے لیے جو تحریریں شائع نہ ہوسکیں وہ شائع کرنا ایک اچھا قدم ہے۔ دیکھتے ہیں اگلے ماہ کون سی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ بھگوان شکاری بھی خوبصورت ... ہوئے بھی اپنے اندر، انداز تحریر کافی دلکش تھا۔ سیریل کلر ایک اور اچھا انتخاب، ذاتی طور پر ایسی ہی تحریریں میری کمزوری ہیں۔ سراب اپنے انداز میں ... سچ بیانیوں میں رقصِ زندگی، کاری، غریب، تلاش سب سے بہترین رہیں۔ خصوصاً رقصِ زندگی میں رئیس خان کا کردار انتہائی گھناؤنا تھا۔ کاری میں افشاں نے آخر میں اپنے بھائی کو خوبصورت جواب دیا اور نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا کردیا۔ مجموعی طور پر مارچ کا شمارہ بہت بہتر تھا۔"

✉ **رانا محمد شاہد**، بورے والا سے لکھتے ہیں "مارچ کا شمارہ لاہور سے خریدا۔ یہاں پر شادی کی شاپنگ کے لیے آیا ہوں۔ 23 مارچ کو زندگی کا نیا سفر شروع ہوجائے گا (پیشگی مبارک باد) عشقِ ناکام نمبر کا اعلان پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ایک تجویز ہے کہ اس میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد کے ساتھ ساتھ علاقائی عشقیہ داستانوں جیسے سندھ کی عمر ماروی وغیرہ کو بھی شامل کیجیے گا۔ (سرگزشت کا خاصہ ہے کہ ... والی اہم کہانیاں، واقعات کو سامنے لائے) اداریہ حساس اور چبھتا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں ٹیکنالوجی کا استعمال مثبت کے بجائے منفی کاموں میں ہو رہا ہے۔ ... نوجوان کمپیوٹر اور موبائل پر چیٹنگ

کرتے ہیں لیکن اپنی تعلیم اور مثبت کاموں میں فائدہ نہیں اُٹھاتے، یہ ایک بڑا قومی المیہ ہے۔ کرشن چندر کی مختصر سرگزشت متاثر کن تھی۔ خصوصاً اس حوالے سے کہ وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ شاہد ہ گلزار نے صحیح لکھا کہ بکس سے زیادہ اچھا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ تفسیر عباس بابر کا خط اچھی باتوں سے معمور تھا۔ علی سفیان آفاقی کے لیے دعا گو ہیں۔ اردو کے عظیم شاعر میر سوز پر ڈاکٹر ساجد امجد نے بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھا۔ سربلند مریم کے خان کی مہم جوئی سے بھرپور تحریر تھی۔ زلفی شاہ نے پاکستان کی ایک ایسی جگہ کی سیر کرادی، جہاں جانا تو دور، ہم نے پہلے سنا بھی نہیں تھا۔ یہ تحریر اس لیے بھی انفرادیت کی حامل تھی کہ ہم لوگ ہمیشہ یورپ اور دوسرے ممالک کی شان میں قصیدے پڑھتے رہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ملک میں بنے شاہکاروں میں بہتری لائیں تو یقیناً یہ برج اور اس جیسی بہت سی جگہیں دنیا بھر کے لیے پُرکشش بن جائیں (درست فرمایا، پاکستان میں سیاحت کے لیے بے شمار مقامات موجود ہیں جو دنیا بھر کے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہیں لیکن سہولیات کا فقدان اور امن و امان کی مخدوش صورتِ حال کی وجہ سے فروغ نہیں پاسکے۔ سیاحت ایک ایسی صنعت کا درجہ رکھتی ہے جو اگر نشوونما پاجائے تو ملک کے حالات تبدیل ہوجائیں) سنہرا ماضی، معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ اُڑن طشتریوں کے حوالے سے آصف ملک نے بھی خوب تفصیل سے لکھا۔ شکاریات کے حوالے سے اس دفعہ مسعود کھدر پوش کا شاہکار موجود تھا۔ ابن کبیر اور ایاز راہی کی تحریریں بھی متاثر کن تھیں۔ سچ بیانیوں میں رقصِ زندگی، زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اُٹھاتی ایک بہترین کہانی تھی۔ ایک گزارش ہے کہ ٹیپو سلطان، شیر شاہ سوری اور محمد بن قاسم پر بھی شائع کریں۔"

✉ **ناصر حسین رند** کا خط، بہاولپور سے "طبیعت کی ناسازی کے باوجود خط لکھنا پڑا۔ سب سے پہلے جناب محترم علی سفیان آفاقی صاحب کی علالت کا پڑھ کر دل افسردہ ہوگیا۔ دعا ہے کہ وہ صحت یاب ہوکر سرگزشت کو رونق بخشیں (آمین) شہرِ خیال میں ایم اے خالق بھٹی، حقِ صدارت ادا کرتے نظر آئے۔ سہیل احمد عباسی بھائی، آپ کا نام دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ یسرا انجم پر آپ کا تبصرہ حق اور سچ کی آواز تھا۔ ملک ثاقب شاہ خولی صاحب، آپ کے لفظ بہرحال نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ محمد جاوید خان سرکانی درانی، ویسے ہمارے دل میں بھی تیجے کے بارے میں تجسس تھا جو کہ آپ نے دور کردیا۔ جہاں تک ہمارے دل چھوٹا ہونے کا تعلق ہے تو عرض کرتے چلیں جناب ہمارا دل آپ کے نام کی طرح بڑا ہے۔ سکندر اعظم آج سے کافی سالوں پہلے سسپنس کی زینت بن چکی ہے جو مرحوم الیاس سیتاپوری صاحب کی کاوش تھی (سرگزشت میں تین بار آچکی ہے۔ منسلک عورتوں پر لکھی گئی تحاریر میں) ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ، پُراسرار معنفہ ہوچکی ہیں اس لیے کافی عرصے بعد جلوہ گر ہوئیں۔ رانا سجاد صاحب، پُراسرار مخلوق کی شکل میں آپ کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوگئی، آپ کو مبارک ہو۔ سدرہ بانو ناگوری نے پچھلے شمارے میں معراج رسول صاحب کے انٹرویو کی فرمائش کی جس کی ہم بھرپور تائید کرتے ہیں کیونکہ سسپنس میں شائع ہونے والا انٹرویو نامکمل تھا۔ عشقِ ناکام نمبر کا پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ ابھی تو پُراسراریت نمبر کی گونج باقی تھی کہ آپ نے دوسرا دھماکا کردیا۔ شمی کپور کی آپ بیتی مختصر تھی۔ ان کی فلموں کی لسٹ شائع کرکے مزہ دوبالا کردیا۔ تنویر ریاض صاحب غالباً آفاقی صاحب کی کمی کو پورا کررہے تھے۔ شمی کپور کی فلمیں دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمارے دل میں یہ خواہش ہوتی تھی کہ کاش وہ مسلمان ہوجاتے۔ شمی کپور کی فلمیں اکثر ہم اپنے ابو کے ہمراہ دیکھا کرتے تھے۔ پُراسرار مخلوق، پراسرار سیارہ، سیریل کلر غالباً پُراسرار نمبر سے باقی شدہ مال تھا۔ (صحیح فرمایا) معراج رسول صاحب خط لکھنے کا ایک یہ بھی ہمارا مقصد تھا کہ آپ سے گزارش کریں کہ اگر ہوسکے تو پُراسرار نمبر سے رہ جانے والی کہانیوں کو کسی ایک جگہ پر یکجا کردیں (دو نمبر کے بعد تیسرا نمبر؟) آخر میں سعید احمد چاند، احمد خان توحیدی، طاہر الدین بیگ، آپ سب کا شکریہ تبصرہ پسند کرنے پر۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، ایسی بھی کیا بے رُخی، آپ پر آفرین ہے کہ اس دور میں سرگزشت، سسپنس اور جاسوسی میں تبصرے لکھ لیتے ہیں۔ افتخار احمد تبسم صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔"

✉ **احتشام احسان** نے صفدر آباد سے لکھا ہے "میں سرگزشت کا نیا قاری ہوں۔ پہلے سسپنس پھر جاسوسی اور اب سرگزشت سے ملاقات ہوگئی۔ خیر انکل جی، میں غریب لڑکا ہوں، آپ سے بھی نہیں منگوا سکتا۔ میں کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں، سنا ہے معاوضہ بھی ملتا ہے اور ڈائجسٹ بھی۔ میں نے اپنی ایک سچی کہانی ارسال کردی ہے، عنوان لکھنا بھول گیا، کیا وہ شائع ہوجائے گی؟" (کہانی پڑھ کر بتایا جاسکتا ہے لیکن ان چار سطور کو دیکھ کر ہی لگتا ہے کہ آپ نے کہانی بھی بے ربط لکھی ہوگی، ابھی آپ کو مزید مطالعے کی ضرورت ہے)

✉ **غلام یٰسین نوناری**، چوک سرور شہید سے لکھتے ہیں "اس ماہ سرگزشت سے ملاقات 25 فروری کی شام کو ہوئی۔ اداریے میں افسوس ہوا کہ مفید ٹیکنالوجی کو کس طرح منفی انداز میں استعمال کرکے پیسا اور وقت کا زیاں کیا جارہا ہے۔ عظیم لکھاری کرشن چندر کا احوالِ زیست مختصر سرگزشت کے عنوان تلے پڑھا۔ پہلی مرتبہ سرگزشت کی وساطت سے یہ بات علم میں آئی کہ کرشن کے والد وقار الملک مسلمان تھے (آپ نے بغور پڑھا نہیں، کرشن چندر مسلمان ہوگئے تھے اور ان کا ہی نام وقار الملک تھا) اس کے بعد خطوط کی محفل میں داخل ہوئے۔ ایم اے خالق بھٹی ہمیشہ جب بھی آتے ہیں، چھا جاتے ہیں اور اپنے آپ کو منوا کر اُٹھتے ہیں اسی لیے تقریباً نوے فی صد ان کے خطوط کرسی صدارت کے لائق ٹھہرے ہیں۔ محترم، آپ نے ٹھیک لکھا، دوسرے ممالک میں تعلیم یافتہ پروفیسر ز کی ... لیکن اس ملک میں کتابیں پڑھی جاتی ہیں علم نہیں۔ ہم کتابیں صرف ایک عدد ڈگری خریدنے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ ڈگری ملتے ہی بھول جاتے ہیں ... حیرت کی بات ہے کہ آپ کے علاقے میں سرگزشت لیٹ پہنچتا ہے، پھر پُراسراریت نمبر ایک کے بجائے دو پہلے کیسے پہنچ گیا۔ ویسے وہاں کوئی ... منگوانا ہو تو الگ بات ہے۔ اعجاز حسین سحار، آپ طویل تبصرہ لکھا کریں، طویل تبصرہ مجھے بہت پسند ہے۔ سعید احمد چاند، آپ کا تبصرہ بے حد ... رانا محمد شاہد، ہزاروں نوجوان باہر جاتے ہیں اور ہزاروں نوجوان اپنے ملک میں اچھی نوکری نہ ملنے پر بھکاری، چور اور لٹیرے بن جاتے

www.paksociety.com

ہیں۔ ملک ثاقب صاحب، اس ملک میں روزانہ ہزاروں پھول کھلتے ہیں لیکن بہتر حوصلہ افزائی نہ پاکر مرجھا جاتے ہیں۔ ارفع کریم جیسے کئی ٹیلنٹڈ بچے موجود ہیں جن کی صلاحیتیں غیرت کی چادر میں لپٹی ہوئی ہیں۔ باقی لکھنے والوں نے بھی اچھا لکھا۔"

ایم اے خالق بھٹی، صدر پریس کلب، اللہ آباد ضلع رحیم یار خان سے لکھتے ہیں "آفاقی صاحب کی بیماری کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہے، اللہ تعالیٰ جلد انہیں صحت یاب کرے۔ (آمین) آپ کا شکریہ جو اس شمارے میں مجھ ناچیز کا لیٹر سرفہرست شائع کر کے میری عزت میں اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے سوز و ساز کے عنوان سے سید محمد میر سوز کا مکمل تعارف اور نمونہ کلام سے دوبارہ روشناس کرایا۔ مریم کے خان حسب سابق ایک مہم جو کی کتھا سربلند کے نام سے لے کر آئیں۔ زلفی شاہ نے ہمیشہ کی طرح پیارے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر لینس ڈاؤن برج، سکھر روہڑی پل کا تعارف اور پس پردہ حقائق سے آگاہی دی۔ تنویر ریاض نے چلبلا کے عنوان سے شمی کپور کا تعارف کرایا۔ ٹی وی سے ان کا ڈراما دیکھا تھا، نام تو بھول گیا ہوں البتہ ان کا منایا اور رعب داب واقعی متاثر کن تھا۔ انکل، آپ جانتے ہیں ٹی وی اب مقبول میڈیا ہے اور آج کل سب سے زیادہ شائقین ٹی وی کے ہیں لہٰذا اب ٹی وی آرٹسٹ اور ٹیکنیکل عملے کی آپ بیتی اور دلچسپ واقعات سے ہر ماہ قسط وار روشناس کرائیں۔ یعقوب جمیل نے ایکسٹرا میں کملا دیوی کا ذکر اچھا کیا ہے۔ مختار آزاد کی سنہرا ماضی اور آصف ملک کی پُراسرار مخلوق ہمارے لیے نئی معلومات تھیں۔ سفر کہانی شب رنگین مسعود عالم کی پُرلطف کاوش تھی۔ بھگوان شکاری، مسعود کھدر پوش جن کے لباس کے باعث یہ لفظ ہمیشہ کے لیے جڑ گیا ہے۔ ابن کبیر کی سیریل کلر بھی معلوماتی اور نئی چیز تھی۔ پُراسرار سیارہ ایاز راہی کی محنت اور سرگزشت کی جدت کی آئینہ دار تھی۔ سرگزشت نے جو نئی چیز پیش کرنے کا معیار رکھا ہے، اس میں ہر ماہ اضافہ ہو رہا ہے۔ سچ بیانیاں بھی متاثر کن ثابت ہوتی ہیں۔ خاص کر اداریہ میں آئی ٹی کا غلط استعمال یعنی انٹرنیٹ پر چیٹنگ اور تفریح کے لیے استعمال ہمارے لیے ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔ مختصر بیتی میں کرشن چندر کو جلانے کے واقعے نے رنجیدہ کیا تھا۔ اب اس کی یاد میرے دل میں تازہ ہو گئی ہے۔ اعجاز حسین سنجار، آپ جیسی محبت کرنے والی شخصیات کی مثالیں کم کم ہی ملتی ہیں۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، کھالو، پی لو، خوب موج اڑالو۔ ملک ثاقب شاد خوش، کہیں سعید احمد چاند کے نام سے چاند پر جانے کا خیال تو دل میں نہیں مچل اٹھا۔ محمد جاوید خان سرکانی درانی اپنے علاقے کے بارے میں معلومات لکھ کر مجھ سمیت ہزاروں ریڈرز کا بھلا کیا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب، ہم نے تو یاد رکھا ہے لیکن آپ نے کوریئر کے بجائے سرکاری ڈاک کے سادہ لفافے کو ترجیح دے دی ہے۔ تفسیر عباس بابر، کیا فقرہ لکھا ہے، میرا انگ انگ اش اش کر اٹھا ہے۔ علی مغل، مہوش رفیق، سعید احمد صدیقی، طاہر الدین بیگ، احمد خان توحیدی، محمد شاہد، محمد عزیز ترین، شاہد و گلزار، سدرہ بانو ناگوری، جویریہ قاضی، آپ لوگ یاد رکھیں یا بھول جائیں، میرا اسلام قبول ہو۔"

مہوش رفیق کی لانڈھی کراچی سے تشریف آوری "میں نے پہلی دفعہ قلم اٹھایا اور آپ نے حوصلہ افزائی کی لہٰذا میں تہ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ 28 فروری کو ہی میں نے مارچ 2012ء کا شمارہ خرید لیا اور دکان پر کھول کر شہر خیال میں پہنچ گئی۔ تین صفحے دیکھنے کے بعد تھوڑی سی مایوسی ہوئی مگر آگے صفحے پر آتے ہی اپنا خط دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی، میں نے جو کہانی آپ کو ارسال کی تھی، میری آپ سے گزارش ہے کہ پلیز آپ اسے ری رائٹ کرا دیجیے (درست کرنے کی کوشش کی گئی لیکن۔۔۔ کوئی دوسری کہانی بھیجیں) اب آتی ہوں تبصروں کی طرف تو سب سے پہلے اداریہ میں معراج انکل کو پڑھا اور میں بھی ان کی رائے سے متفق ہوں، واقعی ہم نے آئی ٹی سے کتنا استفادہ کیا، صرف اور صرف موبائل پر میسجنگ اور انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں کیا۔ یک مشتی سرگزشت میں عظیم لکھاری میں کرشن چندر کو پڑھا، اتنی عظیم ہستی کو دفنانے کے بجائے ہندووانہ رسم و رواج کے مطابق جلایا گیا تا کہ ان کا کوئی نام و نشان نہ رہے۔ شہر خیال کی طرف آتی ہوں، ایم اے خالق بھٹی، اعجاز حسین سنجار، جویریہ قاضی، ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب کے تبصرے پڑھے ہمیشہ کی طرح بہت پسند آئے۔ جناب علی سفیان آفاقی صاحب کی علالت کا سن کر دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) لینس ڈاؤن برج کے بارے میں پڑھا، سکھر کی تاریخ پڑھ کر اچھا لگا۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ ایکسٹرا نہایت بہترین موضوع ہے، انسان کی بنیادی ضرورت پیٹ کی آگ کو بجھانا، پڑھ کر پتا چلا کہ پیسے کی کتنی اہمیت ہے۔ اتنے بڑے ہیرو بن کر زیرو ہوئے اور زندگی کے آخر میں ایکسٹرا کے کردار پر راضی ہو گئے، بہت عبرت ناک اور بہترین کہانی ہے۔ اب آتی ہوں اپنی موسٹ فیورٹ سچ بیانیوں کی طرف۔ سرورق کی پہلی کہانی رقص زندگی عارفہ کی کہانی پڑھی، زندگی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے اور کیسے کیسے ناچ نچاتی ہے مگر جو غلط ہے وہ تو غلط ہے۔ دوسری کہانی کاری میں آج بھی سندھ کے کئی دیہی گاؤں میں لڑکیوں کو کاری قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ عورت کو صرف قربان ہونا ہے بس۔ تیسری کہانی غریب، یہ تو سچ ہے کہ جرم کبھی بھی نہیں چھپتا۔ یہاں نہیں تو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ضرور سزا ملے گی۔ چوتھی کہانی مار آستین بہت زبردست کہانی ہے۔ نعیم نے جاوید کے ساتھ بہت بُرا کیا۔ جبکہ جاوید نے زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دیا۔ اصل میں نعیم کو احساس کمتری اور حسد نے مار دیا۔"

طاہر الدین بیگ نے میر پور خاص سے لکھا ہے "عظیم لکھاری کی تدفین کا پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا، ایسے ہی ایک لکھاری تھے جنہوں نے خود وصیت کی تھی کہ مجھے دفن نہیں بلکہ جلا دیا جائے، نام ذہن میں نہیں آ رہا، آپ کچھ رہنمائی کریں۔ شکریہ (عصمت چغتائی) شہر خیال میں جویریہ قاضی اور سدرہ بانو ناگوری کے ساتھ ساتھ بھٹی صاحب اور سنجار صاحب کے تبصرہ جات اچھے لگے۔ پشاور سے شاہدہ گلزار سلام لے کر آئیں، وعلیکم السلام۔ سوز و ساز میں ڈاکٹر صاحب اپنے رنگ میں خوب نظر آئے۔ ڈاکٹر صاحب سے التجا ہے کہ فراز صاحب پر کچھ ہو جائے (فراز پر دو دو بار چھپ چکا ہے) محترم آفاقی صاحب، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تندرست و توانا رہیں (آمین) ان کی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ آپ بیتیوں میں ایسا کیوں اچھی رہی۔ خیر الدین اور کریم الدین یہ کردار آپ کو کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔ نیکی اور آخری تحفہ والی آپ بیتی خاص طور پر نیکی والی آپ بیتی زبردست ہی نہیں معاشرے کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے

کہ لوگ کتنے بے حس ہیں، اب پڑھ لیں گی اور معلوم ہو گا کہ لوگ بے حس کیوں ہیں؟ اس دفعہ سرگزشت میں معلومات کا خزانہ ہے۔ آصف ملک صاحب کی اُڑن طشتری، جناب آزاد صاحب کی ماضی وہ بھی سنہرا بہت خوب اور کافی معلوماتی مضمون ہے جہاں ایکسٹرا پڑھ کر بے حد دکھ ہوا وہیں چلبلا پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ زلفی شاہ بڑی زبردست محنت کر رہے ہیں لینس ڈاؤن میں، ایک خوبصورت معلوماتی مضمون جہاں سربلند واقعی سربلند رہا، ہمت اور استقلال کی کہانی وہیں 19 بات پر بھی اچھی کہانی لکھی گئی ہے۔"

احمد خان توحیدی، کراچی سے رقم طراز ہیں "سرگزشت و سسپنس اکٹھے ملے سارے یہ کیا، عشق ناکام نمبر کب آئے گا؟ صبر نہیں آتا۔ معراج رسول صاحب، ہماری عظیم قوم کون سا کام نہیں کر سکتی؟ کیرج فیکٹری اسلام آباد کے باوجود ہم انجن نہیں بناتے، وجہ افسر شاہی و مافیا کو کمیشن نہ ملنے پر پیٹ کا درد ہے۔ عظیم لکھاری، وقار الملک مسلمان ہو کر بھی جلا دیے گئے، افسوس۔ محفل خطوط میں قدم رکھا۔ ایم اے خالق بھٹی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ اعجاز سنجار، جویریہ قاضی، سدرہ ناگوری نے اچھے تبصرے لکھے۔ شاہدہ گلزار پشاور، فی الوقت واقعی سرگزشت کا متبادل رسالہ پاکستان میں ہے۔ راجا ثاقب ساہیوال، محمد شاہد بورے والا، آپ نے ارفع کریم جیسی معصوم فرشتہ پر اظہار خیال کیا۔ عظیم لوگوں کی زندگی میں ہم لے کب قدر کی ہے؟ بعد میں مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ ملک ثاقب تحولی ایڈووکیٹ یقیناً بھاری فیس والا کیس ملا ہو گا جو وقفے سے تشریف لائے۔ سعید احمد صدیقی، آپ کا تاریخی ورثہ کے بارے میں فرمان درست ہے۔ لیڈران کو تھری پیس سوٹ اور غیر ملکی دوروں کی عیاشی سے کب فرصت ہے؟ دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ماہا ایمان حافظ آباد اور نثار بٹ، حمیدہ انگ غائب تھے۔ سوز و ساز سید میر محمد، تاریخی معلوماتی تحریر۔ اشعار بہت پسند آئے۔ سربلند معلوماتی تحریر مریم کے خان صاحبہ کے ٹو اور ہمالیہ پہاڑ کے بارے میں الگ مضمون لکھیں (مضمون آ چکا ہے) واہ زلفی شاہ صاحب لینس ڈاؤن برج جسے ہم سکھر بیراج کہتے ہیں، ایوب برج کا علم نہ تھا دریائے سندھ ابتدا سے اختتام تک ملنے والے دریا اور علاقہ راستہ کا تفصیلاً مضمون لکھیں (اس پر بھی مضمون آ چکا ہے) آفاقی صاحب کی علالت کا افسوس ہے اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) منظر امام غائب ہیں۔ چلبلا اور ایکسٹرا فلمی کہانیاں، شمی کپور، کملا دیوی، راجا ہریش چندر یقیناً فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے بھی ان پر لکھا ہو گا۔ سنہرا ماضی، پراسرار مخلوق، تاریخی معلوماتی تحریریں ہیں۔ شب رنگین، مہربان کے طرز عمل پر خوب ہنسی آئی۔ بھگوان شکاری مسعود نے مسلمانوں کے ازلی دشمن کی سازش کے باوجود علم کی روشنی پھیلانے کی سعی کی۔ دوسری قسط کا انتظار ہے۔ سیریل کلر ڈیوڈ ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ کی تفتیشی طرز 16 سال تک قتل کرنے والے کیری تک پہنچ گیا۔ پاکستانی پولیس ہوتی تو تک مکا کے بعد ملزم اسم سکونت نامعلوم لکھ کر داخل دفتر کر دیتی۔ انوکھا سیارہ اور سراب ابھی پڑھی نہیں۔ سچ بیانیوں میں عارفہ نے عقل مندی سے رئیس سے شرعی نکاح پر اس کے کرتوت کی سزا دے کر نیک کام کیا۔ کاری یہ غلیظ رسم روزمرہ کا معمول بن گئی ہے۔ ظالم خود عبرت بن گئے ہیں۔ افشاں کو اشرف اور گلشن کے تعاون سے شادی کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ غریب، کامران کی غلط روش یہی انجام ہونا تھا۔ مار آستین، نعیم واقعی آستین کا سانپ ہے ایسے بے ضمیر سردار سوا ہوتے ہیں۔ پسند، عقیل اور روبی کی پہلی ملاقات پر ہی ذہن میں یہی خیال آیا، گھر والوں نے روبی کا ہی رشتہ طلب کیا ہے۔ مکافات، جو ہونا تھا ہو گیا۔ حامد کو چغلی نہیں کرنی تھی۔ جنید اور فرح کو ماضی بھول کر بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنی چاہیے۔ نیکی، پہلے واقعی نیک نیت تھے۔ نیت میں فتور لالچ بری بلا کا پھندا اب کے گلے میں، اچھی عبرت ملی۔ ایسا کیوں، بہت اچھی کہانی، انسان نیک نیت ہو تو قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ مزمل اور اسما بیگم جیسے فرشتہ صفت کا قتل قلبی دکھ ہوا۔"

منظر علی خان کا پیام والا ہور سے "سرگزشت کا شمارہ مارچ 2012ء نظر سے گزرا۔ سوز و ساز کے عنوان سے سید محمد میر سوز صاحب کے حالات زندگی نظر سے گزرے۔ میر تقی میر، میر درد کے دور میں سادہ الفاظ میں غزل میں رنگ تغزل اور جاذبیت موجود ہے۔ اردو غزل کے ارتقا میں ایسے ہی لوگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سربلند کے عنوان سے مہم جوئی اور کوہ پیمائی کے متعلق میسنر کے حالات معلوم ہوئے۔ فلمی الف لیلہ کے عنوان سے علی سفیان آفاقی کی فلمی دنیا سے متعلق واقعات کی کمی محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ محترم آفاقی صاحب کو صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائیں (آمین) لینس ڈاؤن برج روہڑی سکھر کے تفصیلی حقائق نہایت دلچسپ اور جاذب نظر ہیں۔ چلبلا کے عنوان سے ماضی کے ایک مقبول اداکار کی کتھا، آفاقی صاحب کی فلمی کتھا کی برابری نہیں کر سکتی (آفاقی صاحب سلطان اعظم ہیں، ان کا مقابلہ کسی اور سے ہو ہی نہیں سکتا) ایکسٹرا کے عنوان سے افسانوی انجام سبق آموز اور جھٹکا دینے والا تھا۔ سنہرا ماضی کیوبا اور ہوانا کے تاریخی حالات پر تحریر پسند آئی۔ پراسرار مخلوق میں آصف ملک نے اُڑن طشتریوں پر روشنی ڈالی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فاصلہ اور وقت، مادہ اور اسپیس سے ماورا جو کچھ ہے، ہم وقت اور عکس کے قیدی اس کے ادراک کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بے شمار مخلوق اور سیارے کائنات میں موجود ہیں جہاں زندگی ہے۔ یہ زمین ایک چھوٹا سیارہ ہے۔ کائنات میں زندگی ہی زندگی بکھری ہوئی ہے۔ تبدیلی بہرحال خاصہ فطرت ہے (درست فرمایا) شب رنگین میں مسعود عالم صاحب نے کینیا، نیروبی کے ترقی یافتہ اور رنگین دنیا کا نظارہ کرایا ہے۔ انداز بیاں خوب ہے۔ بھگوان شکاری کے عنوان سے مسعود کھدر پوش نے پسماندہ قبائلیوں اور بھیل قوم کا تذکرہ دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ شیر کا شکار اور تنگ دھڑنگ قبائلیوں میں رہنا مسعود صاحب کی انسانیت دوستی اور محبت کا کمال ہے۔ سیریل کلر یورپ کا انداز تحریر دامن میں لیے ہوئے ہے۔ آپ کو ایک چھوٹا سا مشورہ ہے کہ مغربی ملکوں سے درآمد شدہ واقعات کے بجائے برصغیر میں پھیلے ہوئے معاشرتی مسائل سے متعلقہ تحریروں کو منظر عام پر لانا بہتر ہو گا (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے لیکن سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دونوں طرح کی تحریریں پسند کرنے والوں کا خیال رکھا جاتا ہے) پُراسرار سیارہ میں اوہوا ولس کے متعلق جس لوک کہانی کا تذکرہ کیا گیا ہے، خاصا دلچسپ ہے۔ سراب سے دلچسپی کم ہو گئی ہے، بہرحال خوب ہے۔ سچ بیانیوں میں مار آستین بلا شبہ، اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ رقص زندگی میں تواتر سے یکساں کچھ پیش آنا حیرت انگیز نہیں۔ تیسری پشت میں تبدیلی آتی ہے اور

غالباً ساتویں پشت میں سب کچھ یکسر بدل جاتا ہے۔ مگر کہیں کہیں ایسا نہیں بھی ہوتا۔ فریب نے برے ماحول میں پھنس کر سب کچھ غارت کر دیا۔ اگر اچھے ماحول کو اختیار کرتا تو مسبب الاسباب ذات اسے وصال سے ہمکنار کر دیتی مگر تقدیر بھی تو ہے۔ پسند کا انداز بیان خوب تھا۔ روایات کی پابندی کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ مکافات، مکافاتِ عمل میں مفید ایک شخص کی کہانی ہے۔ انسان اپنے کیے کو برداشت کرتا ہے۔"

✉ **جام اکبر علی ماہڑہ**، مظفر گڑھ سے رقم طراز ہیں "سات عدد کہانیاں روانہ کی تھیں لیکن نہ واپس آئیں اور نہ ہی آپ سے اطلاع مل سکی (ہم معذرت خواہ ہیں کہ مسترد کہانیاں واپس نہیں بھیج سکتے۔ اسی وجہ سے التماس کرتے ہیں کہ فوٹو کاپی اپنے پاس رکھیں) شہر خیال میں آپ کے مخصوص لوگوں اور چہیتے افراد کی اجارہ داری ہے۔ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی بہت کم ہوتی ہے (بدگمانی بری بات ہے، یہ پرچا آپ کا ہے لیکن کہانیاں صرف اعلیٰ معیار کی لگتی ہیں۔ وقت پر ملنے والے خطوط ضرور لگتے ہیں) کافی مرتبہ لکھنے، کچھ کہنے کو دل چاہا مگر آپ کی نظر انداز کر دینے والی پالیسی ہمارے جذبات کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ باقاعدگی سے لکھنے اور اقتباسات روانہ کرنے کی اپنی شرائط سے آگاہ کریں (جو کچھ بھی بھیجیں، اس کا معیار مدِنظر رہے۔ پانچ سے آٹھ تاریخ تک خطوط مل جائیں) اب ٹوٹا پھوٹا تبصرہ مارچ کے شمارے پر۔ ایسا کیوں نامی کہانی پڑھ کر انتہائی حیرت ہوئی۔ یہ کہانی پُراسرار نمبر کے لیے بے حد موزوں تھی (آپ کا اندازہ صحیح ہے) تلاش میں فیصل ریحان کی بیوی نے خوبصورت جملے کا اضافہ کر کے شوہر کو مثبت سوچ اپنانے پر مجبور کر دیا یعنی سوچ کا دھارا بدل دیا۔ نیکی پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارا معاشرہ کس سمت جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی صورت حال رہی تو پھر؟ پسند میں ایک عجیب و غریب اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا سلوک پڑھ کر حیرت ہوئی۔ یہ کیفیت تو اس صاحب کو زندگی بھر یاد رہے گی اور بھول جانا بھی چاہے تو نہیں بھول پائے گا۔ مار آستین نے اپنی منفی سوچ سے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ اس محسن کشن کو آخرت میں جو سزا ملے گی وہ تو الگ ہے لیکن اس خود غرض انسان کے ہاں جب تک شامانہ ہے، اس کی صورت ہی اسے تڑپاتی رہے گی۔ جاوید اپنی بیوی کی صورت میں اسے برتر نظر آتا رہے گا حالانکہ آج وہ جس مقام پر ہے اس میں جاوید کا کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ غریب کے موصوف نے جو شارٹ کٹ اختیار کیا اس کا انجام یہی ہونا تھا۔ آج کل کے جو نوجوان چاہتے ہیں کہ محنت نہ کرنی پڑے تو یہ ان کے لیے ایک بھرپور سبق ہے۔ کاری پڑھ کر بے حد دکھ ہوا اور افشاں کی پُرانی زندگی سے دوری کے فیصلے نے دانش مندی کے بجائے بربادی کی سمت متعین کر لی۔ حالانکہ قدرت نے اسے موقع دینے میں کوئی کمی نہ کی تھی۔ سرورق کی معصوم اور دلنشیں صورت نے نقل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ صبر کا مظاہرہ کرتی تو حالات بدل سکتے تھے، حالات بدلے تو اب بھی ہیں لیکن؟ محفل شعر و سخن یعنی بیت بازی میں پرانے شعر نہ دہرائے جائیں۔ سراب کے شہباز ملک ایک بار پھر مجبوریوں کی دلدل میں اُترتے جا رہے ہیں۔ پُراسرار سیارہ میں سیارے کے بارے میں معلومات کم اور باقی معلومات زیادہ تھیں۔ سیریل کلر کے ڈیوڈ نے اپنی پوری ہمت اور جانفشانی سے قاتل کو کٹہرے میں لا کے دم لیا۔ اس کی ہمت، حوصلے اور فرض سے دل جمعی نے دل خوش کر دیا۔ کاش ہمارے ہاں بھی دو چار ایسے جواں مرد پیدا ہو جائیں تو برسوں سے نامعلوم قاتلوں کے چہروں سے نقاب اُتر سکے۔ نہ جانے ہمارے ہاں کتنے لوگ مٹی میں جا سوئے لیکن ان کے قاتل سزا تو دور منظر عام پر بھی نہ آ سکے۔ بھگوان شکاری نام عجیب سا نہیں ہے، موصوف شکار کے ساتھ پڑوسی ملک کی انتظامیہ کے پردے بھی چاک کر رہے ہیں۔ خواب مسعود عالم رنگینی کے علاوہ اگر معلومات کا تسلسل بھی قائم رکھتے تو زبردست ہوتا۔ شہر ماضی بھی اچھی کاوش تھی۔ ایکسٹرا کی یعنی دیپ راؤ کی بے بسی نے دکھی کر دیا۔ شمارہ بہترین تھا۔"

✉ **عاطف نعمان شاہ**، لودھراں سے لکھتے ہیں "آپ سے پوچھنا تھا کہ وادی بمن نامی مضمون روانہ کر دوں، اس کا جواب درکار ہے (بھیج دیں اگر سرگزشت کے معیار کا ہوا تو ضرور شائع ہوگا لیکن فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیں مسترد مضمون تلف کر دیا جاتا ہے) بہاولپور سے ناصر حسین رند کا خط پُراسرار نمبر پر بھرپور اور زبردست تھا اور ہم رند صاحب کی اس تجویز سے صد فی صد اتفاق کرتے ہیں کہ اس طرح کا نمبر خوفناک، حیرت انگیز اور ناقابلِ فراموش یہ سرگزشت کے لیے یقینی بہترین تجویز ہے۔ اس پر ضرور غور کریں (سلیکشن کے وقت جملوں کی بندش، معلومات اور دیگر فنی وجوہات کو بھی ہم مدِنظر رکھتے ہیں) پُراسرار نمبر سے ایک کہانی قبر گزیدہ پر ڈراما لکھنا اور بنانا چاہوں تو اس کی اجازت لینی ہوگی؟" (یقیناً تحریری اجازت لینا ضروری ہے)

✉ **غضنفر علی خان** کی ملائیشیا سے آمد "عرصۂ دراز سے آپ کے رسالے سرگزشت کو پڑھ رہا ہوں، مجموعی طور پر ہر لحاظ سے یہ ایک بہت اچھا معیاری رسالہ ہے جس میں آپ کو دینی اور دنیاوی معلومات مل جاتی ہیں۔ ہر کہانی پر تبصرہ کرنا بیکار ہے، ہر کہانی اصلاحی ہوتی ہے۔ زمانے کے نشیب و فراز کے بارے میں آگاہی فراہم کرتی ہے اور اس کی عکاسی کرتی ہے۔ خاص طور سے تاریخی معلومات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کے رسالے کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کو اور آپ کے رسالے سرگزشت کو اللہ عمر خضر عطا فرمائے، آمین۔ میں تقریباً چار سال سے ملائیشیا میں مقیم ہوں، فارغ اوقات میں مطالعے کا شوق ہے، جس میں آپ کا رسالہ پہلے نمبر پر ہے۔ میں جب پاکستان جاتا ہوں، واپسی پر اپنے بیگ میں آپ کے رسالے بھر کر لے آتا ہوں، خود پہلے پڑھتا ہوں دوستوں کو بعد میں دیتا ہوں۔ کئی دوست آپ کے رسالے کو پڑھ کر اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔" (آپ کا بہت شکریہ)

✉ **ملک دل شان ملوکر**، خانقاہ سراجیہ، میانوالی سے تشریف لائے ہیں "سرگزشت میں "عشق ناکام نمبر" میں مزہ آئے گا..... مگر یہ آئے گا کب؟ لینس ڈاؤن برج نے بہت معلومات دیں۔ چلبلا، چلبلی تحریر تھی۔ پُراسرار مخلوق، اس کو پُراسراریت نمبر میں شامل کیوں نہیں کیا؟ میری فرمائش ہے کہ فاروق مدکھڑی مرحوم کو پہلے صفحات پر شائع کریں۔ بہت پہلے آپ نے مختصری تحریر پر فرما دیا تھا۔" (مضمون آیا تو ضرور شائع ہوگا)

✉ **ملک ثاقب شاہ تنولی** کی ضلع ایبٹ آباد سے تشریف آوری "سب سے پہلے تو اک دلچسپ واقعہ بتانا چاہوں گا کہ میرے ایک محترم دوست

جو کہ ہمیشہ ڈائجسٹ کے خلاف بولتے ہیں 14 فروری کو مجھے کال کر کے بولے کہ دو چھٹیاں ہیں، وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ ہی پڑھ لوں۔ میں نے انہیں فروری کا ہی سرگزشت بھجوا دیا، دو دن بعد مجھے دوبارہ مجھے انہی محترم نے فون کیا تو میں نے سوچا کہ اب یہ جناب اپنا فلسفہ جھاڑیں گے کہ سب فضول تحریریں تھیں لیکن میرے ان قابلِ ذکر دوست نے مجھے گھر آنے کی نوید سنائی اور کچھ دیر بعد موصوف میرے گھر آ گئے۔ مختصراً یہ کہ آدھا گھنٹا سرگزشت کی تعریفوں میں لگا دیا اور ساتھ میری بھی تعریفیں کہ آپ اتنا جامع، بہترین اور اعلیٰ معیار کا رسالہ پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ساتھ ہی موصوف نے مجھ سے ایک درجن سے زائد پُرانے سرگزشت بھی طلب کر لیے۔ ہے نا مزے کی بات! (آپ نے ہمارا دل بھی باغ باغ کر دیا۔ آپ کی محبت اور خلوص کا شکریہ۔ فروغِ علم کا یہ انداز ہمیں بہت پسند آیا) دوسری بات جو کہ قارئین کے نوٹ کرنے سے پہلے بتا دوں، وہ ہے اپنے نام کے ساتھ لفظ ایڈووکیٹ نہ لکھنا، مختصراً یہ کہ 3 سال بعد وکالت کے پیشے سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور آج کل ملازمت کے حصول میں مصروف ہوں۔ اب آتا ہوں مارچ کے شمارے کی طرف۔ اداریے میں آپ آئی ٹی کے حوالے سے نوحہ کناں تھے۔ جناب، ہم نے آج تک کسی چیز سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا ہے؟ ہم نے تو اس ملک کو بدنام کر دیا ہے، کبھی بھرے بازار عزت لٹتی ہے تو کبھی قانون کے محافظوں کی نگرانی میں لرزہ خیز قتل مثلاً واقعہ سیالکوٹ، کرپشن، ناقص خارجہ پالیسی، ناکام حکمرانی، عالمی سطح پر پاکستان کو اتنا بدنام کیا ہوا ہے کہ دیارِ غیر خصوصاً یورپ میں پاکستانی ہونے کے ناتے اپنا تعارف کروانے پر ہمیں اس انداز سے دیکھا جاتا ہے جیسے دنیا کے سارے لٹیرے، دہشت گرد، ظالم اور ناانصاف صرف پاکستان میں ہی ہیں۔ بہرحال پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ..... کرشن چندر جیسے عظیم لکھاری کے بارے میں پڑھا لیکن پیاس باقی ہے۔ شہر خیال میں ایم اے خالق بھٹی طویل، مفصل اور دلچسپ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر بھی قابض ہوئے۔ خوب، بہت خوب۔ بورے والا سے محمد شاہد، آپ نے درست فرمایا کہ ہم احسان فراموش ہیں، جس قوم نے اپنے عظیم محسن کو رسوا کیا اس کی نااہل افسر شاہی سے کیا بھلے کی امید۔ تفسیر عباس بھی قابلِ ستائش تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس..... کہیں آپ نے محکمۂ ڈاک کے کسی اہلکار سے معائنے کی فیس تو زیادہ نہیں وصول کر لی کیونکہ اکثر آپ کو محکمۂ ڈاک سے گلہ رہتا ہے۔ اب شہر خیال میں ایک دوسرے کی خیر و عافیت کم اور کہانیوں پر بحث زیادہ ہوتی ہے (یہی ضروری ہے) علاوہ ازیں بہت سے دوست جن میں قرۃ العین زینب ایڈووکیٹ، رانا محمد سجاد، سہیل کھتری، سید امتیاز بخاری، شان احمد گشکوری اور بہت سے دیگر نام غیر حاضر ہیں۔ بھئی آپ سب اپنی خیریت سے تو مطلع کریں (ہمیں بھی فکر لاحق ہے۔ آپ سب فوراً حاضری دیں اور محفل کو رونق بخشیں) پُراسرار سیارہ ایک زبردست اور معلوماتی تحریر تھی اگر مریخ پر بھی ایک مفصل مضمون شامل کیا جائے تو سونے پہ سہاگا (آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے) سراب کے تو کیا ہی کہنے، شہباز ملک اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے۔ بیت بازی میں ناہید فراز کا شعر بہت پسند آیا۔ سچ بیانیوں میں رقصِ زندگی بہت پسند آئی۔ عارفہ، اس کی ماں اور نانی کے ساتھ جو ہوا وہ عجیب اتفاق کہ کس طرح سب کی شادیاں ہوئیں اور کیسے حالات ہوئے۔ رئیس خان جیسے ضمیر فروش، بے غیرت انسان کی سزا موت ہی ہوتی ہے۔ عارفہ نے جو کچھ کیا، بالکل صحیح کیا۔ رئیس خان جیسے لوگ ہمارے معاشرے میں ایک ناسور ہیں۔"

✉ **جویریہ قاضی** کی آمد مظفر گڑھ سے "فروری 2012ء کا شمارہ ملا۔ اپنا خط نہ پا کر کافی سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ اعجاز حسین سنھار کرسی صدارت پر متمکن تھے، اچھا تبصرہ تھا۔ سعید احمد چاند، آپ کو مجھ میں ایک اچھی رائٹر کے آثار نظر آ رہے ہیں، بالکل یہی آثار عابد دولت کو بھی نظر آتے ہیں مگر افسوس ڈائجسٹ والے فی الحال ہمیں رائٹر تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، ان کے خیال میں ہمیں ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے۔ ویسے آج کل میں ایک افسانہ نما ناول لکھ رہی ہوں۔ دعا کریں وہ شائع ہو جائے (پیشگی مبارک باد) ایم اے خالق بھٹی، میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ اب سرگزشت کا اولیا نمبر شائع ہونا چاہیے۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، سدرہ بانو ناگوری، ناصر حسین رند اور رانا محمد سجاد کے تبصرے بھی قابلِ ستائش تھے۔ اس ماہ کی سب سے اچھی تحریر خلا کے شکاری تھی۔ اس قدر معلوماتی، دلچسپ اور خوبصورت تحریر پر مریم کے خان یقیناً مبارک باد کی مستحق ہیں۔ عبدالغفور نساخ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا اچھا لگا کیونکہ کچھ بنیادی معلومات تو میں اپنے ایم اے اردو کے نصاب میں پڑھ ہی چکی ہوں۔ پروین شاکر کے بارے میں بھی ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا جانا چاہیے۔ پروین شاکر میرے پسندیدہ شعرا میں سے ایک ہیں۔ تمام سچ بیانیاں ہمیشہ کی طرح عمدہ تھیں۔"

✉ **سدرہ بانو ناگوری** کا خط، کراچی سے "ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی تازہ شمارہ 23 تاریخ کو ملا۔ شہر خیال کی محفل میں پہنچے، تمام ساتھیوں نے اچھا تبصرہ کیا۔ ابتدا اس بار ایک ہی صفحے میں مکمل سرگزشت عظیم لکھاری سے کرتے ہیں۔ کرشن چندر کو اردو ادب کا وقار کہا جاتا ہے، اب پتا چلا کہ وہ تو سچ میں وقار الملک تھے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو جیسے عظیم لکھاری کسی مخصوص مسلک کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ یہ لوگ تو انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں اور ان کا قلم درد کے آنسو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے تو ہی عظیم کہانیاں وجود میں آتی ہیں۔ سراب اس دفعہ ایک نئے موڑ پر آئی۔ شب رنگیں ایک علیحدہ انداز کا سفرنامہ تھا گویا ہم نے ایک نئی دنیا، نئے انداز اور رنگ ڈھنگ سے دیکھی۔ فلمی دنیا سے ایک روداد عجیب لے کر آئے۔ راجا برلیش چندر کا حال پڑھ کر سنہری اسکرین پر نظر آنے والے خوش و خرم چہروں کے پیچھے چھپے دکھ اور مصائب سے آگاہ کر گیا۔ بھگوان شکاری دل کو تڑپا دینے والی داستان تھی۔ ہم نے اسے شکاریات کے درجے پر نہیں بلکہ انسانیت کے آئینے میں رکھ کر پڑھا تو ماضی کا مشرقی پاکستان نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ سیریل کلر میں تھرل اور تجسس آخر تک رہا۔ دعا ہے کہ اللہ انکل علی سفیان آفاقی کو جلد از جلد صحت یاب کرے، آمین۔ بیت بازی میں ناہید فراز کا شعر اس دفعہ بازی لے گیا۔ رقصِ زندگی ایک حیران کن تحریر ہے اور عارفہ صاحبہ نے ایک تنہا عورت ہونے کے ناتے حالات کا بہت ہمت اور جدوجہد سے مقابلہ کیا ہے لیکن اس تحریر کو پڑھ کر اس بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا کہ سچے دل سے مانگنے والوں کو خدا اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ مار آستین، نسیم الحسن نے جاوید جیسے اچھے اور نیک انسان کے ساتھ بہت

www.paksociety.com

ہی بُرا کیا۔ پسند فاروق انجم کی ایک بہت ہی خستی سکرانی تحریر ہے اور کہانی کے اختتام نے تو بہت ہی ہنسایا۔ ایسا کیوں، کمال الدین کے ساتھ جو حالات و واقعات پیش آئے، وہ واقعی بہت حیرت انگیز اور دلچسپ تھے اور کہانی کو آخر تک پڑھنے کے بعد ہم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسا کیوں؟ باقی کہانیاں بھی اچھی لگیں، اب تو بس ہمیں عشق ناکام نمبر کا انتظار ہے۔"

✉ **معراج الدین** کا مکتوب خاص، مردان سے "میرا نام معراج الدین ہے، گیارہویں جماعت پری میڈیکل سال اول کا طالب علم ہوں۔ ساتویں جماعت سے سرگزشت زیر مطالعہ ہے۔ پہلی بار کسی بھی رسالے کے بارے میں لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ مدیر اعلیٰ اور شہر خیال کے بزرگ شرکا میرے اس بچگانا تبصرے کی غلطیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مجھے ہمت و حوصلہ دیں گے (محفل کے شرکا اور ہماری جانب سے خوش آمدید) سرگزشت کے حصول کے لیے حسب معمول دو ڈھائی میل کی مسافت طے کی لیکن سرگزشت کے ہاتھ میں آتے ہی ساری تھکان دور ہو گئی۔ اشتہارات سے گزر کر ہماری آنکھیں معراج رسول صاحب کی تحریر پر رک گئی۔ واقعی ہم نے انٹرنیٹ سے عمومی طور پر چیٹنگ کے علاوہ کوئی کام نہیں لیا۔ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 62فی صد انٹرنیٹ چیٹنگ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ عظیم لکھاری میں کرشن چندر جی وقار الملک کے بارے میں پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے جسد خاکی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس سے قطع نظر اللہ تعالیٰ نے یقیناً انہیں درجات عالیہ سے نوازا ہوگا۔ اوراق پلٹے اور یک گئی سرگزشت کے خوبصورت پلوں سے گزر کر ہم شہر خیال کی خوبصورت محفل میں وارد ہوئے تو جناب ایم اے خالق بھٹی صاحب کو تخت صدارت پر جلوہ افروز پایا۔ ان کا تبصرہ پڑھا تو انہیں اس مقام کا حقدار پایا۔ اعجاز حسین سٹھار اکمل کا تبصرہ حسب معمول مزے دار تھا۔ جویریہ قاضی، صدرہ بانو، تا گوری کی تحریریں ہمیشہ کی طرح بہت پسند آئیں۔ ڈاکٹر روبینہ صاحبہ شاید کسی وجہ سے غصے میں تھیں اور اپنے غصے کو انہوں نے ڈاک کے ساتھ ساتھ سرگزشت پر اُتارنے کا اعلان کر کے ہمیں بہت ڈرا دیا۔ علی مغل صاحب کی سرگزشت کی تحریروں پر اتنی باریک نگاہ دیکھ کر ہمیں اپنی تحریر کے لالے پڑ گئے۔ محمد عزیز ترین، سعید احمد چاند، راجا ثاقب نواز ثاقب، محمد شاہد، ملک ثاقب شاد تنولی، احمد خان تو حیدی، سعید احمد صدیقی، سہیل احمد عباسی سمیت سب کی تحریریں اور تبصرے اچھے تھے لیکن جس تحریر سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی، وہ تھی پشاور سے شاہدہ گلزار صاحبہ کی تحریر۔ ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ اگر کسی اور کو نہیں تو آپ کے اس چھوٹے پٹھان بھائی کو آپ کی تحریر بہت پسند آئی۔"

✉ **طاہرہ**، صوابی سے لکھتی ہیں "میں پہلے اور رسالے پڑھتی تھی جو خواتین کے لیے ہوتے ہیں لیکن ایک دفعہ سرگزشت پڑھا تو اسی کی ہو کر رہ گئی۔ اب ہونے سے بھی کوئی اور ڈائجسٹ نہیں پڑھتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اور ڈائجسٹوں میں افسانوی طرز بیان ہوتا ہے اور ناول اور افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے جبکہ سرگزشت کی اکثر کہانیاں عام لوگوں کی لکھی ہوتی ہیں۔ مارچ کا رسالہ یکم مارچ کو ہاتھ آ گیا۔ عشق ناکام نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ امید ہے کہ اس کی ہر ایک کہانی دل پر نقش ہونے والی ہوگی۔ گزارش ہے کہ کہانیاں مشرقی ہونی چاہئیں، مجھے مغربی عشق پر یقین نہیں ہے اور نہ ہی وہاں کی کہانیاں اچھی اور سچی لگتی ہیں (عشق تو عشق ہے اس کی کوئی سرحد، کوئی زبان نہیں ہوتی۔ پھر مغربی ملکوں کی کہانیاں اور واقعات پڑھ کر ہمیں اپنی تہذیب اور ثقافت کا احساس زیادہ ہوتا ہے) اب تذکرہ ہو جائے مارچ کے سرگزشت کا، پہلے کی طرح سب سے پہلے سراب پڑھی۔ تمام کردار بہت اچھے لگتے ہیں لیکن مجھے فتح خان بہت پسند ہے چونکہ یہ کہانی شروع سے نہیں پڑھی ہے اس لیے مرشد کو ابھی تک نہیں جانتی۔ خیر آگے اسے بھی دیکھ ہی لوں گی۔ دوسرے نمبر پر سچ بیانی رقص زندگی پڑھی لیکن یہ کہانی مجھے بالکل متاثر نہ کر سکی۔ اس کے بجائے پہلے نمبر کی حق دار مار آستین ہونی چاہیے۔ واقعی محبت جان دینے کا نام ہے، کسی کی جان لینے کا نہیں۔ نیکی پڑھ کر فلمی کے دورے پڑتے رہے۔ بے چارے مصنف اور ان کی اہلیہ کو بلاوجہ اور نیکی کے عوض زندگی کے پانچ قیمتی سال جیل میں گزارنے پڑے۔ آخری سچ بیانی ایسا کیوں بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس میں ایک طرح سے معاشرے میں موجود وحشی اور یتیموں کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کا تذکرہ ملا تو دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک اچھے لوگ موجود ہیں جو یتیموں اور بے سہارا بچوں کا سہارا بن کر عاقبت سنوارتے ہیں۔ سچ بیانیوں کے بعد بھگوان شکاری پڑھی، بہت مزہ آیا۔ مسعود صاحب کی کاوشیں اور شیر کا شکار بہت پسند آیا۔ بھیل قوم کے بارے میں پڑھ کر جہاں معلومات میں اضافہ ہوا وہاں ان کی بدحالی اور استحصال دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ آئندہ واقعات کا انتظار ہے۔ مجھے اوٹ پٹانگ کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے پُراسرار مخلوق نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ مجھے اُڑن طشتری کے قصے اور خلائی مخلوق پر بالکل یقین نہیں ہے۔ اگر زمین کے علاوہ زندگی ہوتی تو قرآن کریم جیسی الہامی کتاب میں اس کا تذکرہ ضرور ملتا (قرآن میں دو مشرقوں اور دو مغربوں کا ذکر ہے جبکہ ہم صرف ایک مشرق اور ایک مغرب سے واقف ہیں۔ یوں بھی وہ کائنات کا رب ہے اور کائنات میں زمین کے علاوہ بھی بے شمار سیارے اور ستارے ہیں جن کے بارے میں ہمیں ابھی تک مکمل آگاہی نہیں ہو سکی ہے۔ اس طرح کے مضامین ہمیں مختلف ممالک میں ہونے والی تحقیق کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں، ضرور پڑھا کیجیے اور تحقیق کیا کیجیے) اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ نہ دیتا۔ پہلے محفل شعر و سخن کی کمی محسوس ہوتی تھی لیکن اب یہ کمی آپ لوگوں نے دور کر دی ہے لیکن آپ لوگوں نے بیت بازی کی جو شرط لگا رکھی ہے، یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ اس کے بجائے اگر آپ لوگ اپنی اپنی پسند کے اشعار شائع کرتے جو کسی بھی حرف سے شروع ہو تو مزہ آ جاتا۔" (اس طرح کا سلسلہ سسپنس میں جاری ہے)

✉ **ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی** کا مکتوب، ڈیرہ غازی خان سے "علی سفیان آفاقی کی علالت کی خبر نے افسردہ کر دیا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) عبدالخالق بھٹی صاحب مسند صدارت کی مبارک باد۔ درست لفظ رطب اللسان ہوتا ہے۔ جناب ایاز راہی نائب یا خلیفہ اس

ہستی کا مقرر ہوتا ہے جو اپنے منصب سے ہٹ جائے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حاکمیت اعلیٰ کسی بھی مخلوق کو نہیں دے سکتے لہٰذا یہ نظریہ غلط ہے۔ علمائے لغت بیان کرتے ہیں کہ خلیفہ بلفظ خلف سے نکلا ہے اور لازم ہے کہ خلف کا سلف ہو اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی سلف نہیں (قرآن نے صاف کہا ہے انسان کے متعلق کہ میں زمین پر خلیفہ بھیج رہا ہوں، جس پر شیطان نے کہا کہ یہ فتنہ و فساد برپا کرے گا) زہرہ دیوی کو کلدانیوں کے ہاں مالکتا کہا جاتا تھا اور ایرانی اسے مترا بھی کہتے تھے۔ اہل بابل اسے عشتار کہتے تھے، وہاں جا کر دیوی بہت بدنام ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں یہ حسن و عشق کی بجائے جنسیت کی علامت بن جاتی ہے۔ بابلی تہذیب میں عشتار کے مندر ایک طرح سے برائی اور بدکاری کے مرکز تھے اور ان عوامل کو مذہبی تقدس بھی حاصل تھا۔ تمبر ایلنی سوس والے اس عشتار کو ڈیا نا دیوی کا نام دیتے تھے اور وہاں بھی اسے وہی حیثیت حاصل تھی جو کہ اہل بابل میں عشتار کو۔ ایک شکایت ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ صوبہ سرحد کے ایک شاعر نے علاقہ پنجھ کے لوگوں کی تعریف و توصیف پشتو اشعار میں کی تھی جن کا ترجمہ یہ ہے۔ کیا لوگ ہیں پنجھ کے سارے کے سارے، شیر ببر ہیں مگر آپ نے اس انداز سے کاٹ چھانٹ کی کہ جملہ بے معنی ہی ہو گیا۔ باقی رسالے کے سارے ہی مضامین خاص تھے خصوصیت کے ساتھ پُراسرار مخلوق کہ بچپن سے ہی اُڑن طشتریاں میرا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔"

✉ **صداقت حسین ساجدہ** کا شور کوٹ سٹی سے تحفہ تحریر "سرگزشت کافی عرصہ سے پڑھ رہا ہوں۔ شہر خیال میں بھی حاضری دیتا رہا پھر مصروفیات ایسی آن پڑیں کہ پڑھنا تو جاری رہا لیکن خط نہ لکھ سکا۔ امید ہے کہ آپ اور سب دوست خوش دلی کے ساتھ ویلکم کریں گے (خوش آمدید) سلسلے وار تحریر سراب ہر قسم دلچسپی میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ سوز و ساز میں میر سوز کے مفصل حالات زندگی سے آگاہی حاصل کی۔ سربلند پیلس ڈاؤن برج کی سیر بہت عمدہ رہی۔ چلبلا تو شہ خاص تھی۔ ایکسٹرا بھی پسند آئی۔ شاید یہ بھی ان تحریروں میں سے ایک تھی جو خاص نمبر میں جگہ نہیں پا سکی تھیں۔ (جی ہاں) شب رنگین کمال کی سز کہانی تھی۔ مجھے بہت پسند آئی۔ مسعود کھدر پوش کی خوبصورت تحریر بھگوان شکاری بہترین رہی۔ سچ بیانیاں سب عمدہ تھیں۔" (آپ کی تحریر مل گئی، پڑھ کر بتایا جائے گا کہ شائع کب ہوگی)

✉ **علی مغل** نے کلوال، مانسہرہ سے لکھا ہے "نومبر اور موجودہ مارچ کے شمارے میں اپنے اداریوں میں جس خوبصورت انداز سے معراج رسول صاحب نے پوری قوم کو بیدار کرنے کی بھرپور سعی کی یہ ان کی اعلیٰ سوچ اور وطن سے محبت کا بین ثبوت ہے۔ ہند کے صوبہ گجرات میں واقع ولی محمد کے باغ میں آم کا پیڑ گزشتہ دو سو سال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور پاک قوم انفارمیشن ٹیکنالوجی میں خسارے کا بجٹ پیش کر رہی ہے۔ یہ محض افسوس کی بات نہیں بلکہ دکھ کی بات ہے۔ ہندو مسلم فسادات کی آڑ میں کرشن چندر جیسے عظیم لکھاری کی آخری رسومات میں جو تنازع پیدا ہوا پڑھ کر اپنے علاقے کے ایک عظیم شخص کے انتقال کا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کا جنازہ اٹھا، خاندان کے افراد بٹ گئے۔ ایک کا اصرار تھا کہ ہم اپنے طور پر اپنے طریقے کے مطابق اپنے قبرستان میں دفن کریں گے اور دوسرے بضد تھے کہ قبر ہم نے بھی تیار کر رکھی ہے اور مرحوم کا جنازہ لوگوں کے کندھوں پر تماشا بنا ہوا تھا۔ اس دفعہ شہر خیال پھیکا پھیکا سا تھا یا مجھے ایسا لگا۔ صاحب صدر کی بجائے ناظم صاحب نے کچھ۔ راجا ثاقب نواز ثاقب نے اگر دو ہی ہاتھ کیے تو اعجاز سٹھار صاحب بھی پیچھے نہ رہے۔ ایم اے خالد بھٹی صاحب، آپ خلوص اپنی جگہ مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ اچھا لکھتے ہیں تو کچھ بہت اچھا۔ کوئی لاجواب ہے تو بعض نایاب لکھاری بھی ہیں۔ چنانچہ پھولوں بھرے باغ میں کسی ایک پھول کو ترجیح دینا میرے نزدیک کور ذوقی کی دلیل ہے۔ پھول اگر سارے کے سارے پھول ہی ہیں تو لکھاری بھی سارے اہل قلم ہی ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ہر ماہ بہترین مواد لے کر آتے ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کو تشنگی میں مبتلا کر کے چلے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح عشق ناکام کا اشتہار منتظرین کے لیے اک صلیب بنا ہوا ہے، انتظار کی صلیب۔ سرگزشت جتنے دن ہاتھ میں رہے کسی اور اخبار، میگزین یا کتاب کی طرف نظر ہی نہیں اٹھتی۔ اور یہ سب مدیر سرگزشت کی ان تھک محنت اور بھرپور خلوص کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ماہانہ جرائد تو اور بھی بہت ہیں۔ اپنے مانسہرہ کے محمد ایاز راہی صاحب کے مضامین پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہم اہل مانسہرہ بھی سرگزشت کی کچھ نہ کچھ خدمت کر ہی رہے ہیں۔"

دیر سے آنے والے خطوط۔

یونس مانسہروی (اورنگی کراچی) بشیر احمد بھٹی (بہاولپور) راجا ثاقب نواز ثاقب (ساہیوال) فیض احمد (لاہور) نصیر حیدر (چکوال) کامران بشیر (خیر پور) نغمہ فصیح (کمالیہ) نرجس خاتون (ایبٹ آباد) ڈاکٹر سلطان نظامی (نارووال)

سرگزشت کے لکھاری یعقوب جمیل گزشتہ 13 مارچ کو خالق حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا الیہ راجعون) مرحوم پاکستانی فلمی صنعت سے عرصہ تک بحیثیت کہانی نویس و منظرنامہ نگار جڑے رہے۔ ادارہ ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

www.Paksociety.com

باربی ڈول

محمد اختر

وہ خواب نگر کی شہزادی تھی۔ اس کا حسن جہاں گیر فتنہ سامانی کا سبب تھا۔ اس کے عشاق اس کا نام لے لے کر آہیں بھرتے اور وہ ان کے دلوں کو ٹھوکروں میں رکھتی۔ اس کے حسن کی جنوں خیزی کو مدنظر رکھ کر اسے مشورہ دیا گیا کہ اپنے حسن کی جادوگری سے علاقے کے باہر جو دنیا ہے، اسے بھی محظوظ کرو اور اس نے یہ مشورہ مان لیا۔ اس راہ پر چل پڑی جو دولت وشہرت سے نوازتا ہے۔ جب آگے بڑھی تو پھر بڑھتی ہی چلی گئی۔ راستے کی ہر دیوار خود ہی گرتی چلی گئی۔ عکس وفن کی اس دنیا میں اس کا راج قائم ہوگیا تھا۔ وہ فن کی دیوی کہلانے لگی۔ آج بھی اس کی پرستش اسی انداز میں ہوتی ہے۔

[illegible]

جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے ہونٹ اس طرح سکڑے ہوئے تھے جیسے دل بنا ہوا ہو۔ اس کے ہونٹ دیکھ کر بے اختیار دل آجاتا تھا اور دل چاہتا تھا کہ اس بچی سے محبت کی جائے' وہ محبت کی نشانی تھی' محبت کا نشان ہونٹوں پر لے کر پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا نام "لو" یعنی محبت ہی رکھ دیا گیا۔ لو (LOVE) نام رکھنے کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ اس کی ماں بیٹ ہیوٹ جن دنوں کالج میں زیر تعلیم تھی۔ اس وقت اس کی سب سے بہترین دوست کا نام لو (LOVE) تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ اس کے سنہری بال' ہوا میں لہراتے تھے اور اس کی کمر سے نیچے کولہوں تک پہنچتے تھے۔ اس کی جلد شفاف' سفید اور گلابی جبکہ آنکھیں گہری جھیل کی طرح نیلی تھیں۔ وہ ایک بھرپور شخصیت تھی اور کالج کے ہر نوجوان کے دل کی دھڑکن' وہ اس کی ماں کی زندگی میں آنے والی خوبصورت ترین عورت تھی۔ وہ ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو گئی تھیں کہ جب جدا ہونا پڑا تو دل خون کے آنسو رونے لگا۔ جدا ہوتے وقت اس نے لو (LOVE) سے وعدہ کیا اور کہا کہ اگر میری بیٹی پیدا ہوئی تو میں اس کا نام لو رکھوں گی اور تمہاری محبت کو ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ جب تم یاد آؤں گی تو اسے پیار کر لیا کروں گی اور تمہاری دوری ستائے گی تو اسے دل سے لگا کر تمہیں یاد کر لیا کروں گی اور پھر جب بیٹ ہیوٹ کے یہاں ایک بیٹے کے بعد بیٹی نے جنم لیا تو اس کا نام "لو" (LOVE) رکھ دیا گیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ نام لو رکھ دینے سے اس کی شخصیت اتنی متاثر کن نہیں ہوئی جتنی اس کی ماں کی سہیلی "لو" کی تھی۔ نہ اس کی طرح بال سنہری ہو کر اس کے کولہوں تک آئے اور نہ قد پانچ فٹ گیارہ انچ ہو سکا۔ اگرچہ اس نے پوری دنیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے اور "آئی نو واٹ ڈو یو ڈولاسٹ سمر" میں اپنے جسم کی نمائش کے بعد وہ پوری دنیا میں شہرت حاصل کر گئی۔ باوجود اس کے کہ اس کا قد بھرپور شباب میں پانچ فٹ تین انچ' بال بھورے اور آنکھیں بھی بھوری ہی ہیں۔

ہم بات کر رہے ہیں' ہالی ووڈ کی سحر انگیز بیوٹی کوئین جینیفر لوہیوٹ کی' جس سے آج شوبزنس کی دنیا کا ہر فرد واقف ہے۔ اس کی شخصیت' بچپن' تاریخ' جوانی وغیرہ سے واقف ہو نہ ہو۔ اس کے پُرکشش بدن اور بے مثال اداکاری کا ہر ایک دیوانہ ہے۔ جینیفر لوہیوٹ امریکن ہے۔ اس کا خمیر امریکی ریاست ٹیکساس کے قریب ایک مقام کلین (KILLEEN) سے اُٹھا ہے۔ ٹیکساس کے بارے میں یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ دیگر امریکی ریاستوں جیسی ریاست نہیں ہے۔ یہ وہ ریاست ہے جہاں جنوبی امریکا کے پرانے طور طریقے' قدیم روایات' جنوب اور مغرب کے ہلچل مچا دینے والے انداز سے ملتے ہیں۔ یہ امریکا کی سب سے بڑی ریاست ہے' یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ ریاست نہیں بلکہ پورا کا پورا اقلیم ہے۔ جس میں شمالی شہر ڈیلاس اور جنوبی شہر ہوسٹن بھی واقع ہیں اور یہ دونوں شہر اس ریاست کے بڑے شہری مراکز ہیں۔

ٹیکساس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خوف ناک حد تک آزاد ریاست ہے۔ وہاں کے لوگ ہر کام اپنے طریقوں سے کرتے ہیں' اور ہر معاملے میں ہمیشہ اپنی ہی من مانی کرتے آئے ہیں' لیکن یہ خوف ناک آزادی صرف شہروں تک محدود ہے۔ جدید دنیا کے ساتھ اس ریاست میں پھیلے متعدد چھوٹے قصبے اور چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی ثقافت اور روایات کے باعث اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں اب بھی قدیم روایات کی پاس داری پر جان تک دے دینے کا رواج موجود ہے۔

اب بھی وہاں قدیم روایات کی طرح ہائی اسکول کی ٹیموں کے درمیان روایتی فٹ بال میچوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ ٹیکساس کے لوگ ان کھیلوں میں اور دیگر قدیم مشاغل میں اب بھی اسی طرح دلچسپی لیتے ہیں' جس طرح آج سے پچاس یا ساٹھ سال قبل لیتے تھے۔ حتیٰ کہ عمر رسیدہ افراد کی دلچسپی کا محور بھی یہی تفریحات ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً ہونے والے مقابلہ حسن' جن کو جدید شہروں میں رہنے والے لوگ ماضی سے برآمد ہونے والی دلچسپی سمجھتے ہیں اور محض کنواری لڑکیوں کے حسین و جمیل نشیب و فراز دیکھنے کے لیے ہی ان مقابلوں میں جاتے ہیں۔ یہ مقابلے آج بھی اسی شد و مد کے ساتھ ٹیکساس کی معمول کی زندگی کا حصہ ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ٹیکساس' دراصل امریکا کے ماضی اور حال کا حسین امتزاج ہے۔

کلین ((KILLEEN) جہاں کی گلیوں میں جینیفر لوہیوٹ کے شباب کی مہک آج بھی رچی بسی ہے۔ ٹیکساس کے مرکز سے اتنا ہی قریب ہے جتنا کہ کوئی اور شہر' اس سے قریب ترین دوسرا شہر آسٹن ہے۔ ٹیکساس کے رہنے والے ٹیکسن کہلاتے ہیں اور آسٹن نامی شہر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ٹیکسنوں کی باقاعدگی کا اعلیٰ ترین نمونہ' جدید سوچ رکھنے والا' قدیم روایات کو زندہ رکھنے والا' کالجوں کا مرکز اور امریکی موسیقی کا اہم ترین مرکز ہے' یہی وہ جگہ ہے جہاں جینیفر لوہیوٹ' پلی بڑھی جوان ہوئی اور جوانوں کے دلوں کی

امنگ بنی۔

جینیفر لوہیوٹ اصل میں وہاں سے چند میل شمال کی جانب واقع "واکو" میں 21 فروری 1979ء کو پیدا ہوئی۔ "واکو" وہی مقام ہے جو قانون نافذ کرنے والے افسران اور ڈیوڈین فرقے کے درمیان 1994ء میں ہونے والی جھڑپوں کے بعد پوری دنیا میں بہت مشہور ہوا۔ جینیفر کی پیدائش سے پہلے اس کے والدین بیٹ ہیوٹ اور ٹام ہیوٹ ایک بیٹے کے ماں باپ بن چکے تھے گویا جینیفر ان کی دوسری اولاد تھی۔ بیٹے کا نام ٹوڈ تھا۔ جینیفر کی پیدائش کے وقت وہ آٹھ سال کا تھا۔ اگر وہ خود لڑکی ہوتا تو شاید پھر اس کا نام ہی "لو" رکھا جاتا۔ کیونکہ ان کی ماں اپنی دوست کے بچھڑنے کے بعد یہ طے کر چکی تھی۔ ٹوڈ اگرچہ آٹھ سال کا تھا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کی بہن کا نام علاقے میں اس کی شرمندگی کا باعث بن جائے گا۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی کہ اس کی بہن کا نام کس قدر عمدہ اور دل نشین ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کو اپنی بہن کی پیدائش کے بارے میں بتایا تو اس کے تیرہ سالہ دوست جم نے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا "آف۔۔۔! لو! کس قدر پیارا نام ہے۔ دل چاہتا ہے آگے بڑھوں اور اس کا بوسہ لے لوں، ویسے ٹوڈ تمہاری بہن کا نام بہت پیارا ہے۔ تمہاری بہن اتنی بڑی کب ہوگی جب میں اسے پیار کرسکوں۔"

بات تکلیف دہ تھی، کم عمری کے باوجود ٹوڈ کی سمجھ میں آگیا کہ اس کی بہن کا نام کس قدر آگ لگا دینے والا ہے۔ جم سے جھگڑنا بیکار ہے۔ اسے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ جوں جوں "لو" بڑی ہوگی۔ علاقے کا ہر نوجوان اسے "لو" کرنے کو بے چین نظر آئے گا اور اسے ذہنی عذاب بھگتنا ہوں گے۔ وہ غصے میں کھولتا ہوا گھر آیا، اور اپنی ماں کے پاس پہنچا اور بولا "ممی، لو کا نام تبدیل کریں۔ یا اس کے نام کے ساتھ کوئی ایسا عام سا نام لگا دیں جس سے مجھے باہر لوگوں کی باتوں کا نشانہ بننے کا موقع نہ مل سکے۔"

وہ چھوٹا سا تھا، بات بڑی کر رہا تھا۔ والدین نے ذرا غور کیا تو چھوٹے منہ سے نکلی ہوئی بڑی بات سمجھ میں آگئی، انہوں نے اپنے بیٹے کا منہ چوم لیا۔ ماں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہمارا ٹوڈ، بہت سمجھ دار ہے۔ اتنی سی عمر میں اس قدر سمجھ داری کی بات کرتا ہے۔ ہمیں اس کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔"

باپ نے کہا "بچوں کی رائے کا احترام کیا جائے تو ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ تمہارا بہت شکریہ بیٹا! تم نے بہت اہم بات کی ہے۔ لہٰذا ہم تمہیں یہ اختیار دیتے ہیں کہ اپنی بہن لو کے نام سے پہلے کوئی عام سا نام تجویز کرو!"

ٹوڈ آٹھ سال کا بچہ تھا، مگر امریکی بچے آٹھ سال کی عمر میں بالغوں کی طرح سوچنے اور حسین لڑکیوں پر فدا ہونے کا سبق سیکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی گلی میں چند مکانوں کے فاصلے پر ایک گھر میں رہنے والی لڑکی "جینیفر" پر فدا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ دل ہی دل میں اس کو چاہتا تھا۔ باپ نے نام تجویز کرنے کی ذمّہ داری دی تو اس کے ذہن میں آنے والا پہلا نام اس کی گرل فرینڈ یا محبوبہ جینیفر کا ہی تھا۔ ذہن میں ابھرنے والا نام بے اختیار زبان سے پھسل گیا۔ یوں لو (LOVE) کے نام سے آنے والی بچی چند ہی دنوں میں جینیفر لوہیوٹ بن گئی۔ اس کے گھر والے اور دوست پھر بھی پیار سے اسے لو ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

دوسرے بچوں کی طرح اس کے بارے میں بھی کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ بچی کیا گل کھلانے والی ہے اور کن مقامات پر جا کر اپنی خوشبو پھیلانے والی ہے۔ اس کے پورے گھرانے میں بھی کوئی ایسی مثال موجود نہیں تھی، کم از کم قریبی رشتہ داروں میں تو کوئی بھی نہ اداکار تھا، نہ کسی قسم کا فنکار اور نہ پرفارمر، البتہ اس کی پشتوں کو کھنگالا جائے تو پتا چلے گا کہ اس کی دادی کا تیسرا کزن جیسی کلائن، اپنے زمانے میں لوک گیتوں کے حوالے سے ایک لیجنڈ تھا لیکن جینیفر ہیوٹ کے حوالے سے نہ تو اس بات پر کبھی غور کیا گیا اور نہ اس حوالے کو اہمیت دی گئی۔ خود جینیفر کی شخصیت اور مقبولیت اس قدر زیادہ ہوگئی کہ اس حوالے کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

دیکھا جائے تو ان کا گھر ایک آئیڈیل اور مکمل گھرانہ کہلایا جاتا تھا مگر امریکی گھرانوں کی روایات کی طرح آگے چل کر اس گھرانے کا بھی شیرازہ بکھرنا تھا۔ ابھی جینیفر لوہیوٹ محض چھ ماہ کی ہی تھی کہ اس کے والدین ایک دوسرے سے بے زار ہوگئے۔ ساتھ رہنے اور شب و روز گزارنے میں کوئی نئی بات نہیں رہی تو انہوں نے گاڑی کو آگے گھسیٹنے کے بجائے علیحدہ ہو کر اپنی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور یوں قانونی طور پر دونوں کے درمیان طلاق ہوگئی۔

طلاق کے بعد بچوں کی ذمّہ داری ماں نے سنبھال لی۔ بچوں کو پالنے اور اپنے پیٹ کو سنبھالنے کے لیے ان کی ماں کو ملازمت کی ضرورت پڑی۔ اس نے اسپیچ پیتھالوجی (SPEECHPATHALOGY) میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ جلد

ہی اسی شعبے میں اسے کام مل گیا۔ اگرچہ ملازمت کی جگہ واکو سے ذرا فاصلے پر تھی، مگر واکو نامی اس قصبے کے چھوٹے سے شہر میں رہنے کے کچھ فوائد بھی تھے۔ یہ بچوں کی بہترین پرورش کے لیے بہترین جگہ تھی۔ دوسرے علاقوں کی بہ نسبت سستی تھی اور پھر ثقافتی مرکز آسٹن کے قریب ترین بھی تھی۔ اس کے علاوہ ٹوڈ جو کہ تیزی سے بڑا ہو رہا تھا۔ اس نے واکو میں کئی دوست بنائے تھے۔ اگر وہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہوتے تو نئی جگہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا، نئے اسکول میں جانا اور نئے دوست بنانا، یہ سب اس کی شخصیت پر اثرانداز ہوسکتے تھے پھر شاید جینیفر بھی جو اسی علاقے کی مزاج میں رچ بس رہی تھی کسی اور جگہ رہنا اس پر بھی نفسیاتی طور پر اثرانداز ہوتا۔ لہٰذا ان کی ماں نے وہاں سے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ مؤخر کردیا۔

کہتے ہیں پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے ہیں۔ جیسے ہی ننھی جینیفر نے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی، اور چلنا سیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کا گر پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آئی ہے۔ جب اس کے منہ میں زبان آئی تو لوگوں کو احساس ہوگیا کہ یہ بچی آگے چل کر کیا بنے گی اور کیا کرے گی۔ سب جان گئے کہ ہمک ہمک کر قدم اُٹھانے لہک لہک کر گانے اور تھرک تھرک کر چلنے والی یہ بچی بڑی ہو کر ناچے گی، گائے گی اور سب کو نچائے گی۔ اس کے گھر آنے والے مہمان اس کی طرف متوجہ رہتے اور وہ ان کا دل بہلاتی رہتی۔ کبھی گاتی، کبھی ناچتی اور کبھی طرح طرح کی حرکتیں کر کے دکھاتی۔ اس کی ماں کو حیرانی تھی کہ بالشت بھر کی بچی کو یہ سب کیسے آتا ہے۔ کون سکھاتا ہے اور کون بتاتا ہے، مگر اس نے اس کی حرکتوں کو اس کے بچپن کی شخصیت سمجھ کر نظرانداز کردیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ جوں جوں جینیفر بڑی ہوگی سب کچھ بھول جائے گی، جس طرح دوسرے بچے بڑے ہو کر اپنے بچپن کو بھلا کر دوسری ہی طرح کی شخصیت بن جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ وقت گزرتا رہا۔ مہینوں بیت گئے مگر جینیفر اس کیفیت کے سحر سے باہر نہیں آئی۔ وہ لوگوں کا دل بہلانے اور سب کی توجہ کا مرکز بننے کا معمولی سا بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ ناچتی بھی تھی اور گاتی بھی تھی، ایسا لگتا تھا کہ رقص اور گیت اس کے خون میں سرائیت کرچکے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ بچپن سے موسیقی کی تال پر جھومنے اور اٹھلا اٹھلا کر ناچنے والی جینیفر مستقبل میں ایک بہت بڑی اسٹار بننے والی ہے۔

اس کی ماں خالص گھریلو عورت تھی۔ شوبزنس کے متعلق اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اس قسم کی ماں نہیں تھی جو اپنی بیٹی کو سب کی توجہ کا مرکز بنتے دیکھ کر فوراً حریصانہ انداز میں اس کو آڈیشنوں، دلالوں اور مقابلہ حسینان میں گھسیٹتی پھرتی۔ اس کے اپنے دل میں ایسی کوئی پوشیدہ خواہش بھی نہیں تھی جسے وہ اپنی بیٹی کے ذریعے پوری کرکے آسودہ ہوجاتی۔ تاہم وہ اپنی بیٹی کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں کھڑی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم جو کچھ کرنا چاہتی ہو کرو، میں ہر موقع پر اور ہر مقام پر تمہارا ساتھ دوں گی، مگر یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں شعوری طور پر تمہیں اس راہ پر چلانا نہیں چاہتی ہوں، لیکن اگر تم شوبز ورلڈ میں جانا ہی چاہتی ہو تو تمہارے لیے مجھ سے جو بن پڑے گا کروں گی۔"

جب جینیفر تین برس کی تھی تو اس وقت ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے اس کی ماں کو قطعی اشارہ مل گیا تھا کہ جینیفر کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ تینوں ایک شب ڈنر کے لیے ڈنر کلب میں گئے ہوئے تھے۔ ٹوڈ کی عمر گیارہ برس ہو چکی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی پیاری بہن لو ان کے درمیان نہیں ہے، وہ نہ تو میز پر تھی نہ اس کے نیچے، اور نہ اس چھوٹے سے ڈنر کیبن میں کہیں نظر آرہی تھی۔ دونوں ماں بیٹا دہشت زدہ ہوگئے اور دیوانہ وار اس کو تلاش کرنے لگے۔ اچانک بیٹ کو دوسرے کمرے سے جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ بلاشبہ جینیفر کی آواز تھی۔ جو بڑی محویت سے ایک پیانو پر بیٹھی کرس کرسٹوفرسن کا گیت "ہیلپ می میک لیٹ تھرو دی نائٹ" گا رہی تھی۔ ایک پیانو نواز، پیانو پلے کر رہا تھا اور اردگرد بیٹھے لوگ پُرجوش انداز میں بچی کا گیت سن رہے تھے، اس کی حوصلہ افزائی میں تالیاں بجا رہے تھے۔

تین سال کی بچی ہوتی ہی کتنی بڑی ہے۔ اتنی سی عمر میں یہ کارکردگی، اس کی ماں نے اسی لمحے جان لیا کہ اس کے بطن سے کسی عام بچی نے نہیں بلکہ ایک فنکارہ نے جنم لیا ہے۔ اس کی بیٹی گھر میں نہیں اسٹیج پر زندگی گزارے گی۔ انٹرٹینر بنے گی۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس بچی میں فطری صلاحیتیں ہیں اور ان فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانا اور اس بچی کو اس کی اصل منزل پر پہنچانا اس کی ذمّہ داری ہے۔

چار سال کی عمر میں اس کی ماں نے جینیفر کو رقص کی ایک تربیت گاہ میں داخل کردیا اور کنڈر گارڈن میں تعلیم کے

لیے داخل ہونے سے پہلے وہ پیروں کو رقص کے درست زاویوں سے حرکت دینا' دلکش انداز میں تھرکنا' گھومنا اور بَل کھانا سیکھ گئی تھی۔ ڈنر کلب میں کرس کرسٹوفرسن کا گیت گانا اگرچہ جینفر کی پہلی پرفارمنس تھی مگر اس چھوٹے سی پرفارمنس کو فنکارانہ زندگی کا آغاز نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ اس وقت آیا جب وہ چھ برس کی تھی۔ اگرچہ وہ تین اور چار برس کی عمر کے دوران ریڈیو پر گلوکاری کر چکی تھی مگر اسٹیج پر لائیو پرفارمنس کا موقع اس وقت ملا جب وہ چھ سال کی ہو چکی تھی۔ اس وقت تک وہ علاقے میں لوہیوٹ کے نام سے خاصی مشہور ہو گئی تھی۔

امریکا کے چھوٹے قصبوں میں منعقد ہونے والے میلے وہاں کی روایتی زندگی پر بہت اثرانداز ہوتے ہیں' یہ میلے ان قصبوں کی زندگی کا وہ اہم حصہ ہوتے ہیں جہاں انسان اور مویشی یکساں طور پر اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک میلے میں گانے کے لیے لوہیوٹ کو بک کیا گیا تھا۔ اس کی ماں اسے اپنے ساتھ لے کر میلے میں گئی تو بدبو سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے ناک سکیڑ کر کہا "ممی! کیا میں اس جگہ پرفارم کروں گی؟"

میلے کے آرگنائزر ان کے قریب ہی تھا۔ اس نے ڈھٹائی سے کہا "اس جگہ میں کیا بُرائی ہے۔ ایسے میلوں میں بڑے بڑے فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

جینفر نے ناک پکڑتے ہوئے پوچھا "مگر یہاں اتنی بدبو کیوں ہے؟"

"جس جگہ یہ شو ہو رہا ہے' کل تک یہاں کیچڑ تھی اور اس کیچڑ میں سینکڑوں خنزیر لوٹیاں لگا رہے تھے۔ ہمیں اس جگہ شو کرنے کی اجازت ملی ہے۔ مجبوراً کل ہی یہاں سے خنزیروں کو نکالا گیا ہے اور اس جگہ کو صاف کر کے شو کے قابل بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بو تو اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی۔ ویسے ایسے میلوں میں بدبو تو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں یہاں پرفارم کرنے میں تامل ہے؟"

لوہیوٹ نے انکار ... سر ہلا دیا "وہ جگہ کارنیگی ہال یا ہالی ووڈ نہیں تھی۔ لہٰذا ...یوٹ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ گانے اور رقص کرنے پر تیار ہو گئی۔ اس نے کئی گیت گائے' خوب ہیجانی رقص کیا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ جینفر لوہیوٹ کو اپنی پہلی پرفارمنس کے وہ لمحات آج بھی یاد ہیں۔ وہ کہتی ہے۔

"یہ محض ابتدا تھی' اس پرفارمنس کا ذائقہ عجیب تھا۔ مجھے اس ذائقے ہی کی طلب تھی۔ بہت زیادہ طلب' اصل میں ... میں اس وقت کسی بھی جگہ پرفارم کرنے کو تیار تھی۔ وہ میلے ٹھیلے ہوں یا میلہ مویشیاں' میں ہر جگہ ناچ سکتی تھی' گا سکتی تھی اور سب کو اپنے ساتھ نچا سکتی تھی۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں جس جگہ پرفارم کر رہی ہوں وہ کل تک خنزیروں کا احاطہ ہوگا۔ وہاں میں نے وٹنی ہوسٹن کا مشہور ترین گیت "دی گریٹسٹ لو آف آل" گایا تھا۔ اس گیت اور پرفارمنس نے میرے آگے بڑھنے کی راہیں ہموار کر دیں۔"

اس میلے میں جب نو سالہ نوخیز کلی' جینفر لوہیوٹ "دی گریٹسٹ لو آف آل" پر تھرک رہی تھی۔ ایک ٹیلنٹ اسکاؤٹ اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اس بچی کے اندر فن کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ وہ بہت اچھا گا رہی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ اس کی خوبصورتی عجیب ستم ڈھا رہی تھی۔ اس کا رقص سب کو اس کے ساتھ رقص کرنے پر اکسا رہا تھا۔ ٹیلنٹ اسکاؤٹ سیدھا اس کی ماں کے پاس پہنچا اور اپنی رائے دیتے ہوئے بولا "تمہاری بچی بہت ٹیلنٹڈ ہے' اسے کسی مقام پر روکنے یا ٹوکنے کی کوشش مت کرنا' یہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے کرنے دو' بلکہ اس کے حوصلہ بڑھانے کے لیے گلیمر کے تمام زاویوں سے روشناس کراؤ۔"

بات اس کی ماں کی سمجھ میں آ گئی' ان دنوں ٹیکساس میں مقابلہ حسن کے جونیئر مقابلے تواتر سے ہوا کرتے تھے بلکہ آج بھی یہ مقابلے پہلے کی طرح کافی مقبول ہیں۔ جینفر لوہیوٹ نے ماں کے ایما پر ان جونیئر مقابلہ حسن میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جلد ہی اپنی خوبصورتی' پُرکشش جسم اور بے پناہ صلاحیتوں کے سبب اسے "لیونگ ڈول" (LIVING DOLL) کا خطاب دے دیا گیا۔

اب اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی کیفیت بھی تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کیلین میں اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ چھوٹے کھیلوں اور میلوں میں میزبانی کرتی۔ ان کو ہدایات دیتی اور ان میں اداکاری بھی کرتی۔ اس کی سہیلیاں یہ سب نہیں کرتی تھیں۔ وہ سب سے مختلف تھی مگر خود کو عجیب نہیں سمجھتی تھی اس کے ننھے سے وجود میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بہت جلد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیوں کر رہی ہے۔ اس عمر میں اس کا پسندیدہ ترین ٹی وی شو این بی سی کا "پنکی برواسٹر" تھا۔ اس شو میں ایک چھوٹی سی لڑکی سیو لیل مون فرائی مرکزی کردار ادا کرتی تھی۔ وہ عمر میں

جینفر لوہیوٹ سے بڑی نہیں تھی مگر پھر بھی ہر ہفتے چھوٹے سے ٹی وی کے ذریعے کروڑوں امریکی گھروں میں گھس جاتی تھی۔ جینفر کہتی ہے "میں جب بھی ٹی وی آن کر کے "پنکی برواسٹر" دیکھتی تو میرے دل میں شوق پیدا ہوتا کہ میں اس جیسی بن جاؤں۔ اس نے اپنی ماں سے کہا "مم! کیا میں اس ... جیسی بن سکتی' سب اس کو دیکھتے ہیں' اس سے پیار کرتے ہیں اور اس کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔"

ماں نے پیار سے اس کے سر پر چپت ماری اور بولی "تم ابھی چھوٹی ہو لو! تمہیں تو ابھی یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ بچی جو کچھ کرتی ہے اسے اداکاری کہتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی مم...! اور میں جاننا بھی نہیں چاہتی' میں تو بس اس جیسی بننا چاہتی ہوں۔ مما! پلیز آپ مجھے اس جیسا بنا دیں۔"

جینفر لو' کم عمری میں ہی پنکی برواسٹر بننا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ پنکی سے زیادہ معروف رہتی تھی۔ اس کے معمولات اس کی ماں کے لیے حد درجہ تھکا دینے والے تھے۔ اس کی ماں ہی تھی جو اسے میلوں اور مقابلوں میں لے کر جاتی تھی' وہی سارے انتظامات کرتی تھی پھر اس کی پرفارمنس دیکھنے اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے ساتھ بھی ہوتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرنے والی دنیا کی دیگر ماؤں کے جیسی ایک ماں تھی پھر اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان بیٹے کی ذمہ داریاں بھی تھیں پھر خود اس کا اپنا کیریئر بھی تھا۔ وہ کیلین میں اسپیچ تھراپسٹ کے طور پر اچھا کاروبار جما چکی تھی' اس کاروبار کے ذریعے اپنے بچّوں کے لیے اچھی خاصی رقم کما لینے میں کامیاب بھی ہو جاتی تھی۔ اب اپنی ذات کے لیے اس کے پاس بالکل وقت نہیں بچا تھا مگر پھر بھی وہ مگن تھی۔ وہ اپنے بچّوں کے سامنے یہ شکایت زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی کہ وہ ان کی وجہ سے خالی برتن کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

کم عمر جینفر کی دوسری معروفیات کے ساتھ ساتھ رقص کی تربیت بھی جاری تھی۔ اس کی ماں دیکھ چکی تھی کہ اس میں عمدہ ترین رقاصہ بننے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ رقص کی تربیت کے ساتھ اسے نغمہ سرائی بھی کرنا پڑتی تھی۔ غرض انٹرٹین کرنے کا کوئی بھی ذریعہ ہو' وہ جب تک اسٹیج پر رہتی کوشش کرتی' اس وقت تک اس نے اداکاری میں باقاعدہ طور پر حصہ نہیں لیا تھا۔ سوائے اسکول کے ڈراموں میں حصہ لینے کے۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ ٹی وی یا کمرشل ڈراموں میں اداکاری کر سکتی' پھر اتنی کم عمر اداکارہ کے طور پر مرکزی ٹیکساس میں مواقع بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ حالانکہ اسی کیلین میں اپنا بچپن گزارنے والی ایک بچی اینی اوکونز' آگے چل کر نوّے کی دہائی میں ٹیلی ویژن کی بڑی اسٹار بن گئی تھی۔ اینی اوکونز وہی مشہور و معروف حسین ترین اداکارہ ہے جس نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کرنے والی ٹی وی سیریز "ژینا' دی واریئر پرنسس" میں گیبریل کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ سیریز ان دنوں بھی XEN چینل پر دکھائی جاتی ہے مگر چونکہ اینی اوکونز' جینفر لوہیوٹ سے عمر میں دس سال بڑی تھی۔ اس لیے وہ دونوں کیلین میں ایک دوسرے کے سامنے نہ آ سکیں۔ اینی اوکونز' جینفر سے پہلے ہی گلیمر کی دنیا میں جا کر اپنے مقام پر کھپ چکی تھی۔

تاہم جینفر لوہیوٹ نے بھی اس نوعمری میں مقبول ہونے اور سب کی نظروں میں آنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کی شخصیت میں کوئی جادوگری تھی' جس کی بنا پر وہ اسٹیج پر اس قدر حاضر دماغی سے کام لیتی کہ سب بے اختیار تالیاں بجانے لگتے۔ نو برس کی عمر میں اسے مرکزی ٹیکساس میں کوئی دوسری باصلاحیت لڑکیوں کے ساتھ ایک پروگرام میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔ جو اس نے بلا سوچے سمجھے فوری طور پر قبول کر لی۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ یہ شو بہت اہم تھا مگر اہم ہونے کی وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر پہنچی' اور اپنی عمدہ ترین پرفارمنس پیش کی۔ حاضرین میں موجود ایک شخص کی نظریں جینفر پر جیسے جم سی گئیں۔ وہ "ٹیکساس شو ٹیم" نامی تنظیم کا ٹیلنٹ اسکاؤٹ تھا۔ وہ پہلی ہی پرفارمنس دیکھ کر جینفر کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا۔ ٹیکساس شو ٹیم نو عمر بچّوں کا ایسا گروپ تھا جو تقریباً پوری دنیا میں اپنے شو پیش کرتا تھا۔ وہ لوگ پوری دنیا میں امریکی ریاست ٹیکساس کے ثقافتی سفیر کے طور پر رقص و اداکاری کے پروگرام پیش کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کا گروپ ایک سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ٹیلنٹ اسکاؤٹ جینفر کے پاس پہنچا اور بولا "میرا گروپ پوری دنیا کا سفر کر چکا ہے۔ ہم مختلف ممالک میں پروگرام کرتے ہیں۔ جلد ہی ہم لوگ بطور گڈول سفیر' روس روانہ ہو رہے ہیں۔ میں اس گروپ کے لیے تمہیں منتخب کر رہا ہوں۔"

بلاشبہ جینفر کے لیے یہ بہت بڑا موقع تھا۔ اپنی شناخت بنانے کا' کیلین سے باہر پوری دنیا میں روشناس کرانے کا' وہ اور

PAKSOCIETY.COM

اس کی ماں خوشی کے مارے ساری رات سو بھی نہ سکی۔ مگر یہ سفر ان کے لیے آسان نہ تھا۔ انہیں اس سفر میں روس کے ساتھ ساتھ ڈنمارک بھی جانا تھا اور پروگرام کئی ہفتوں کے شیڈول پر محیط تھا۔ اس کا مطلب تھا کئی ہفتوں تک اسکول سے مسلسل غیر حاضری' اور یہی سب سے بڑی مشکل تھی۔ کیونکہ اس کی ماں کی ترجیحات میں اس کی تعلیم سرفہرست تھی۔ تاہم انہوں نے ٹیوٹروں کا انتظام کر لیا۔

اس کی ماں کا کہنا تھا کہ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا' اسے ایسے ملکوں میں سفر اور پرفارمنس کا موقع مل رہا تھا جن کے بارے میں دوسرے بچے صرف کتابوں میں پڑھ سکتے تھے یا ٹی وی پر دیکھ سکتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جینفر اپنے گھر سے' اپنے قصبے' اپنے شہر' اپنی ریاست اور اپنے ملک سے اتنی دور جا رہی تھی۔ اس کی ماں بہت فکر مند تھی۔ اس کو پریشان دیکھ کر ٹیلنٹ اسکاؤٹ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس گروپ میں اکیلی لڑکی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں ہیں۔ ان سب کے ساتھ یکساں اور اچھا سلوک ہوگا۔ ہر چیز کا خیال رکھا جائے گا۔ کھانے پینے اور سونے کا بھی دھیان رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ دیکھ بھال بھی اسی طرح ہوگی جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

اب بھی انہیں بہت سی تیاریاں کرنا تھیں۔ جینفر کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنا تھا۔ اس کے بعد نئے کپڑے خریدے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ سردیوں کے موسم میں روس اور ڈنمارک بہت زیادہ سرد ثابت ہوتے ہیں۔ ٹیکساس اور کیلین کی ٹھنڈ ان علاقوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔

جینفر کی زندگی کا یہ پہلا غیر ملکی سفر بڑے ایڈونچر سے کم نہیں تھا۔ اس سفر میں وہ اپنی ماں کے بغیر دوسری لڑکیوں کے ساتھ گئی تھی اور سرکاری ہستیوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس شو نے اسے روسیوں کو قریب سے دیکھنے' ان کے معاشرت جاننے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اسے معلوم ہوگیا کہ امریکا میں روسیوں کے بارے میں جو کچھ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا تھا۔ اس میں بہت حد تک جھوٹ شامل تھا۔ روسیوں کو قریب سے دیکھنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ روسی کس قدر منظم تھے اور ان کے بچے بھی کس قدر منظم نظر آتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے مگر مسکراہٹ کا بین الاقوامی طریقہ' اظہار جانتے تھے۔ ان کو مسکراتے دیکھ کر وہ بھی مسکراتے تھے۔ لفظوں کے بغیر بھی محض مسکراہٹ کے تبادلے سے ایک دوسرے کے مفہوم جان جاتے تھے۔ اب انہیں معلوم ہوا تھا کہ روسی بھی انسان ہوتے ہیں۔ اس دورے سے چند سال قبل ہی امریکی صدر ریگن نے روس کو "شیطانی سلطنت" کا خطاب دیا تھا۔ جینفر نے اس دورے میں روس کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور حساس دل کے ساتھ محسوس کیا۔ اس وقت روسی حکومت کمیونزم سے ذرا فاصلے پر قدم اٹھا کر چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پورا ملک سیاسی اور معاشی طور پر مشکل دور کا سامنا کر رہا تھا۔ وہاں بے روزگاری تھی' لوگوں کے پاس نہ ذریعہ معاش تھا اور نہ رقم' امریکی لڑکیوں کو جس قسم کے پُرآسائش مکانوں اور اپارٹمنٹس میں رہنے کی عادت تھی' وہاں اس معیار کے نہ گھر تھے اور نہ اپارٹمنٹ' وہاں انہوں نے زندگی کو ایک نئے رُخ سے دیکھا اور زندگی کی ایسی تعلیم حاصل کی جو وہ اسکول میں کتابیں پڑھ کر کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں انہوں نے ٹرین اور روسی ائرلائن ائرفلوٹ کے خوف زدہ کر دینے والے طیاروں کے ذریعے سفر کیا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ روس کس قدر طویل و عریض ملک تھا اور اس کے مضافاتی علاقے کس قدر دور دراز تک پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں مقامی لوگوں کی طرح ساوار سے بھاپ اُڑاتی چائے پی' مقامی کھانے کھائے اور اس دوران میں میکڈونلڈ اور برگر کنگ کو شدت سے یاد کرتی رہی۔

یہ دورہ جینفر کے لیے یادگار ترین تھا۔ اس دوران میں جب وہ مقامی لوگوں کے ساتھ رقص کرتی تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہتا۔ اس دورے سے پہلے انہوں نے ایک ہفتے تک مسلسل ریہرسل کی تھی۔ جس کا پھل اب مل رہا تھا۔ ان کی پذیرائی جس انداز میں ہوئی تھی اس سے ان کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔

ڈنمارک' بھی روس جتنا ہی سرد تھا مگر اس سے زیادہ ماڈرن اور جدید تھا۔ ٹیکساس کی یہ لڑکیاں جن چیزوں کی عادی تھیں۔ وہاں تقریباً وہ سب کچھ میسر تھا۔ یہ چند ہفتے خواب کی سی کیفیت میں گزر گئے۔ لوہیوٹ نے اس دوران میں ایسی چیزیں دیکھیں جن کے بارے میں اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ گھر آئی تو اپنے بھائی اور ماں کے لیے طرح طرح کے تحائف سے لدی پھندی تھی۔ اس کا بھائی اس وقت تک کالج میں زیر تعلیم تھا۔ واپس آ کر کئی دنوں تک وہ گھنٹوں اسی سفر کی باتیں کرتی رہتی۔ اپنی ماں کو' بھائی کو اور اسکول میں سہیلیوں کو وہ سب بار بار بتاتی رہتی جو اس

www.Paksociety.com

سفر کے دوران میں اس نے دیکھا تھا۔

ٹیکساس شو ٹیم دورے کے بعد ٹیکساس پہنچی تو اس کا استقبال سرکاری طور پر کیا گیا تھا۔ ٹیکساس کے تمام اخبارات میں ان کی تصاویر اور ان کی عمدہ کارکردگی پر مضامین شائع کیے گئے۔ ان کے خصوصی انٹرویو شائع ہوئے۔ جب پبلسٹی کی یہ لہر ختم ہوئی۔ حالات معمول پر آئے تو کرسمس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خریداری کے علاوہ کرسمس ٹری کو سجانے' اسکول کی چھٹیاں کا کام۔ بے پناہ مصروفیت کا آغاز ہو گیا۔ وہ معمول کی زندگی گزارنے لگی اور پھر ایک دن فون کی گھنٹی بجی۔ جنیفر کو لگا خوش قسمتی کی گھنٹی بج گئی۔ اس نے فون اُٹھایا۔ دوسری طرف غیر مانوس سی آواز تھی "میں بیٹ ہیوٹ سے بات کر سکتا ہوں۔"

جنیفر نے فون اپنی ماں کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دیر تک فون پر باتیں کرتی رہیں۔ جنیفر کو شدت سے بوریت ہو رہی تھی۔ وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی۔ نہ معلوم وہ کس سے اس قدر طویل گفتگو کر رہی تھیں۔ آج سے پہلے تو انہوں نے اتنی لمبی بات نہیں کی تھی۔

جب انہوں نے بات ختم کی تو جنیفر اس وقت بھی لیونگ روم میں بیٹھی ٹی وی اسکرین کو گھور رہی تھی۔ اس کی ماں صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گئی اور پُرسکون لہجے میں بولی "لاس اینجلس کے ایک اسٹوڈیو کے منیجر کا فون تھا انہوں نے اخبارات میں تمہاری تصویریں دیکھی ہیں اور انٹرویو پڑھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کیلی فورنیا میں تم ایک اداکارہ کے طور پر اپنا کیریئر شروع کر سکتی ہو۔ وہاں تمہاری کامیابی کے روشن امکانات موجود ہیں۔"

جنیفر ساکت ہو کر رہ گئی۔ وہ برسوں سے ٹی وی پر یا فلم میں اداکاری کرنے کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ اپنی ماں کی بات سن کر اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ دن آ گیا' جس کا میں برسوں سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ گھڑی آ گئی جب میں ٹیلی ویژن یا سنیما کی اسکرین پر پوری دنیا میں دکھائی دوں گی مگر اس طرح۔۔۔ یہ تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بھی کسی فلم کا کوئی چونکا دینے والا ڈرامائی منظر ہے۔ وہ شوبزنس کی دنیا کو اچھی طرح جاننے لگی تھی' اسے معلوم تھا کہ مواقع اتنی آسانی سے نہیں ملتے ہیں۔ اس نے بے اختیار اپنی ماں کا منہ چوم لیا۔ والہانہ انداز میں گلے لگ گئی "کب مما۔۔۔ کب۔۔۔؟ اور کیا کہہ رہا تھا؟"

اس کی ماں نے کہا "منیجر نے کسی فلم کی آفر تو خیر نہیں کی ہے' مگر وہ رائے دے رہا تھا کہ اگر لو ایک ماہ کے لیے لاس اینجلس آ جائے اور اسے دیکھے کہ آیا اس کے لیے وہاں کوئی دلچسپی ہے' یا نہیں۔۔۔"

"تت۔۔۔ تو۔۔۔!"

"ہاں! اس نے کسی بات کی ضمانت نہیں دی ہے مگر میرا خیال ہے کہ اگر وہ پُرامید نہ ہوتا اور تمہارے مستقبل کی امید نہ ہوتی تو شاید وہ فون بھی نہ کرتا' کیا تم جاؤ گی؟"

"یس۔۔۔ ماما! میں جاؤں گی' ضرور جاؤں گی اور اپنا نصیب آزماؤں گی۔"

"مگر لو! زیادہ پُرجوش ہونے اور ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کرنے کی کوشش مت کرو ممکن ہے تمہیں وہاں سے ناکام ہو کر واپس لوٹنا پڑے' بالکل خالی ہاتھ۔۔۔!"

جنیفر سمجھ گئی کہ اس کی ماں' محض ایک زمرے پر اسے لاس اینجلس بھیجنے کے حق میں نہیں ہے۔ وہ اپنی ماں کے گلے سے جھول گئی اور ننھی بچیوں کی طرح ضد کرنے لگی۔ "پلیز! ممی۔۔۔ مجھے جانا ہوگا۔ مجھے یہی کام کرنا ہے۔ میں ضرور جاؤں گی' پلیز ممی۔ آپ مجھے بھیج دیں۔ دیکھیں انکار مت کریں۔"

اس کی ماں سوچ میں پڑ گئی' بیٹا (ٹوڈ) کالج واپس چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ اور لو اکیلی ہی گھر پر ہوتی تھیں۔ لو کی ضد بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی' آخر بیٹ نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ مان گئی' دل کو یہ تسلی دے کر پُرسکون کر لیا کہ ایک ماہ کی ہی تو بات ہے۔ ایک مہینا تو یونہی گزر جائے گا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کو ایک اجنبی شہر میں کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسے یقین تھا کہ لو ناکام ہو کر گھر واپس آ جائے گی اور اس ناکامی کے بعد وہ مایوس ہو کر ممکن ہے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اداکاری کرنا اور چھوٹی بڑی اسکرین پر نظر آنا لو کا خواب تھا اگر اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا تو وہ اس سے بھی زیادہ بکھر سکتی تھی۔ اگر وہ زندگی کی ناکامیوں کا ذائقہ نہیں چکھے گی تو زندگی کی تلخیوں کا بھی کبھی سامنا نہیں کر سکے گی۔ یہ بات زیادہ خطرناک تھی۔ یہی سوچ کر اس نے لو کی ضد کے سامنے اقرار میں گردن ہلا دی کیونکہ بغیر شوہر کی زندگی گزارنے کے بعد وہ جان گئی تھی کہ زندگی میں اگر' مگر' چونکہ' چنانچہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خواہ آپ کی عمر دس برس ہی کیوں نہ ہو۔

لو کو اپنی آنکھوں اور سماعت پر یقین نہ آیا۔ وہ بے اختیار اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ وہ تو دل ہی دل میں ڈر رہی تھی

کہ ماں اپنے انکار پر ڈٹ نہ جائے مگر شکر ہے ماں مان گئی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔۔۔ اب وہ لاس اینجلس جا رہی تھی۔ اسے ایک نادر موقع مل گیا تھا۔

21 فروری 1989ء کو لو ہیوٹ کی دسویں سالگرہ تھی۔ اس روز وہ دونوں ماں بیٹی ٹیکساس سے لاس اینجلس پہنچیں۔ یہ کیسی سالگرہ تھی نہ کوئی تقریب' نہ کیک اور نہ ہی موم بتیاں اور نہ ہی تحائف کا انبار۔ لو کے نزدیک لاس اینجلس پہنچنا ہی سب سے بڑا تحفہ تھا۔ ایل اے ایکس (LAX) ائرپورٹ پر جس وقت طیارہ اُتر رہا تھا اس وقت اس نے دیکھا کہ پورا شہر اور ائرپورٹ کا رن وے تک گہری دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ بدشگونی کا یہ منظر بھی اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنے میں ناکام رہا۔ اسے اندازہ لگانے میں بھی ناکامی ہو رہی تھی کہ طیارے کے نیچے یہ شہر کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس نے فضا سے ڈیلاس فورتھ ورتھ ایریا دیکھا تھا۔ یہ شہر تو اس سے بھی حتیٰ کہ لو کی توقعات سے بھی بڑا تھا۔ اس کی آنکھوں نے ایسا سحر انگیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ہالی ووڈ کا مشہور و معروف نشان اور وہ پہاڑی دیکھنے کے لیے طیارے کی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس کی قسمت خراب تھی۔ دھند کے باعث وہ اس نشان اور پہاڑی کو دیکھنے میں ناکام رہی تھی۔

طیارہ رن وے پر اُتر گیا تو اپنا سامان وصول کرنے کے بعد لو اور اس کی ماں بیٹ ہیوٹ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئیں۔ وہ ٹیکساس کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں اور ایک اجنبی شہر میں قدم رکھ رہی تھیں۔ ایک ایسے شہر میں جو بے حد پُرجوش' گرم مزاج اور خوش کن جذبوں سے مالا مال تھا۔ پورے شہر میں جگہ جگہ اور بعض جگہ تو حدِ نگاہ تک کھجور کے درختوں کا سلسلہ تھا۔ لو کو تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لاس اینجلس کے بجائے جزیرہ ہوائی پر اُتر گئی ہو۔ لاس اینجلس سے پہلے لو' ڈنمارک اور روس کی سیر کر چکی تھی مگر اس شہر کی بات ہی نرالی تھی۔ ایسی جگہ اس نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اب تک وہ جو کچھ دیکھ چکی تھی وہ اس شہر نے سب اس کے ذہن سے نکال دیا۔

یہ سفر لو ہیوٹ کے لیے کیا گیا تھا مگر تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ اس کی ماں بیٹ ہیوٹ نے اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی ایک موٹل میں کمرا بک کرا لیا۔ اس کمرے کو اب وہ گھر کے طور پر استعمال کرنے والی تھیں۔ دونوں کو ہی اندازہ نہیں تھا کہ انہیں تیس دنوں کے علاوہ بھی یہاں رکنا پڑے گا۔ لہٰذا رہائش کے لیے کوئی اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کرنے کا خیال ہی احمقانہ تھا۔ یہ عجیب شہر تھا۔ یہاں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں بڑے۔۔۔ اور بچے اپنی قسمت آزمانے اور زندگی بنانے کے خواب آنکھوں میں سجا کر آتے تھے مگر قسمت ہر کسی پر مہربان نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی ہر کسی کے خوابوں کو من چاہی تعبیر ملتی تھی۔ انہیں بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ قسمت ان کا ساتھ دینے والی ہے' یا دھتکار کر منہ موڑ لینے پر تیار ہے۔

موٹل میں سامان رکھنے کے بعد دونوں باہر نکل آئیں۔ یہ سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے کا وقت تھا۔ وہ ہالی ووڈ کے اردگرد کے وہ تمام مشہور مقامات دیکھ لینا چاہتی تھیں جن کے بارے میں لو کو امید تھی کہ اس کی پہچان انہی مقامات کے حوالے سے بنے گی۔ اسے انہی کے حوالے سے شناخت ملے گی۔ دن بھر گھومنے پھرنے اور ایک ایک جگہ کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ برتھ ڈے ڈنر کے لیے ایک ہوٹل میں بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ایک طویل مگر بے حد پُرجوش دن گزارا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اب آئندہ ان کے دن بڑے ہوں گے کہ رات۔۔۔

اس شہر میں داخل تو ہو گئیں تھیں اور یہاں آتے ہی انہیں سب سے پہلی جو ضرورت ہوئی وہ اپنی نمائندگی کرنے والے کی تھی۔ ایک اچھا منیجر۔۔۔ اور ایک فعال ایجنٹ۔۔۔ اور لاس اینجلس میں دونوں اقسام کی مخلوق وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ وہاں تو اسٹارز ہوتے ہیں یا منیجر پھر ایجنٹ۔۔۔ اور اگر کسی شخص میں ان تینوں خوبیوں میں سے ایک بھی خوبی نہیں تو وہ لامحالہ طور پر ایسے لوگوں کا واقف کار ضرور ہوتا ہے۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد لو کی ماں کو اندازہ ہو گیا کہ جس ایجنٹ یا منیجر نے لو کے لیے ان کے گھر فون کیا تھا۔ اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ساکھ بھی اچھی تھی اور پھر وہ غیر قانونی کاموں سے دور ہی رہتا تھا۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہ تو انہیں دھوکا دے سکتا ہے اور نہ ہی نقصان پہنچائے گا۔ وہ منیجر نہیں تھا' لو کے لیے پہلا زینہ تھا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس کی ماں ٹیکساس چھوڑنے سے پہلے ہی اس سے فون پر بات کر کے اس سے ملاقات طے کر چکی تھی۔ ایسی ملاقات جس میں انہیں سارا دن اس کے ساتھ رہنا تھا۔ ان کے پاس صرف ایک مہینا تھا اور وہ ایک گھنٹا بھی ضائع کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

منیجر' لو کی صلاحیتوں' اس کی شخصیت' خوب صورتی' فگر اور اس کے کام سے متاثر تھا اور بیٹ ہیوٹ منیجر سے

متاثر نظر آ رہی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی اسے اعتماد ہو گیا۔ منیجر نے تفصیلی گفتگو کے بعد کہا "لاس اینجلس میں کام کی ابتدا مختلف اقسام کی آڈیشنوں سے ہوتی ہے۔ شہر میں ہونے والی ہر آڈیشن میں لو کو بھیجا جائے اور اس کا نتیجہ دیکھا جائے۔"

بیٹ اور لو کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ کیلی فورنیا میں لو کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہاں اس کی حیثیت اس نووارد لڑکی جیسی تھی جو مختصر سے کردار کے لیے بے انتہا جدوجہد سے اپنے کیریئر کا آغاز کرتی ہے۔"

جینیفر اس وقت تک محض انٹرٹینر تھی۔ اس نے کبھی اداکاری نہیں کی تھی مگر اداکاری کے لیے دیوانی ضرور تھی اور منیجر کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بچی کو کامیاب ہونے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس جیسی خوبصورت، پُرکشش اور باصلاحیت لڑکی اگر بدقسمت نہ ہو تو گلیمر کی دنیا میں شہرت کے ساتویں آسمان پر ضرور پہنچتی ہے۔ اس ایجنٹ کے باوجود لو کو ایک خاص سہارے اور کسی خاص سفارش یا تعارف کی ضرورت تھی۔ ایسے میں اس کی ماں بیٹ ہیوٹ کو یاد آیا کہ کیلین میں اس کی ایک دوست تھی۔ اس کا نام لارین جیسپن تھا۔ اس کا نام یاد آ جانا ہی خوش قسمتی کی علامت تھی۔ لارین جیسپن کیلی فورنیا میں ہی مقیم تھی اور پچاس کی دہائی کی مقبول ترین ٹی وی سیریز "فادر لوز بیسٹ" میں کیتھن کا مشہور و معروف کردار ادا کر چکی تھی۔ وہ اس کی تلاش میں نکلیں تو انہیں ناکامی نہیں ہوئی۔ لارین جیسپن اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہی تھی مگر اداکارہ بے کار ہونے کے بعد بھی بہت کارآمد ہوتی ہے۔ لارین کے رابطے اور وابستگیاں اب بھی برقرار تھیں۔ جلد ہی لارین جیسپن کے مشورے سے ایک فعال ایجنٹ کو منتخب کر لیا گیا اور لارین کی سفارش پر بھی اس نے جینیفر کے لیے کام کرنے پر ہامی بھر لی۔

اس نئے ایجنٹ نے بہت تیزی دکھائی اور اگلے ہی روز ایک جگہ کے بارے میں جہاں لو کو آڈیشن کے لیے جانا تھا۔ لو کو ایک موقع مل گیا تھا یہ موقع اسے اس کے تصور سے بھی پہلے مل رہا تھا۔ لو اور اس کی ماں دونوں ہی بہت پُرجوش تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ ماں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "لو! آج تم پہلی مرتبہ آڈیشن کے لیے جا رہی ہو، ممکن ہے تمہیں کامیابی حاصل ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ناکام ہو جاؤ لیکن آج تمہیں روانہ ہونے سے پہلے مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

لو حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں کی آواز جذبات کے باعث بھرا رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ماں گویا ہوئی "لو! نامعلوم تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ قسمت تمہارے ساتھ کیا گل کھلانے والی ہے۔ ممکن ہے تم آگے نکل جاؤ۔ یا ہو سکتا ہے پیچھے ہی رہ جاؤ۔ خواہ کچھ بھی ہو، اگر تمہیں محسوس ہو کہ تمہارا وقت اچھا نہیں گزر رہا یا تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگے تو تم گھبراؤ گی نہیں، بلکہ ہم دونوں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے اس شہر سے دور... بہت دور... اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گے۔"

لو نے اپنی ماں سے وعدہ کر لیا۔ اس کی ماں ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں موٹل سے روانہ ہوئیں۔ اس اسٹوڈیو میں پہنچیں جہاں لو کو آڈیشن دینا تھا۔ انہیں انتظار گاہ میں لے جایا گیا۔ ان سے پہلے بھی بہت سی مائیں ان نوخیز لڑکیوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ اپنی باری آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے لو نے سوچا کہ کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہی؟ کیلی فورنیا میں... سب کچھ مختلف ہو رہا تھا۔ ٹیکساس میں اسے کبھی اس طرح بھیڑ میں اپنی باری کا انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ انہیں بھیڑ بھاڑ کی عادت نہیں تھی۔ وہ ٹیکساس میں جہاں کہیں بھی جاتی تھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

بیٹ نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر موجود بے چینی دیکھ کر وہ لو کی اندرونی کیفیت کو سمجھ گئی لیکن وہ اتنی جہاندیدہ ضرور تھی کہ یہ بھی سمجھ سکتی کہ انہیں ایسے رویوں کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ خود اسے بھی اگرچہ دکھ ہو رہا تھا۔ اس کی بیٹی ٹیکساس کی خاص اور غیر معمولی ترین لڑکی سمجھی جاتی تھی مگر یہاں آتے ہی وہ دیگر بہت سی عام لڑکیوں کی طرح عام سی لڑکی بن گئی تھی۔ ایسی عام سی لڑکی جو انتہائی حقیر سا کردار حاصل کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی اور پھر وہاں بھی کون سا اداکاری کے لیے آڈیشن ہو رہا تھا۔ وہ تو ٹی وی کے ایک مختصر سے اشتہار میں کام کرنے کے لیے آئی تھی۔ ایسا کام جس میں اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا معمولی سا بھی موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی ماں نے یہ بات لو کے ایجنٹ سے بھی کہی تھی۔ ایجنٹ نے جواب میں کہا تھا "لو کو ابتدا میں ایسے ہی کام حاصل کرنا ہوں گے۔ ہر کام، جو خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، غیر اہم نہیں ہوتا۔"

لو کی بے چینی کی وجہ سے آج سے پہلے اس نے جو کچھ بھی کیا تھا۔ ٹیکساس کے اسٹیج پر جو دھوم مچائی تھی اور ٹیکساس شو ٹیم کا دورہ۔ ان سب کاموں کی یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں آکر اسے بہت شروع سے ابتدا کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس اجنبی دنیا میں اسے ایک بار پھر اپنا اعتبار قائم کرانا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مختصر اشتہارات میں کام حاصل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بلندی پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں اور سیڑھیوں پر ایک ایک قدم اٹھا کر اوپر چڑھا جاتا ہے۔ یہ اشتہارات اس کے لیے ابتدائی سیڑھی کے طور پر تھے۔ لاس اینجلس میں محض آڈیشن کے ذریعے کسی لڑکی کے لیے کام حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ آڈیشن اس قدر مختصر ہوتا تھا کہ لڑکیوں کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ہی نہیں مل پاتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں انہیں کورا سا جواب دے دیا جاتا تھا اور پھر وہ کہیں اور آڈیشن دینے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتیں۔

یہ شکر تھا کہ یہ شہر ٹیلی وژن کی صنعت کا مرکز تھا اور وہاں بار بار کوشش کرنے کے مواقعوں کی کمی نہ تھی۔ لو کو اس ساری صورت حال میں مزہ آ رہا تھا۔ آڈیشن کے لیے اس کا نام پکارا گیا تو وہ بھی اندر گئی۔ اسے صرف دو منٹ دیے گئے تھے۔ یہ دو منٹ اس جیسی ہمہ گیر لڑکی کے لیے بہت کم تھے۔ کیونکہ وہ بہت کچھ جانتی تھی اور محض دو منٹ میں کوئی لڑکی بہت کچھ پیش نہیں کر سکتی مگر وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی اور نروس ہوئے بغیر نہایت اعتماد کے ساتھ اپنی پرفارمنس پیش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ ناکامی اسے دل برداشتہ کر سکتی تھی مگر وہ یہاں ناکام ہونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس سے اگلے روز، پھر اس کے بعد... پھر اس کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ مختلف اسٹوڈیوز میں... جہاں کہیں بھی موقع ملتا آڈیشن کے لیے جاتی رہی۔ انہیں ہر جگہ انتظار گاہوں میں وہی چہرے، وہی لڑکیاں، وہی مائیں دکھائی دیتی رہیں اور پھر محض ایک ہفتے میں ہی لو اپنی زندگی کا پہلا کروا... پہلا اشتہار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ باربی ڈول بنانے والے ادارے میٹل کے کھلونے کا اشتہار تھا مگر لو کے لیے یہ اشتہار بھی بہت تھا۔ وہ کام حاصل کر چکی تھی اس نے کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھ لیا تھا۔ وہ ہالی ووڈ آئی تھی اور اپنے قدم کسی جگہ رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کم عمری سے ہی وہ باربی ڈول کے ساتھ کھیلتی آئی تھی، گھر میں اس کی الماری اب بھی ان گڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس اشتہار کی عکس بندی اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ وہ اس سے پہلے کسی ساؤنڈ اسٹیج یا سیٹ پر نہیں گئی تھی۔ یہاں کی تو دنیا ہی مختلف تھی۔ بے شمار روشنیاں... جو بے حد تیز، بے حد گرم تھیں۔ اس کے پورے وجود کو جھلسا رہی تھیں۔ لوگ اس انداز میں گفتگو کر رہے تھے جیسے بہت جلدی میں ہوں۔ عکس بندی کا پہلا دن اس کے لیے زندگی کا طویل ترین دن ثابت ہوا۔ ان کا بیشتر حصہ اس نے اس انتظار میں گزارا کہ کب اس کا نام پکارا جائے گا اور اس سے کام کروایا جائے گا۔ اس روز اس نے محض چند سیکنڈ کے لیے کیمرے کا سامنا کیا۔ منظر اوکے ہو گیا پھر بھی ڈائریکٹر نے اس منظر کو کئی مرتبہ عکس بند کیا۔ تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہو سکا۔ لو کے لیے یہ سب کچھ تفریح سے کم نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں طے کر چکی تھی کہ وہ چکاچوند کی اس دنیا میں رہے گی، یہ دنیا اور یہ ماحول اسے بھا گیا تھا۔

یہ اشتہار ٹیلی وژن پر اس کا پہلا باقاعدہ کام تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بیٹ نے اسے کہا کہ محض ایک اشتہار سے وہ اسٹار نہیں بن گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے کام کی شروعات ہو گئی ہیں۔"

لاس اینجلس میں ان کے تین ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ ایک ہفتے میں ایک اشتہار حاصل کرنا کوئی یادگار بات نہیں ہے لیکن لو کو قوی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی یادگار بات ضرور ہوگی۔ جب وہ کیلین میں پل بڑھ رہی تھی تو اس وقت سے ہی لاس اینجلس اسے خوابوں میں نظر آتا تھا۔ لاس اینجلس اس کے خوابوں کا نگر تھا۔ ایسی سرزمین جہاں وہ رہنا چاہتی تھی۔ وہ یہاں آکر بہت مطمئن ہو گئی تھی۔ یہاں ایک بھی ایسا بچہ نہیں تھا جو اس کو انٹرٹینر بنتے دیکھ کر یا اداکارہ بننے کی جستجو میں مگن دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتا ہو پھر ٹیکساس میں تو ٹیلی ویژن پر آنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ جبکہ یہاں ہر روز مواقع ملتے تھے اور پھر لاس اینجلس میں ہالی ووڈ جیسی جگہ بھی تھی جہاں وہ "گراؤمین چائنیز تھیٹر" میں جا کر تقریباً تمام ہی فلمی ستاروں کے ہاتھوں کے نشان دیکھ سکتی تھی، یا ہر روز "بن سٹ" جا سکتی تھی جہاں لہروں کے ساتھ رومانس بہتا تھا۔ وہاں وہ سڑکیں بھی تھیں جو ہالی ووڈ ہلز کی طرف جاتی تھیں۔ جہاں بین الاقوامی شہرت یافتہ اداکاروں کے گھر تھے، ان گھروں کے درمیان ہی لو کو بھی اپنا گھر بنانا تھا۔ غرض کہ وہ لاس اینجلس پر عاشق ہو گئی تھی۔ تاہم اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اگر وہ اس ماہ کے دوران... اس ایک اشتہار کے علاوہ مزید کام حاصل نہ کر

سکی تو اس کی ماں اسے واپس کیلین لے جائے گی۔ لہٰذا اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی آڈیشن میں شرکت کر رہی تھی۔ کبھی تو دن میں دو یا تین آڈیشن بھی ہوجاتے تھے۔ یہ سب کام بہت تھکا دینے والا تھا۔ لو کے لیے‘ اس کی ماں کے لیے مگر وہ پھر بھی خاموش تھی۔ اپنی بیٹی کی بے تابی سمجھ رہی تھی‘ اس کی نوخیز بیٹی معمولی سے معمولی موقع کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ کمرشل اشتہاروں میں کام کرنے کا شوق لے کر نہیں آئی تھی‘ وہ ماڈل نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ اداکارہ بننے آئی تھی اور کمرشل اشتہاروں میں اداکاری تو ہوتی ہی نہ تھی مگر اشتہارات میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی صلاحیتیں منظرِ عام پر لانا چاہتی تھی مگر اشتہارات کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ جلد ہی اس نے دو اشتہار مزید حاصل کر لیے اور چند ایک کے لیے اسے انتظار کرنے کو بھی کہا گیا۔

اس نے ایک ماہ میں تین اشتہار حاصل کر لیے تھے۔ کام کی اس رفتار سے وہ مطمئن تھی۔ آڈیشن میں آنے والی دیگر لڑکیوں نے اس کی تیزی پر حیرت ظاہر کی تھی۔ جب مہینے کا اختتام نزدیک آیا تو وہ خاموش تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب آگے کا فیصلہ اس کی ماں کرے گی اشتہارات کے بعد انہیں لاس اینجلس میں رکنا ہے یا واپس کیلین جانا ہے اور وہ اپنی ماں کے فیصلے کی منتظر تھی۔

اب فیصلہ اس کی ماں کو کرنا تھا جو جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کیا چاہتی ہے۔ وہ لاس اینجلس میں ہی ٹھہر کر کام کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کس قدر جنونی انداز میں محنت کر رہی ہے۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ ایک ماہ کے دوران میں اس نے اتنا کام حاصل کر لیا تھا کہ جو دوسری لڑکیاں ایک سال میں بھی حاصل نہیں کر پاتی تھیں۔ یہ بات لو کی ماں کو دوسری لڑکیوں کی ماں نے بتائی تھی۔

مگر وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ لو نے پورا ایک مہینا مختلف انداز میں گزارا تھا۔ اس دوران میں وہ اسکول سے مکمل طور پر غیر حاضر رہی تھی۔ بیث بھی دوسری ماؤں کی طرح تھی وہ اپنی چہیتی بیٹی کے سپنوں کو چکنا چور ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ٹیکساس میں اس کی بیٹی ایک ایسی بڑی مچھلی کی مانند تھی جو چھوٹے سے تالاب میں ہو۔ پھر ٹیلی ویژن پر اشتہاروں میں کام کرنے کے بعد تو وہ اور بھی بڑی ہو گئی تھی مگر یہاں لاس اینجلس میں اس کی یہی بیٹی کی حیثیت ہجوم میں کھڑی کسی عام سی لڑکی کی طرح تھی۔

لاس اینجلس سے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ آسان نہ تھا۔ یہ ایک فیصلہ تھا۔ لو کے لیے بھی اور اس کی ماں کے لیے بھی۔ اس موضوع پر دونوں ماں بیٹی کافی دیر تک بات کرتی رہیں۔ لو سے زیادہ اس کی ماں یہ بات جانتی تھی کہ لو صرف اور صرف انٹرٹین کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ لاس اینجلس میں مزید کچھ وقت گزارے اپنی کامیابی کے لیے راہیں تلاش کرے‘ جہاں تک خود اس کی ماں کا تعلق تھا تو وہ اسپیچ تھراپسٹ کے طور پر کہیں بھی کام کر سکتی تھی۔ خواہ وہ ٹیکساس ہو یا لاس اینجلس‘ اس کے لیے مریضوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر ایک اداکارہ‘ گلوکارہ اور رقاصہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ٹیکساس کے بجائے لاس اینجلس میں رہے۔ ویسے وہیں رہنا پڑتا ہے جہاں کام مل سکتا ہے۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد آخر کار انہوں نے طے کر لیا کہ ان کا نیا گھر لاس اینجلس میں ہی ہوگا۔

رہائش کی تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ لو کی ماں نے پہلے اپنے کام پر نوٹس دیا پھر کیلین میں واقع گھر فروخت کیا۔ گھر میں موجود ساز و سامان کی چھانٹی ہوئی‘ انتہائی ضروری اشیا کے علاوہ باقی چیزوں سے جان چھڑائی گئی۔ بعض چیزیں تلف کر دی گئیں اور بعض اونے پونے داموں فروخت کر دی گئیں۔ اب مسئلہ تھا‘ لاس اینجلس میں کرائے کا اپارٹمنٹ حاصل کرنے کا‘ پہلے جگہ کا تعین کیا گیا پھر کیلین سے وہاں تک سامان منتقل ہونا‘ یہ ایک طویل اور تھکا دینا والا مسائل و پریشانیوں سے بھرپور سلسلہ تھا۔ کیلین سے لاس اینجلس منتقل ہونا لو سے زیادہ اس کی ماں بیث کے لیے تکلیف دہ تھا۔ لو تو ابھی بچی تھی۔ اس کی ماں اپنی بنیادیں تک چھوڑ کر جا رہی تھی اور ٹوڈ کو بھی۔۔۔۔ جو اب کالج میں پہنچ چکا تھا اور گھر سے دور رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیلین سے لاس اینجلس کے علاقے ویسٹ کورٹ میں منتقلی کا مرحلہ آسان نہ تھا مگر بیث نے سب کچھ قابو کر لیا۔ وہ بہت باہمت عورت تھی۔ اپنی بچی کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ لو کے لیے یہ ساری صورتِ حال ایک سنسنی خیز ایڈونچر سے کم نہیں تھی۔ وہ اسکول میں بھی خود کو دوسرے بچوں سے ہمیشہ ہی مختلف محسوس کرتی آئی تھی مگر اب وہ ایسی جگہ رہنے جا رہی تھی جہاں وہ لوگوں سے مختلف نہ ہوتی۔ جہاں اس کو اور اس کے مقاصد کو عجیب و غریب سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب اسے ہر وہ کام کرنے کا موقع ملنے والا تھا جو وہ اب تک چاہتی آئی تھی۔

بیث نے کہا تمام معاملات کو انتہائی خوش اسلوبی سے نمٹا دیا اور محض چند ماہ بعد لو اور اس کی ماں بربینک میں واقع اپنے کرائے کے اپارٹمنٹ میں اپنا سامان کھول رہی تھیں۔ یہ مقام منتخب کرنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں سے ٹیلی ویژن اسٹوڈیوز نزدیک تھے۔ انہوں نے گزشتہ دورے کے دوران اپنا زیادہ تر وقت اسی علاقے میں گزارا تھا۔ لو کے متعدد آڈیشن اسی علاقے میں ہوئے تھے۔ بیث اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر یہاں آئی تھی مگر اب بھی کئی مسائل حل طلب تھے۔ لو کی عمر ابھی محض دس برس تھی‘ اس کا مطلب تھا کہ اسے ہفتے میں پانچ دن اسکول میں بھی گزارنا تھے۔ شوق اور پرفارمنگ اپنی جگہ مگر اچھی تعلیم پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ تعلیم بنیادی چیز ہے اور اس کے شوق اور آڈیشنوں کو اس کے گرد گھومنا چاہیے۔

جلد ہی لو کو ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ابتدا میں نئے اسکول میں جا کر لو کو عجیب محسوس ہوا۔ نئے اسکول میں جا کر ہر بچہ اسی قسم کے احساسات سے گزرتا ہے۔ جن سے لو گزر رہی تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کا لہجہ دوسرے بچوں سے مختلف تھا۔ اس کا لہجہ اب بھی خاص ٹیکسن بچوں کی طرح تھا مگر جلد ہی وہ نئے ماحول سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ اس نے نئے دوست بنا لیے۔ وہاں کی زبان‘ رہن سہن اور طور طریقے تیزی سے سیکھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے آڈیشنوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جن کا انتظام اس کا ایجنٹ کرتا تھا۔ اس کو جلد ہی باربی ڈول کے مزید اشتہار مل گئے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور اشتہار مل چکے تھے۔ اس کا سفر تیزی سے آگے کی جانب بڑھ رہا تھا مگر وہ مطمئن نہیں تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ ٹی وی سیریز میں اداکاری کرے۔ اور ”ٹینگی بریوایسٹر“ کی سویل مون فرائی جیسی بن جائے۔ یہ اس کا خواب تھا۔ جس کی تعبیر وہ جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ کبھی اس کے دل میں خواہش بیدار ہوتی کہ وہ اسی کی دہائی میں جان ہمی کی فلموں سے مقبول ہونے والی ”مولی رنگوالڈ“ بن جائے حالانکہ وہ بچوں کی نہیں بلکہ نوجوانوں کی فلمیں تھیں۔ جنہیں لو نہ صرف شوق سے دیکھتی تھی بلکہ ان کی ویڈیو بھی اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

اس زمانے میں ڈزنی چینل کی ایک سیریز ”کڈز ان کارپورائیڈ“ بہت مقبول ہو رہا تھا۔ اور گزشتہ چھ برسوں سے مسلسل دکھائی جا رہی تھی۔ اس میں موسیقی‘ گانے‘ رقص‘ خاکے وغیرہ ہوتے تھے اور یہ سب کچھ بچے ہی پیش کرتے تھے۔ لو کے لیے ایسی سیریز آئیڈیل تھیں۔ اگرچہ وہ اپنے کمرشلز وغیرہ کی وجہ سے بہت مصروف تھی۔ اس کے پاس بالکل وقت بھی نہیں تھا مگر پھر بھی جب اس کے ایجنٹ نے اسے فون پر بتایا کہ ”کڈز ان کارپورائیڈ“ میں اس کے لیے جگہ نکلی ہے تو وہ ایک دم پُرجوش ہو گئی۔ یہ اس کے لیے ایک شان دار موقع تھا۔ اب وہ سب کو بتا سکتی تھی کہ اس میں کیا کیا گن ہیں۔ اس نے آڈیشن کے لیے باقاعدہ ریہرسل شروع کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کردار کو حاصل کرنے کے لیے اسے سخت مقابلہ کرنا پڑے گا مگر جب وہ آڈیشن دینے گئی تو یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اس ایک کردار کے لیے سیکڑوں لڑکیوں کا ہجوم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لاس اینجلس کی ہر لڑکی اپنی قسمت آزمانے وہاں آگئی ہے۔ وہ رابن نامی لڑکی کا ایسا کردار تھا جو کسی بھی لڑکی کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا سکتا تھا۔ وہ اس سیریز کا مسلسل کردار تھا۔ جو لڑکی بھی اس کردار کو حاصل کر لیتی اس کے لیے مزید مواقعوں کا راستہ کھل جاتا۔

لو نے اس کردار کو حاصل کرنے کے لیے گیارہ سو لڑکیوں کے ساتھ آڈیشن دیا۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے اچھی پرفارمنس دی تھی۔ آڈیشن دینے کے بعد وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ بیث نے کہا ”لو! تمہیں اس کردار کے حوالے سے زیادہ پُرجوش نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم توقعات سے زیادہ امیدیں وابستہ کر لو گی تو ممکن ہے ناکام ہونے پر کہیں دل شکستہ نہ ہو جاؤ۔“

”مگر ممی! اگر میں یہ حاصل نہ کر سکی تو سچ مچ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“

اس کی ماں اپنی بیٹی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا ”مجھے بھی تمہاری کامیابی کی پوری امید ہے مگر بیٹا! نتیجہ آنے سے پہلے کامیابی کی امید کر لینا‘ کبھی کبھی تکلیف کا باعث بھی بن جاتا ہے۔“

لو خاموش ہو گئی۔ اس روز کے بعد کئی آڈیشن ہوئے‘ وہ ہر آڈیشن میں اپنی بہترین پرفارمنس پیش کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ لڑکیاں مسترد ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کی تعداد کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار صرف دو لڑکیاں مقابلے میں رہ گئیں۔ ان میں سے ایک لو تھی پھر آخری آڈیشن ہوا اور لو مسترد ہو گئی دوسری لڑکی نے یہ کردار حاصل کر لیا۔ لو اپنی اس ناکامی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ دو ہفتے تک گھر سے باہر نہ نکلی اور پھر جیسے اس کی مراد بر آئی۔ ڈزنی چینل سے اس کے لیے فون آیا۔ اسے طلب کر لیا گیا تھا۔ ماں بیٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

افرا تفری میں اسٹوڈیوز پہنچیں تو انہیں بتایا گیا کہ دوسری لڑکی شوٹنگ کے وقت ان کی توقعات پر پوری نہیں اُتری تھی۔ لہٰذا اس کی جگہ لو کو ہی فائنل کرلیا گیا ہے۔

اس کی بدقسمتی اچانک ہی خوش قسمتی میں بدل گئی تھی۔ اس سیریز میں کام شروع کرتے ہی لو کے مسائل میں بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ خوف ناک حد تک مصروف ہوگئی تھی۔ اب وہ ریہرسل بھی کرتی تھی۔ اقساط کی ریکارڈنگ بھی کراتی تھی اور ساتھ ساتھ اسکول بھی جارہی تھی۔ مجبوراً شوبزنس کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے لیے بھی سیٹ پر ہی ٹیوٹر کا انتظام کردیا گیا۔ لو نے دیکھا تھا کہ ”کِڈز ان کارپورائیڈ“ کے تمام اداکار اداکاری کے ساتھ ساتھ مختلف ساز بھی بجاتے تھے جبکہ لو کو کوئی ساز بجانا نہیں آتا تھا۔ اس بات نے اسے پریشان کردیا۔ کیونکہ اسے سیریز میں رابن کے طور پر کی بورڈ بھی بجانا تھا۔ مگر جلد ہی اسے یہ جان کر اطمینان ہوگیا کہ ساز کسی اور کو بجانا تھا۔ اسے تو صرف ساز پر اپنی آواز میں گیت گانا تھے اور یہ اس کے لیے بہت آسان تھا۔

کِڈز ان کارپورائیڈ کے ساتھ ہی اس نے اپنا اگلا آڈیشن ”ایل اے گیئر“ کے اسپورٹس شوز اور کپڑوں کے پرنٹ کمپی ٹیشن کے لیے دیا اور کئی آڈیشنوں میں اپنے تجربے اور قابلیت سے کام لیتے ہوئے آخر وہ فائنل تک پہنچ گئی اور پھر جلد ہی وہ اس کمپی ٹیشن کے لیے منتخب بھی کرلی گئی۔ اس وقت تک اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس اشتہاراتی کمپی ٹیشن میں اسے اسّی کی دہائی کے سپر اسٹار مائیکل جیکسن کے ساتھ کام کرنا تھا۔ یہ دس برس کی ننھی سی اداکارہ کے لیے ایک معرکہ تھا جسے لاس اینجلس آئے ہوئے محض چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس مقابلے کے شروع ہونے تک اس سیزن کے لیے اس کی ”کِڈز ان کارپورائیڈ“ کی ریکارڈنگ مکمل ہوچکی تھی۔ لہٰذا وہ اس کمپی ٹیشن میں کام کرنے کے لیے آزاد تھی۔ اب وہ ایک ایسے گروپ کی رکن بن چکی تھی جو مائیکل جیکسن کے ساتھ ٹور پر جا رہا تھا۔ اسے مائیکل جیکسن کے ساتھ ناچنا تھا، گانا تھا اور اپنی بھرپور کارکردگی دکھانا تھی۔ لو کے لیے یہ ایک نادر موقع تھا۔ پوری ریاست ہائے متحدہ امریکا، ایشیا، پورا یورپ اور باقی کی پوری دنیا گھومنے کا بہترین موقع۔ ایسے مواقع نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ وہ راتوں رات نصیب والی بن گئی تھی لیکن ایک مشکل اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ ابھی اس کے اسکول کا سال ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی تعلیم اُدھوری نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ”ایل اے گیئر“ والوں نے اس کی مشکل کے پیش نظر اس بات کا انتظام کردیا کہ پورے ٹور میں ایک ٹیوٹر ان کے ساتھ رہے گا۔ تاکہ اس کی پڑھائی متاثر نہ ہوسکے۔

وہ کم عمر ہونے کے باوجود عجیب تاریخ رقم کررہی تھی۔ اس انداز میں تعلیم حاصل کررہی تھی جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی پرنسپل اس کو چھٹی دینے پر ہچکچا رہی تھی مگر لو اور اس کی ماں نے جب اسے یقین دلایا کہ وہ اپنے ٹور کے دوران اپنی ٹیچر کو مسلسل خط لکھتی رہے گی اور انہیں اپنی پڑھائی کے تسلسل سے آگاہ کرتی رہے گی تو وہ مان گئی۔

اس کا ٹور بہت عجیب و غریب تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان سفر کرتے ہوئے، سڑک پر چلتے ہوئے یا پھر سیٹ کے پیچھے اپنی باری کا انتظار کرتے وقت وہ اپنے ٹیوٹر سے سبق لینے میں مصروف رہتی تھی اور لو ان سب معمولات میں بھی مگن تھی۔ وہ کسی بھی قسم کی اُلجھن کا شکار نہیں تھی۔ جب وہ اپنی کلاس ٹیچر یا کلاس فیلوز کو خط لکھتی تو بہت پرجوش ہوجاتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید اس کی ہر کلاس فیلو اس کے ٹور پر اتنی ہی خوش ہو رہی ہوگی جتنا کہ وہ ہے۔ کِڈز ان کارپورائیڈ کا شوٹنگ والا شیڈول اس کو تھکا دینے والا تھا تو دوسری طرف یہ ٹور اس کی توانائیاں نچوڑ لینے والا تھا۔ وہ مسلسل سفر کررہی تھی۔ دنیا کے مختلف مقامات دیکھ رہی تھی۔ تحائف خرید رہی تھی۔ دن میں چار چار مرتبہ پرفارمنس اور پھر اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی، اب اس کے پاس ٹھیک طرح سے سونے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔ اس پورے دورے کے دوران میں وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز مسلسل بنی رہی تھی۔

جب وہ لاس اینجلس پہنچی تو تھک کر چور چور ہوچکی تھی۔ اس کی ماں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ماں کے گلے لگتے ہوئے بولی ”مما! میں بہت تھک گئی ہوں۔ کچھ ہفتے آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”لگتا ہے میری بیٹی کو اس ٹور میں مزا نہیں آیا۔ اگر ایسا تھا تو تم خطوط میں اس قدر پُرجوش کیوں نظر آتی تھیں۔“

لو نے خوشی کے مارے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا ”میں نے کب کہا کہ میں ٹور میں بور ہوئی۔ یہ ٹور میری زندگی کا حسین ترین ٹور تھا۔ میں نے اس قدر انجوائے کیا کہ شاید زندگی میں ایسا موقع کبھی دوبارہ نہ مل سکے لیکن میں بُری طرح تھک گئی ہوں۔ اب کچھ دن آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

لو نے چند دن آرام کیا۔ سفری تکان سے نجات حاصل کی اور ایک بار پھر ”کِڈز ان کارپورائیڈ“ کے سیٹ پر پہنچ

گئی۔ اگلے سیزن کے لیے پروگراموں کی ریکارڈنگ شروع ہوگئی تھی، جس میں وہ ”رابن“ کا کردار ادا کررہی تھی۔ وہ ایک بار پھر مصروف ہوگئی، اس کے پاس خود اپنے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ ایک کم عمر بچی تھی مگر اس قدر مصروف تھی کہ وہ پل بھر کے لیے بھی بچی نہیں بن سکتی تھی اور یہی اس کی اداسی تھی۔ وہ ہمیشہ سے جو کچھ چاہتی آئی تھی، وہی سب کرنے میں مگن تھی۔ اس نے اپنی ماں کو خود ہی تو لاس اینجلس آنے پر مجبور کیا تھا اور اب سب کچھ اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس کی عمر اتنی تیزی سے نہیں بڑھ رہی تھی جتنی تیزی سے اس کا تجربہ بڑھ رہا تھا۔

O*O

اپنی بہترین کارکردگی کے باعث وہ ”کِڈز ان کارپورائیڈ“ کے دوسرے سیزن کی کاسٹ میں شامل رہی۔ اپنی کم عمری میں بھی وہ اس قدر پروفیشنل تھی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے اور برملا کہہ دیا کرتے تھے کہ اس لڑکی کو بہت آگے جانا ہے۔ آگے جاکر شہرت کی بلندیوں کو سر کرنا ہے اور اس کے لیے وہ ابھی سے تیاری کررہی تھی۔ وہ ہر ہفتے رقص کے نئے زاویے اور نئے انداز سیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم اس قدر خوبصورت تھا کہ لوگ اس کی موومنٹ پر پلکیں تک جھپکانا بھول جاتے۔ اسے احساس تھا کہ زندگی صرف شوبزنس تک محدود نہیں، لہٰذا وہ اسکول بھی پابندی سے جا رہی تھی اور اس دوران میں مختلف اشتہارات کے حصول کے لیے آڈیشنوں میں جانے کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوچکا تھا کہ کوئی بھی نیا کام حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو بتانا پڑتا ہے کہ آپ میں کتنے گن ہیں۔ اس لیے وہ کسی بھی آڈیشن میں بلا جھجک پہنچ جاتی۔ اس کے اشتہاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا پھر وہ اپنے بے پناہ ٹیلنٹ اور اسٹیج پر عمدہ کارکردگی سے وہ ہدایت کاروں کی نظروں میں بھی آتی جا رہی تھی۔

دیکھا جائے تو لو باربی ڈول کے اشتہارات کی مستقل رکن بن گئی تھی۔ باربی ڈول کا جو بھی اشتہار سامنے آتا، ممکن نہیں تھا کہ اس میں لو نہ ہو۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے باربی ڈول کے لگ بھگ بیس اشتہار کر ڈالے۔ اور پھر وہ موقع آیا جب باربی ڈول کی یہ گڑیا، اچانک سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ہوا یہ کہ 1991ء میں باربی ڈول کی وڈیو بنانے کا اعلان کیا گیا، کاسٹنگ شروع ہوئی۔ یہ وڈیو ایک خاص خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائی جا رہی تھی اور وہ خاص خیال تھا ورزش۔ اصل میں اس دور میں ایک نیا رجحان یہ سامنے آیا کہ ہالی ووڈ کے متعدد اسٹارز کی ایسی وڈیو سامنے آنا شروع ہوئیں جن میں انہیں ورزش کرتے دکھایا گیا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہالی ووڈ کا ہر اسٹار ورزش کرتے ہوئے اپنی وڈیو بنوانے کے لیے جنون میں مبتلا ہوگیا ہے۔ یہ ایک فیشن تھا، اور اس فیشن کی ابتدا اداکارہ جین فونڈا نے کی تھی۔

فلمی دنیا، کسی بھی ملک کی ہو، بھیڑ چال سے نہیں بچ سکتی، ہالی ووڈ میں بھی یہی ہوتا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا ہے۔ باربی ڈول بنانے والے ادارے نے سوچا کہ اگر باربی ڈول کے ساتھ رقص کرنے یا ورزش کرتے ہوئے لوگوں کو پیش کیا جائے تو انہیں ایک خاص مارکیٹ مل سکتی ہے۔ چونکہ دوسری تمام وڈیوز بالغ افراد کے لیے بنائی جا رہی تھیں، لہٰذا فیصلہ کیا کہ باربی ڈول کی وڈیو ان لڑکیوں کے لیے بنائی جائے گی جو یا تو ابھی نابالغ ہوں یا بلوغت کی عمر کو پہنچنے والی ہوں۔ وڈیو کا آئیڈیا یہ تھا کہ نو عمر پُرکشش لڑکیوں کو کمپیوٹر کی مدد سے تخلیق کی جانے والی ایک باربی ڈول کے ساتھ رقص کرتے، گیت گاتے اور ورزش کرتے دکھانا تھا۔ اس وڈیو کے ذریعے سست امریکی بچوں میں تحریک پیدا کرنی تھی کہ وہ ٹی وی اور کمپیوٹر اسکرین کے سامنے سے ہٹ کر دن میں کچھ دیر کے لیے ورزش بھی کرلیا کریں کہ یہ فطری زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہوسکیں۔

اس وڈیو کے آڈیشن کے لیے بھی بلاشبہ سیکڑوں کی تعداد میں لڑکیاں آئیں۔ لو نے بھی آڈیشن دینے میں تامل نہیں کیا۔ ”کِڈز ان کارپورائیڈ اور باربی کے گزشتہ اشتہاروں میں کام کرنے کی وجہ سے پروڈیوسروں نے اسے اپنی ترجیحی فہرست میں شامل رکھا۔ اس دوران متعدد بار آڈیشن ہوئے اور لو ہر فہرست میں شامل ہوتی رہی اور آخرکار جب حتمی آڈیشن ہوا تو لو نے اس میں بھی کامیابی حاصل کرلی اور اسے وڈیو میں کام کرنے کے لیے دیگر آٹھ لڑکیوں کے ساتھ سائن کرلیا گیا۔

اس کی ماں کو حیرت تھی کہ لو اس بے مزہ اور پھیکی سی وڈیو کے لیے اس قدر پُرجوش کیوں ہو رہی ہے، جب کہ اس کو سائن کرلیا گیا تو اس کی ماں نے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے بارے میں کیا سوچوں، تمہیں اداکاری کا شوق ہے مگر اس وڈیو میں مجھے نہ تو کسی فلم کا سا گلیمر نظر آرہا ہے اور نہ ہی اس وڈیو میں کام کرکے تم کسی ٹی وی سیریز میں کام کرنے جیسی عزت و توقیر حاصل کرسکتی ہو؟“

لو نے پُرجوش لہجے میں کہا "ممّا! یہ گلیمر ورلڈ ہے۔ یہاں آگے بڑھنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ بھی تو کام ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ وڈیو کیا چیز ہے۔ اسے ہزاروں بلکہ لاکھوں بچے دیکھیں گے اور میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وڈیو میں کام کرکے مجھے بہت مزہ آیا ہے۔"

"ہاں! میں جانتی ہوں کہ تم یہ سارے کام محض اس لیے کرتی ہو کہ تمہیں اس میں مزہ آتا ہے مگر بیٹی! جب بھی تمہیں زندگی میں کبھی ایسا محسوس ہو کہ تم اداکاری اور پرفارمنگ میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھی ہو، تمہیں مزہ نہ آئے تو پھر یہاں ایک دن بھی ضائع مت کرنا۔ اس دنیا کو اسی دن چھوڑ دینا کیونکہ زندگی صرف گلیمر کی اس دنیا تک محدود نہیں۔ کیریئر کے طور پر اپنانے کے لیے پرفارمنگ آرٹ کے علاوہ بھی بہت سے شعبے ہیں۔"

اس کی ماں جب بھی اس سے اس قسم کی باتیں کرتی وہ خاموشی اختیار کرلیتی۔ وہ اس موضوع پر کسی کا بھی لیکچر سننا پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ کچھ اور کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی تیار نہیں تھی۔ وہ صرف ایک بات جانتی تھی کہ وہ صرف اسی لیے زندہ ہے کہ وہ اسٹیج پر شائقین کے سامنے تالیوں کی گونج میں یا پھر سیٹ پر کیمرے کے سامنے تیز روشنیوں کے ریلے میں چمکتی رہے۔

باربی ڈول کی ورزش وڈیو کے دوران اسے واقعی بہت مزہ آرہا تھا۔ یہ وڈیو بنیادی طور پر رقص پر مشتمل تھی اور رقص تو اس کی گھٹی میں شامل رہا تھا۔ وہ برسوں سے رقص کرتی آرہی تھی۔ تاہم یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی ایسی وڈیو میں کام کر رہی تھی جس میں کمپیوٹر سے تشکیل شدہ گڑیا کے ساتھ اسے رقص کرنا تھا۔ "ڈانس ورک ودھ باربی" نامی اس مشہور و معروف وڈیو میں لو نے صرف رقص ہی نہیں کیا تھا بلکہ اور بھی بہت کچھ کیا تھا۔ اصل میں رقص کے لیے موسیقی اور خاص طور پر کسی گیت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت لو کو اپنی صلاحیتیں پیش کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ اسے گیت ریکارڈ کرانے اور ان پر پرفارمنس دکھانے کا وسیع تجربہ تھا۔ وہ بچپن سے نوعمری تک یہی کچھ تو کرتی آئی تھی۔ لہٰذا اس وڈیو البم میں شامل تمام گیتوں کے لیے اس کا انتخاب ہوجانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بے شک وڈیو میں سارے گیت کمپیوٹر سے تخلیق ہونے والی باربی گاتی تھی مگر اصل میں وہ سارے گیت لو کی آواز میں ریکارڈ ہوئے تھے۔ اس وڈیو اور پھر ہفتہ وار شو میں مسلسل کام کرنا لو کے لیے بلاشبہ بہت زیادہ کام تھا۔ وہ ابھی بہت کم عمر تھی۔ ساتھ ساتھ اسکول اور پڑھائی بھی جاری تھی مگر وہ اس وڈیو سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یہ وڈیو اس کے لیے بہت اہم تھی۔ اپنے تئیں وہ زندگی کا حسین اور یادگار ترین دور گزار رہی تھی۔ اس کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ وہ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود پڑھائی میں بھی بہت تیز تھی اور یہی اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

کڈز ان کارپورائیڈ میں بہت سے مہمان اداکار بھی کام کرتے تھے۔ ان میں ایک نوجوان اداکار ایسا بھی تھا جس سے چند سالوں بعد لو کا سابقہ پڑنے والا تھا۔ جب وہ اس پروگرام میں بطور مہمان اداکار آیا تو وہ اسٹار نہیں تھا۔ اس کا نام اسکاٹ وولف تھا۔ اس وقت تک اس نے محض چند اشتہارات میں کام کیا تھا، اور اس کے کریڈٹ پر "سیوڈ بائی دی بیل (SAVED BY THE BELL) نامی ایک مزاحیہ ڈرامہ تھا جس میں اس نے ایک ویٹر کا معمولی سا مختصر کردار ادا کیا تھا۔ کڈز ان کارپورائیڈ میں اسے اس وقت تک اپنے کیریئر کا سب سے بڑا کردار ملا تھا۔ اس کی عمر اس وقت 23 برس تھی۔ نوجوان چہرے کا مالک پتلا دبلا سا اسکاٹ وولف لو سے لگ بھگ دس برس بڑا تھا۔ لو اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ اس وقت کسی کو بھی اندازہ نہ ہوسکا کہ محض چند برسوں بعد زندگی کے ایک اہم موڑ پر ان کا سامنا عجیب انداز میں ہونے والا تھا۔

لو ہیوٹ کامیابی کی داستان تھی۔ ہر وہ کام جسے کرنے کا اس نے خواب دیکھا تھا کر گزری تھی مگر یہ بھی طے تھا کہ اسے ہر کردار میں منتخب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت تک اسے احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ کامیابیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی جھولی میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی کامیاب ہوتی آئی تھی۔ اس لیے جب اسے ایک فلم میں کام حاصل کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ بکھر کر رہ گئی۔ ناکامی کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار آنسوؤں میں بہہ گیا تو سیدھی ماں بیٹ ہیوٹ کے پاس پہنچی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ممّا! اب میں اس فیلڈ میں نہیں رہ سکتی آپ ابھی ٹکٹ کا انتظام کریں، ہم واپس ٹیکساس جائیں گے۔"

اس کو اداکاری کی تربیت دینے والا استاد بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے لو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "اتنی جلدی ہمت ہارنا بہادروں کا کام نہیں، میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے

دل کی ہی لگن اور اداکاری کی شدید تڑپ ہے۔ تم آج یہاں جانے کا فیصلہ کر رہی ہو کیا تم نے سوچا کہ جب واپس چلی جاؤ گی تو بعد میں تمہیں کتنا دکھ ہوگا۔"

وہ تین گھنٹوں تک باتیں کرتے رہے۔ اس کا استاد اسے دلاسے اور تسلیاں دیتا رہا اور سمجھاتا رہا۔ لو نے اس کی بات مان لی اور پھر اگلے ہی دن اسے ایک اور کام مل گیا تو وہ پہلی ناکامی کو ایک ہی دن میں بھول گئی۔ لو کو آج بھی وہ واقعہ اسی طرح یاد ہے وہ کہتی ہے "میرا استاد ٹھیک کہتا تھا۔ اس نے مجھے بہترین نصیحت کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں واقعی اداکاری کرنا چاہتی ہوں تو مجھے خود کو اس قدر مضبوط بنانا ہوگا کہ میں بار بار مسترد کیے جانے کے عمل کو بھی برداشت کرسکوں۔ ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ تم جتنی جلدی یہ بات سمجھ جاؤ گی کہ مسترد کیا جانا کوئی ایسی بات نہیں جسے جی کا روگ بنالیا جائے اتنا ہی تمہارے حق میں یہ بات بہتر ہوگی۔"

لو نے اپنے استاد کا یہ سبق اچھی طرح یاد کرلیا اور سمجھ گئی کہ اسے اپنی لگن اور تڑپ کو زندہ رکھنا ہے۔ کام کی اس کے لیے کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ وہ کسی فلم یعنی کسی حقیقی مووی میں کام کرنا چاہتی تھی مگر اس کی یہ خواہش پوری ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس کی ماں اس کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا "دل چھوٹا مت کرو لو! تمہیں فلم ضرور ملے گی مگر ابھی شاید اس کا وقت نہیں آیا۔ ہر چیز اپنے وقت کے مطابق ہوتی ہے۔ تمہارا وقت آئے گا تو تمہیں فلم میں کام کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ تم اس وقت اپنی ساری توجہ اپنی سیریز اور اپنے اشتہارات پر دو۔"

لو نے کچھ عرصے کے لیے فلم کا خیال دل سے نکال دیا۔ اس دوران اس نے ایک ایسے اشتہار میں بھی کام کیا جو اس کی عمر کے لحاظ سے ناموزوں تھا۔ اس اشتہار میں اس کے جسمانی خدوخال کی نمائش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس اشتہار کا سب سے زیادہ نوٹس اسکول میں لیا گیا۔ اس کی ٹیچر نے سخت لہجے میں کہا "لو! تم اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ اداکاری کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان جنون میں مبتلا ہو جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اچھی تعلیم سے محروم نہ ہو جاؤ۔"

لو کی سمجھ میں اپنی ٹیچر کی بات کسی طرح بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس نے تعلیم کے دوران پوری دنیا کا سفر کیا تھا۔ اپنے کیریئر کو بہت زیادہ وقت دے رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اسکول میں درجہ اوّل کی طالبہ سمجھی جاتی تھی۔ نہ معلوم ٹیچر نے یہ بات کیوں کہہ دی تھی۔ اس نے گھر آکر اپنی ماں سے بھی یہی کہا "میں جب پڑھائی میں بہت اچھی ہوں۔ تمام لڑکیوں سے ممتاز ہوں تو اساتذہ کو اور کیا چاہیے۔"

لو سب سے الگ لڑکی تھی۔ اس کے پاس کھیل کود اور سیر و تفریح کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ وہ بچپن سے ہی خواب دیکھتی رہی تھی۔ اس کو اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنا تھی۔ اگرچہ اس کے پاس فارغ وقت بالکل نہیں تھا مگر وہ پھر بھی اپنے اساتذہ کی ہر ہدایت پر سختی سے عمل کرتی تھی۔ تاہم گھر میں اپنی ماں کے ساتھ وقت گزارنے کے علاوہ اگر اسے کسی جگہ سب سے زیادہ خوشی ہوتی تھی تو سیٹ پر پہنچ کر یا ایسے لوگوں کے درمیان پہنچ کر جو اسی کے انداز میں سوچتے تھے اور اسی کی طرح پروفیشنل تھے۔ ان کے ساتھ کام کرکے وہ گویا جی اٹھتی تھی۔ اس کا کیریئر نہایت کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ محض تین برس کی عمر میں اس نے ٹیکساس کے سپر کلب میں "ہیلپ می میک اٹ تھرو دی نائٹ" (HELP ME MAKE IT THROUGH THE NIGHT) گا کر گیا تھا اور بارہ برس کی عمر میں اس کی آواز مزید نکھر کر خوب مسحور کن ہوگئی تھی۔ اس آواز کی وجہ سے وہ "کڈز ان کارپورائیڈ" میں گانے والی دوسری لڑکیوں سے ممتاز تصور کی جاتی تھی۔ گلوکاری اس کی روح تک میں جڑ پکڑ چکی تھی مگر وہ خود کو گلوکارہ کے بجائے اداکارہ کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ وہ گلوکاری کے بجائے اداکاری کرنا چاہتی تھی اور جب اسے اگلا بڑا بریک گلوکاری کے حوالے سے ہی ملا تو وہ صدمے کے باعث نڈھال ہوگئی۔

"ڈانس ورک آؤٹ ودھ باربی" اور "کڈز ان کارپورائیڈ" میں اس کی اداکاری سے زیادہ گلوکاری کا نوٹس لیا گیا اور وہ بھی امریکا میں نہیں بلکہ جاپان میں.... جاپان کی کمپنی میڈلیک ریکارڈز اس وقت مشہور گلوکاروں کے گیت جاپان میں ریلیز کرتی تھی۔ انہوں نے لو سے رابطہ کیا کہ وہ اس کی آواز میں ایک البم تیار کرکے جاپان میں ریلیز کرنا چاہتے ہیں۔ لو صرف اس شرط پر راضی ہوئی کہ اس البم کو صرف جاپان میں ریلیز کیا جائے گا۔ اگر البم ہٹ ہوگیا تو اسے امریکا میں ریلیز کرنے کے بارے میں سوچا جائے گا۔ اس شرط کے ساتھ یہ کام لو کے لیے نقصان دہ نہیں تھا۔ البم جلد ہی ریکارڈ ہوگیا۔ اس میں پاپ موسیقی کے ساتھ بیلے موسیقی بھی شامل تھی۔ جس کا ایک بہت ہی پیارا گیت "ڈانس اٹ گونا ٹیک" بھی شامل تھا۔ جس کا ڈانس ٹریک

خاصا تیز تھا۔ یہ گیت اور پورا البم ہی پورے جاپان میں بے حد مقبول ہوا۔

لو کہتی ہے "مجھے آج بھی اپنی کامیابی اور مقبولیت کے وہ ابتدائی دن اچھی طرح یاد ہیں میرا البم ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ میرا ایک گیت جاپانی چارٹس میں چار مہینوں تک پہلے نمبر پر رہا اور اس قدر مقبول ہوا کہ بعد میں اسے انگلینڈ، جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں بھی ریلیز کیا گیا۔

اس البم کا نام "لو سونگز" (LOVE SONOS) تھا۔ 1992ء میں اس وقت ریلیز ہوا جب لو نے نوجوانی میں قدم رکھ دیا تھا۔ پورے البم میں کل گیارہ گیت تھے اور تمام گیت اس عمر کی نوخیز لڑکیوں کے جذبات کی مکمل ترجمانی کرتے تھے۔ لو کے گیت، رقص کی شہرت اور پھر یہ البم۔ یہ سب اس کے کام میں غیر معمولی اضافہ تھے اور ان سے ثابت ہو رہا تھا کہ لو ایک غیر معمولی اور ہمہ جہت فنکارہ ہے۔ لو سونگز کا سب سے مقبول گیت "پلیز! سیو اس دی ورلڈ" (PLEASE SAVE US THE WORLD) اس نے کنڈز ان کارپورائیڈ کے فنکاروں کے ساتھ ریکارڈ کرایا تھا۔ یہ گیت دراصل ماحولیات کے تحفظ اور جنگ کے خاتمے کی ایک معصومانہ درخواست تھی۔

اس گیت کو فنکاروں نے "کنڈز ان کارپورائیڈ" میں بھی پیش کیا اور پھر 1992ء میں ان کو "یونائیٹڈ سیربیل پالیسی ٹیلی متون" میں بہ طور مہمان بلایا گیا اور وہاں بھی ان سے اس گیت کی فرمائش کی گئی اور پھر یہ گیت اس گروپ کا باقاعدہ ترانہ بن گیا لہٰذا انہوں نے اس گیت کی وڈیو بنائی۔ جس میں کنڈز ان کارپورائیڈ کی کاسٹ کے علاوہ کئی دوسرے مشہور نوجوان فنکاروں کو بھی شامل کیا گیا تھا پھر 1992 میں ہی ماحولیات کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں "ارتھ سمٹ" ہوئی جس میں دنیا بھر سے مہمان شریک ہوئے تھے۔ اس سمٹ میں یہ نغمہ "پلیز! سیو اس دی ارتھ" کو اس قدر پسند کیا گیا کہ اسے "ارتھ سمٹ" کا آفیشل گیت قرار دیا گیا۔ یہ لو کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس کی آواز کو اس انداز میں سراہا گیا تھا کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مگر اس اعزاز اور کامیابی سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ لوگ اسے اب بہت اچھی طرح پہچاننے لگے تھے۔ اب اس کا کیریئر روشن ہو گیا تھا۔

گرمیوں سے پہلے "کنڈز ان کارپورائیڈ" کے اگلے سیزن کی تکمیل کے بعد لو نے ایک فلم کے لیے آڈیشن دیا تھا اور خوش قسمتی سے یہ فلم اسے مل گئی۔ اس فلم کا نام منچی (MUNCHI) تھا۔ اس میں لو نے اینڈریا کا کردار ادا کیا تھا مگر یہ فلم اس کے لیے کسی بھی شناخت کا سبب نہیں بن سکی تھی۔ اصل میں یہ فلم 1987ء میں ریلیز ہونے والی فلم "منچیز" کی کہانی پر بنائی گئی تھی پھر منچیز خود بھی 1987ء کی ایک فلم "گریملنز" کا بھونڈا چربہ تھی۔ اس فلم کا ایک چربہ 1990ء میں بھی تیار ہوا تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہالی ووڈ میں بھی کس قدر دھڑلے سے چربہ سازی کی جاتی ہے۔

لو نے جس فلم "منچی" میں کام کیا تھا۔ اس کے ہدایت کار جم وائے نورسکی تھے۔ یہ ایک مزاحیہ فلم تھی مگر مزے دار بات یہی تھی کہ اس میں مزاح نام کو بھی نہ تھا۔ اس فلم کے فنکاروں میں سب سے بڑا نام "لونی اینڈرسن" کا تھا۔ لونی اینڈرسن نے ایک مزاحیہ ٹی وی سیلے "سنسائی" کے ذریعے نام کمایا تھا بعد ازاں اس کی شہرت یہ رہ گئی تھی کہ اس نے مشہور اداکار برٹ رینالڈ سے شادی کر لی تھی۔ برٹ رینالڈ کی بیوی کے طور پر لونی اینڈرسن نے اپنی اداکاری سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس فلم کا مرکزی کردار "جمی میک ایتان" نے ادا کیا تھا۔ اس کردار کا نام "گیگ ڈولسن" تھا۔ جو اتفاقی طور پر ایسی مخلوق دریافت کر لیتا ہے جو پُراسرار قوتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس مخلوق کا نام ہی منچی تھا۔ منچی نامی یہ مخلوق گیگ ڈولسن کی بہت مدد کرتی ہے۔ اسکول میں پھندے باز قسم کے لڑکوں سے بچاتی ہے اور منچی کی مدد سے ہی وہ اپنے خوابوں کی شہزادی اینڈریا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

انتہائی قلیل بجٹ کی یہ فلم باکس آفس پر کوئی رنگ نہ جما سکی۔ لو نے اس فلم میں اینڈریا کا مختصر کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم ایسی بدترین ناکامی سے دوچار ہوئی کہ لوگوں نے فلم دیکھنے کے لیے سینماؤں کا رُخ ہی نہ کیا مگر بہرطور اب اس کے کریڈٹ پر ایک فلم کا نام آگیا تھا۔ اب اس کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے گزشتہ بارہ سال میں بہت کام کیا تھا۔ کئی اہداف سر کیے تھے۔ ایک فلم، ایک البم اور نوجوانوں کے سفیر کا اعزاز۔۔۔ وہ اس کے علاوہ بھی مزید کام کرنے کے لیے کمربستہ تھی۔

1992ء میں ہی لو نے ٹیلی ویژن کے لیے اپنے ڈرامے کی عکس بندی کرائی تھی۔ یہ دراصل "رننگ ورلڈ" کے نام سے بنائی جانے والی سیریز کا پائلٹ پروگرام تھا۔ اس سیریز کے مرکزی کردار کے طور پر آج کے مشہور و معروف جیمز بانڈ ہیرو پیئرس بروسنن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس وقت تک

[...] ٹن کی سیریز "ریمنگٹن اسٹیل" بے حد مشہور ہو [...] تھی اور اس کامیابی کے نشے نے پیئرس بروسنن کو بُری [...] طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ حقیقتاً اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا [...] رننگ ورلڈ میں وہ ایک آٹوموبائل رسالے کا کردار ادا [...] رہا تھا اور لو اس کی بیٹی کے کردار کے لیے منتخب ہوئی تھی [...] متی سے این بی سی والوں نے اس پائلٹ پروگرام کو [...] ساں ہی نہیں ڈالی۔ چنانچہ یہ ہر پروگرام آن ایئر جا سکا اور [...] اس آئیڈیے پر سیریز تیار کرنے کا کام آگے بڑھا۔

لو کو اس بات سے ایک جھٹکا سا لگا تھا مگر اب ایسا دکھائی [...] رہا تھا کہ اگر اس کا ایک قدم پیچھے کی طرف جاتا تھا تو وہ [...] قدم آگے بھی بڑھ جاتی تھی۔ کنڈز ان کارپورائیڈ کے [...] سیزن کا کام ختم ہوا تو اس نے ایک فلم مزید سائن کر لی [...] شروع ہونے والے نوکس نیٹ ورک کے لیے تیار [...] ہونے والی ایک نئی سیریز کے لیے آڈیشن بھی دے دیا۔ خوش [...] سے اس سیریز کا پائلٹ منظور ہو گیا۔ اس کا مطلب [...] وہ اس سیریز کی مستقل کاسٹ میں شامل ہونے والی تھی [...] اس کے آئندہ چند ماہ اسی سیٹ پر گزرنا تھے۔ اب وہ [...] آگیا تھا جب اسے اپنے کیریئر اور زندگی میں چند اہم [...] لمحوں سے گزرنا تھا۔ مثلاً کنڈز ان کارپورائیڈ سے [...] ہونا۔ یہ ایک بہت مشکل فیصلہ تھا۔ کیونکہ اس سیریز کی [...] تمام ہی کرداروں سے اس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی [...] یہ کڑوا گھونٹ اسے پینا ہی تھا۔ اب وہ اپنے کام میں [...] لانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس نے یہ کڑوا گھونٹ جبر [...] کے پی لیا۔ اب وہ بہت زیادہ پروفیشنل ہو گئی تھی۔ بچی نہ [...] بڑی ہو گئی تھی، بڑے بڑے فیصلے کرنے لگی تھی۔

[...] نئی سیریز کی تیاری کے لیے اسے سیٹ پر خاصا وقت دینا [...] سے جمعہ تک مسلسل شوٹنگ ہو رہی تھی۔ گویا اب [...] لو کو یہ بھی فیصلہ کرنا تھا کہ اسکول چھوڑ دے یا پھر سیریز، [...] سیریز کے مسلسل شوٹنگ شیڈول کے باعث وہ اسکول [...] نہ جا سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنے لیے ایک ایسے ٹیوٹر کا [...] انتظام کر لیا جو سیٹ پر مسلسل اس کے ساتھ رہنے کا پابند [...] لو نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔

○☆○

"رننگ ورلڈ" کے پائلٹ کی ناکامی کے بعد لو اب [...] نئے پروجیکٹ کی طرف سے خاصی فکرمند تھی۔ اس کی [...] توجہ اسی کی طرف تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ تین [...] سال قبل معرضِ وجود میں آنے والے نوکس نیٹ ورک کو [...] ایسے پروگراموں کی اشد ضرورت تھی جن کے ذریعے دوسرے نیٹ ورک کے کامیاب پروگراموں کا مقابلہ کیا جا سکتا۔ اس نئے پروجیکٹ "بیکی گراؤنڈ" کو اس انداز میں بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ گویا یہ سیریز دیگر پروگراموں کا مقابلہ کرنے کی اہل ہو گی۔ بیکی گراؤنڈ کا موضوع بہت حساس تھا۔ دیگر سیریزوں اور حقیقی زندگی کی طرح اس میں ڈراما اور مزاح دونوں ہی شامل کیے جا رہے تھے۔

کینیڈا کا اداکار میک فریور اس سیریز میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ میک فریور خاصا مقبول اداکار تھا۔ اسی کی دہائی میں اس نے "سکس بیڈ روم" نامی سیریز میں مرکزی کردار ادا کر کے نام کمایا تھا۔ اگرچہ سیریز مقبول نہ ہو سکی مگر میک فریور کو لوگ جاننے اور پہچاننے لگے تھے۔ یہ کردار اس کی شناخت بن کر رہ گیا جس سے پیچھا چھڑانا اس کے لیے ناممکن بنتا جا رہا تھا۔ جس دور میں "بیکی گراؤنڈ" بنانے کا منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا، ان دنوں ایک نیا لفظ "ڈاؤن سائزنگ" اچانک معرضِ وجود میں آیا تھا اور لوگوں کے ذہنوں پر بھوت کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ ڈاؤن سائزنگ ایک ایسی اصطلاح تھی جس نے ایسے بے شمار لوگوں کو اچانک بے روزگار کر دیا تھا جو یہ سمجھتے آئے تھے کہ وہ ہمیشہ برسرِ روزگار رہیں گے، ان لوگوں کی نہ صرف ملازمتیں ختم ہو گئیں بلکہ وہ کئی اقسام کی مراعات سے بھی محروم ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں امریکا کے بے شمار وائٹ کالر محنت کش مالی مسائل کا شکار ہو ہو کر دگرگوں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسا صرف اس لیے ہوا تھا کہ کارپوریٹ امریکا کو اچانک احساس ہوا تھا کہ اس کے پاس موجود ملازمین کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے، لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ کام کا زیادہ تر بوجھ ایسے لوگوں پر ڈال دیا جائے جو بہت زیادہ محنتی ہیں، اس طریقے سے ایسے بہت سے وائٹ کالر ملازمین سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے جن کی تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ ڈاؤن سائزنگ کی اس اصطلاح نے امریکا میں موجود ہزاروں، لاکھوں لوگوں کی نیندیں اُڑا دیں تھیں۔

کامیابیوں کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ہزاروں لوگ اپنی نوکری چھن جانے کے خوف میں مبتلا ہو کر نفسیاتی مریض بننا شروع ہو گئے تھے۔ یا نوکری سے فارغ ہو کر اب نئی نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ صرف وہی نہیں بلکہ ان کے اردگرد رہنے والے لوگ، ان کے پڑوسی، دوست، رشتہ دار سب ہی اچانک بے روزگار ہو کر گھر بیٹھ گئے تھے۔ ڈاؤن سائزنگ نامی اس پالیسی کا استعمال بڑے بے رحمانہ طریقے سے ہو رہا تھا۔ اور بے رحمانہ طریقۂ کار کے باعث بے شمار لوگ جن کی نوکریاں ابھی برقرار تھیں اچانک

ہی نوکری چھن جانے کے خوف میں مبتلا ہو کر انتہائی حدوں تک کنجوس ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ایک ایک پائی بچا رہے تھے یہ سوچ رہے تھے کہ وہ بے روزگار ہو گئے تو یہ رقم ان کے کام آئے گی۔

ٹیکی گراؤنڈ نامی سیریز کا موضوع یہی حالات تھے۔ فریور کو باب موڈی نام کے ایک روایتی وائٹ کالر ملازم کا کردار ادا کرنا تھا۔ جس کی آمدنی اخراجات سے کم تھی۔ اسے قرضوں کی ادائی کا بھی دھڑکا تھا۔ کار کی قسطیں دینے کی بھی فکر تھی اور بچوں کی ضروریات کی فکر بھی دامن گیر تھی۔ نوکری چھن جانے کا خوف اس پر ہمہ وقت سوار رہتا تھا اور کتنی ہی سخت' کیسی ہی ترکیبوں کے باوجود وہ اپنی نوکری کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ بلاشبہ ایسے آدمی کی بیٹی کو کافی زندہ دل اور زندگی سے بھرپور ہونا چاہیے تھا اور یہیں لو کو سامنے آنے کا موقع ملا۔ اس نے اس کردار کے لیے آڈیشن دیا اور نوجوانوں کی دہلیز پر قدم رکھنے والی چالاک' ہوشیار اور جاذب نظر پریذیڈنٹ کا کردار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ حقیقی زندگی میں بھی وہ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔

شوٹنگ شروع ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ آزادی کسے کہتے ہیں' وہ ہر روز سیٹ پر نظر آتی تھی۔ وہ صرف اداکاری ہی نہیں کر رہی تھی' تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی' سیٹ پر اس کا کام نہ ہوتا تو وہ ریہرسل سے فارغ ہو چکی ہوتی یا اس کی ریہرسل میں وقت ہوتا تو وہ ٹیوٹر کے پاس آ کر بیٹھ جاتی' کتابیں کھول لیتی۔ مکالموں کے بجائے سبق یاد کرنا اور ذہن نشین کرنا شروع کر دیتی۔ سیٹ پر تعلیم حاصل کرنے اور ٹیوٹر سے پڑھنے کا ایک فائدہ تھا۔ وہ اسکول کے تنگ کرنے والے بچوں کی دست برد سے بچ گئی تھی۔ اب اساتذہ کے شعلے برساتی نظریں بھی اس کے تعاقب میں نہیں رہتی تھیں۔ طالب علم کو شیطان بچوں اور سخت گیر اساتذہ سے نجات مل جائے تو اس کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اب وہ بھی اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ دینے کے قابل ہو گئی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے اور سبق پڑھنے کا یہ وقفہ بہت مختصر ہوتا تھا' مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اسے اپنے پسندیدہ شعبے یعنی اداکاری میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع کھل کر مل رہا تھا۔ وہ فریور کے سامنے اداکاری کر رہی تھی۔ فریور بہت اچھا اور منجھا ہوا اداکار تھا اس کے سامنے اداکاری کرنا آسان کام نہ تھا وہ مشکل کام آسانی سے کر رہی تھی۔

لو ہیوٹ کی ایک خامی یہ تھی کہ اپنی گوناگوں مصروفیا اور سخت شیڈول کے باعث وہ باقاعدہ طور پر اداکاری تربیت حاصل نہیں کر پائی تھی۔ وہ بے استادی تھی۔ استادے عام طور پر عملی زندگی میں مار کھا جاتے ہیں لیکن ہیوٹ نے اس کا بھی حل تلاش کر لیا۔ آڈیشنوں کی تیار کے سلسلے میں اس نے مختصر وقت میں ایک استاد اداکاری کے کئی سیشن لے لیے تھے۔ ان اسباق کو لینے بعد اس کے اندر کی خود اعتماد اداکارہ نے اسے یقین دلا کہ وہ بہت کچھ جان چکی ہے۔ اس کے ایک واقف کار اسے مشورہ دیا اور کہا کہ وہ اداکاری سکھانے والے دوسرے ادارے میں داخلہ لے لے' یہ اس کے حق میں رہے گا۔"

لو ہیوٹ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی "ادا سکھانے والے اداروں میں وہ داخلہ لیتے ہیں جنہیں اداکا نہیں آتی۔ میں فطری اداکارہ ہوں' پیدائشی رقاصہ اور گلوکارہ ہوں' مجھے کسی ادارے میں داخلہ لینے کی ضرو نہیں۔"

"مگر لو! اداکاری سیکھنا پیدائشی اداکاروں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہ فیلڈ بہت ٹیکنیکل ہے اگر تم محض شوق اور لگن کے سہارے آگے بڑھنا چاہو جلد ہی ہانپ جاؤ گی۔"

لو نے ایک ادا سے جواب دیا "میں جس دن محسو کروں گی کہ ہانپ رہی ہوں اس دن لاس اینجلس سے کر جاؤں گی۔ میں یہاں ہانپنے کے لیے نہیں دوڑنے کے آئی ہوں' رہی بات ٹیکنیک کی تو میں اب تک اداکاری کی کئی رموز اور متعدد ٹپس سے آگاہ ہو چکی ہوں۔ فطری ادا کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے۔"

بولنے والا خوش ہو گیا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھ ایسے کام میں جو اس نوعمری لڑکی کے لیے بے حد تھکا دینے والا تھا مگر اس تھکن کو وہ دل سے پسند کرتی تھی۔ اس باوجود کہ بوجھ اس کی استعداد سے بھی زیادہ تھا۔ پہلے ہی میں شوٹنگ کے دوران سب سے بڑی مشکل یہ آئی کہ قوانین کے مطابق لو ہیوٹ کو بچی شمار کیا گیا۔ ابھی وہ اتنی نہیں ہوئی تھی کہ بالغ سمجھی جاتی۔ نابالغ محنت کشوں کے اس ملک میں قوانین بنائے گئے تھے۔ ادارے کے مشیر نے صاف انداز میں کہہ دیا کہ لو ہیوٹ چند مخصوص گھنٹوں سے زیادہ سیٹ پر نہیں گزار سکتی۔ یہ ایک پریشانی تھی۔ ادارے اور ہدایت کار کو اپنی ہر قسط شی

اور اندر عکس بند کرنا تھی' تو بھی اس صورت حال سے لیے اس کی ماں نے مشورہ دیا کہ لو ہیوٹ کا کام سب پہلے عکس بند کر لیا جائے' اور اس احتیاط سے عکس بند جائے کہ وہ دوبارہ شاٹ لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

تجویز اچھی تھی' اس پر عمل شروع ہو گیا۔ ظاہر ہے دباؤ اس ننھی سی جان پر پڑ گیا۔ اب اسے ایک ایک انتہائی احتیاط اور پرفیکشن کے ساتھ مکمل کرانا پڑتا تھا۔ دینے والا کام تھا مگر اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ اب وہ جس قسم کی محنت کر رہی تھی اس کی وجہ سے وہ ہی دیر میں تھک کر چور ہو جاتی تھی مگر یہ تھکن اسے ان اور خاص طور پر اپنے شوق اداکاری سے متنفر نہیں کر سکی تھی۔ اس نے اپنی تھکن سے جان چھڑانے کے لیے ایک لمحے سے لطف لینا سیکھ لیا۔ وہ زندگی کے حسین سے لطف اندوز ہونے لگی اور جب 1992ء میں گراؤنڈ" کی پہلی قسط آن ائر گئی تو تہلکہ مچ گیا۔ اسے محنت کا صلہ مل گیا۔ وہ اپنے پر فخر محسوس کرنے لگی۔

نڈ دلچسپ شو تھا اور بہت اچھا بھی تھا لیکن ایک اس عمدہ ترین شو کو کھا گئی۔ ابتدا سے ہی وقت اس لیے مسئلہ ثابت ہوا۔ اس زمانے میں "60 منٹ" پروگرام اپنے مدمقابل آنے والے ہر پروگرام کو ہڑپ کر جاتا تھا۔ یہ خبروں کا پروگرام تھا اور سی بی ایس ٹیلی ویژن نے کیا تھا۔ اس پروگرام کے سامنے جو پروگرام بھی آیا' اس مات کھائی۔ گویا اس پروگرام نے ٹی وی پر مقابلے کی فضا ختم کر ڈالی تھی۔ جس وقت یہ پروگرام ٹی وی پر چل رہا تھا۔ اس وقت کسی بھی چینل پر کچھ بھی دکھایا جاتا' بری طرح پٹ جاتا تھا۔ "ٹیکی گراؤنڈ" کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے وقت دیا گیا اس وقت دوسرے چینل پر "60 منٹ" چل رہا ہوتا تھا پھر اس پروگرام میں کوئی بہت مشہور و معروف نام نہیں تھا یہ صورت حال خودکشی کے مترادف تھی اور توقع کے خلاف نہیں نکلا۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ ٹیکی گراؤنڈ نامی کا کوئی نیا پروگرام شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا ہے۔ نیٹ ورک والوں نے ایک حماقت یہ بھی کر ڈالی کہ حال کا اندازہ ہو جانے کے بعد بھی نہ تو اس پروگرام تبدیل کرنے کی کوشش کی اور نہ اس کی بھرپور پبلسٹی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی اور یوں سترہ کے بعد جب "ٹیکی گراؤنڈ" کو ناظرین میسر نہ آ سکے تو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حالانکہ پروگرام میں اتنی تھی کہ اگر اسے بھرپور پبلسٹی مل جاتی تو 60 منٹ کا مقابلہ کرنے کا اہل تھا۔

یہ ناکامی لو ہیوٹ کو منتشر کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ٹیلی ویژن سیریز میں بھرپور کامیابی سمیٹنے والی اداکارہ کے طور پر سامنے آنے میں ناکام ہو رہی تھی مگر یہ اس کا اختتام نہیں تھا۔ لو کے ترکش میں ابھی اور بھی تیر تھے۔ فلم بننے کے بعد اس کے فلمی کیریئر نے رفتار پکڑ لی تھی۔ ٹیکی گراؤنڈ کے ابتدا سے بھی پہلے اس کی جھولی میں اس کے کیریئر کی دوسری فلم آ چکی تھی۔ جس کی شوٹنگ وہ مکمل کرا چکی "لٹل مس ملینز" (LITTLE MISS MILLION) نامی یہ فلم 1993ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

لٹل مس ملینز ایک جذباتی کہانی پر مشتمل تھی۔ جس پر کنکارڈ پکچرز نے سرمایہ کاری کی تھی۔ یہ فلم خاص طور پر کرسمس کے لیے بنائی گئی تھی۔ پہلی بار اس فلم میں لو ہیوٹ کو ایک بڑا کردار دیا گیا تھا۔ ایسا کردار جس میں اسے بہت زیادہ دیر تک پردے پر رہنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس فلم کا بڑا نام ہرگز نہیں تھی۔ اس فلم میں دو بڑے نام تھے ایک ہاروڈ ہیس مین اور دوسرا لونی اینڈرسن کا۔ ہاروڈ ہیس مین ٹی وی کے مزاحیہ کھیل "ڈبلیو کے آر پی ان سنسناٹی" میں کام کر کے ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس مزاحیہ کھیل میں لونی اینڈرسن بھی اس کے ساتھ تھی۔ جو لو ہیوٹ کی پہلی فلم میں بھی اس کے ساتھ کام کر چکی تھی۔

لو ہیوٹ نے اپنی دوسری فلم میں ایک نو سالہ بچی "ہیدر لوفٹن" کا اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ ایک ایسی مظلوم بچی جو اپنی ظالم سوتیلی ماں کے ساتھ زندگی گزارنے اور اس کے ظلم سہنے پر مجبور ہے۔ دراصل وہ بچی کروڑوں ڈالر کی وارث ہوتی ہے جو اس کا باپ اس کے لیے ترکے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں ان کروڑوں ڈالروں کے حصول کے لیے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالتی ہے۔ جب سوتیلی ماں کے مظالم اس بچی کے لیے حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ تب تک فروسٹ (ہاروڈ ہیس مین) نامی ایک شخص کو اس کی تلاش کا کام سونپا جاتا ہے۔ اس سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ بچی کو تلاش کر کے گھر واپس لانے میں کامیاب ہو گیا تو اسے پانچ لاکھ ڈالر معاوضہ دیا جائے گا۔ نصف ملین ڈالر کی رقم معمولی نہیں تھی۔ وہ تلاش میں جت جاتا ہے' آخر لڑکی کو تلاش کر کے اسے سوتیلی ماں کے حوالے کر دیتا ہے مگر اسے معاوضہ نہیں دیا جاتا بلکہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ رقم کی لالچ میں خود اسی نے اس بچی کو اغوا کیا تھا۔ اس کے پیچھے اغوا برائے تاوان

کے الزام میں ایف بی آئی لگ جاتی ہے' وہ جان بچا کر بھاگتا ہے۔ بے چارہ غریب ٹک فراسٹ اپنی صفائی میں کوئی گواہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ وہ مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ اسے صرف ایک شخصیت اس عذاب سے بچا سکتی ہے اور وہ شخصیت ہے وہی نو سالہ بچی ہیدر۔ تب اس نو سالہ بچی اور ٹک فراسٹ کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ بچی اپنی حقیقی ماں کے پاس جانا چاہتی ہے' اسے یقین ہے کہ اس کی حقیقی ماں اس کی دولت سے زیادہ اس سے پیار کرتی ہے۔ وہ ٹک فراسٹ کو یقین دلاتی ہے اگر وہ اسے اس کی ماں کے پاس پہنچا دے تو وہ ایف بی آئی والوں کے سامنے اس کے حق میں گواہی دے کر اس کی گلو خلاصی کرا دے گی...... یہ اس قدر آسان کام نہ تھا۔ اس ایڈونچر میں انہیں بے پناہ خطرات اور کئی مشکلات کا سامنا کرنا تھا مگر ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس ایڈونچر میں کامیاب ہو جاتے تو دونوں کو خوشیاں ملتیں اور بدی کا نمونہ یعنی سوتیلی ماں کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ اب یہ بتانے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ اس فلم کا انجام بھی بخیر ہوتا ہے۔ ٹک ہیدر کو اس کی ماں کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کو دوبارہ بانہوں میں پا کر نہال ہو جاتی ہے۔ ہیدر کی گواہی کے بعد ٹک بھی بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔ سوتیلی ماں کے ہاتھ پھوٹی کوڑی بھی نہیں آتی۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہے اور باقی سب لوگ ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی کہانی نہیں تھی جسے معرکہ آرائی کہا جائے۔ نہ اس فلم میں کسی کردار کے پاس کچھ کرنے کے ایسے مواقع تھے کہ وہ فن کی بلندیوں پر نظر آنے کی کوشش کرتا۔ یہ ایک عام سی ڈراما مووی تھی۔ کرسمس کے موقع پر کوئی اس سے زیادہ جذباتیت یا میلو ڈراما برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فلم میں پیش ہونے والے کرداروں میں اچھے کردار واقعی نظر آئے اور برے کردار برے محسوس ہوئے۔ اب تک کے فلمی اور ٹی وی کیریئر میں ہیدر کا کردار' لو ہیوٹ کے لیے سب سے بڑا کردار تھا۔ یہ کردار اس کی دونوں ٹی وی سیریل سے بھی بڑا تھا۔ اب تک کسی ایک فلم یا ڈرامے میں اسے اتنی دیر تک کیمرے کا سامنا کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ثابت کر دیا کہ وہ ننھی سی عمر میں بھی ایک باکمال فنکارہ ہے۔ اپنی عمر سے کم عمر کی لڑکی کا کردار کرنا لو ہیوٹ کے لیے آسان نہ تھا۔ کہانی کے مطابق اس فلم میں اس لڑکی کی عمر محض نو برس دکھائی گئی ہے جبکہ جس وقت اس فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی وہ تیرہ برس کی نوخیز اور پرکشش لڑکی بن چکی تھی۔ اگرچہ اس کے نسوانی خدوخال پر ابھی جوبن نہیں آیا تھا مگر تیرہ برس کی لڑکی' اگر گلیمر ورلڈ میں ہو تو اس قدر پرکشش ضرور ہوتی ہے کہ ٹین ایجرز اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اس عمر میں ٹین ایجرز کی جان بن چکی تھی۔ اس کے پاس آنے والے خطوط زیادہ تر پندرہ سولہ برس کے لڑکوں کی طرف سے بھیجے گئے ہوتے تھے۔ اس وقت تک لو ہیوٹ کو اندازہ نہیں تھا کہ نوجوان اس میں کس حد تک دلچسپی لینے لگے ہیں۔

اس فلم نے بہت زیادہ کامیابی تو حاصل نہیں کی لیکن اسے ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اوسط درجے میں کامیاب ہونے والی فلم نے جلد ہی ایسی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ چھٹیوں کے دوران اکثر اسے ٹی وی وغیرہ پر دکھایا جانے لگا۔ البتہ ٹی وی پر اس فلم کا نام تبدیل کر دیا جاتا تھا اور اسے "ہوم فور کرسمس" کے نام سے پیش کیا جاتا تھا۔ ہوم فور کرسمس کے ہی نام سے بعد میں ایک اور فلم بھی بنائی گئی تھی جس کا مرکزی کردار کیلی اون نے ادا کیا تھا۔

اس فلم کی ریلیز تک لو ہیوٹ' لاس اینجلز میں چار برس گزار چکی تھی۔ ان چار برسوں کے دوران اس نے بہت زیادہ کام کر لیا تھا۔ اتنی مدت میں اس کی عمر سے دگنی اور پرکشش ترین اداکارائیں بھی اتنا کام حاصل کرنے کا صرف خواب ہی دیکھتی ہیں۔ اب اس کے کریڈٹ پر سیریلز کے علاوہ بے شمار اشتہارات اور فلمیں بھی تھیں۔ فلم کی ریلیز کے بعد دونوں ماں بیٹی گھر پہنچیں تو لو ہیوٹ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ پر چھلانگ لگاتے ہوئے کہا "مما' میں بہت خوش ہوں' اتنی مختصر مدت میں اتنا سارا کام! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

اس کی ماں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "بے شک! تم ضرورت سے زیادہ کامیاب رہی ہو' ٹیکساس چھوڑ کر لاس اینجلس میں رہنے کا فیصلہ درست ثابت ہوا مگر میں سوچ رہی ہوں کہ تم بہت سی ناکامیوں سے بھی گزری ہو۔"

لو ہیوٹ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کی ماں درست کہہ رہی تھی۔ کئی آڈیشنوں میں ناکامی اور متعدد کردار ہاتھ سے نکل جانے پر وہ اکثر مایوس ہو جاتی تھی۔ مگر اس مایوسی کے باوجود اس نے ثابت قدم رہنے اور جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس نے کہا "مما! ٹھیک ہے' میرے حصے میں ناکامیاں بھی آئی ہیں مگر کامیابیوں کا گراف

بھی بہت بلند ہے۔"

"کیا تم خوش ہو لو؟" اس کی ماں نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی "میں بہت خوش ہوں مام! مگر... محض اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں سکتی' میں ابھی اپنے آپ کو ذرا بہتر انداز میں منوانا چاہتی ہوں۔"

"اس کے لیے تمہیں ایسے کردار مسلسل کرنا پڑیں گے جن سے ایک طرف تو تمہاری صلاحیتوں کو زنگ نہ لگے اور ساتھ ساتھ ان میں نکھار بھی پیدا ہوتا رہے۔"

"ہاں مما! میں ایسے کردار ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جن سے ہر طرف میری دھوم مچ جائے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کے ذہنوں میں بس کر رہ جاؤں گی۔"

اس کی ماں اپنی ننھی سی پری کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں ڈھنگ سے چلنا اور تہذیب سے کھانا بھی نہیں سیکھ پاتی ہیں اور وہ گلیمر ورلڈ پر راج کرنے اور دھماکے کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ لو ہیوٹ نے اپنے آپ کو ہمیشہ لو ہیوٹ کہلایا تھا مگر یہ اس کا پورا نام نہیں تھا۔ اب جوں جوں اس کی عمر بڑھ رہی تھی۔ فن نکھر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب اسے اپنی شناخت کو بھرپور بنانے کے لیے تھوڑے مختلف نام کی ضرورت ہو گی۔ ایک انٹرویو کے دوران لو ہیوٹ نے کہا تھا "جب میں بچی تھی۔ کم عمری کی زندگی گزار رہی تھی تو اس وقت ہر شخص مجھے لو (LOVE) کہہ کر پکارتا تھا۔ میں اس ادھورے نام کی عادی ہو گئی تھی۔ طویل عرصہ تک میں نے اپنا پورا نام لو جینیفر لو ہیوٹ استعمال کرنے کا سوچا بھی نہیں' مگر جوں جوں میں جوانی میں قدم رکھ رہی تھی مجھے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ کسی نوخیز لڑکی کے لیے مناسب ترین بات یہی ہے کہ وہ مکمل نام اختیار کرے۔ نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورا نام اختیار کرنے سے ہی میری سنجیدگی اور وقار میں اضافہ ہو گا۔

1993ء میں جب لو ہیوٹ کو تیسری فلم "سسٹر ایکٹ ٹو' بیک ان دی ہیبٹ" میں کاسٹ کیا گیا تو وہ لو ہیوٹ سے جینیفر لو ہیوٹ بن چکی تھی۔ سسٹر ایکٹ ون وہ فلم تھی جو ڈزنی اسٹوڈیو والوں کی تجوریاں بھرنے کا سبب بن گئی تھی۔ 1992ء میں منظر عام پر آنے والی اس فلم نے خراب تبصروں کے باوجود باکس آفس پر نہایت آسانی سے ۱۹۱ ملین ڈالر کمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس فلم کی خاص الخاص بات یہ تھی کہ اس کے ذریعے وہوپی گولڈ برگ جیسی ایک اداکارہ دریافت ہوئی اور ہالی ووڈ کی قدر و منزلت میں اضافے کا سبب بن گئی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد دوسرا حصہ بنانے کی بحث چل نکلی تو اس وقت شوبزنس کے رسالوں میں یہ افواہیں گردش میں تھیں کہ وہوپی گولڈ برگ اور ڈزنی والوں کے درمیان معاملات خراب ہو گئے ہیں اور کئی تنازعات جنم لے چکے ہیں مگر یہ افواہیں دم توڑ گئیں جب وہوپی گولڈ برگ نے سسٹر ایکٹ ٹو میں کام کرنے کے لیے ڈزنی والوں کے ساتھ ساڑھے سات ملین ڈالر معاوضے کے عوض معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کے بعد وہوپی گولڈ برگ ہالی ووڈ کی تاریخ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن گئی۔ ڈزنی اسٹوڈیو کو یقین تھا کہ سسٹر ایکٹ ٹو کے ذریعے بھی وہ کروڑوں ڈالر کمانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

پہلی فلم کے کئی اداکار سسٹر ایکٹ ٹو میں بھی شامل کیے گئے تھے۔ پہلی فلم کے ہدایت کار ایمائل آرڈولینو تھے مگر دوسرے حصے کی تیاری کے وقت وہ بستر سے لگ چکے تھے چنانچہ دوسرے حصے کی ہدایت کاری کے فرائض بل ڈیوک کو سونپے گئے۔ بل ڈیوک ایک معروف ہدایت کار تھا۔ اس سے قبل "اے ریج ان ہارلم" اور "ڈیپ کور" نامی کامیاب فلموں کی ہدایت کاری کی وجہ سے خاصی شہرت سمیٹ چکا تھا۔ اس تبدیلی یعنی ہدایت کار کی تبدیلی کے بعد پروڈکشن کے آغاز کے بعد اسکرپٹ میں بار بار تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔ جو براہ راست فلم کے مستقبل پر اثر انداز ہوئیں۔

جینیفر لو ہیوٹ نے سسٹر ایکٹ میں سینٹ فرانسس ہائی اسکول کی طالبہ مارگریٹ کا کردار ادا کیا۔ یہ وہی اسکول تھا جس کی مالی حالت بہتر کرنے کے لیے وہوپی گولڈ برگ کو سسٹر میری کلیرنس کے نام سے بھیجا جاتا ہے۔ کہانی کے مطابق سسٹر میری کلیرنس کا اصل نام ڈیلورس وان کارٹیر تھا اور وہ نن (راہبہ) بھی نہیں تھی' فلم میں جینیفر کی کلاس میں پڑھنے والی ایک لڑکی ایلکس مارٹن بھی تھی جو کہانی کے مطابق وہوپی گولڈ برگ کی بیٹی الیگزینڈا کا کردار ادا کر رہی تھی۔ اس فلم کے لیے جینیفر کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اچھی اداکارہ تھی بلکہ بہت اچھا گا بھی سکتی تھی اور رقص کے فن سے بھی واقف تھی۔ گانا اور رقص اس فلم کی بنیادی ضرورت تھے۔ گانا اور رقص اور اداکاری' یہ تینوں چیزیں جینیفر کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔ وہ ان نغموں کی بہتر ادائی اور ان پر عمدہ رقص اور اداکاری پر اچھی طرح قادر تھی جو اس فلم کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہے تھے۔ فلم میں پیش کیا جانے والا اسکول سینٹ فرانسس ہائی اسکول وسط شہر میں واقع تھا اور تمام تر روایتی مسائل کا گڑھ

www.Paksociety.com

بن چکا تھا۔ اسکول کے تمام بچے بدمعاش بن پُر تولنے لگے تھے۔ پڑھنے لکھنے سے قطعی طور پر بے زار ہو گئے تھے اسکول کے تمام اساتذہ اس خوف میں مبتلا ہو گئے تھے یہ بچے جلد یا بدیر ان پر حملہ کر دیں گے۔

فلم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ یہ 1955ء میں ریلیز ہونے والی فلم "دی بلیک بورڈ جنگل" ایک اور فلم "فیم" اور "ویلکم بلیک کوٹر" کا ملغوبہ محسوس ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان فلموں کے پورے پورے مناظر کو جوڑ کر ایک نئی فلم تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بات پر تنقید نگاروں نے نہایت سنجیدگی سے قلم اٹھایا اور کڑی تنقید کے بعد جلد ہی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ فلم کا اسکرپٹ نہایت کمزور ہے اور اس میں اصلاح کی شدید ضرورت تھی۔ جب فلم سینما گھروں میں ریلیز ہوئی تو ناقدین اور ناظرین نے جلد ہی بھانپ لیا کہ سسٹر ایکٹ پر لطف اور پر مزاح فلم تھی سسٹر ایکٹ ٹو میں ان دونوں خصوصیات کا فقدان تھا۔ رسائل و اخبارات میں سسٹر ایکٹ کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ نیویارک ٹائمز میں معروف قلم نگار کیرن جیمز نے لکھا "سسٹر ایکٹ ٹو کی کہانی کا کوئی سر پیر ہی نظر نہیں آتا ایسا لگتا ہے فلم تیار کرنے میں خطرناک حد تک جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔"

نیوز ڈے میں شائع ہونے والی رائے یہ تھی کہ "سسٹر ایکٹ ٹو نے پہلے حصے کی خامیوں کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ دوسرا حصہ پہلے حصے کی خوبیوں کو بھی ہضم کر گیا ہے۔"

جو فلمیں محض فلم کے پہلے حصے کی مقبولیت سے متاثر ہو کر محض پیسہ بٹورنے کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ ان فلموں کو اسی قسم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ طے ہے کہ پہلی فلم تو اکثر اوقات نہایت متاثر کن ثابت ہوتی ہے مگر ان ہی کرداروں کے ساتھ اتنی ہی اچھی کہانی کے تانے بانے دوسری مرتبہ بنا خاصا مشکل اور کسی حد تک ناممکن کام ہوتا ہے۔ اس کی مثال مشہور عالم فلم "گاڈ فادر" سے دی جا سکتی ہے۔ ماریو پزو کے شہرہ آفاق ناول پر بننے والی فلم "گاڈ فادر" نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر محض پیسہ بٹورنے کے لیے اس فلم کا دوسرا اور تیسرا حصہ تیار کیا گیا مگر دوسری دونوں فلموں کو نہ تو پہلی فلم جیسی کامیابی ملی اور نہ ہی تاریخ میں وہ دونوں فلمیں زندہ رہ سکیں۔ صرف یہی نہیں، یہ بھی طے ہے کہ کسی فلم کا ری میک اکثر اوقات غیر متاثر کن ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لیے ہالی ووڈ سمیت بالی ووڈ اور لولی ووڈ کی درجنوں فلموں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ سسٹر ایکٹ پارٹ ٹو کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ پہلی فلم بہترین بزنس کرنے میں کامیاب ہوئی مگر دوسری فلم کو وہ کامیابی نہ مل سکی جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ ڈزنی والوں نے "سسٹر ایکٹ ٹو" پیسہ بٹورنے کے لیے تیار کی تھی مگر یہ فلم محض ستاون ملین ڈالر کمانے میں بہ مشکل کامیاب ثابت ہوئی، یہ رقم اس فلم کی لاگت کا نصف بھی نہیں تھی۔ گویا باکس آفس کی اصطلاح میں اس فلم کو ڈبا یہ فلاپ ہی کہا جائے گا۔

سسٹر ایکٹ ٹو میں کام کرنے سے ایک طرف تو جینیفر لوہیوٹ کے کریڈٹ میں مزید فلاپ فلم آ گئی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے فلم میکنگ اور ایکٹنگ کے شعبے میں خاصا تجربہ حاصل ہوا۔ اس فلم میں اس کا مارگریٹ کا کردار گانے اور ناچنے والے بچوں کے ہجوم میں ایک رقاصہ اور گلوکاری کے مختصر کردار سے بہت زیادہ تھا۔ تاہم یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے اس کردار میں بہت کچھ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ تھی کہ پوری فلم وہوپی گولڈ برگ اور میگی اسمتھ کے مضبوط کرداروں کے گرد گھوم رہی تھی۔ میگی اسمتھ اس سے پہلے "دی پرائم مس جین بروڈی" اور "اے روم ودھ اے ویو" نامی فلموں میں کام کر کے خاصی شہرت حاصل کر چکی تھی۔ جینیفر کو ان دو بڑی اداکاراؤں کے خاصے مضبوط کرداروں کے درمیان اپنی پرفارمنس پیش کرنا تھی۔ گویا وہ ایک پِس پِسا کردار کر رہی تھی پھر فلم بندی اتنی تیزی سے ہوئی کہ جینیفر کو پتا ہی نہیں چل سکا کہ کب فلم شروع ہوئی اور کب ختم ہو گئی۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے کریڈٹ پر پِس پِسے کردار والی ایک بڑی مگر ناکام فلم آ گئی۔ اگرچہ فلم میں بڑے اداکار تھے۔ اس بنا پر اس کی پبلسٹی بھی بھرپور انداز میں کی گئی تھی لیکن یہ فلم آئی اور گئی کے مصداق کسی کو بھی یاد نہ رہ سکی۔ نہ ہی کسی کے ذہن میں یہ بات جگہ بنا سکی کہ ٹیلی وژن کی نوخیز اسٹار جینیفر لوہیوٹ بھی اس فلم میں موجود تھی۔ کسی نے بھی جینیفر کا نوٹس نہیں لیا۔ تب یہ بات کہی جانے لگی کہ جینیفر کو فلم انڈسٹری یا شوبز ورلڈ میں رہنا ہے تو اسے لازمی طور پر ایک ہٹ فلم تلاش کرنا ہو گی۔ ایک ایسی ہٹ فلم جو اس کے نام اور کارکردگی کی وجہ سے ہٹ ہو۔ لوگ فلم کو یاد کریں تو جینیفر کا نام پہلے ان کے ذہن میں آئے۔

اگرچہ جینیفر کو سخت محنت کرنے کا جنون تھا مگر کامیابی کی دیوی ابھی اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ بدقسمتی کے سائے اس پر سایہ فگن تھے۔ وہ سونے کو ہاتھ میں لیتی تو مٹی

بن رہا تھا۔ جن پائیلٹ پروگراموں میں وہ حصہ لیتی وہ منظور ہی نہ ہو پاتے۔ اگر خوش قسمتی سے منظور ہو جاتے تو اس سے پہلے کہ وہ آن ائیر جا کر ناظرین میں اپنی جگہ بناتے، انہیں کینسل کر کے بند کر دیا جاتا اور جینیفر وہیں کھڑی ہو جاتی جہاں سے اسے اپنے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی، مایوسی ہی مایوسی اور ناکامی ہی ناکامی نظر آتی تھی۔ اس کی فلمیں بھی لوگوں کو متاثر کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس کی فلموں پر تبصرہ کیا جاتا تو ان میں جینیفر کا نام تک نہیں لیا جاتا۔

جینیفر عمر کے اس دور میں قدم رکھ چکی تھی جب نو برس کی بچی کا کردار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اگرچہ ابھی وہ محض تیرہ برس کی تھی مگر اس کے پُرکشش جسم کے نشیب و فراز اپنی موجودگی اور تازگی کا احساس دلانے لگے تھے۔ وہ اس تبدیلی کی عادی نہیں تھی۔ ایک دن وہ تنگ آ گئی اور ناراض لہجے میں ماں سے بولی۔

"مما! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، میری تمام تر شرٹس بے کار ہو گئی ہیں اب پہلے جیسی نہیں رہیں، میں کیا کروں؟"

ماں نے اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا اور چمکارتے ہوئے بولی "ہو! اب تم بڑی ہو رہی ہو، ٹین ایج میں داخل ہو رہی ہو۔ اس عمر میں لڑکیوں کا بدن تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔"

"مگر مما! مجھے بہت الجھن ہوتی ہے۔ ٹی شرٹ تنگ لگتی ہے....."

ماں بولی "یہ تو ہو گا، تم ایسا کرو، اپنے لیے کچھ ڈھیلی شرٹس خرید لو!"

جینیفر نے ماں کے مشورے سے ڈھیلی شرٹس خرید لیں، مگر اپنے جسم میں ہونے والی تبدیلی اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان تبدیلیوں کے بعد ہی تو وہ امریکی نوجوانوں کی سوئٹ ہارٹ بننے والی ہے۔ جسم میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے ایسے لباس زیب تن کرنے لگی جیسے سیارہ ویز "پارٹی آف فائیو" کے ابتدائی دنوں میں پہنا کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے تبدیل شدہ جسم کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اس کے وارڈ روب میں کم عمر لڑکیوں کے بجائے نوخیز مگر پُرشباب لڑکیوں کی مناسبت سے لباس نظر آنے لگے۔

اس کی جسمانی تبدیلیوں کا مطلب تھا کہ اب وہ نوجوان لڑکی کے کردار کر سکتی تھی۔ ایسے کردار جو زیادہ چیلنجنگ اور زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اب فلم میں کسی کی گرل فرینڈ یا محبوبہ بن سکتی تھی۔ کوئی نفسیاتی کردار بھی ادا کر سکتی تھی اور ہیجان خیز کرداروں میں بھی اپنی جگہ بنا سکتی تھی۔ سب یہ تسلیم کرتے تھے کہ جینیفر ایک اچھی اداکارہ ہے مگر اسے اب تک ایسی کوئی سیریز، بھرپور فلم نہیں ملی تھی جو اس کے لیے سنگ میل ثابت ہوتی۔ انہی دنوں جب وہ خود کو جوان لڑکی سمجھنے لگی تھی اسے ایک نئے شو کے آڈیشن کے لیے بلایا گیا۔ یہ شو "مل اسٹریٹ بلو" اور ایسے دیگر کامیاب ڈراموں کا خالق "اسٹیون بوکو" تیار کر رہا تھا۔ اس کی کامیابیوں نے اسے ٹیلی وژن پر خاصا طاقت ور بنا دیا تھا۔ اس کے آئیڈیاز اور اسکرپٹ کو خاصی مقبولیت ملتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے آئیڈیاز اور اسکرپٹ دونوں ہی ناظرین پر جادو کر دیتے تھے۔ ٹیلی وژن کے تمام ہی نیٹ ورک اس کے ساتھ کام کرنے پر ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لہٰذا جب بوکو نے "پائرڈ آف پیراڈائز" کے خیال کو اے بی سی نیٹ ورک سے ڈسکس کیا تو وہ فوراً منظور ہو گیا اس شو کے آڈیشن کے لیے جینیفر کو طلب کیا گیا۔

یہ ایک فیملی شو تھا۔ جس کی کہانی بائرڈ خاندان کے گرد گھوم رہی تھی۔ ٹموتھی بش فیلڈ اس سیریز میں سام بائرڈ کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کردار کے مطابق وہ ییل یونیورسٹی میں اخلاقیات کا پروفیسر تھا مگر ڈکیتی کی ایک واردات میں جب اس کی بیوی قتل ہو گئی تو اس نے یہ ملازمت ترک کر دی اور اپنے بچوں کے ہمراہ ہوائی کے جزیروں میں سے ایک جزیرے اوہایو پر منتقل ہو گیا۔ وہاں وہ ایک چھوٹے سے اسکول میں بہ طور پرنسپل ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ خوبصورت لوکیشن کے علاوہ اس سیریز کی خاص بات اس خاندان کے ساتھ گزرنے والے واقعات تھے۔ اس خاندان کے بچے تیزی سے بڑے ہو رہے تھے اور اپنی ماں کے بغیر زندگی گزارنے کی جدوجہد کے علاوہ نئے کلچر اور ماحول میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جینیفر لوہیوٹ آڈیشن میں کامیاب ہو گئی۔ اسے سام بائرڈ کی جواں سال بیٹی فین بائرڈ کے کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا اور بالکل پہلی مرتبہ وہ ایک ایسا کردار ادا کرنے جا رہی تھی جو اس کی اپنی شخصیت سے قطعی مختلف تھی۔ وہ ایک ایسی جوان لڑکی کا کردار تھا جو نوجوانی کے جوش و جذبے اور ہیجان سے بھرپور تھی۔ وہ سگریٹ نوش تھی، لوگوں سے چلا چلا کر باتیں کرتی، اپنے والد کی کار خود چلاتی تھی اور جینیفر لوہیوٹ بہ ذات خود ایسی ہرگز نہیں تھی۔ سیریز میں فین بائرڈ کا کردار خاصے پیچیدہ اور نفسیاتی تھا۔ وہ پندرہ برس کی عمر میں بہت ہی ہیجان انگیز تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کو

چھوڑ کر کسی نئے علاقے میں رہائش اختیار کرنے پر ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نفسیاتی اور جسمانی طور پر متعدد تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ ایسے میں اس کی ماں بھی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ ماں کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی اور اس حقیقت کا بھی اسے ادراک تھا کہ اسے اپنی ساری زندگی ماں جیسی ہستی کے بغیر گزارنا ہے۔ جینیفر کے لیے یہ کردار خاصا وقت طلب اور پریشان کن اس لیے تھا کہ وہ خود ابھی تک نوجوانی کے تازہ تازہ جذباتی اور نفسیاتی دباؤ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ساری گفتگو اپنی ماں سے ہوتی تھی۔ ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی نوجوان نہیں آیا تھا جو جوانی کے غیر معمولی دباؤ کو برداشت کرنے میں اس کی مدد کرتا۔

وہ اپنی ماں کی بیٹی تھی۔ کردار کی تفصیل سن کر اپنی ماں کے پاس آئی اور بولی "یہ کردار کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں بہت مایوس ہو گئی ہوں۔"

اس کی ماں ہیٹ ہیوٹ بیٹی کی ذہنی کیفیت کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے جینیفر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تمہاری شخصیت اس کردار سے قطعی مختلف ہے مگر تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔ اسی کو اداکاری کہتے ہیں۔ یہ کردار کرنے میں ایسی کون سی مشکل ہے۔ جس کی وجہ سے تم مایوسی کی باتیں کر رہی ہو؟"

"ممّا! یہ ایک پیچیدہ کردار ہے۔ جینی بائز ایسی لڑکی ہے جو اپنی شخصیت اور جسمانی تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے اور۔۔۔"

"مگر ایسا تو خود تمہارے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ تم بھی عمر کے اسی حصے میں ہو جہاں تبدیلیاں لڑکیوں کا دامن پکڑ لیتی ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ کردار تمہارے لیے بہت اہم ہے۔ تمہیں اس میں وہی کچھ پیش کرنا ہے جو خود تمہارے ساتھ ہوا ہے' بات جینیفر کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اس کردار میں ڈٹ کر کام کیا اور ایسی لازوال اداکاری کی کہ ناقدین نے صاف کہا کہ جینیفر اس کردار میں اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔

ایک جریدے کو انٹرویو دیتے وقت اس سیریز کے بارے میں بات کرتے ہوئے جینیفر نے کہا "یہ میری زندگی کا وہ وقت تھا جب میرے لیے ہر چیز پیچیدہ تھی۔ میں سچ مچ اپنے آپ کو مایوسیوں میں گھرا ہوا پاتی تھی' فین بائز کی ماں نہیں تھی اور میرا باپ میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ بھی جذباتی اور جسمانی تبدیلی کے عمل سے گزر رہی تھی اور میں بھی۔ لہٰذا میں اپنی مایوسی کو ہر روز فین بائز کے کردار کے ذریعے اپنے وجود میں سے باہر نکالتی تھی۔ میں یوں کہوں گی کہ اس کردار نے بہتر نوجوان بننے میں میری مدد کی۔"

اس شو کی عکس بندی خوبصورت ترین جزیرے اواہایو میں کی گئی تھی۔ اس کا پریمئر اے بی سی ٹیلی ویژن پر مارچ 1994ء میں ہوا۔ یعنی جینیفر لوہیوٹ کی پندرہویں سالگرہ کے محض چند روز کے بعد۔ اپنے اس کردار کی طرح حقیقی زندگی میں خود جینیفر بھی تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اس کی ماں ہر قدم پر اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ جب وہ کام نہیں کر رہی ہوتی تھی تو اپنی استانی سے سبق لے رہی ہوتی تھی یا پھر بستر پر گہری نیند میں ڈوبی ہوتی تھی۔ اس دوران جینیفر کو بعض ایسے کام بھی کرنا پڑے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مثلاً اسکول کے ایک پرام میں شرکت۔ پرام (Pram) اس ڈانس پارٹی کو کہتے ہیں جو ہائی اسکول یا کالج کے طلبہ و طالبات منعقد کرتے ہیں اس کے شو میں ایکسٹرا کا کام کرنے والا ایک اداکار "کوک نکاما" بھی اپنے اسکول کی ڈانس پارٹی میں شرکت کی تیاری کر رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اسے اپنے ساتھ رقص کرنے والی ساتھی رقاصہ کے طور پر کوئی مناسب لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ تب اس کے ذہن میں جینیفر لوہیوٹ کا خیال آیا۔ اگرچہ جینیفر اس سے بڑی اداکارہ تھی۔ شو کے مرکزی کرداروں میں شامل تھی اور وہ ٹھہرا ایک ایکسٹرا اداکار' مگر پھر بھی اس نے ڈانس پارٹی میں جینیفر کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کرک نکاما کو پتا چل گیا تھا کہ جینیفر کا تعلق ٹیکساس سے ہے۔ وہ خود بھی ٹیکساس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ایک درجن زرد گلاب کا تحفہ جینیفر کو بھیجا اور ڈانس پارٹی میں اپنے ساتھ چلنے کی فرمائش بھی کر ڈالی۔

جینیفر کے لیے ایسی کسی تقریب میں شرکت کا موقع گنوانا ناممکن تھا! وہ اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس دور میں ایسی محبت بھری آفر مسترد کرنا ناممکن تھا۔ یہ اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا' کسی نوجوان کی طرف سے زرد گلاب کا تحفہ کسی بھی لڑکی کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جینیفر نے اب تک ساری زندگی عجیب افراتفری اور ہنگامہ خیز مصروفیت میں الجھ کر گزاری تھی۔ امریکا میں تازہ تازہ جوان ہونے والی لڑکی کو زرد گلاب بھیجنا نوجوانوں کی روایت ہے۔ اس طرح ہم عمر لڑکے اور لڑکیوں کو میل جول بڑھانے کا موقع ملتا ہے۔ جینیفر بھی زندگی کے اس مرحلے پر کھڑی تھی جہاں اسے اس طرح کی تبدیلیوں سے گزرنا تھا۔

اس تقریب کے تجربے نے اس کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ سیٹ سے باہر پہلی مرتبہ وہ کسی نوجوان کی بانہوں میں اپنی مرضی سے یعنی کسی ڈائریکٹر کی ہدایت کے بغیر رقص کر رہی تھی۔ رقص کی تو وہ بچپن سے ہی ماہر تھی۔ اس تجربے کے فوراً بعد "بائزڈ آف پیراڈائز" تو جیسے اسے تجربات کی دولت سے مالا مال کر رہی تھی۔ سیٹ پر اور سیٹ سے باہر اس کی زندگی نت نئے تجربات سے آشنا ہو رہی تھی۔ اب وہ زندگی کو اور زندگی اسے ایک دوسری ہی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اسی سیریز کے سیٹ پر اس کی زندگی کا یادگار ترین تجربہ اس کے بوسے کا پہلا منظر تھا۔

اس وقت تک کسی نوجوان لڑکے کے ہونٹ اس کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ جب کردار کی ڈیمانڈ کے مطابق وہ وقت آیا کہ اسے انیس برس کے ایک لڑکے کی بانہوں میں جا کر اسے زندگی سے بھرپور بوسہ دینا تھا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ سمجھا جاتا ہے کہ امریکی اور یورپی معاشروں میں بوس و کنار وغیرہ عام سی بات ہے' ممکن ہے یہ بات درست ہو' مگر یہ عام سی بات کسی لڑکی کے لیے اس وقت بہت خاص ہو جاتی ہے جب وہ کسی کو زندگی میں پہلی مرتبہ بوسہ دے رہی ہو۔ جینیفر کا پریشان ہو جانا فطری تھا۔ اب تک کسی نے اسے چھوا نہیں تھا' ہونٹ تو دور کی بات ہے۔ کسی نے اس کے شانوں پر بھی ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ جب ڈائریکٹر نے اسے اس منظر کے بارے میں بتایا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ اپنی ماں کی پشت پر چلی گئی' شرم و حیا کے باعث اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ پریشان نظروں سے کبھی اپنی ماں کی طرف اور کبھی ڈائریکٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈائریکٹر نے کہا "اس میں پریشانی کی بات کیا ہے جینیفر! ایک اداکارہ کو اس قسم کے مناظر کا عادی ہونا چاہیے۔ یہ بہت اہم منظر ہے۔ مجھ سے زیادہ یہ بات تم خود بھی سمجھ سکتی ہو۔"

اس نے تنک کر کہا "مگر یہ بہت مشکل کام ہے۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

ڈائریکٹر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں اسے سمجھانے لگی "مو! تم کوئی سچ مچ اپنا تھوڑا کر رہی ہو' یہ تو محض ایکٹنگ ہے' تمہیں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اس قدر جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

جینیفر خاموش رہی۔ اس کی تسلی کے لیے کافی تھا کہ اس کی ماں اس کے سامنے تھی۔ اس نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اثبات میں سر ہلایا مگر ڈائریکٹر سمجھ چکا تھا کہ کیمرے کے سامنے بوسے کا یہ منظر غیر فطری محسوس ہو گا۔ کردار کے مطابق جینیفر کو بوسے کا منظر بھرپور انداز میں شدید ترین جذباتی ہیجان کے ساتھ عکس بند کروانا تھا۔ ہدایت کار نے کہا "کیمرے کے سامنے تمہیں فطری پن لانا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تو اس لڑکے کے ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے چلی جاؤ' ایک دوسرے کو بے حجابانہ انداز میں KISS کرو۔ ورنہ کیمرے کے سامنے غیر فطری انداز میں بوسہ لیا گیا تو شرمندگی ہو گی۔"

یہی کیا گیا۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو شرم و حیا کو جھاڑیوں کے پیچھے ہی چھوڑ آئی تھی۔ اسکرین پر بوسے کا یہ منظر بہت ہیجان خیز انداز میں پیش کیا گیا۔

بعد میں ٹی وی کے ایک پروگرام "ٹو نائٹ شو" میں میزبان جے لینو سے باتیں کرتے ہوئے جینیفر نے بتایا کہ میں اس وقت بہت خوف زدہ اور ڈری ہوئی تھی۔ اس لڑکے کی عمر انیس برس تھی۔ وہ بہت تجربہ کار تھا اور یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میری ماں جھاڑیوں کے سامنے تھی لیکن یہ طے تھا کہ میری زندگی کا پہلا بوسہ جسے میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ کسی جذباتی یا رومانی لمحے کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس لیے میں کہہ سکتی ہوں کہ میرا پہلا بوسہ خود میرے لیے بہت عجیب ثابت ہوا تھا۔"

اس شو کے خالقین میں سے ایک چارلس رینگلی نے اس بوسے کے منظر کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ٹی وی گائیڈ میگزین کو بتایا تھا کہ "یہ منظر شو کے لیے بہت اہم تھا۔ جینیفر جس انداز میں انکار کر رہی تھی اس پر ہمیں بہت غصہ آ رہا تھا لیکن جب وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے واپس آئی تو بہت جذباتی اور غصے میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے چند لمحوں تک اس کی کیفیت پر غور کیا۔ اس وقت مجھے وہ اپنی بیٹی جیسی لگی' جو کسی بھی خلاف معمول بات پر جھنجلا جاتی تھی۔ میں جب جینیفر کی کیفیت کا ادراک کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ بہت پیاری اور پیار کرنے والی محسوس ہوئی۔"

بائزڈز آف پیراڈائز ایک بہترین شو تھا' کہانی اور کارکردگی کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ تھا۔ جینیفر تمام اداکاروں میں بازی لے گئی تھی۔ ہالی ووڈ رپورٹرز نے اپنے تبصرے میں کہا تھا کہ یہ شو تازہ خوبصورت تحریر اور اداکاری کا مرقع ایک معیاری فیملی ڈراما ہے۔ ایسے شو ٹی وی نیٹ ورکس پر خال خال ہی نظر آتے ہیں۔"

یہ شو بھی دو بہت گمبھیر مسائل کا شکار رہا۔ پہلی وجہ تو

اس کی بڑھتی ہوئی لاگت تھی۔ اصل لوکیشن پر فلم بندی، اسٹوڈیوز کے اندر ہونے والی فلم بندی کے مقابلے میں خاصی مہنگی ثابت ہو رہی تھی لیکن ڈرامے میں جان ڈالنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کی فلم بندی اوہایو جزیرے کی اصل مقامات پر ہی کی جائے۔

دوسرا بڑا مسئلہ درجہ بندی کا تھا۔ اگرچہ یہ ایک مقبول ڈراما تھا مگر اے بی سی نیٹ ورک والوں کو اس وقت سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب چارٹس میں یہ ابتدائی نمبروں پر جگہ بنانے میں ناکام رہا۔ لہٰذا پہلے سیزن کے اختتام پر اس ڈرامے کو مزید جاری نہ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس ڈرامے کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اسے ذہانت سے تیار کیا گیا تھا اور یہ بات ذہن میں رکھ کر تیار کیا گیا تھا کہ امریکی لوگ کوئی معیاری ڈراما دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی غلط سوچ تھی۔ ایسا سوچ کر جب بھی کوئی معیاری اور اچھا ڈراما بنایا گیا تو لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس ڈرامے کی خوبی ہی اس کی سب سے بڑی خامی بن گئی۔ کیونکہ بے حد مصروف معاشروں میں لوگ شام کے فارغ وقت میں صرف اور صرف تفریح چاہتے ہیں۔ اچھائی یا بُرائی پر سوچنے کا وقت ان کے پاس نہیں ہوتا۔

اس شو کی بندش سے متعلقہ اداکاروں کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ خود جینیفر کے لیے بھی یہ ڈراما اب تک کا سب سے اچھا، منفرد اور مختلف تجربہ تھا۔ پارٹی آف فائیو کے بعد اسے بہ ذات خود اپنی پرفارمنس اسی شو میں پسند آرہی تھی۔ آج تک کسی کو بھی اصل بات نہیں معلوم کہ "بائرڈز آف پیراڈائز" کیوں بند کیا گیا۔ جینیفر کا ذاتی خیال یہی ہے کہ اس کی لاگت اس پروگرام کو بند کرنے کا سبب بن گئی تھی۔

اس شو کو کچھ عرصہ بعد اے بی سی کے فیملی چینل پر بھی چند برسوں تک مسلسل دکھایا گیا۔ جس کے باعث لوگوں کو جینیفر لوہیوٹ کے ٹیلنٹ میں ترقی کے مشاہدے کا موقع ملا۔ شو بند ہونے کے بعد جینیفر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ واپس اپنے گھر لاس اینجلس آجائے۔ اب وہ بے کار تھی اور گھر پر موجود تھی۔ اس کا مطلب ایک بار پھر اسکول کی پڑھائی کا آغاز، لہٰذا اس نے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جہاں پہلے سے بدتر صورتِ حال اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پہلے بوسے کے بعد اپنی جسمانی تبدیلیوں کے بعد اب وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور برتنے لگی تھی۔ لڑکی خوبصورت اور پُرکشش ہو تو لڑکے اس کے اردگرد شہد کی مکھیوں کی طرح نظر آنے لگتے ہیں پھر اداکارہ ہونے کا مطلب ہوتا ہے لڑکی مکمل کھیل چکی ہے۔ اب اس کے شب و روز اسی انداز میں گزرنے لگے جیسا کہ عام طور پر امریکی لڑکیوں کے گزرتے ہیں۔ اگرچہ وہ بالغ نہیں ہوئی تھی۔ قانونی طور پر نابالغ ہی تھی مگر اس عمر میں بالغوں جیسے کاموں کے لیے کسی قانون کی پروا کون کرتا ہے؟

لہٰذا لاس اینجلس میں پہلی اور آخری مرتبہ اس کا واسطہ قانون سے بھی پڑ گیا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ سارا قصور اس لڑکے کا تھا جس کے ساتھ وہ کار میں موجود تھا۔ ان کی گاڑی مل ہولینڈ ڈرائیو پر کھڑی تھی۔ بہ ظاہر باہر سے دیکھنے سے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ کار میں موجود سوار اس بلند ٹیلے سے شہر کی رونقوں کا نظارہ کرنے میں مصروف ہیں، مگر ایسا نہیں تھا۔ کار کے اندر کی اپنی رونقیں تھیں۔ جینیفر اس لڑکے کے ساتھ تنہا تھی۔ وہ خطرے کی حدود پھلانگ کر مستی و سرشار کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے کہ کار کے شیشے پر دستک ہوئی۔

وہ بُری طرح سٹپٹا گئے۔ باہر ایک پولیس اہلکار کھڑا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دستک دی اور تیز آواز میں بولا "کھڑکی کا شیشہ نیچے کرو۔"

جینیفر کے حلق سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ فطری عمل کو غیر قانونی انداز میں کرنے پر وہ گرفتار ہونے والی ہے۔ اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ اخبار میں تصویریں اور خبریں شائع ہوں گی۔ اس کا کیریئر برباد ہو کر رہ جائے گا۔

اس نے گھبراہٹ میں شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا "ج۔۔۔ جی! مسٹر آفیسر!"

وہ آفیسر نہیں تھا۔ معمولی پولیس اہلکار تھا۔ آفیسر کہنے پر تھوڑا نرم پڑ گیا مگر پھر بھی تحکمانہ انداز میں پوچھا "تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے کو چپ لگ گئی۔ جینیفر بُری طرح گھبرائی اور سٹپٹا کر بولی "ہم۔۔۔ موج مستی کر رہے ہیں۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

پولیس اہلکار کو لڑکی کی گھبراہٹ سے شہ مل گئی۔ اس نے ڈپٹ کر کہا "تم دونوں باہر آجاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔"

جینیفر نے اسی گھبراہٹ کے ساتھ کہا "نن۔۔۔ نہیں جناب! مجھے معلوم نہیں تھا۔ دراصل جناب میں ایک اداکارہ ہوں اور۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اداکاروں کو ممنوعہ

اور غیر ممنوعہ علاقوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہوتا۔ آپ پلیز اس وقت ہمیں معاف کر دیں، مجھے صبح سویرے شوٹنگ پر جانا ہے۔ اس وقت گرفتار ہونا میرے لیے نقصان دہ ہو گا۔"

جینیفر کی گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ اسے "غیر قانونی موج مستی" کے جرم میں گرفتار ہونے اور حوالات میں بند ہو جانے کا پورا یقین تھا۔ حالانکہ وہ غلطی پر تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنی کار غلط جگہ پارک کر رکھی تھی۔ باہر نکل کر جینیفر نے موبائل پر اپنی مما کو اطلاع کر دی۔ اسے یہ بھی گھبراہٹ تھی کہ اس کی مما بھی آکر اسے تھوڑی سی وقت سے پہلے کی موج مستی کے جرم میں خوب ڈانٹے گی۔

لیکن بیٹ ہیوٹ نے اسے بالکل نہیں ڈانٹا، وہ اس چھوٹے سے واقعے پر بہت خوش تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جیل جانے کے خوف نے اس کی نابالغ بیٹی کو بہت بھرپور سبق دے دیا ہے۔ ایسا بھرپور سبق جو وہ کسی سزا یا پھر اس کی ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ سے کبھی بھی نہیں سیکھ سکتی تھی۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد جینیفر لوہیوٹ کو ایک نئی سیریز میں کام مل گیا۔ اس مرتبہ اسے ٹی وی کے تجربہ کار اداکار چاڈ ایولیٹ کے ساتھ کام کرنا تھا۔ سیریز کا نام "میک کینا" تھا۔ جس میں چاڈ جیک میک کینا کا مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ میک کینا ایک رنڈوا تھا۔ جب اس کے بیٹے کی بھی موت ہو گئی تو اپنے باپ کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے اس کا دوسرا بیٹا "اداکار ایرک مکوز) بھی اس کے پاس آجاتا ہے۔ وہ نوجوانی میں اپنے باپ سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بہن کیسیڈی (اداکارہ وینیزا شا) بھی ہوتی ہے۔ یہ گھرانا مرکزی اوریگن کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ اس ڈرامے کی عکس بندی اسی قصبے کے حسین مقامات پر کی گئی تھی۔ گویا اس سیریز میں بھی آؤٹ ڈور مناظر کی خاصی تعداد تھی۔ اچھی کہانی کے ساتھ ساتھ اس سیریز میں اچھا خاصا ایکشن بھی تھا اور مرکزی خیال قدرے منفرد اور مختلف تھا۔ اس سیریز کے پائیلٹ کو اے بی سی والوں نے منظور کر لیا تھا مگر بگڑی ہوئی نوجوان باغی بیٹی کے طور پر اے بی سی والے وینیزا شا کی اداکاری سے مطمئن نہ تھے۔ وہ اس کردار میں کسی اور لڑکی کو لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا آڈیشن کا اہتمام کیا گیا اور وہ "کوئی اور لڑکی" جینیفر لوہیوٹ ثابت ہوئی۔

1999ء کے موسم برسات میں اس سیریز کا پائیلٹ آن ایئر ہو گیا تو وینیزا شا کی کارکردگی بہت عمدہ نظر آرہی تھی لیکن اگلے سیریز کی دوسری قسط میں لوگوں کو وینیزا شا کی جگہ کیسیڈی کے کردار میں جینیفر لوہیوٹ نظر آئی۔ جینیفر کو یہ کردار "بائرڈ آف پیراڈائز" میں اپنے لین ہائرا کے کردار سے زیادہ مختلف محسوس نہیں ہوا۔

اے بی سی والے اس سیریز کے آن ایئر جانے کے بعد جلد ہی سمجھ گئے کہ وہ ایک بار پھر ہار گئے ہیں۔ لہٰذا جلد ہی یہ سیریز بھی بند کر دی گئی۔ جینیفر لوہیوٹ اسی جگہ کھڑی تھی جہاں اس نے نیا سفر شروع کیا تھا۔ وہ جس سیریز میں بھی کام کر رہی تھی اس کے نصیب میں ناکامی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ وہ سخت مایوسی کی حالت میں سوچنے لگی تھی کہ وہ منحوس ہے۔ ایسی منحوس لڑکی، جو اچھی اچھی سیریز میں کام کرنے والے بڑے اور نام ور اداکاروں کی کامیابیوں اور نصیب کو بھی گہن لگا دیتی ہے۔

ناکامی کے صدمے اور مایوسی کی لہر سے نکلنا آسان نہ تھا۔ وہ لاس اینجلس میں واقع اپنے گھر واپس آئی تو شدید دکھ اور کرب کی کیفیت میں مبتلا تھی، ایسے میں اس کی مہربان اور شفیق ماں نے اسے دلاسے دیتے ہوئے کہا "مایوسی آگے بڑھنے کے تمام راستے بند کر دیتی ہے۔ ناکام ہونا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے، ناکامی تو شوبزنس کا حصہ ہے، آج اگر ناکامی تمہارے مقدر میں ہے تو کل یقیناً تم کامیاب ہو جاؤ گی۔"

ماں کے سمجھانے پر اس نے مایوسی کو اپنے سے دور کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ بہت سی نئی سیریز ناکامی سے ہی دوچار ہوتی ہیں۔ اس میں اداکاروں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ بلکہ سخت مقابلہ کامیابی اور ناکامی کی بساط بچھاتا ہے۔ یہ تو ایک جوا ہے اور یہ جوا کھیلتے رہنا اس کی مجبوری ہے۔

اس کی ماں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ "ابھی تو وہ محض سولہ برس کی ہے۔ اس کے پاس کامیاب ہونے کے لیے ابھی بہت سا وقت ہے۔ لوگ اس عمر میں ناکامیوں سے شروعات کرتے ہیں۔" ماں کی ان باتوں نے اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

٭

جس وقت "میک کینا" منسوخ ہوئی اس وقت اس کے ساتھ شروع ہونے والی اکثر سیریز اپنا ایک سیزن مکمل کر چکی تھیں۔ ان میں ایک سیریز "پارٹی آف فائیو" بھی تھی اگرچہ یہ کامیاب سیریز تھی مگر اس کا مستقبل بھی غیر یقینی تھا۔

www.Paksociety.com

جب میک کینا جیسی سیریز بند ہو سکتی تھی تو پارٹی آف فائیو کا بند ہونا بھی لازمی تھا۔ اس کا تیکنیکی عملہ اور اداکار سانس روکے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ آیا آئندہ سیزن میں بھی اس سیریز کو جاری رکھا جائے گا یا نہیں۔

پارٹی آف فائیو ابتدا ہی سے اچھی جا رہی تھی۔ ہر مہینے اس کے شائقین میں اضافہ ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ آن آئیر جانے سے قبل ہی اس سیریز کے کافی چرچے ہو چکے تھے۔ اس سیریز کا مرکزی خیال "سینڈی گروشو" کے تخلیقی دماغ سے برآمد ہوا تھا۔ سینڈی گروشو نئے منظر عام پر آنے والے فوکس نیٹ ورک کی پروگرامنگ ایگزیکٹو تھی۔ اس کا آئیڈیا کچھ یوں تھا کہ ایسے بچوں کے متعلق سیریز تیار کی جائے جو خود مختارانہ زندگی گزارتے ہوں۔ ان کی زندگیوں میں ان کے والدین کا عمل دخل نہ ہو یعنی بیورلی ہلز 90210 اور میل روز پلیس کے درمیان کی کوئی سیریز، جس میں ضرورت کے مطابق سیکس تڑکا بھی لگایا جا سکے۔

اس سیریز کو لکھنے کے لیے ایمی ادرلپ مین اور کرسٹوفر کیسر کا انتخاب کیا گیا مگر وہ دونوں ہی اس خیال سے خوش نہیں تھے۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ والدین یا سرپرستوں کی غیر موجودگی نوعمر بچیوں پر کس بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے اس تناظر میں اپنے انداز سے تین بھائیوں اور دو بہنوں کا بغیر والدین کے خاندان تخلیق کیا۔ ان کے والدین کا انتقال ایک حادثے میں ہو گیا تھا۔ اس شو کی کہانی والدین کی موت کے چھ ماہ بعد سے شروع ہوتی ہے۔

فوکس نیٹ ورکس کے ایگزیکیٹو کے سامنے حتمی اسکرپٹ پیش کرتے وقت دونوں مصنفین یعنی کیسر اور لپ مین قطعی پرامید نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسکرپٹ مسترد ہو جائے گا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فوکس نیٹ ورک کو ڈراموں اور سیریز وغیرہ کا اب تک کوئی خاص تجربہ نہیں تھا لیکن جلد ہی انہیں یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہیں پائیلٹ تیار کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ صرف مصنفین ہی نہیں، فوکس کے ڈیویلپمنٹ وائس پریذیڈنٹ باب گرین بیلٹ بھی اس شو کے حوالے سے خدشات کا شکار تھے۔ ان کی گھبراہٹ کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سیریز کا خیال بہت معرکہ آرا نہیں تھا۔ پھر اس میں بیورلی ہلز 90210 جیسے سیکس کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ فوکس والوں کا خیال تھا کہ اس سیریز کو پرمزاح اور ہلکا پھلکا ہونا چاہیے مگر مصنفین کرس اور ایمی کا اصرار تھا کہ اس میں ڈراما بھی ہونا چاہیے اور بالآخر انہیں اس بات کی اجازت مل ہی گئی۔

آڈیشن شروع ہوئے تو پہلے ہی دن اسکاٹ وولف کو فائنل کر لیا گیا۔ وہ اسی قدر گرم جوش اداکار تھا کہ اسے فوری طور پر بیلی کا کردار سونپ دیا گیا۔ میتھیو فوکس نے آڈیشن کے لیے اپنی وڈیو روانہ کی تھی۔ یہ اس کی حماقت تھی۔ اس وجہ سے یہ سیریز تقریباً اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے جو وڈیو بھیجی تھی تو اس میں کوئی خرابی تھی، کم روشنی میں بنائی گئی تھی۔ وہ وڈیو میں زردی مائل سبز رنگت کا دکھائی دے رہا تھا۔ کیسر اور لپ مین نے اسے ذاتی طور پر حاضر ہونے کا کہا۔ اسے دیکھتے ہی دونوں مصنفین نے بے ساختہ کہہ دیا کہ "چارلی' کے کردار کو میتھیو فوکس سے بہتر انداز میں کوئی نہیں کر سکے گا۔"

میتھیو فوکس کی طرح لیسی چیبرٹ نے بھی آڈیشن میں بہ ذات خود حاضر ہونے کے بجائے اپنی وڈیو بھیج دی تھی۔ وہ اسٹیج کی معروف اداکارہ تھی۔ قبل ازیں وہ ٹیلی وژن پر بھی کام کر چکی تھی۔ سیریز کے خالقین کو لیسی چیبرٹ میں وہ ذہانت نظر آگئی جو کلاڈیا کے کردار کی ضرورت تھی۔ یوں کلاڈیا کے کردار میں لیسی چیبرٹ کو فائنل کر لیا گیا۔ سب سے مشکل انتخاب جولیا کے کردار کے لیے ثابت ہوا۔ سیکڑوں لڑکیوں نے اس کردار کے حصول کے لیے متعدد بار آڈیشن دیے مگر فوکس نے سب کو مسترد کر دیا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ پائیلٹ پروگرام کی ریکارڈنگ میں محض دو دن باقی تھے اور جولیا کے کردار کے لیے کسی اداکارہ کا انتخاب نہیں ہو سکا تھا۔

تب معروف اداکارہ نیوی کیمبل آڈیشن روم میں داخل ہوئی۔ اس نے بھرپور اعتماد کے ساتھ صرف دو منٹ تک اسکرپٹ پڑھا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے کاسٹنگ ڈائریکٹر کو بلایا گیا اور نیوی کیمبل کو جولیا کے کردار میں فائنل کر لیا گیا۔ لگتا تھا کہ قدرت اس کردار کے لیے نیوی کیمبل کو خاص طور پر وہاں لائی تھی۔ وہ صرف ایک ہفتہ قبل ہی لاس اینجلس آئی تھی۔ اس کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ وہ کینیڈا میں رقص کی تربیت حاصل کر رہی تھی مگر ایک حادثے میں زخمی ہونے کے باعث اسے یہ تربیت چھوڑنا پڑی۔ اداکارہ کے طور پر وہ کینیڈا میں خاصی مقبول تھی۔ کینیڈا میں بننے والی ایک سیریز "کیٹ واک" کے باعث اسے بہت شہرت مل چکی تھی۔ وہ خاصی پُرکشش اور جاذب نظر جسم کی مالک تھی۔ کیٹ واک میں اس نے فیاضی سے اپنے جسم کی نمائش کی تھی۔ سیکس سمبل کا لیبل اس کے نام کے ساتھ چسپاں ہو گیا تھا اور پھر وہ امریکا آگئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہ قول نیوی کیمبل، کینیڈا میں کوئی بھی اداکارہ خاص طور سیکس سمبل اداکارائیں شہرت و مقبولیت کی ایک خاص سطح تک پہنچ جانے کے بعد تھم کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی اداکارئیں مزید نام، شہرت اور پیسے کے حصول میں امریکا کا رُخ کرتی ہیں۔ امریکا آتے ہی نیوی کو ایک بڑا اور بھرپور مقبولیت دینے والا کردار مل گیا تھا۔

فروری 1994ء میں شو کی عکس بندی کے لیے سان فرانسسکو کا انتخاب کیا گیا لیکن بعد میں عکس بندی وینکوور، برٹش کولمبیا میں کی گئی۔ جو سان فرانسسکو کے مقابلے میں خاصا سستا تھا۔ فوکس نیٹ ورکس نے مئی 1994ء کے لیے جب نئے شیڈول کا اعلان کیا تو اس میں پارٹی آف فائیو بھی شامل تھا۔ اس کی تیرہ اقساط بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ پائیلٹ پروگرام اگرچہ کینیڈا میں تیار ہوا تھا مگر بقیہ تمام اقساط کی عکس بندی ہالی ووڈ کے سونی لاٹ میں کی گئی تھیں۔ تمام اداکار پیر سے جمعہ تک صبح آٹھ بجے میک اپ روم میں پہنچ جاتے اور رات آٹھ بجے کام سے فراغت کے بعد ہی انہیں چھٹی ملتی تھی، ہالی ووڈ میں اسی انداز میں مسلسل کام کیا جاتا ہے۔ اداکار صبح سے شام تک ایک ہی سیٹ پر کام کے لیے ہمہ وقت موجود رہنے کے پابند ہیں۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ سیلنگر خاندان کے افراد کی عمریں ایک سے چوبیس برسوں کے درمیان تھیں انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ ہر ہفتے سیریز کا کوئی اداکار پوری کاسٹ کی دعوت کیا کرے گا۔ لہٰذا ہر ہفتے تمام اداکار کسی ایک اداکار کے گھر پر جمع ہوتے تھے۔ یوں تمام اداکار جلد ہی ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اسکرین پر تمام اداکار جذبات نگاری میں عروج پر دکھائی دیتے تو آف اسکرین وہ بات بات پر قہقہے لگا رہے ہوتے تھے۔

پارٹی آف کی خوش قسمتی تھی کہ ناقدین نے اسے ابتدا سے ہی سراہنا اور اس کی تعریف کرنا شروع کر دیا تھا۔ نیویارک پوسٹ میں معروف ناقد جان یوڈ ہوریڈز نے لکھا "موسم برسات کے سیزن کے لیے فوکس نے "پارٹی آف فائیو" جیسا سب سے بہترین پائیلٹ پیش کیا ہے۔ اس کی ذہانت اور عمدگی سے لکھی گئی ہے۔ جذباتی مناظر اور واقعات سے بھرپور ہے اور تمام اداکاروں کی کارکردگی بھی انتہائی لاجواب ہے۔"

اس قدر عمدہ تعریف کے باوجود جب یہ سیریز آن ائیر گئی تو ابتدائی چند ہفتوں میں درجہ بندی میں یہ مشکل دسویں نمبر پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکی۔ اس کا دن اور وقت قطعی ناموزوں تھا۔ یہ سیریز، پیر کے روز رات نو بجے دکھائی جاتی تھی پھر پبلسٹی اس قدر ناقص تھی کہ لوگوں کو اس سیریز کے بارے میں پتا ہی نہ چل سکا۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ اکثر ٹیلی وژن ادارے ان حالات میں سیریز کو بند کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ مگر فوکس والوں کا کام کرنے کا انداز ہی مختلف تھا۔ وہ اس سیریز کو مزید وقت دینے پر آمادہ تھے۔ ان کے گزشتہ شوز "میلروز پیلس اور بیورلی ہلز 90210!" کو بھی ذرا دیر سے ناظرین کی توجہ ملی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد "پارٹی آف فائیو" کا دن تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یوں یہ سیریز بدھ کی شب بیورلی ہلز 90210 کے بعد دکھائی جانے لگی۔ اس تبدیلی سے پارٹی آف فائیو دسویں نمبر سے نویں نمبر پر آگیا۔ یہ کوئی خاص کامیابی نہیں تھی۔ سب کے دل بجھ کر رہ گئے۔ اداکاروں اور تیکنیک کاروں کو اپنے مستقبل کی طرف سے فکروں نے گھیر لیا۔ سب ہی تشویش میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں فوکس والوں نے تین اقساط کی مزید عکس بندی کرنے کے بعد اگلے سیزن کے لیے بھی اسکرپٹ لکھنے کی اجازت دے دی تھی لیکن یہ کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ہر شخص سیریز کے مستقبل کی طرف سے مایوس اور فکرمند نظر آرہا تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ شاید آئندہ ہفتے اس سیریز کو لپیٹ دیا جائے، مگر ایسا نہ ہوا۔

نومبر میں سب کی جان میں جان آنا شروع ہوئی، سیریز نے جان پکڑ لی تھی۔ اس کی مقبولیت میں یکلخت اضافہ ہو گیا تھا۔ جنوری 1995ء میں اسے بدھ کے روز مستقل جگہ مل گئی اور ناظرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ درجہ بندی میں بھی بہتری آئی۔ اس شو کے ناظرین میں زیادہ تر اٹھارہ سے چونتیس سال کے لوگ شامل تھے۔ تشہیری اداروں کے لیے یہ پسندیدہ ایج گروپ تھا لیکن اب بھی یہ کوئی کامیابی نہیں تھی۔ ابھی وہ وقت دور تھا جب یہ سیریز پوری دنیا میں آگ لگانے والی تھی۔ نقادوں نے بھی اس کے بعد بدترین مستقبل کی پیش گوئیاں کرنا شروع کر دی تھیں۔ تاہم ناظرین نے اس شو کو مکمل طور پر بند ہونے سے بچا لیا۔

ٹی وی گائیڈ نے "ہمارے ٹی وی شوز کو بچائیں" کے عنوان سے سالانہ رائے شماری کرائی تو "پارٹی آف فائیو" نے اٹھائیس ہزار ووٹ حاصل کر لیے۔ Defama Woo The Qay and Lesblans Alliance Against نامی تنظیم نے اپنے ممبران کو ایسے پوسٹ کارڈز روانہ کیے

ٹن میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ پارٹی آف فائیو کے خلاف ووٹ نہ دیں اور انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ کارڈز فوکس نیٹ ورک کو روانہ کر دیں۔ یہی نہیں' انٹرنیٹ کے ذریعے بھی ناظرین نے اس شو کی بے حد تعریف کی۔ لہٰذا فوکس والوں نے ان کی کوششوں کے بدلے میں اس سیریز کو اگلے سیزن میں بھی جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ یہ سیریز درجہ بندی میں ٹاپ پوزیشن حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی مگر پھر بھی' اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ اس سیریز کو ابھی مزید حمایت کی ضرورت تھی' جلد ہی یہ حمایت بھی مل گئی' ٹی وی گائیڈ نے ایک اسٹوری شائع کی جو "پارٹی آف فائیو" کے متعلق تھی' اس کا عنوان تھا "بہترین شو' جسے آپ دیکھ نہیں رہے۔" اس کے علاوہ پیپل ٹائم اور یو ایس اے ٹوڈے نے بھی اس سیریز کو امریکی ٹیلی ویژن کی بہترین سیریزوں میں سے ایک قرار دیا پھر گولڈن گلوب ایوارڈز میں بھی اس سیریز نے بہترین ڈراما سیریز کا گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کیا تو لوگ چونک کر اس سیریز کی طرف متوجہ ہوگئے۔

دوسرے سیزن میں اس سیریز میں بعض اہم تبدیلیاں کر دی گئیں اور ایک اہم نئے کردار کا اضافہ بھی کیا گیا۔ اس کردار کے لیے فوکس نیٹ ورکس کو ایسی پُرکشش' جوان اور سیکسی لڑکی کی ضرورت تھی جو جولیا کی ہم عمر ہو لیکن شخصیت کا تاثر جولیا سے مختلف ہو۔ اسے ممکنہ طور پر سیریز میں بیلی کی پُرجوش محبوبہ کا کردار ادا کرنا تھا۔ مصنفین نے اس لڑکی کے کردار کا نام بھی سوچ لیا تھا۔ سارہ ریوز۔ اب انہیں ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو سارہ ریوز کا یہ اہم کردار ادا کر سکتی۔ ان دنوں جینیفر لو ہیوٹ کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ٹیلی وژن دیکھ سکتی۔ لہٰذا اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ٹی وی پر "پارٹی آف فائیو" نامی سیریز بھی پیش کی جا رہی ہے۔ جب اسے اس سیریز کے بارے میں علم ہوا تو اس وقت بھی وہ اس پر توجہ نہیں دے سکی۔ اب وہ پابندی سے اسکول جاتی تھی۔ دنیا میں اسکول واحد جگہ تھی۔ جہاں جانا اسے سخت ناپسند تھا۔ اسے اسکول کے نام سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ اس کی ماں ضد کرتی تو وہ کہتی "مما! اسکول میں مجھے عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خود کو تم سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے تمہیں عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر تم غیر معمولی نہ ہوتیں۔ اس قدر معروف اور مقبول نہ ہوتیں تو وہ تمہیں عام سی لڑکی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔"

جینیفر نے جھنجلا کر کہا "مما! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں' اسکول کی لڑکیاں اور لڑکے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اسکول کی عمارت میں مجھ پر حملہ کرنے اور مارنے پیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر میں راہداری میں گزرتی ہوں تو مجھ پر کوک یا پانی پھینک دیا جاتا ہے۔"

بیٹ ہیوٹ کے لیے یہ بات تشویش انگیز تھی مگر وہ خود بھی مجبور تھیں۔ لو کے ساتھ یہ جارحانہ رویّہ کسی ایک طالب علم کا نہیں تھا۔ سب ہی اس کے ساتھ بُرا سلوک روا رکھتے تھے۔ جینیفر لو ہیوٹ کو اچھی طرح احساس ہونے لگا کہ اسکول کی لڑکیوں اور لڑکوں کے اس رویّے کا اصل سبب کیا ہے۔ اصل میں وہ ایک ایسی زندگی گزار رہی تھی جو اسکول کے ان طلبا و طالبات کو میسر نہیں تھی۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق وہ اپنی تشنگی اور ناکامی کا اظہار لو پر حملہ کرکے اور اسے ہراساں کر کے کیا کرتے تھے۔ جینیفر اسکول کی زندگی کے علاوہ شوبز اور آڈیشن کی دنیا میں مصروف رہتی تھی۔ اس سے نفرت کرنے والی لڑکیوں کو یہ زندگی میسر نہیں تھی۔ جینیفر نے اسکول کے بچوں کے رویوں سے اپنا ذہن ہٹانے کی کوشش شروع کر دی پھر جلدی سے اسے ریکارڈنگ کا ایک کنٹریکٹ مل گیا۔

اصل میں جینیفر بنیادی طور پر بہت اچھی گلوکارہ تھی۔ اس نے اپنی آواز میں چند ٹیپ ریکارڈ کرائے تھے جو اس کے ایجنٹ نے تمام ریکارڈنگ کمپنیوں کی طرف روانہ کر دیے تھے۔ اس دوران جینیفر کی پوری توجہ اداکاری کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ سیریز کر رہی تھی اور فلموں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں مگن تھی۔ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس کے ریکارڈ شدہ آزمائشی نمونوں کے ساتھ کیا ہوا؟ اور پھر ایک دن جب اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا تو اس کے ایجنٹ کا فون آگیا۔

"مادام! میں نے آپ کی ساری ٹیپ مختلف کمپنیوں کو بھیج دی تھیں' اب ایک بڑے ادارے کی طرف سے گانے ریکارڈ کرانے کی آفر ہوئی ہے۔"

"مگر جان! تم تو جانتے ہو کہ مجھے گائے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا' میری ساری توجہ صرف اور صرف اداکاری کی طرف ہے' کیا ایسے میں گانا میرے لیے ٹھیک رہے گا۔"

دوسری طرف سے جان نے کہا "مگر لو! یہ آفر کسی معمولی ادارے کی طرف سے نہیں ہے' مجھے یاد ہے 92ء میں تمہاری ریکارڈنگ نے جاپان میں دھوم مچا دی تھی' یہ البم بھی اسی ادارے کے مدِ نظر ہے۔"

"لیکن! میں تو اس البم کو بھلا چکی ہوں' ویسے بھی اس وقت بہت چھوٹی بچی دکھائی دی تھی۔"

"ٹھیک ہے' اپنا اچھا بُرا تم بہتر سمجھتی ہو' لیکن! یہ تمہارے لیے بہت اچھا موقع ہے' یہ آفر امریکا کی سب سے بڑی ریکارڈنگ کمپنی اٹلانٹک کی طرف سے ہے۔"

جینیفر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی' اتنے بڑے ادارے کی طرف سے آفر۔ ٹھکرا دینا بہت بڑی حماقت تھی' اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی' ویسے بھی اس کے گزشتہ کئی آڈیشن بے نتیجہ رہے تھے۔ اگر اداکاری میں کیریئر مایوسی پھیلا رہا تھا تو ایسے میں موسیقی اور گانے سے بھی انکار کر دینا سراسر بے وقوفی تھی۔

اس کی ریکارڈنگ کی ریہرسل کا کام شروع ہو گیا۔ میوزک تیار ہونے لگا۔ وہ ایک بار پھر مصروف ہو گئی اور جب ایک شام اپنی ماں کے ساتھ تھکی ہاری گھر پہنچی تو فیکس پر موجود ایک پیغام میں اس کے لیے ہدایت تھی کہ وہ فلاں تاریخ کو چند مکالموں کے ایڈیشن کے لیے وقت مقررہ پر پہنچ جائے۔ اسکرپٹ کا موضوع (POS) تھا' اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے فیکس مشین سے کاغذات علیحدہ کیے اور مسہری پر دراز ہو کر اسکرپٹ کے مکالمے اور کردار کی تفصیل پڑھنے لگی۔

یہ پارٹی آف فائیو میں سارہ ریوز کے کردار کی تفصیل تھی۔ جینیفر نے وہ منظر پڑھا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے دل نے اشارہ دے دیا تھا کہ قدرت نے یہ کردار صرف اور صرف اسی کے لیے لکھوایا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کردار پر سو فیصد فٹ بیٹھی ہے۔ اس نے چہک کر اپنی مما کو مخاطب کیا اور اُچھلتے ہوئے بولی "ارے واہ! یہ کردار تو میری طرح باتیں کرتا ہے۔ مما' میں جان گئی کہ اس کردار کو کس طرح ادا کرنا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے تم یہ کردار حاصل کرنے کی کوشش کرو گی؟" بیٹ ہیوٹ نے باورچی خانے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہر صورت میں! بلکہ یہ کردار تو صرف اور صرف میرا ہے۔ کوئی بھی لڑکی مجھ سے اچھے انداز میں یہ کردار نہیں کر سکتی۔"

دو دن بعد آڈیشن تھا۔ یہ وقت جینیفر کے لیے اس قدر مختصر ثابت ہوا کہ وہ اپنے لباس پر بھی توجہ نہ دے سکی۔ وہ محض جینز اور ایک ٹی شرٹ پہن کر آڈیشن دینے پہنچ گئی۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کہیں اس نے لباس کی طرف سے بے پروائی برت کر غلطی تو نہیں کی ہے۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
اپریل 2012ء کے شمارے

جنون • مشرق کی فضاؤں بلندیوں اور پستیوں کی سنسنی خیز داستان کاشف زبیر کی تحریر
مغرب کے نرالے انداز • مغربی تہذیب اور ماحول کی عکاسی محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں
گرداب • منزل کی جانب مسلسل قلندری کی سلسلے وار کہانی
للکار • طاہر جاوید مغل کے جاسوسی کی ایک اور جھلک
سرورق کی کہانیاں
دیوانگی • محبت کی الجھنوں میں گرفتار ... احمد اقبال کا شگفتہ انداز بیان
کہانی در کہانی • سب کچھ ... پانے والوں کا قصہ سرورق کی دلچسپ کہانی

وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر دل بیٹھنے لگا کہ وہاں پہلے سے سو کے قریب بے حد بنی سنوری خوب میک اپ کی ہوئی، پچیس چھبیس سالہ لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تقریباً سب ہی سرو قد، اور بے حد خوبصورت تھیں۔ ایک نظر دیکھنے میں پُرکشش ماڈل لگ رہی تھیں۔ ان کے مختصر اسکرٹ اور کھلے گریبان والی بنیان کے باعث جینفر ان کے درمیان بہت حد تک پھیکی، سادہ اور کسی حد تک چغد لگ رہی تھی...... مگر جلد ہی جینفر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کردار کے لیے کاسٹ ہو جائے گی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ کیسر اور لپ مین ان سب لڑکیوں میں سے کوئی ایسی لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں جو فطری طور پر سارہ ریوز کے کردار کے قریب تر ہو۔ انہیں اس کردار کے لیے کسی شوخ و شنگ اور سیکسی لڑکی کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ وہ کردار سے مماثل ایک بھرپور لڑکی کی تلاش میں تھے جو محض چہرے اور جسم کی نمائش کے بجائے اداکاری بھی جانتی ہو۔

جینفر کو یہ بات معلوم تھی کہ سارہ وہی ہے اور جب اس نے آڈیشن کے وقت اسکرپٹ پڑھا تو پروڈیوسروں کو اس بات کا یقین ہو گیا۔ اگرچہ جینفر اس شو، سیریز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، مگر آڈیشن کے دوران سیریز کے متعلق معلوم ہوتے ہی وہ اس کردار کے لیے جذباتی ہو گئی تھی۔ اسے اس کردار کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کردار اس کے لیے محض ایک کردار نہیں تھا بلکہ بہت کچھ تھا۔ اس کا آڈیشن ہوا تو سب ہی اس کی کارکردگی سے متاثر نظر آئے۔ واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ جینفر لو کو اس کردار کے مطابق نہیں بلکہ سارہ ریوز کے اس کردار کو جینفر لو کی شخصیت کے مطابق ہونا چاہیے۔

وہ گھر واپس آگئی اور اپنے البم میں مصروف ہو گئی مگر کان مسلسل فون کی گھنٹی کی طرف لگے رہے تھے اور پھر چند دنوں بعد اسے فون پر خوش خبری مل گئی، وہ بے اختیار ناچنے اور چیخنے لگی اسے سارہ کے کردار میں کاسٹ کر لیا گیا تھا۔ اس وقت تک جینفر اس کردار کے ملنے کی آس دل سے نکال چکی تھی۔ دل کو بہلا چکی تھی کہ یہ کردار اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے، مگر جب اسے بلایا گیا تو وہ خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو گئی اور دیوانہ وار ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنے لگی اور بولی "اوہ گاڈ! میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس کردار کے لیے منتخب کر لیا جائے گا۔"

دوسری طرف شو کا ایگزیکٹو پروڈیوسر سرکین فولپسکی تھا۔ اس نے کہا "میں نے تمام لڑکیوں کا اسکرین ٹیسٹ اور ریکارڈ شدہ آڈیشن دیکھا ہے، تم ان سب میں سب سے زیادہ باصلاحیت ہو۔ تمہارے انداز سے پتا چلتا ہے کہ اداکاری تم میں رچی بسی ہے۔"

جینفر کے لیے اتنے بڑے پروڈیوسر کے یہ الفاظ بہت اہم تھے، وہ اپنی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اب وہ پارٹی آف فائیو کی مستقل رکن بننے جا رہی تھی لیکن ایک مشکل یہ تھی کہ وہ اس سے پہلے ہی البم کے چکر میں پھنس چکی تھی۔ اس البم کے لیے اس نے خاص طور پر پہلی مرتبہ ایک نغمہ بھی لکھا تھا۔ یہ البم تیاری کے مراحل میں تھا۔ اسے 1995ء کے آخر میں ریلیز ہونا تھا مگر جینفر لو ہیوٹ کی بدقسمتی یہ تھی کہ البم کے نام لیٹس گو بینگ (Let's go bang) تجویز کیا گیا تھا۔ جینفر کو یہ نام قطعی پسند نہیں آیا۔ اس نے ریکارڈنگ کمپنی سے اس بارے میں بات بھی کی مگر اس کی بات نہ مانی گئی۔ اس بات سے وہ خاصی دلگرفتہ ہو گئی۔ اگرچہ البم کا ٹائٹل گیت یہی تھا۔ اس نے یہ گیت خود لکھا تھا۔ اس لیے اسے پسند بھی بہت تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ گیت مشہور تو بہت کیا جائے مگر البم کا نام اس گیت پر نہ رکھا جائے۔ وہ اپنی ہر بات اپنی ماں سے کرتی تھی۔ جب البم کا نام فائنل ہو گیا اور اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی ماں سے بولی "مما! یہ گیت مجھے پسند ہے، میں نے اس پر بہت محنت کی ہے لیکن مجھے لگتا ہے البم کا نام اس گیت پر رکھنا حماقت ہو گی!"

"ممکن ہے لو! یہ محض تمہارا خیال ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے، یہی بات البم کی کامیابی کا سبب بن جائے اور ویسے بھی کمپنی والے مارکیٹ کو زیادہ سمجھتے ہیں۔ تم محض پرفارمر ہو، وہ لوگ اس کو بزنس کی طرح ڈیل کرتے ہیں۔"

"مگر اس گیت کو ٹائٹل بنانے پر میرا امیج خراب ہو جائے گا۔ آپ تو سمجھتی ہیں کہ بینگ دراصل ایک رقص ہے مگر لوگ یہی سمجھیں گے کہ شاید میں کوئی سولہ سال کی جنس زدہ لڑکی ہوں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ تمہیں زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔"

بعد میں وقت نے ثابت کر دیا کہ اس کی ماں اور ریکارڈنگ کمپنی کا خیال غلط تھا۔ اس گیت کو واقعی اس انداز میں لیا گیا، اسے نوخیز مگر جنس کی ماری بھوکی لڑکی سمجھا گیا، اور کسی نے البم کے اس گیت کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ تیسرے درجے کے سیکسی گیتوں کی طرح اس گیت کو بھی چند ہی دنوں میں نظرانداز کر دیا گیا۔ یہ بات اسے فکرمند کرنے کے لیے کافی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ تو اس نے میوزک پر خاص

طور سے توجہ دی تھی اور نہ میوزک میں اپنا کیریئر بنانے کا سوچا تھا مگر وہ موسیقی کے حوالے سے بہت جذباتی تھی۔ بطور پرفارمنس اس نے سب سے پہلے نغمہ ہی گایا تھا اور موسیقی کے شعبے میں اس کے لیے خاص جگہ موجود تھی۔ گلوکاری اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا گلوکاری اس کے اندر کی آواز ہے۔ گلوکاری کے علاوہ موسیقی سے بھی اسے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ ریڈیو کھول دیتی اور جب کام نہ ہوتا تو سارا سارا دن سی ڈی پلیئر پر موسیقی سنتے اور رقص کرتے گزار دیتی۔

اس کی مصروفیت اور کام کے دباؤ میں یکلخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو پارٹی آف فائیو میں وہ سارا ریوز کے کردار میں اداکاری کر رہی تھی، دوسری طرف اس کے البم کی ریکارڈنگ بھی مسلسل جاری تھی۔ دو مختلف کشتیوں میں سواری کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے مگر وہ دونوں کشتیوں کی مسافر تھی، ایک پاؤں اِدھر اور ایک پاؤں اُدھر رکھے دونوں کام بہ یک وقت کر رہی تھی۔ دونوں طرف بھرپور توجہ دے رہی تھی، دونوں بہترین کام تھے۔ دونوں ہی اس کے لیے عمدہ مواقع کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ کسی ایک موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اب تو اسے شہرت بھی ملنا شروع ہو گئی تھی۔ پارٹی آف فائیو، اس کی شمولیت سے پہلے درجہ بندی میں اچھا نہیں رہا تھا، مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ معیاری سیریز تھی۔ اس میں بڑے اور معروف اداکار کام کر رہے تھے۔ اب جینفر بھی ان بڑے اداکاروں کی ٹیم کا حصہ بن گئی تھی۔ ابھی وہ پارٹی آف فائیو میں کاسٹ ہی ہوئی تھی کہ اخباری رپورٹر اس کی کھوج میں لگ گئے تھے۔ اخبارات میں اس کے حوالے سے مضامین لکھے جانے لگے۔ لوگ چونک چونک کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ سارہ ریوز کے کردار میں کس لڑکی کو فائنل کیا گیا ہے۔ ان کا پورا نام کیا ہے؟"

پارٹی آف فائیو کے ابتدائی دنوں میں پریس سے اس کا سامنا ذرا مختلف ڈھنگ سے ہوا۔ اس کا دماغ ساتویں آسمان پر اُڑنے لگا۔ اس سے پہلے پریس والے اس کے پیچھے اس انداز میں نہیں لگے تھے۔ اس کی دھڑا دھڑ تصاویر بن رہی تھیں۔ رپورٹر اس کے اردگرد گھوم رہے تھے، بات کرنے اور کچھ پوچھنے کا مواقع تلاش کر رہے تھے۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی گمنامی کا دور اب ختم ہونے والا ہے۔ وہ اپنی توقع سے بھی بہت پہلے اور بہت جلد اسٹار بننے جا رہی تھی۔ جن دنوں پارٹی آف فائیو

تاریخ کا باوا آدم

لفظ "تاریخ" یا انگریزی کا لفظ "ہسٹری" یونانی لفظ "ہسٹوریا" جس کے معنی "چھان بین" کے ہیں، لفظ "ہسٹور" سے آیا ہے، جس کے معنی "تعلیم یافتہ انسان" کے ہیں۔ ہیروڈوٹس نے "ہسٹوریا" کو یونانی زبان میں پہلی بار "تاریخ" کے معنی میں استعمال کیا یعنی کہ "چھان بین" کے معنی میں۔ ہیروڈوٹس نے "تاریخ" نامی دنیا کی پہلی کتاب تاریخ کے بارے میں لکھی اور تاریخ کا باوا آدم کہلایا۔

مرسلہ: شاہ دار کا کا خیل، پشاور

میں اس کی انٹری ہوئی۔ انہی دنوں میں اس کا البم "لیٹس بینگ" ریلیز ہو گیا۔

میوزک کمپنی والوں نے اس ضمن میں ایک بھیانک غلطی کر ڈالی، وہ ہر ہفتے ٹی وی پر نظر آ رہی تھی مگر البم کی تشہیر میں اس بات کو اہمیت نہیں دی گئی۔ ٹی وی پر اس کی موجودگی کا فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ یہ بہ ذات خود جینفر لو ہیوٹ کے لیے بڑے شرم کی بات تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ میوزک کمپنی والے اتنی بڑی حماقت بھی کر بیٹھیں گے۔ جب اس کا البم ریلیز ہوا تو لوگوں کا کہنا تھا اس کی آواز معمولی نہیں ہے۔ ایک اخبار نے تو یہ تک لکھ دیا کہ جینفر لو ہیوٹ، معروف گلوکارہ ماریا کیریا اور ٹونی بریکسٹن کے درمیان کی کوئی چیز ہے۔

اگرچہ یہ البم پاپ موسیقی پر مشتمل تھا مگر جنہوں نے بھی سنا، خاص طور پر وہ لوگ جو اس کا پہلا البم سن چکے تھے، ان کا خیال تھا کہ البم میں نظر آنے والی نوجوان، پُرکشش لڑکی، جسمانی خدوخال کے ساتھ ساتھ عمدہ گلے کی بھی مالک ہے۔ ہر نئے گیت کے ساتھ اس کی آواز پہلے سے بہتر اور زیادہ نکھری ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اسے اپنے گلے پر مکمل عبور حاصل تھا۔ گیت کی ریکارڈنگ سے قبل وہ موسیقی کے ایک استاد سے سبق لیتی رہی تھی۔ اس کے لیے آسانی یہ تھی کہ وہ سُر اور تال سے بہت اچھی طرح آگاہ تھی۔ بس ایک کمی تھی۔ اسے ابھی سانس پر خاصا کام کرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی فطری صلاحیت کو خوبی سے استعمال کرنے کا گر سیکھنا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آسانی یہ بھی تھی کہ وہ ساٹھ کی دہائی کی موسیقی سنتے ہوئے جوان ہوئی تھی۔ پُرانی موسیقی نے ہی سُر اور تال سے اس کی دوستی کرائی تھی۔ جینفر اس حوالے سے خود کہتی ہے "میں جینس جوپلن، اریتھا فرینکلن اور روبی شرلیس کو سنتے ہوئے جوان ہوئی ہوں، لہٰذا

بھی پُرانی موسیقی مجھے حد درجے پسند ہے۔ جدید موسیقی بھی اچھی لگتی ہے لیکن جدید موسیقی میں بھی سُر اور تال کا خیال تو بہر طور رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

یہ بات جینیفر نے امریکا آن لائن پر چیٹنگ کے دوران بتائی تھی۔ اس نے گلوکاری کی ابتداء لوک گیت سے کی تھی۔ جیشی کلائن سے اس کی رشتہ داری بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ موسیقی اس کے خون میں شامل ہے مگر لوک موسیقی اس کے کیریئر کا حصہ نہ بن سکی۔ اس سے طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے۔ "تو! تم نے لوک موسیقی کو اپنا کیریئر کیوں نہیں بنایا؟"

"مجھے اس سے رغبت نہیں۔"

"مگر تم تو لوک موسیقی سنتے ہوئے بڑی ہوئی ہو؟ تمہارے خاندان میں جیشی کلائن جیسا نامور لوک گلوکار گزرا ہے!"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی پکے راگ گانا شروع کر دوں۔ میں نے لوک موسیقی بہت سنی ہے۔ اتنی زیادہ کہ اب مجھے اس سے رغبت نہیں رہی۔ میں جدید موسیقی کو اپنانا چاہتی ہوں مگر اداکاری میری اوّلین ترجیح ہے۔"

ایک اخبار نے ماریا کیری سے اس کی آواز کا موازنہ کر ڈالا۔ بعض لوگ اس کی حمایت میں اور بعض اس کی مخالفت میں بولنے لگے۔ وہ پارٹی آف فائیو کے سیٹ پر آئی تو لوگ اسی حوالے سے باتیں کر رہے ہوتے۔

"ہاں آواز تو بہت اچھی ہے۔ خود بھی خاصی پُرکشش ہے مگر ہر پُرکشش لڑکی بڑی گلوکارہ نہیں ہوتی۔" ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ انجان بن کر بیٹھ گئی۔ پارٹی آف فائیو کے دو فنکار آپس میں باتیں کر رہے تھے، اپنے بارے میں گفتگو سننے کا یہ تجربہ نہایت عجیب تھا، دوسری آواز اُبھری "لو کی آواز ماریا کیری کی طرح نکھری ہوئی نہیں ہے۔ اس کی آواز میں ویسا لوچ نہیں ہے لیکن ایک بات ہے۔ اس کی آواز کانوں کے رستے دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔"

جینیفر خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ آج وہ اتنی اہم ضرور ہو گئی تھی کہ لوگ اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جو لوگ جینیفر کو محض اداکارہ سمجھتے تھے ان کے لیے اس کا البم انہیں حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ البم کا کور بننے کا مرحلہ آیا تو عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔

ریکارڈنگ کمپنی کے منیجر اس سے کہہ رہا تھا "کور ایسا ہو گا کہ نوجوانوں کے دل میں آگ لگ جائے گی۔ اس میں تمہاری ایسی شخصیت کی عکاسی کی جائے گی کہ لوگ گیت سنیں گے، کور دیکھیں گے اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھریں گے۔"

جینیفر کو اس کی باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔ اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ گیتوں کے البم کا نوجوانوں کی ٹھنڈی آہوں سے کیا تعلق؟"

"تعلق ہے لو! تعلق ہے... میں اس البم کے لیے تمہارا ایک گرما گرم فوٹو سیشن کرانا چاہتا ہوں۔ تم خود اپنے آپ کو دیکھو گی تو پہچان نہیں پاؤ گی۔"

دوسرے دن فوٹو سیشن تھا۔ وہ پارٹی فائیو کے سیٹ سے فارغ ہو کر اپنی ماں کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچ گئی۔ میک اپ آرٹسٹ نے اس کا ہیر اسٹائل تبدیل کر دیا۔ بڑی بڑی براؤن آنکھوں اور ہونٹوں کو نمایاں کر دیا۔ لباس کے نام پر نقرئی رنگ کا مختصر بریزر دیکھ کر وہ اُچھل ہی تو گئی۔ اس نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ فوٹو گرافر نے کہا "مادام! گھبرائیں مت۔ یہ پتلون بھی اس کے ساتھ ہے۔"

جینیفر کی جان میں جان آئی۔ وہ ڈریسنگ روم میں لباس تبدیل کر کے آئی تو گویا اسٹوڈیو میں بجلی سی کوند گئی۔ مختصر بریزر اور انتہائی چست پتلون میں وہ واقعی ایسی ہو گئی تھی کہ جو بھی دیکھتا، غش کھا کر گر جاتا، یا اس کی زندگی بھر کی نیندیں اُڑ جاتیں۔

گرما گرم تصویر سے سجا البم جینیفر کے سامنے آیا تو وہ اپنے آپ کو پہچان ہی نہ سکی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ سولہ برس کی عمر میں خود کو بچی سمجھنے والی جینیفر اس قدر سیکس سے بھرپور ہے۔ اس البم نے اس کی شخصیت کا دوسرا ہی پہلو اُبھارا تھا۔ اس کا ہیر اسٹائل کسی کو بھی دل لبھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھیں بہت زیادہ نمایاں تھیں۔ نقرئی بریزر اور چست پتلون میں اس کا شباب عجیب ہی داستان بیان کر رہا تھا۔ وہ اس میں نہ تو "گنڈ زان کارپورائیڈ" کی راہن دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی "پارٹی آف فائیو" کی سارہ ریوز نظر آتی تھی۔ سی ڈی کے کور کے اندر اس کی اور بھی تصاویر تھیں، جن میں سے ایک تو بے حد گلیمرس تھی۔ جس میں اس کا بے حد گورا چہرہ نمایاں تھا۔ بال ایک جانب ڈھلکتے ہوئے تھے اور وہ ذرا مختلف مگر بے حد ہیجان برپا کر دینے والے لباس میں فرش پر لیٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔

جاری ہے

سفید سرزمین

طارق عزیز خان

وہ سرزمینِ ابیض مادرِ پرخطر بھی کہلاتی ہے۔ وہاں قدم قدم پر موت منہ کھولے کھڑی رہتی ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اس خطۂ ارض کو دریافت ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ عالمی قوانین کے مطابق اس خطے پر کوئی بھی ملک اپنا حق نہیں جتاسکتا۔ اگر کسی ملک نے اس کے کسی حصّے پر قبضہ کیا تو اقوام متحدہ اسے پیچھے دھکیلے گی مگر تجربات کے لیے ہر ملک کے سائنس داں وہاں جاسکتے ہیں۔ اگر کسی سائنس داں نے تجرباتی طور پر بھی وہاں ایٹمی دھماکا کردیا تو آدھی دنیا سیلاب کی لپیٹ میں آجائے گی۔

باذوق قارئین کے لیے تحفۂ خاص، ایک معلوماتی تحریر

ہمیں فوراً جوائننگ کا حکم ملا تھا جسے ہم نے حکم نامۂ سزا کے نام سے موسوم کر دیا۔ اس لیے کہ وہاں جانا اور پھر سال بھر رہنا آسان نہیں مگر کیا کرتے، حکم مانے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ نوکری بچانے کے لیے وہاں پہنچنا ضروری تھا جبکہ وہ علاقہ کرۂ ارض کے انتہائی جنوبی حصے میں انسانی وجود سے خالی دنیا کا سرد ترین، خشک اور ہوادار ترین علاقہ ہے۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا علاقہ نہیں، پورا ایک براعظم ہے۔ یہ زمین کے جنوبی قطب کو گھیرے ہوئے لگ بھگ پانچ ہزار کلومیٹر کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے جس کا کل زمینی رقبہ 14 ملین مربع کلومیٹر (5.4 ملین مربع میل) ہے۔ یہ ایشیا، افریقا، شمالی امریکا اور جنوبی امریکا سے چھوٹا جبکہ یورپ اور آسٹریلیا سے بڑا ہے۔ انٹارکٹیکا کے قریب ترین علاقوں میں جنوبی امریکا (چلی) 1000 کلومیٹر، آسٹریلیا 2500 کلومیٹر اور جنوبی افریقہ 4000 کلومیٹر شمال میں واقع ہیں۔ جغرافیائی قطب جنوبی،

انٹارکٹیکا کے عین مرکز میں واقع ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دنیا کے نقشے پر کھینچے گئے طول البلد (Longitude) کا ہر خط آ کر ملتا ہے۔ اس مقام سے آپ جس طرف کو بھی چل پڑیں، آپ شمال کی طرف ہی جا رہے ہوں گے۔ خلا سے دیکھیں تو انٹارکٹیکا ''کوما'' (Comma) کے نشان کی طرح دکھائی دیتا ہے، جس کا 70 فیصد حصہ گول جبکہ باقی جنوبی امریکا کی طرف نکلی ہوئی دُم (Tail) یا جزیرہ نما حصے پر مشتمل ہے۔ گول حصہ مشرقی جبکہ دُم والا مغربی علاقہ کہلاتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے مشرقی حصہ کوئین موڈ (Queen Maud) اور ولکس (Wilkes) جبکہ مشرقی حصہ پالمر لینڈ (Palmer Land)، ایلس ورتھ لینڈ (Ellsworth Land) اور میری بائرڈ لینڈ (Marie Byrd Land) پر مشتمل ہے۔ براعظم کی سرزمین کا 97.6 فیصد حصہ برف کی موٹی چادر تلے دبا ہوا ہے جبکہ صرف 2.4 فیصد حصہ خشک چٹانی علاقے پر مشتمل ہے۔ انٹارکٹیکا پر جمی برف کی مقدار 29 ملین کیوبک کلومیٹر (18 ملین کیوبک میل) ہے۔ اس برف کا 70 فیصد حصہ جمے ہوئے تازے پانی پر مشتمل ہے۔ جبکہ یہ دنیا میں پائی جانے والی کل برف کا 90 فیصد ہے۔ اگر یہ تمام برف پگھل جائے تو دنیا کے سمندروں کی سطح 200 فٹ بلند ہو جائے گی۔ جس کے نتیجے میں دنیا کے بیشتر ساحلی علاقے ڈوب جائیں گے۔ برف کی اس چادر کی اوسط موٹائی 7090 فٹ (2160 میٹر) جبکہ زیادہ سے زیادہ ریکارڈ شدہ موٹائی 15400 فٹ ہے۔ برف کی اس تہ کی وجہ سے براعظم انٹارکٹیکا کی اوسط بلندی باقی تمام براعظموں سے زیادہ ہے۔ انٹارکٹیکا کے چاروں اطراف واقع سمندر کو بحرِ جنوبی کہتے ہیں جو خط استواء سے 55 ڈگری جنوب کے خط پر بحرالکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند سے ملا ہوا ہے۔ موسم سرما کے عروج پر انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین کے علاوہ اس کے اطراف موجود بحرِ جنوبی کا 21 ملین مربع کلومیٹر حصہ جم جاتا ہے جبکہ گرمیوں میں بھی سمندر کا 5 ملین مربع کلومیٹر علاقہ مستقل جما رہتا ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ انٹارکٹیکا کی برف دنیا کے موسموں پر اثرانداز ہوتی ہے۔ موسم گرما میں اس کی برف کے 11 فیصد حصے کے پگھلنے سے کرۂ ارض کے سمندروں کی سطح بڑھ جاتی ہے جبکہ سردیوں میں یہاں کی تیز سرد ہوائیں شمال کی طرف چلتے ہوئے جنوبی نصف کرہ کے وسیع حصے کو گھیر لیتی ہیں۔ برف کے نیچے ڈھکی انٹارکٹیکا کی زمین کی سطح سمندر سے اوسط بلندی 6500 فٹ ہے جبکہ براعظم کا سب سے اونچا مقام ونٹ ونسن ماسف (Vinson Massif) ہے۔ اس پہاڑ کی بلندی 16066 فٹ (4892 میٹر) ہے اور یہ انٹارکٹیکا کے مغربی دُم والے حصے پر ایلس ورتھ کے علاقے میں واقع ہے۔ انٹارکٹیکا پر جمی ہوئی برف کی عظیم پرتوں (Shelf) میں روسے آئس شیلف، فلچ نر آئس شیلف اور روز آئس شیلف نمایاں ہیں۔ جن میں سے روز آئس شیلف 6 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے پر محیط ہے۔

یہی وجہ تھی کہ ہمارے ساتھی وہاں کے سخت موسم سے گھبرائے ہوئے تھے کیونکہ کرۂ ارض کے انتہائی جنوب میں واقع ہونے کی وجہ سے انٹارکٹیکا کا موسم اور وقت دونوں ہی دنیا سے نرالے ہیں۔ اکتوبر کے دوران یہاں سردیوں کا شکنجہ ڈھیلا پڑنے پر چھ ماہ طویل دن کی شروعات ہوتی ہے۔ تاہم آنے والے مہینوں میں پوری آب و تاب سے چمکنے کے باوجود سورج اس سرزمین پر اپنا دبدبہ قائم نہیں رکھ پاتا اور درجۂ حرارت منفی 30 ڈگری کے آس پاس ہی رہتا ہے۔ مارچ کی شروعات میں سورج کی روشنی ماند پڑنے لگتی ہے، یہاں تک کہ اپریل ختم ہوتے ہوتے انٹارکٹیکا کے پورے علاقے پر سرد رات کا سناٹا چھا جاتا ہے۔ ستمبر تک چھائے گہرے گھپ اندھیرے میں انٹارکٹیکا کا درجۂ حرارت منفی 90 ڈگری سینٹی گریڈ کی حد کو چھو لیتا ہے۔ یہاں بارش کی سالانہ اوسط صرف 4 انچ (10 سینٹی میٹر) ہے۔ جس کا زیادہ تر حصہ انٹارکٹیکا کے جزیرہ نما دُم والے حصے پر برستا ہے۔

اتنے سخت موسم میں بھی یہاں قدرت کی فیاضی وافر نظر آتی ہے۔ یہاں پر پرندوں کی 40 نایاب اقسام پائی جاتی ہیں جن میں پینگوئن کی 7 البٹروس (Albatross) کی 4 اور پیٹرل (Petrel) نسل کی 20 اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر جنگلی حیات ساحلی علاقوں اور ملحقہ جزائر پر ہی پائی جاتی ہے۔

انٹارکٹیکا کی خاص پہچان یہاں کے سب سے قدیم باسی شہنشاہ پینگوئن (Emperor Penguins) ہیں۔ پینگوئن ایک ایسا پرندہ ہے جو اُڑ نہیں سکتا۔ ایک اندازے کے مطابق انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقوں میں شہنشاہ پینگوئن کی 40 کالونیاں واقع ہیں جن میں لگ بھگ 2 لاکھ پینگوئن پائے جاتے ہیں۔ ایک نوجوان پینگوئن کا زیادہ سے قد 45 انچ اور وزن 30 سے 40 کلوگرام ہو سکتا ہے۔ جبکہ یہاں پائے جانے والے اب تک کے سب سے بڑے پینگوئن کا قد 3.9 فٹ اور وزن 45 کلوگرام ریکارڈ کیا گیا تھا۔ شہنشاہ پینگوئن منفی 60 ڈگری سینٹی گریڈ کی کڑکڑاتی ٹھنڈ اور 160 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی برفانی ہواؤں کو برداشت کر سکتا ہے۔ مادہ سال میں صرف ایک انڈا دیتی ہے جس کی دیکھ بھال کی ذمے داری نر پر ہوتی ہے۔ مادہ کی ذمے داریاں انڈے سے چوزہ نکلنے پر شروع ہوتی ہیں اور وہ دو ماہ تک چوزے کو پالتی ہے۔

پینگوئن شکار کی تلاش میں سمندر میں 1850 فٹ گہرا غوطہ لگا سکتا ہے۔ یہ 60 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے شکار کا پیچھا کرتا ہے اور بغیر سانس لیے قریب 20 منٹ تک پانی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ انٹارکٹیکا کے برفیلے ساحلوں پر وہ نظارہ بڑا ہی حیرت انگیز ہوتا ہے جب مادہ پینگوئن سمندر سے باہر آ کر ساحل پر منڈلاتے ہزاروں چوزوں میں سے خاص اپنے چوزے کو پہچان کر صرف اسے ہی کھانا کھلاتی ہے۔

انٹارکٹیکا اور اس سے ملحقہ جزائر پر پائے جانے والے دیگر جانوروں میں لیوپرڈ سیلز نمایاں ہے۔ ایک عام سیلز کا قد 5 فٹ اور وزن 300 کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔

ایسے دشوار ترین خطے میں وقت گزارنا آسان نہیں، لیکن ہماری ڈیوٹی تھی اس لیے ہم سب نے کمر کس لی اور جنوری کے وسط میں سفر کا آغاز کر دیا۔ ہمارا سفر اور قیام تحقیقی تھا اس لیے ہمیں اتنا کچھ بتایا گیا تھا پھر بھی میں نے انٹارکٹیکا کی تاریخ کے بارے میں کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ یوں بھی سمندری سفر میں مطالعے کا اپنا مزہ ہے۔ کتابوں سے پتا چلا کہ لگ بھگ 300 ملین سال پہلے انٹارکٹیکا، کرۂ ارض پر واقع ایک عظیم براعظم پانگیا (Pangaea) کا حصہ تھا۔ 280 ملین سال پہلے پانگیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، 80 ملین سال پہلے آسٹریلیا اور انٹارکٹیکا جدا ہوئے اور قریب 20 ملین سال پہلے انٹارکٹیکا کو اس کی موجودہ جغرافیائی حیثیت حاصل ہوئی۔ انٹارکٹیکا، یونانی لفظ Antarktikos سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے آرک ٹک یعنی جمے ہوئے سمندر کے مدمقابل۔ یہ دنیا کے نو دریافت شدہ خطوں میں سے ایک ہے جس کے بارے میں یورپین کو اوّلین معلومات انگریز کیپٹن جیمز کک کی مہم کی بدولت حاصل ہوئیں، جو دائرۂ قطب جنوبی کو پار کرنے والا پہلا مہذب انسان تھا۔ کک نے جنوری 1774ء میں بحرِ جنوبی میں خط استواء سے 71.10 ڈگری جنوب اور 170 ڈگری مغرب کے خط تک رسائی حاصل کی۔ کک کو انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین دکھائی نہیں دی، تاہم اس نے قرب و جوار میں تیرتے برف کے بڑے بڑے تودوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ جنوب میں برف سے ڈھکے وسیع خطے کی موجودگی کے امکانات تھے۔ 1819ء کی شروعات میں برطانوی بحریہ نے جزیرہ نما انٹارکٹیکا کے 200 کلومیٹر شمال میں واقع جنوبی شیٹ لینڈ (South Shetland) کے غیر آباد جزائر کو دریافت کیا۔ ملحقہ قرب و جوار کے علاقے پر چھائی گہری دھند کی وجہ سے انگریز ملاحوں کو انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین دکھائی نہیں دی۔ جزائر شیٹ لینڈ تک رسائی کے بعد برطانوی حکومت،

اُن کیلئے، جنہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر یقین ہے
جو کہانیاں، افسانے، ناول لکھنا چاہتے ہیں!

صف اوّ ے بالی رو ورا یو
کی نگرانی میں فکشن رائٹنگ سیکھنے۔

فکشن فورم پاکستان اور
میڈیا اویرنیس اینڈ گائیڈنس سوسائٹی (رجسٹرڈ)
کے زیرِ اہتمام

7 اور 8 اپریل 2012ء
(صبح 11 بجے سے شام 5 بجے)

★ پلاٹ اہمیت ★ اچھا ابتدائیہ ★ موثر ڈائیلاگ
★ جیتے جاگتے کردار ★ نظرثانی کرنے کے طریقے
★ سسپنس پیدا کرنا ★ کہانی شائع کرانے کیلئے رہنمائی

کورس فیس: -/1900 روپے
(جس میں شامل ہیں کورس میٹریل، اسٹیشنری، لنچ، چائے، اسنیکس، ٹریننگ اور سرٹیفکیٹ)

مقام
APEX ACADEMY، میزانائن فلور، پلاٹ C-19، 27 ویں کمرشل اسٹریٹ، عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے سی ویو کلفٹن کی جانب جاتے ہوئے پی ایس او پٹرول پمپ کے پیچھے توحید کمرشل ایریا، ڈی ایچ اے، کراچی۔

ای میل: fictionforumpk@gmail.com
سیل فون: 0315-3830001, 0301-8210848

انٹارکٹیکا کی دریافت اور اس کی برٹش ایمپائر میں شمولیت کے حوالے سے پُراعتماد تھی۔ تاہم ان کی یہ خوش فہمی منصوبہ بندی کے مراحل میں ہی تھی کہ روس ان پر بازی لے گیا۔

روس کے شہنشاہ زار الیگزینڈر اوّل (Czar Alexander I) (1801-1825) نے اپنی بحریہ کے ایک نوجوان افسر فےبیان گوٹ لیب ون بلنگ شاسن Fabian (Gottlieh van Bellingshausen) کی قیادت میں ایک بیڑے کو جنوبی سمندروں کی چھان بین کے لیے روانہ کیا۔ بلنگ شاسن نے 5 ستمبر 1819ء کے دن دو بادبانی بحری جہازوں 900 ٹن وزنی فلیگ شپ ووستوک (Vostak) اور 530 ٹن وزنی مرنے (Mirny) کے ساتھ بحیرہ بالٹک کی بندرگاہ سینٹ پیٹرس برگ سے مہم کا آغاز کیا۔ مرنے کا کپتان میخائل پیٹرووچ لیزاریف (Mikhail Petrovich Lazarev) تھا جبکہ مہم میں شریک افراد کی کل تعداد 200 کے قریب تھی۔ روسی بحری جہاز، بحیرہ بالٹک میں سے ہوتے ہوئے رودبار انگلستان کو پار کرکے شمالی بحراوقیانوس کے کھلے سمندر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے قریب 4 ناٹ (7.4 کلومیٹر) فی گھنٹے کی مناسب رفتار پر سفر کرتے ہوئے اکتوبر کے آخر میں خط استواء پار کرکے جنوبی بحراوقیانوس میں رسائی حاصل کی۔ جہاں ان کا پہلا پڑاؤ برازیل کی بندرگاہ ریوڈی جنیرو تھی۔ بلنگ شاسن نے دسمبر کی شروعات میں ریو سے لنگر اٹھائے۔ اس کے بحری جہاز جنوری کے وسط میں جنوبی بحراوقیانوس میں واقع جزائر ساؤتھ جارجیا کے قریب پہنچے، جنہیں انگریز کیپٹن جیمز کک فروری 1775ء میں دریافت کرچکا تھا۔ روسیوں نے 26 جنوری 1820ء کے دن دائرہ قطب جنوبی کو پار کیا۔ صاف موسم اور موافق ہواؤں کی مدد سے وہ جنوب کی طرف گامزن رہے، یہاں تک کہ بلنگ شاسن نے 28 جنوری 1820ء کے دن خط استواء سے 69.21 ڈگری جنوب اور 14.50 ڈگری مغرب پر پہنچ کر برف کی ایک عظیم شیٹ کا نظارہ کیا۔ بلنگ شاسن نے اسے انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین کا حصہ خیال کیا۔ اس نے فلیگ شپ ووستوک کی لاگ بک میں لکھا کہ اس کے بحری جہازوں کی رسائی کے مقام سے انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین لگ بھگ 32 کلومیٹر (20 میل) دور واقع تھی۔

(آج ہم جانتے ہیں کہ روسی بحری جہازوں کی رسائی کے مقام سے انٹارکٹیکا کا قریب ترین ساحل 150 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ برطانوی مورخ Age Jones نے 1982ء میں سینٹ پیٹرس برگ میں واقع Russin States Museum of the Arctic & Antartic میں موجود ریکارڈ کے حوالے سے بلنگ شاسن کی مہم کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ جونز کی تحقیق کے مطابق روسی بیڑے پر موجود ماہرین نے اعداد و شمار کے حوالے غلطی ہوئی تھی انھوں نے جنوری میں ایک عظیم آئس شیٹ جبکہ فروری کی شروعات میں انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین کو دریافت کیا تھا)

آئس شیٹ کے نظارے کے بعد بلنگ شاسن نے خشک اور قابل رسائی زمین کی تلاش میں مغرب کی طرف سفر شروع کیا۔ اس کے بحری جہاز جنوری 1820ء کے آخری ایام میں خط استواء سے 62 ڈگری جنوب کے خط پر جزیرہ نما انٹارکٹیکا سے متصل جزائر ساؤتھ شیٹ لینڈ (Shauth Shetland Islands) کے قریب سے گزرے، برطانوی دعوے کے مطابق ان جزائر کو 1819ء کے آخر میں رائل نیوی نے دریافت کرلیا تھا۔ بلنگ شاسن نے سفر جاری رکھا یہاں تک کہ اس نے فروری 1820ء کی شروعات میں خط استواء سے 66 ڈگری جنوب اور 68 ڈگری مغرب کے خط پر جزیرہ نما انٹارکٹیکا پر مشتمل براعظم انٹارکٹیکا کی مرکزی سرزمین کو دریافت کرلیا۔ بلنگ شاسن نے جزیرہ نما کے ساحلوں کو روسی شہنشاہ کے نام پر "الیگزینڈر کوسٹ" کا نام دیا۔ اس نے دو دن کے وقفے سے جزیرہ نما کے مغربی ساحل سے متصل ایک بڑے جزیرے کو دریافت کیا۔ بلنگ شاسن نے اسے "الیگزینڈر" کا نام دیا۔ جو آج براعظم انٹارکٹیکا کی حدود میں واقع سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ انٹارکٹیکا کی دریافت کے بعد بلنگ شاسن نے اپنے بیڑے کا رُخ شمال مغرب کی طرف کردیا۔ اس کے بحری جہاز مارچ 1820ء کی شروعات میں بحرالکاہل کے کھلے سمندر میں داخل ہوئے۔ بلنگ شاسن نے اپریل سے اگست کے دوران جنوبی و وسطی بحرالکاہل میں واقع جزائر کی سیاحت کی، جن میں سے بیشتر کو انگریز کیپٹن جیمز کک 1775ء سے 1779ء کے دوران دریافت کرچکا تھا۔ روسیوں نے 1820ء کی سردیاں نیوزی لینڈ میں گزاریں۔ وہ مارچ 1821ء میں بحرِہند میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپریل کے دوران راس امید کے گرد گھوم کر بحراوقیانوس میں رسائی حاصل کی۔ وہ مغربی افریقا کی بندرگاہوں میں رُکتے ہوئے 4 اگست 1821ء کے دن مغربی روس کی بندرگاہ سینٹ پیٹرس برگ واپس پہنچ گئے۔ روس میں بلنگ شاسن کا قومی ہیرو کے طور پر استقبال کیا گیا۔ اس نے ماسکو پہنچ کر شہنشاہ الیگزینڈر اوّل سے ملاقات کی جس نے اس کی مہم کو سراہا۔

دائرہ قطب جنوبی کے پار نئی سرزمین کی دریافت کی خبریں یورپ میں پھیل گئیں۔ 1823ء میں انگریز مہم جو، جیمز ویڈل نے بلنگ شاسن کے قدموں کے نشان پر چلتے ہوئے انٹارکٹیکا سے متصل اپنے نام سے منسوب کیے گئے بحیرہ ویڈل کو دریافت کیا۔ 1839ء میں انگریز مہم جو، سر جیمز کلارک روز (Sir James Clark Ross) کی جانب سے بحیرہ روز اور روز آئس شیلف (Ross Ice Shelf) کی دریافت کے بعد برطانیہ کی اگلی منزل قطب جنوبی تھا۔

قطب جنوبی سے عام طور پر جغرافیائی قطب جنوبی (Geographical South Pole) مراد لی جاتی ہے۔ یہ کرۂ ارض کا انتہائی جنوبی مقام ہے جہاں 90 درجے جنوبی طول البلد (Longitude) کا ہر خط آکر ملتا ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جس سے زمین کا گردشی محور زمین کی جنوبی سطح سے ٹکراتا ہے۔ گردشی محور وہ فرضی لکیر ہے جس پر زمین اپنے گرد گردش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے آپ جس طرف کو بھی چل پڑیں آپ شمال ہی کی طرف جارہے ہوں گے۔ اسے صحیح قطب جنوبی بھی کہتے ہیں۔ شمالی قطب کے برعکس یہ سمندر پر نہیں بلکہ براعظم انٹارکٹیکا پر واقع ہے۔ اس پر برف کی تین ہزار میٹر دبیز تہ جمی ہوئی ہے جو 10 میٹر سالانہ کے حساب سے سرک رہی ہے۔ برف کی اس حرکت کی وجہ سے قطب جنوبی پر تعمیر کی گئی تجربہ گاہیں اور اس تک رسائی حاصل کرنے والوں کے پرچم اپنی اصل جگہ سے ہٹ جاتے ہیں اور چند سال بعد انہیں دوبارہ پہلے والے مقام پر تعمیر کرنا پڑتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زمین کی لرزش کی وجہ سے جغرافیائی قطب جنوبی اپنے اصل مقام سے چند میٹر اِدھر اُدھر سرکتا رہتا ہے۔ اس صورت حال کو چانڈلر کا ارتعاش (Chandler Wobble) کہتے ہیں۔ جغرافیائی قطب جنوبی پر 23 ستمبر کے دن چھ ماہ کے لیے سورج طلوع ہوتا ہے۔ 25 دسمبر کے دن سورج کا زوال شروع ہوتا ہے اور وہ 21 مارچ کو مکمل غروب ہوجاتا ہے جس کے بعد اگلے چھ ماہ تک وہاں رات طاری رہتی ہے۔ قطب شمالی کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ سرد مقام ہے۔ شمالی قطب سمندر پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کی حرارت ضائع نہیں ہوتی، تاہم ٹھوس زمین پر جمی برف کی تہ پر واقع ہونے کی وجہ سے قطب جنوبی کا اوسط درجہ حرارت منفی 65 ڈگری سینٹی گریڈ تک گرجاتا ہے۔ قطب نما (Compass) کی سوئی کا جنوبی سرا جغرافیائی قطب جنوبی کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اس کا رُخ مقناطیسی قطب جنوبی (Magnetic South Pole) کی طرف ہوتا ہے۔ مقناطیسی قطب جنوبی اپنی جگہ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ زمین کے اندرونی مغز (Core) میں ہونے والا انتشار ہے۔ 2005ء میں مقناطیسی قطب جنوبی کا نقطہ خط استواء سے 64.53 ڈگری جنوب اور 137.86 ڈگری مشرق کے خط پر جنوب مغربی بحرہند میں واقع تھا۔ مقناطیسی قطب جنوبی سے "ارضی مقناطیسی قطب جنوبی" کا گہرا تعلق ہے۔ زمین کا مقناطیسی میدان مثالی نہیں ہے۔ اگر ہم جنوبی مقناطیسی قطب اور شمالی مقناطیسی قطب کو ایک فرضی لکیر کے ساتھ ملائیں تو ایک خط مستقیم نہیں بنے گا، تاہم اگر اس لکیر کو زمین کے مرکز سے گزاریں تو وہ لکیر زمین کی جس جنوبی سطح سے ٹکرائے گی اسے "ارضی مقناطیسی قطب جنوبی" کہیں گے۔ قطب جنوبی کی ایک اور قسم سماوی قطب جنوبی ہے۔ دراصل زمین کی محوری گردش کے سبب ہمیں آسمان پر ستاروں کا جھرمٹ ایک ساتھ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے جو چوبیس گھنٹوں بعد اپنی پہلی جگہ پر آجاتا ہے۔ زمین جس فرضی لکیر کے گرد اپنی محوری گردش کرتی ہے وہ لکیر فرضی طور پر جغرافیائی قطب جنوبی سے آسمان میں ستاروں کے جھرمٹ میں جس جگہ ٹکراتی ہے اسے سماوی قطب جنوبی کہتے ہیں۔ قطب جنوبی کی پانچویں قسم "بعید ترین قطب جنوبی" کہلاتی ہے۔ یہ جغرافیائی قطب جنوبی سے کچھ دور 85.8 ڈگری جنوب اور 65.5 ڈگری مشرق پر انٹارکٹیکا کی حدود میں واقع ہے۔

انٹارکٹیکا اور اس کے متعلقہ سمندروں کی دریافت کے بعد برطانوی حکومت نے کرۂ ارض کے انتہائی جنوبی مقام تک سب سے پہلے رسائی کی تیاریاں شروع کردیں۔ لندن کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے قطب جنوبی دریافت کرنے کے لیے ایک سے زیادہ مہمات ترتیب دیں۔ تاہم بدقسمتی اس بار بھی ان کے آڑے آئی جب محض چند دن کے فرق سے قطب جنوبی پر یونین جیک لہرانے کا خواب اُدھورا رہ گیا۔ اس بار برطانوی امیدوں پر پانی پھیرنے کا سبب شمالی یورپ کا نیا آزاد ملک ناروے تھا۔

26 اکتوبر 1905ء کو سویڈن سے آزادی کے فوری بعد ناروے دیگر یورپین اقوام کے ساتھ دریافتوں کی دوڑ میں شامل ہوا۔ ناروے کی آزاد مملکت کے پہلے حکمران کنگ ہاکون ہفتم (Hakon VII) (1905-1957) نے رولڈ ایمنڈسن (Raald Amundsen) کی قیادت میں قطب شمالی و جنوبی کو دریافت کرنے کی مہمات کا اعلان کیا۔

ایمنڈسن وہ پہلا انسان تھا جس نے 1903ء سے 1906ء کے دوران بحر منجمد شمالی میں واقع شمال مغربی بحری

راستے (Northwest Passage) پر پہلا کامیاب بحری سفر مکمل کیا۔ ایمنڈسن نے 1908ء میں قطب شمالی تک رسائی کی مہم کا اعلان کیا، تاہم اسی دوران اسے امریکی مہم جو، رابرٹ ایڈون پیرے کی طرف سے قطب شمالی تک رسائی کی مہم شروع کرنے کی خبر ملی۔ ایمنڈسن کے پاس بہتر وسائل موجود تھے اور وہ پیرے کی نسبت قطب شمالی کے قریب بھی تھا۔ وہ چاہتا تو پیرے کے مقابلے میں قطب شمالی تک رسائی کی مہم کا اعلان کرسکتا تھا، تاہم اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے فی الحال انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ رابرٹ ایڈون پیرے کی طرف سے اپریل 1909ء میں قطب شمالی کی دریافت کی خبر ناروے پہنچی تو ایمنڈسن نے قطب جنوبی تک رسائی کی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا۔ وہ ناروے سے نکلنے کو تیار تھا کہ اسے برطانوی مہم جو، رابرٹ فیلکن اسکاٹ (Robert Falcon Scott)(1868-1912) کی جانب سے قطب جنوبی تک رسائی کی مہم شروع کرنے کی اطلاعات ملیں۔ ایمنڈسن نے اسکاٹ سے پہلے مہم شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ اسکاٹ اس کی تیاریوں کی خبر سن کر اپنی مہم ملتوی کردے گا۔

رولڈ ایمنڈسن نے "فرام" (Fram) نامی فیول پاور شپ کے ذریعے 3 جون 1910ء کے دن اوسلو کی بندرگاہ سے قطب جنوبی تک رسائی کی مہم شروع کی۔ جہاز پر عملے کے بیس افراد کے ساتھ پانچ درجن تربیت یافتہ کتے بھی سوار تھے۔ ایمنڈسن نے رودبار انگلستان کو پار کرکے شمالی بحراوقیانوس کے کھلے سمندر میں واقع میڈیرا (Medeira) کے پرتگالی جزائر میں لنگر گرائے۔ اس نے مقامی ٹیلی گراف آفس سے لندن میں رابرٹ اسکاٹ کے نام قطب جنوبی تک رسائی کی مہم شروع کرنے کا ٹیلی گرام روانہ کیا۔ اس ٹیلی گرام کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

BEG TO INFORM YOU FRAM PROCEEDING ANTARCTIC–AMUNDSEN

ایمنڈسن نے جولائی 1910ء میں جنوبی بحراوقیانوس کی برازیلی بندرگاہ ریوڈی جینرو سے تازہ رسد جمع کی۔ وہ آبنائے میگلن سے ہوتا ہوا بحرالکاہل میں داخل ہوا۔ اس نے فرام کا رُخ مغرب کی طرف رکھا اور اکتوبر میں آسٹریلیا کے شہر ملبورن پہنچ گیا۔ ایمنڈسن کو ملبورن کے برطانوی سفارت خانے کے توسط سے رابرٹ اسکاٹ کی مہم کے جاری رہنے سے متعلق خبر ملی۔ ایمنڈسن نے ایک بار پھر اسکاٹ کو ٹیلی گرام کے ذریعے اپنی مہم سے باخبر کیا اور ملبورن سے لنگر اٹھالیے۔

وہ جنوب کی طرف سفر کرتا ہوا انٹارکٹیکا کے قریب پہنچا۔ اس نے 14 جنوری 1911ء کے دن خط استواء سے 77.55 ڈگری جنوب اور 164.25 ڈگری مغرب کے خط پر خلیج ویلز (Bay af Whales) کے کنارے انٹارکٹیکا کے برفیلے ساحلوں پر اپنا بیس کیمپ "فراہم ہیم" (Framheim) قائم کیا جبکہ قریب اسی دن انگریز مہم جو، رابرٹ اسکاٹ نے بحیرہ روز میں ایمنڈسن کے کیمپ سے 650 کلومیٹر مغرب میں واقع میک مرڈو ساؤنڈ (McMuddo Saund) کے علاقے میں اپنا کیمپ لگایا۔ ایمنڈسن نے انٹارکٹیکا کی طویل سرد رات شروع ہونے سے پہلے پہلے اپنے کیمپ میں خوراک اور دیگر ضروری سامان کا وافر ذخیرہ جمع کرلیا۔ مارچ کے تیسرے عشرے کی شروعات میں انٹارکٹیکا کی سرزمین نے رات کی سیاہ چادر اوڑھ لی۔ آنے والے ہفتوں میں درجۂ حرارت منفی پچاس ڈگری سے بھی نیچے گرگیا۔ تاہم وافر سپلائی موجود ہونے کی وجہ سے ایمنڈسن اور اس کے ساتھیوں کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی اور انہوں نے جیسے تیسے کرکے موسم سرما گزار ہی لیا۔

ایمنڈسن نے اگست کے دوران مہم کی تیاریاں شروع کیں۔ خلیج ویلز کے کنارے سے قطب جنوبی 1270 کلومیٹر جنوب کی سیدھی لکیر پر واقع ہے۔ ایمنڈسن نے طے کیا کہ وہ 160 اور 170 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کرتا ہوا سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھے گا۔ 8 ستمبر 1911ء کے دن رولڈ ایمنڈسن نے اپنے تین ساتھیوں جالمر جوہنسن (Hjalmar Jahansen)، کرسٹین پریسٹرڈ (Kristian Prestrud) اور جورگن سٹبرڈ (Jorgen Stubberud) کے ساتھ تین درجن کتوں اور دو کتا گاڑیوں کی مدد سے قطب جنوبی تک رسائی کی پیدل مہم شروع کی۔ بدقسمتی سے خراب موسم کی وجہ سے اس کی پہلی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی اور اسے انٹارکٹیکا کے ساحلوں پر بیس کیمپ واپس آنا پڑا۔ ایمنڈسن نے اپنی حکمت عملی اور ٹیم دونوں تبدیل کیں۔ ایمنڈسن نے 20 اکتوبر کے دن چار نئے ساتھیوں اولیو جالینڈ (Olav Bjaaland)، ہیلمر ہنسن (Helmer Hanssen)، سیورے ہسل (Sverre Hassel) اور اوسکر وسٹنگ (Oscar Wisting) کے ساتھ مہم دوبارہ شروع کی۔ اس بار اسے چار کتا گاڑیوں اور 52 صحت مند کتوں کی مدد حاصل تھی۔ ایمنڈسن کے پیدل سفر کے ابتدائی دنوں میں سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ گو کہ درجہ حرارت منفی 15 ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس تھا، تاہم مناسب

وسائل اور صاف موسم کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ اکتوبر کے آخر میں ایمنڈسن نے 79 ڈگری جنوب تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ وہ اس دوران 500 کلومیٹر کے قریب پیدل سفر طے کرچکا تھا۔ ایمنڈسن کو اندازہ تھا کہ قطب جنوبی کی تسخیر کے لیے رابرٹ اسکاٹ کی قیادت میں برطانوی ٹیم بھی ان کے اریب قریب ہی سفر کررہی تھی۔ وہ اپنی منزل تک اولین رسائی کے موقعے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس نے جلد بازی میں قدم اُٹھانے کی بجائے مناسب رفتار سے سفر جاری رکھا۔ نومبر کے شروعاتی دنوں میں ایمنڈسن نے روز آئس شیلف کی جمی ہوئی سرزمین میں خط استواء سے 80، 81 اور 82 ڈگری جنوب کے خط پر تین سپلائی ڈپو قائم کیے۔ اس نے واپسی کے سفر میں ممکنہ خطروں سے نمٹنے کے لیے اپنے پاس موجود چند کتوں کو ہلاک کرکے ان کا گوشت سپلائی ڈپو میں محفوظ کردیا۔ نومبر کے وسط میں سرد طوفانی ہواؤں نے ایمنڈسن کے آگے بڑھنے کی رفتار کم کردی۔ آنے والے دنوں میں اسے اپنے کتوں کو زندہ رکھنے کے لیے دو درجن کتے ہلاک کرنا پڑے جبکہ اس کے چند کتے سردی سے اکڑ کر مرگئے۔ دسمبر کی شروعات میں موسم بہتر ہونے پر ایمنڈسن نے سکھ کا سانس لیا۔ خوش قسمتی سے اسے مزید کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا اور وہ دھیرے دھیرے اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ 14 دسمبر 1911ء کے دن رولڈ ایمنڈسن کی قیادت میں پانچ یورپین اور 16 کتوں پر مشتمل ٹیم نے قطب جنوبی پر پہنچ کر ناروے کا قومی پرچم لہرایا۔ انہوں نے قطب جنوبی پر چھوٹے خیمے پر مشتمل کیمپ قائم کیا۔ ایمنڈسن نے کیمپ کا نام Polheim رکھا جس کا نارویجن زبان میں مطلب "قطب پر واقع گھر" ہے۔ اس نے قطب جنوبی کے علاقے کو ناروے کے بادشاہ کے نام پر King Hakan Plateau کا نام دیا۔ ایمنڈسن نے کیمپ میں تین دن گزارے اور اپنے آلات کی مدد سے اس بات کی تصدیق کی کہ وہ عین 90 ڈگری جنوب کے خط پر موجود تھا۔ اسے توقع تھی کہ ان کے قطب جنوبی پر قیام کے دوران برطانوی مہم جو رابرٹ اسکاٹ وہاں پہنچ جائے گا، تاہم وہ وہاں 17 جنوری 1912ء کے دن پہنچا، جہاں موجود ایمنڈسن کے کیمپ کی باقیات اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ایمنڈسن نے بیس کیمپ واپسی سے پہلے قطب جنوبی پر قائم کیمپ میں ایک خط لکھ کر محفوظ کیا جس پر ان کے وہاں پہنچنے کی تاریخ اور مہم جوؤں کے نام تحریر تھے۔

ایمنڈسن نے 17 دسمبر کے دن قطب جنوبی سے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس سفر کے دوران اسے اپنے پانچ کتوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ وہ 25 جنوری 1912ء کے دن اپنے پانچ ساتھیوں اور گیارہ مددگار کتوں کے ساتھ انٹارکٹیکا کے ساحلوں پر واقع اپنے بیس کیمپ فرام ہیم تک رسائی میں کامیاب رہا۔ رولڈ ایمنڈسن نے اپنے بیس کیمپ سے قطب جنوبی اور پھر واپس بیس کیمپ تک 99 دن کی مہم کے دوران کل 2700 کلومیٹر کے قریب سفر طے کیا۔ وہ اپنے بحری جہاز کے ساتھ 7 مارچ 1912ء کے دن آسٹریلیا کے جزیرے تسمانیہ کی بندرگاہ ہوبارٹ پہنچا، جہاں اس نے ایک پریس کانفرنس میں اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ ایمنڈسن بحرہند کے راستے 1912ء کی گرمیوں میں ناروے واپس پہنچا۔ اوسلو کی بندرگاہ میں عوام کے جم غفیر نے اس کا شایانِ شان استقبال کیا۔ ناروے کی حکومت نے اس کے کارنامے کو سراہا اور اس کے لیے اعزازت کا اعلان کیا۔ سال کے آخر میں اس مہم سے متعلق ایمنڈسن کی کتاب The South Pall منظر عام پر آئی جس کی عوامی مقبولیت نے اسے شہرت کی نئی بلندیوں پر پہنچادیا۔

انٹارکٹیکا کی مکمل دریافت کے بعد 20 ویں صدی عیسوی کے دوران برطانیہ، ارجنٹائن، ناروے، فرانس، چلی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر مشتمل دنیا کے سات ممالک نے انٹارکٹیکا کی برفیلی سرزمین پر اپنا حق جتایا جسے امریکا اور روس نے مسترد کردیا۔ انٹارکٹیکا کو جنگ و جدل سے بچانے کے لیے امریکا، روس، برطانیہ، فرانس، بلجیم، ناروے، ارجنٹائن، چلی، جاپان اور جنوبی افریقہ پر مشتمل دنیا کے 10 ممالک نے یکم دسمبر 1959ء کو "معاہدۂ انٹارکٹیکا" (Antarctic Treaty) پر دستخط کیے۔ جس کے مطابق انٹارکٹیکا سمیت خط استواء سے 60 ڈگری جنوب کے علاقے میں عسکری سرگرمیوں اور معدنی کان کنی پر پابندی لگادی گئی۔ معاہدے کی رو سے انٹارکٹیکا میں سائنسی تحقیق اور براعظم کی ماحولیات کی حفاظت کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ 1996ء میں معاہدۂ انٹارکٹیکا میں شامل ملکوں کی کل تعداد 40 تک پہنچ گئی جن میں پاکستان اور بھارت بھی شامل ہیں۔ ہر سال موسم گرما کے دوران معاہدہ انٹارکٹیکا میں شامل ممالک کے چار ہزار سائنس دان اس سرزمین پر تحقیقی سرگرمیاں سرانجام دیتے ہیں۔ جبکہ موسم سرما میں وہاں موجود سائنس دانوں کی تعداد پانچ سو تک محدود ہوجاتی ہے۔ ہمیں بھی اسی ٹیم میں شامل ہونا تھا تاکہ پاکستان کا نام تابندہ رہے۔ اسی خیال سے ہماری ٹیم مسلسل سفر کرتی ہوئی انٹارکٹیکا کی طرف بڑھ رہی تھی۔

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی

نیا جنم

محمد عفان آزاد

وہ تصویر دو صدی بعد ظاہر ہوئی۔ اس نے ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ اس تصویر کے ظاہر ہوتے ہی پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی اس لیے کہ اس تصویر کا خالق ایک ایسا مصّور تھا جسے لوگ پوجنے کی حد تک چاہتے تھے اسی لیے وہ تصویر مشکوک قرار پاگئی تھی۔ لوگ مخمصے میں تھے کہ کیا واقعی یہ تصویر اسی مصّور کی ہے یا پھر یہ فنکارانہ فراڈ ہے؟

یورپ بھر میں چھڑی بحث پر مبنی ایک دلچسپ کتھا

آرٹ کی دنیا میں جس دن بیانکا فورزا کو.... متعارف کروایا گیا، اس دن وہ شاہ کار دیکھنے والے تو چند لوگ ہی تھے مگر اس کے چہرے پر جس کی بھی پہلی نظر پڑتی تھی، وہ پلکیں جھپکانا بھول جاتا تھا۔ 'بیانکا فورزا' 30 جنوری 1998ء کو دنیائے مصوری کے فلک پر نمودار ہوئی تھی۔ یہی وہ پہلا دن تھا جب وہ پورٹریٹ پانچ سو سال بعد پہلی بار عام لوگوں کی نظروں کے سامنے آیا تھا مگر وہاں کوئی شخص یہ بات نہیں جانتا تھا ماسوائے مصور کے جو صدیوں پہلے منوں مٹی تلے سوچکا تھا اور پورٹریٹ میں نظر آنے والی دوشیزہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی...... وہ تو بس ایک پینٹنگ تھی مگر وہ ایک عام پینٹنگ ہرگز نہیں تھی۔

اُس دن نیویارک کے 'کرسٹائیز آکشن' میں مصوری کے قدیم فن پاروں کی نیلامی ہونا تھی۔ وہاں گنتی کے بیس پچیس لوگ ہی موجود تھے مگر یہ دنیائے فن کے پرستار نہیں بلکہ بیوپاری تھے۔ اُن کے لیے پینٹنگ ایک شے تھی کہ جس کی خرید و فروخت دولت کے ڈھیر لگا دیتی ہے۔ وہ مشاق جوہری تھے جن کی پہلی ہی نظر ہیرے کی تابناکی کو بھانپ لیتی تھی۔ اُس دن جس نے بھی بیانکا فورزا کو دیکھا، بس دیکھتا ہی رہ گیا مگر کوئی جوہری اُس ہیرے کی اصل اہمیت کو پہچان نہ سکا۔ اُن کے لیے وہ صرف ایک چہرہ تھا۔ یہ اور بات کہ پینٹنگ دیکھنے والوں کے لیے اُس دلکش دوشیزہ کے چہرے سے نظریں ہٹانا مشکل تھا۔

کرسٹائیز آکشن بہت بڑا نیلام گھر نہیں تھا۔ اُس کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ جہاں دنیائے فن کے بیش قیمت فن پارے نیلامی کے لیے رکھے جاتے ہوں۔ وہ نیویارک کے بہت سارے درمیانے درجے کے نیلام گھروں میں سے ایک تھا۔ وہیں یہ نیلامی ہو رہی تھی۔

بیانکا فورزا کو نیلامی سے پہلے سب نے دیکھا تھا مگر کاروباری آنکھ سے۔ وہ پینٹنگ سب کو پسند آئی تھی مگر اُس کی قیمت سے وہ ناواقف تھے۔ قیمت بھی وہ جو اُس فن پارے کی تھی نا کہ وہ قیمت جو نیلام گھر انتظامیہ نے ابتدائی بولی کے لیے مقرر کی تھی۔

نیلامی میں آنے والا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کس کی تخلیق ہے مگر اتنا ضرور جانتے تھے کہ کسی ماہرانہ ہاتھوں نے اسے جنم دیا ہوگا۔ بازارِ فن میں بیانکا فورزا قدرداں کی منتظر تھی۔ اُس کے حُسن کے نیلامی کی ابتدائی قیمت مقرر کی جا چکی تھی۔ آہستہ آہستہ نیلام گھر بھر رہا تھا۔ خریدار آتے جا رہے تھے۔ بولی شروع ہونے میں بس کچھ دیر باقی تھی۔

لکڑی کے سادہ سے فریم میں جڑا وہ چھوٹا سا پورٹریٹ کس کے حُسن کا عکاس تھا، یہ بات کسی کے علم میں نہیں تھی۔ کن ہاتھوں نے نفیس چرمی پارچے پر وہ چہرہ تخلیق کیا تھا، یہ بات بھی کسی کے علم میں نہیں تھی۔ بس اس پر ایک نام لکھا ہوا تھا 'بیانکا فورزا' اور بس! یہ ایک پورٹریٹ تھا جسے نیلامی کے لیے پیش کیا جانے والا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ اور بات کسی کو بھی پتا نہیں تھی۔

کرسٹائیز آکشن میں نیلامی کے لیے پیش کیے جانے والے فن پاروں کا کیٹلاگ شائع کیا گیا تھا۔ یہاں آنے والوں کے ہاتھ میں اس کی کاپی تھی۔ نیلامی کے لیے پیش کیے جانے والے تمام فن پاروں کے مصوروں کے نام اور دیگر تفصیلات کیٹلاگ میں درج تھی مگر بیانکا فورزا کے صفحے پر صرف پورٹریٹ کی چھوٹی سی تصویر کے علاوہ کوئی اور خاص بات درج نہیں تھی۔ البتہ یہ ضرور تحریر تھا کہ پینٹنگ نہایت نفیس چرمی پارچے vellum پر تیار کی گئی ہے۔ فن پارہ رنگوں اور 'چاک اینڈ انک' سے بنا ہوا ہے۔ یہ انیسویں صدی کے ابتدائی عہد اور جرمنی سے تعلق رکھتا ہے۔ پورٹریٹ کی تیاری اور انداز میں یورپ کے عہدِ نشاۃ ثانیہ Renaissance کی جھلک نظر آتی ہے۔

نیلامی شروع ہوئی تو نیویارک سے ہی تعلق رکھنے والے ایک آرٹ ڈیلر کیٹ گینزرا نے اپنے خیال میں سب سے اونچی بولی دی۔ اُس نے پورٹریٹ کے لیے اکیس ہزار، آٹھ سو پچاس ڈالر کی بولی لگائی تھی۔ اُس وقت کچھ بیوپاریوں کا خیال تھا کہ کیٹ نے گھاٹے کا سودا کرلیا ہے۔ بولی دینے کے بعد ایک لمحے کو اُس کے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ کیا اُس کا فیصلہ درست تھا مگر ایک دو ثانیے...... اس کے بعد کچھ سوچنا فضول اور رقم ادا کرکے پورٹریٹ ساتھ لے جانا اُس کی مجبوری تھی۔

کیٹ گینزرا آرٹ ڈیلر تھا اور نیویارک میں ہی اس کی گیلری تھی۔ اُس نے پورٹریٹ گیلری میں لگا دیا تھا۔ بیانکا فورزا کا حُسن سحرانگیز تھا۔ جو بھی آتا وہ اسے غیر معمولی دلچسپی سے دیکھتا۔ ایسا نہیں کہ کسی گاہک نے اس کی قیمت نہیں لگائی تھی۔ کئی بار اُس کی قیمت لگی لیکن وہ اتنی کم تھی کہ اگر کیٹ اُسے فروخت کر دیتا تو یقیناً گھاٹے میں رہتا۔ کرسٹائیز آکشن سے کیٹ گینزرا کی گیلری میں پہنچنے تک، دس سال گزر چکے تھے۔ اس دوران وہ پورٹریٹ بدستور دیوار پر لٹکا رہا مگر اس کے باوجود وہ بدقسمتی سے کسی کی نظر میں ایسے نہ سما سکا کہ جو اس کی قدر کرتے ہوئے اونچے مول لگاتا۔ پینٹنگ کسی قدرداں کی منتظر تھی مگر اب تک ایسا کوئی قدرداں اُس گیلری میں نہیں پہنچا تھا۔ اب تو کبھی کبھی خود کیٹ کو دس سال پہلے کا وہ لمحہ یاد آتا تھا، جب اس نے آخری بولی دی تھی۔ کئی بار اُس نے سوچا کہ وہ دن اس کے لیے بُرا تھا۔ ایک ہی دن میں وہ لگ بھگ بائیس ہزار ڈالر کے قریب رقم پھنسا چکا تھا۔

کیٹ گینزرا کی گیلری میں بیانکا فورزا کا گیارھواں سال

شروع ہوا تو اُس کی قسمت نے بھی کروٹ بدلی۔ اُن دنوں کینیڈا سے تعلق رکھنے والا نوادرات جمع کرنے کا ایک شوقین پیٹر سیلور مین نیویارک آیا ہوا تھا۔ پیٹر سلور مین کی کئی آرٹ گیلریاں بھی تھیں۔ اُس نے کینٹرا گیلری کے کیٹلاگ میں بیانکا فورزا کا خاکہ پڑھا اور تصویر دیکھی۔ جس دن پیٹر نے کینٹر گیلری کا کیٹلاگ دیکھا تھا، اُس شام وہ پینٹنگ اُس کے کمرے میں تھی۔ اس نے بنا بھاؤ تاؤ کیے، فوراً منہ مانگی رقم کیٹ کو ادا کر دی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ خوش تھے۔ کیٹ اس لیے خوش کہ دس سال تک پھنسے رہنے کے بعد اس کی رقم نکل آئی تھی، وہ بھی بھاری منافع کے ساتھ اور پیٹر اس لیے بہت خوش تھا کہ اُس کے خیال میں نایاب فن پارہ ہاتھ لگا تھا۔

اگرچہ پیٹر کی اپنی بھی گیلریاں تھیں مگر وہ صرف بیش قیمت پینٹنگز خریدتا، بیچتا تھا۔ اُسے مصوری کی تاریخ سے بھی بہت اچھی مدد پر تھی۔ اگرچہ کرسٹائیز آکشن کے کیٹلاگ میں لکھا تھا کہ پینٹنگز نشاۃ ثانیہ کے عہد کے انداز میں بنی ہوئی ہے۔ اس کا تعلق انیسویں صدی کے آغاز سے بتایا گیا تھا مگر پیٹر کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اُس نے جب پہلی بار یہ پینٹنگ کینٹرا گیلری کے کیٹلاگ میں دیکھی، تب ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ نشاۃ ثانیہ کے انداز میں نہیں، بلکہ اُسی دور کی یا اُس عہد کے قریب قریب کی بنی ہوئی تھی۔ پینٹنگز پر مصور کا نام نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا اشارہ جس سے اُس کا کچھ سراغ ملتا ہو ماسوائے ایک نام کے 'بیانکا فورزا'۔ پیٹر سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی بہت ہی بڑے مصور کا شاہکار ہے۔ اُس نے از خود اسے دنیائے مصوری کے عظیم فن کار لیونارڈو ڈاونچی کا فن پارہ قرار دے دیا تھا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ تو وہی جانے مگر ایک بات طے تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح کا یہ شاہکار ہے، اُسے کوئی عظیم مصور ہی تخلیق کر سکتا ہے اور لیونارڈو ڈاونچی سے عظیم کوئی اور مصور اُس کی نظر میں پوری دنیا میں نہیں تھا۔

☆☆☆

15 اپریل 1452ء کو اٹلی کے شہر تسکینے کے ایک گاؤں ونچی میں پیدا ہونے والا لیونارڈو ڈاونچی یورپ کے دورِ نشاۃ ثانیہ کا علمبردار نہایت عظیم مصور اور آرکیٹکٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔ بطور انسان وہ کئی خوبیوں اور خداداد ذہنی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اٹلی میں بسر کیا تھا۔ اب بھی روم، فلورنس اور میلان میں اس کی مجسمہ سازی اور تعمیراتی ڈیزائن کے حوالے سے کئی دلکش ثبوت موجود ہیں مگر اُس کی غیر معمولی شہرت کی وجہ اس کی مصوری ہے۔ تقریباً پانچ سو سال قبل دنیا سے اُٹھ جانے والا اپنے وقت کا یہ عظیم یورپی فنکار آج بھی پوری دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مصوری کی دنیا میں کوئی اور ایسی قد آور شخصیت نہیں جو اس کے قد کو چھو سکے۔

ناقدین فن اور ماہرینِ مصوری کا کہنا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل فنکار تھا۔ دنیائے مصوری کی تاریخ میں اسے یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ وہ چند غیر متوازی لکیروں سے چہرے کے بھرپور تاثرات کو کینوس پر نمایاں کر دیتا تھا۔ ایسے تاثرات جنہیں پیش کرنا دوسرے اساتذہ مصوری کے لیے ناممکن نہیں تو ازحد مشکل تھا۔ لیونارڈو نے غیر متوازی چند معمولی لائنوں سے تاثرات کو وہ انداز بخشا ہے، جو اُس عظیم مصور کا خاصہ ہے۔

جس عہد میں لیونارڈو نے مصوری شروع کی، اُس عہد میں یورپ بالخصوص اطالوی سماج مکمل طور پر چرچ کے زیرِ اثر تھا۔ اس لیے اُس کی مصوری کا زیادہ تر عہد بھی مذہبی نوعیت کے فن پارے تخلیق کرنے میں صرف ہوا۔ اس لحاظ سے ناقدین کہتے ہیں کہ اُس کا فن ابتدائی دور میں مذہب کے زیرِ اثر رہا۔ لیونارڈو کی دنیا بھر میں پہچان بننے والی پینٹنگ مونالیزا ہے، جس کے چہرے کی مسکراہٹ اتنی خوبصورتی سے پینٹ کی گئی ہے کہ آج تک کوئی فن پارہ اس کی گرد بھی نہیں چھو سکا۔

گزشتہ سوا ایک سو برس سے پیرس کے میوزیم میں موجود 'مونالیزا' جہاں ایک بیش قیمت فن پارہ ہے، وہیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت کہ لیونارڈو کو چہرے کے تاثرات کینوس پر پیش کرنے میں غیر معمولی کمال حاصل تھا۔

لیونارڈو ڈاونچی کی زندگی جہاں خود کئی جہتوں میں منقسم تھی اور ہر جہت ایک کہانی تھی، اُسی طرح مونالیزا بھی آج تک ایک ایسی پُراسرار پینٹنگ ہے جس کے راز جاننے کے لیے اسکالرز نے مدتوں تحقیق کی مگر اُس کے باوجود کوئی بات حتمی نہیں۔

مونالیزا کون تھی، کیا یہ ایک حقیقت تھی یا صرف افسانوی چہرہ؟ آج بھی یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے۔ اس سوال نے کئی افسانوی کہانیوں کو بھی جنم دیا ہے۔

سولہویں صدی میں بنائی گئی مونالیزا اپنے عہد سے آج تک دنیا کی معروف ترین پینٹنگ کے مقام پر فائز ہے۔ یہ اسٹول پر بیٹھی عورت کا پورٹریٹ ہے جو اپنے عہد کے خالص اطالوی لباس میں ملبوس ہے۔ یہ نہ دوشیزہ ہے اور نہ ہی جوان عورت بلکہ وہ ان سے تھوڑا آگے کی عمر والی لگتی ہے۔ اس کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ ہی پینٹنگ کی وہ جان ہے جس کے باعث سولہویں صدی سے لے کر آج تک وہ زندہ ہے۔

مونالیزا کون تھی؟ اس بارے میں طرح طرح کی کہانیاں ہیں مگر کسی بھی قصے کو مصدقہ نہیں کہہ سکتے۔ لاکھ سر توڑ کوششوں کے باوجود حقیقت اب تک راز ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ لیزا گیرادینی جیوکونڈو کا پورٹریٹ ہے جو فلورنس کے نہایت مالدار تاجر فرانسسکو ڈیل جیوکونڈو کی بیوی تھی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ مونالیزا پینٹنگ کو آج بھی اٹلی میں 'لا جیوکونڈ' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض ناقدین کی رائے ہے کہ پینٹنگ والی عورت دراصل لیونارڈو کی خادمہ تھی۔ کچھ کا خیال ہے کہ لیونارڈو نے خود اپنا پورٹریٹ بنایا تھا۔ وہ اپنے اس سیلف پورٹریٹ میں خود کو عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

لیونارڈو نے مونالیزا پینٹنگ فلورنس میں اپنے قیام کے دوران 1503ء میں پینٹ کرنا شروع کی تھی۔ لگ بھگ چار سال تک وہ اس پینٹنگ پر کام کرتا رہا اور آخر 1506ء میں یہ مکمل ہوئی۔ تکمیل کے بعد لیونارڈو نے نہ تو یہ پینٹنگ بیچی اور نہ ہی کسی کو تحفے میں دی۔ یہ پینٹنگ 2 مئی 1519ء میں لیونارڈو کی موت تک اُس کی تحویل میں رہی۔

لیونارڈو کے بعد کی تین صدیوں کے دوران یہ پینٹنگ کئی ہاتھوں سے ہوتے ہوئے آخر نپولین بونا پارٹ کے پاس پہنچ گئی جسے اُس نے اپنی خواب گاہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ 1804ء میں یہ پینٹنگ پیرس کے لوورے میوزیم میں پہنچ گئی تھی اور تب سے اب تک وہیں ہے۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ 1913ء میں اُسے کچھ چوروں نے میوزیم سے چوری کر لیا تھا لیکن 1913ء میں ہی اسے اٹلی سے بازیاب کروا کر واپس میوزیم پہنچا دیا گیا۔ میوزیم کی یہ مشہور تصویر ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیاح پیرس کا رخ کرتے ہیں۔ لیونارڈو کی موت کو پانچ سو سال ہونے والے ہیں لیکن اُس کا فن اب بھی یورپ سمیت دنیا بھر میں ناقدین اور طالب علموں کا دلچسپ موضوع ہے۔

میلان میں قیام کے دوران لیونارڈو شاہی دربار سے منسلک تھا جہاں اُس نے شاہی خاندان کی فرمائش پر اُن کے کئی پورٹریٹ تخلیق کیے ہوں گے۔ اُن میں سے ایک پورٹریٹ پانچ سو سال تک گمنامی میں کھوئے رہنے کے بعد اکیسویں صدی میں پہلی بار منظرِ عام پر آ کر تنازعے کو جنم دینے والا تھا۔ سچ کو جھٹلانے والے بہت تھے مگر سچ کو سچ ثابت کرنے والے کا نام مارٹن کا جذبہ اور عزم بہت جواں تھا۔

☆☆☆

'بیانکا فورزا' کے مصور کے بارے میں پیٹر سلور مین کی خیال درست تھی۔ جب وہ اُسے لیونارڈو داونسی کا فن پارہ

قرار دے رہا تھا، اُس وقت وہ یہ سوچ کر بھی حیران ہو رہا تھا کہ اگر واقعی یہ پینٹنگ لیونارڈو کی تخلیق نکل آئی تو پھر کیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اُس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

پیٹر جو کچھ سوچ رہا تھا وہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ایک دن کوئی شخص گھومتا ہوا کسی آرٹ گیلری میں پہنچ گیا ہو۔ اُسے ایک پینٹنگ پسند آئی۔ قیمت ادا کی اور خرید لیا۔ نہ خریدار کو علم تھا کہ وہ کیا خرید چکا ہے اور نہ ہی دُکان دار کو علم کہ اُس نے کون سی قیمتی شے کوڑیوں کے مول بیچی ہے۔ بعد میں راز کھلا کہ کوڑیوں کے مول بکنے والی تصویر تو لیونارڈو ڈاونسی کا عظیم فن پارہ تھا جس کی دنیائے فن میں قیمت لگی ہے ایک سو ملین امریکی ڈالر......

جب سے اُس نے پینٹنگ خریدی تھی، تب سے وہ اسی طرح کے خیالوں میں مگن تھا۔ اُس کے خیال میں ایسا ہو جائے تو لمحہ بھر میں اُس کی قسمت بدل جائے گی۔ ایسا ہونا ناممکن تو نہیں مگر بہت آسان بھی نہیں تھا۔ ایسے اتفاق تو شاذ و نادر ہی ہوا کرتے ہیں۔ اُس رات بھی بیانکا فورزا کو کارنس پر رکھ کر اُسے غور سے دیکھنے والا پیٹر سلور مین ایک بار پھر کسی ایسے ہی اتفاق پر سوچ رہا تھا۔ بس ایک فرق تھا۔ وہاں گاہک اور دُکان دار، دونوں پینٹنگ کی اہمیت سے ناواقف تھے مگر یہاں خریدار کو پتا تھا کہ اُس نے کیا مال خریدا ہے۔ وہ اسے درحقیقت لیونارڈو سے منسوب کر چکا تھا مگر یہ بات ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تنہا یہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف نایاب پینٹنگ کا شوقین اور آرٹ ڈیلر تھا جو کاروباری رموز تو بہت اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ ناقد نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ فن پارہ لیونارڈو کی تخلیق ہے تو پیٹر لمحہ بھر میں اپنی سوچ سے زیادہ امیر بن سکتا تھا۔ وہ زندگی بھر کسی ایسے فن پارے کی تلاش میں رہا جو کوڑیوں کے بھاؤ ملے مگر ہو نادر و نایاب۔ اب وہ مطمئن تھا کہ

کم از کم ایک نادر پینٹنگ تو اُس کے پاس ہے۔ اُسے لگ رہا تھا کہ یہ پینٹنگ اُس کی عمر بھر کی محنت کا پھل ثابت ہو سکتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہوئی تو جیسا وہ سوچ رہا تھا، ویسا اتفاق ممکن بھی ہو سکتا ہے۔ پیٹر نے جب سے بیانکا فورزا خریدی تھی، تب سے وہ مسلسل اس اُدھیڑبُن میں تھا کہ کیا یہ فن پارہ لیونارڈو ڈاونسی کا شاہکار ہے، مگر اُس پر ایک سوالیہ نشان تھا۔ اس پینٹنگ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ عظیم مصور کی تخلیق ہے، تب جا کر ہی اس کا بھاری مول مل سکتا تھا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک نایاب پینٹنگ تھی۔ جس وقت پیٹر نے اُسے خریدا، تب اُس پینٹنگ کے بارے میں ماہرین کی آخری بار کی گئی اُس کی تصدیق کو 75 برس گزر چکے تھے، جس کے مطابق یہ ایک نایاب اور بہت عمدہ پورٹریٹ تھا۔ یہ تصدیق بھی اُس وقت کی بات ہے جب پہلی بار کرسٹائیز آکشن نے اُسے اطالوی عورت سے خریدا تھا۔ تصدیق نامہ وہ خود اپنے ساتھ لائی تھی۔ یہ بات پیٹر نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے دل میں اُس کا رشتہ لیونارڈو ڈاونسی سے جوڑ رہا تھا۔ اس بات کے کوئی شواہد موجود نہیں تھے کہ دنیا کے عظیم ترین فن پارے 'مونا لیزا' کے خالق نے اُس کے بعد کبھی کوئی اور پینٹنگ چمڑی پارچے vellum پر بنائی ہو۔ اُس پینٹنگ کی کبھی کوئی نقل نہیں ملی۔ ایسی کوئی ڈرائنگ نہیں ملی جو اس پینٹنگ کو تیار کرنے کے لیے لیونارڈو نے تمہیدی طور پر تیار کی ہو۔ اب ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بیانکا فورزا ڈاونسی کی تخلیق تھی تو پھر پچھلے پانچ سو برس کے دوران وہ دنیا کی نظروں سے کیوں اور کیسے اوجھل رہ پائی ہے؟ یہ سوالات پیٹر کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اسے اپنے سوال کا جواب چاہیے تھا کہ آیا بیانکا فورزا ڈاونسی کی تخلیق ہے یا نہیں۔ اُس کی خواہش تھی کہ جواب صرف 'ہاں' میں ملے۔ ویسے وہ 'نہ' سننے کے لیے بھی تیار تھا۔ حقیقت کو دیکھ کر وہ آنکھیں نہیں چرانا چاہتا تھا مگر پھر بھی ہاں سننے کی خواہش اُس پر غالب تھی۔

پینٹنگ کے خالق کی تلاش کے لیے پیٹر نے پورٹریٹ کی ڈیجیٹل کیمرے سے ایک تصویر کھینچی اور اسے پروفیسر مارٹن کیمپ کو ای میل پر بھیج دی۔ پروفیسر مارٹن اوکسفرڈ یونیورسٹی، کیمبرج میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے مدت ملازمت پوری کر کے سبکدوش ہوئے تھے۔ اب وہ یونیورسٹی سے اعزازی طور پر منسلک تھے۔ پروفیسر مارٹن کی ایک قابلیت یہ بھی تھی کہ انہیں دنیا بھر میں لیونارڈو ڈاونسی کے کام پر مستند ماہرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے کچھ قریب ساتھی تو انہیں 'ڈاونسی کا جنونی' بھی کہتے ہیں۔ جو لوگ پروفیسر کو جانتے ہیں، وہ اکثر دنیا بھر سے انہیں پینٹنگ کی تصاویر ای میل پر بھیجتے ہیں، فون کرتے ہیں۔ اپنے سوالوں کے جوابات پوچھتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ تر فنِ مصوری کے شوقین ہوتے ہیں۔ یہ بات پیٹر کے علم میں بھی تھی کہ وہ لیونارڈو کے کام پر اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لیے اُس نے پروفیسر مارٹن کو پورٹریٹ کی ڈیجیٹل تصویر بھیجی، ساتھ ساتھ یہ استدعا کی تھی کہ وہ یہ بات جاننے میں اس کی مدد کریں کہ آیا یہ پینٹنگ ڈاونچی کی تخلیق ہے؟ اس نے یہ بھی لکھا تھا "ڈیئر پروفیسر...... آئیں، ہم مل کر لیونارڈو کی ایک اہم گمشدہ تخلیق کی دریافت تو کریں۔"

پروفیسر مارٹن کہتے ہیں "اس ای میل کو پڑھنے اور تصویر کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میرا پہلا تاثر نفی میں تھا مگر اس کم عمر دوشیزہ کے چہرے میں کچھ ایسی بات تھی جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں پینٹنگ کی بھیجی گئی تصویر کا بغور مشاہدہ کروں۔ اُس کے چہرے میں کچھ عجیب سی جاذبیت تھی۔ اُس کے تاثرات بھرپور انداز میں چمڑی پارچے پر اُتارے گئے تھے۔ جس انداز میں پینٹنگ بنائی گئی تھی، اُس میں کچھ خاص بات تھی۔ یہ بات میں تب سمجھا جب کئی گھنٹوں تک اُس کا مختلف زاویوں سے بغور جائزہ لیا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکے۔ "بس! یہی بات تھی جس نے مجھے مجبور کیا کہ اس معاملے کو اچھی طرح جان لوں۔"

دوسری طرف پیٹر کو یقین تھا کہ اُس کے پاس جو ہے، وہ مستقبل میں بہت اہم ثابت ہونے والی ہے۔ اس نے پینٹنگ کو محفوظ رکھنے کے لیے بینک لاکر میں محفوظ کر دیا۔ پینٹنگ بڑے سائز کی نہیں تھی۔ وہ تیرہ ضرب سوا نو انچ کی مستطیل نہایت نفیس چمڑی پارچے پر بنائی گئی تھی۔ یہ سائز غیر معمولی نہیں تھا۔ اگر ہم تقابل کریں تو یہ سائز لیگل سائز کے صفحے کے برابر تھا جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پیٹر نے پینٹنگ کو ایک عام سے خاکی لفافے میں لپیٹ کر لاکر میں رکھ دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی بھی حرکت سے آرٹ چوروں کو پتا ہو کہ وہ کسی ممکنہ نادر پینٹنگ کا مالک ہے۔ اگر یہ خبر پھیل جاتی تو اُس کے حصول کے لیے آرٹ چوروں کی دنیا میں کھلبلی مچ جاتی۔

پروفیسر مارٹن نے بعد میں اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا "سرسری نگاہ ڈالنے پر تو وہ مجھے کوئی خاص پینٹنگ نہیں لگی لیکن جب کئی روز تک ماہرانہ نگاہ سے اُس کا تجزیہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس میں کچھ غیر معمولی بات ہے۔ یہ میری ماہرانہ چھٹی حس مجھے باور کروا رہی تھی۔ اُس کے بعد میرے اندر بھی اُس پینٹنگ کے حوالے سے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔"

پروفیسر مارٹن کے تجسس نے اسے پینٹنگ کے حوالے سے خود تحقیق کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہتے ہیں "پینٹنگ کی وہ تصویر جس شام پہلی بار میں نے دیکھی تھی، اُس رات دیر تک اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے غور کرتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے غیر معمولی ہونے کا یقین اور پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس پر از خود تحقیق کرنی چاہیے۔ یہ بہت آسان کام نہیں تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ تمام کام اگر ٹھیک ٹھاک ہوا اور پیٹر کے ساتھ میرا شک بھی یقین میں بدلا تو دنیا کے سامنے مونا لیزا کے بعد ڈاونچی کا ایک اہم غیر معمولی کام دنیا کے سامنے آ سکتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہوگی آرٹ کی دنیا۔ بس...... اسی لیے میں نے فیصلہ کیا اور پھر دوسرے ہی دن سے کام شروع کر دیا۔"

پروفیسر نے پیٹر سے رابطہ کیا۔ اُن دنوں وہ سوئزرلینڈ کے زیورخ میں تھا۔ پروفیسر کی طرف سے رابطہ اس کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ "میں فوراً تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر نے رسمی کلمات کے جھنجھٹ میں پڑے بنا فوراً مطلب کی بات کی۔ پیٹر، پروفیسر مارٹن کا ای میل پڑھتے ہی اچھل گیا۔

"میں زیورخ میں ہوں۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔" پیٹر نے ای میل پر ہی فوراً جواب دیا۔ "تم چاہو تو آ جاؤ۔ میں ٹکٹ بھیج دیتا ہوں۔ رہائش کا انتظام ہوٹل میں ہو جائے گا۔"

ای میل پر پیغامات کے اس تبادلے کے دو روز بعد پروفیسر زیورخ کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔

بیانکا فورزا نے اُن دونوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں۔ پیٹر خیالوں میں دولت کے بہت بڑے ڈھیر کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ رہا تھا اور پروفیسر یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ پانچ سو سال بعد وہ ایسا فن پارہ دریافت کرنے والا ہے جو اُس عظیم مصور کی تخلیق ہے جسے اکثریت صرف 'مونا لیزا' کے حوالے سے جانتی ہے۔ اُس کی تحقیق دنیائے مصوری میں ایک بڑی دریافت ہوگی۔ اُسے یقین تھا کہ چھوٹے سائز پر بنی پینٹنگ اگرچہ مونا لیزا کی متبادل تو نہیں لیکن اُس کی ہمسر ہو سکے گی۔ پروفیسر کے نزدیک مونا لیزا اور بیانکا فورزا کے تماثل کی ایک بہت بڑی وجہ تھی، چہرے کے تاثرات۔ پروفیسر مارٹن کو خوشی تھی کہ یہ دریافت اُسے دنیائے آرٹ، دنیائے مصوری اور اُس کے شوقینوں میں تادیر یاد رکھنے کا سبب بن جائے گی۔ پروفیسر غلط نہیں سوچ رہا تھا۔ اُسے جو چیز زیورخ کھینچ لا رہی تھی، اُس کی تصدیق تجربے، علم اور اُس کی ماہرانہ

خلیفہ ہارون رشید کی ایک محبوب کنیز نے کھڑے ہو کر انگڑائی لی اور انگڑائی کے بعد جب اپنے ہاتھوں کو نیچے لانا چاہا تو نہ لا سکی اور وہ اسی طرح کھلے کے کھلے اوپر رہ گئے۔

ہارون رشید کو اطلاع پہنچی تو اس نے آ کر اس کے حال کا مشاہدہ کیا۔ پھر فوراً شاہی اطبا سے مشورہ کیا۔ ہر طبیب نے اپنی اپنی تدبیر کی اور اپنی اپنی دوائیں دیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک روز ہارون رشید کے طبیب نے کہا "امیر المومنین، اس مرض کی میرے پاس دوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے نوجوان بیٹے کے ذریعے آپ کی کنیز کے جسم کی مالش کراؤں۔"

ہارون رشید کو اس کی بات بہت ناگوار گزری مگر کنیز کی صحت کی خاطر اسے منظور کر لیا اور دل ہی دل میں طے کر لیا کہ طبیب کے لڑکے کو بعد میں قتل کرا دے گا۔

پھر وہ نوجوان جسے طبیب نے اپنا لڑکا بتایا تھا، تخلیے میں کنیز کے پاس گیا، کنیز پر شدت سے گھبراہٹ اور حیا کا غلبہ ہوا اور حرارت طبعی کے باعث اس کا پورا جسم گرم ہو گیا۔ جسم گرم ہوتے ہی ردِعمل کے طور پر تیزی سے اس کے ہاتھ حفاظت کے لیے نیچے ہو گئے۔

نوجوان نے کہا "تو شفا پا چکی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو آہستہ آہستہ جنبش دیتی رہنا۔"

باہر نکلتے ہی اس نوجوان کو گرفتار کر کے ہارون رشید کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہاں وہ طبیب بھی موجود تھا۔

طبیب نے اُٹھ کر نوجوان کی داڑھی کھینچ لی تو وہ مصنوعی نکلی۔ پھر اس نے اس کی پگڑی اُتار دی تو اس کے بال بکھر گئے اور وہ نوجوان، مرد کے بجائے لڑکی ثابت ہوا۔

طبیب نے آداب بجالا کر عرض کیا "اے امیر المومنین۔ میں کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ آپ کی حرمت اور ناموس کو کسی مرد کے سامنے کرا دوں۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے یہ بات آپ کو بتا دی تو کہیں اس کی اطلاع مریضہ کو نہ ہو جائے۔ میں مریضہ کے دل میں سخت گھبراہٹ اور خوف پیدا کر کے اتنی گرمی اور جوش اُبھار دینا چاہتا تھا جو اس کے ہاتھوں کو حرکت میں لے آئے چنانچہ میں نے اس کام کے لیے اپنی باندی کو تربیت دی اور اچھی طرح سمجھا کر یہاں لے آیا۔"

خلیفہ بہت خوش ہوا اور اس نے حکیم کو بڑا صلہ اور انعام عطا کیا۔

مرسلہ: سہیل عابد، شیخوپورہ

آنکھوں نے کی تھی۔ اب وہ نادر و نایاب فن پارے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

پیٹر سلورمین نے پروفیسر مارٹن کو ڈیجیٹل کیمرے سے پینٹنگ کی بنائی گئی ہائی ریزولیشن تصویر بھیجی تھی لیکن پروفیسر کا خیال تھا کہ یہ تصویر تجزیے کے لیے مناسب نہیں۔ وہ نہ صرف اپنی آنکھوں سے اصل فن پارہ دیکھنا چاہتا تھا بلکہ اس کی نہایت پیشہ ورانہ خطوط پر بہت اعلیٰ ڈیجیٹل اسکیننگ کروا کر بڑے سائز کا تہ در تہ 'ڈیجیٹل امیج' بنوانا چاہتا تھا۔ زیورخ کے اس دورے میں اسے یہ دونوں مقاصد حاصل کرنا تھے۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تصویر کا مکمل تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ اُسے یقین تھا کہ پیٹر اُس کی بات سمجھ جائے گا۔ پروفیسر کو خدشہ تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کردے۔

پیٹر اور پروفیسر کی زیورخ میں ہونے والی یہ ملاقات بہت کامیاب رہی۔ پیٹر نے تصویر سوئز بینک کے لاکر میں محفوظ کردی تھی۔ وہ پروفیسر کی ہر بات سے متفق تھا۔ پروفیسر پینٹنگ کی اسکیننگ کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے مدد لینے کا فیصلہ تو پہلے ہی کرچکا تھا۔ اس نے پیٹر کو اعتماد میں لیا۔ "یہ ہماری تحقیق کے لیے بہت ضروری ہے۔" اُس نے پیٹر کو یقین دلایا تاکہ وہ اسکیننگ پر راضی ہوجائے۔ "ہم جو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہ اس کے بغیر ممکن نہیں۔"

"آپ کی بات درست ہے۔" وہ فوراً ہی تیار ہوگیا۔ ویسے بھی اُس وقت تک، ان دونوں کے سوا کسی کو علم نہیں تھا کہ کرسٹائیز آکشن سے نیلامی میں خریدی گئی بیانکا فورزا کس کی تخلیق ہے۔

دوسرے دن انہوں نے لاکر سے پینٹنگ نکالی اور پیرس کے لیے پرواز کرگئے، جہاں پینٹنگ کی اسکیننگ ہونی تھی۔ پروگرام کے مطابق کام مکمل ہونے کے بعد پیٹر واپس زیورخ لوٹ آتا اور پروفیسر اپنے گھر چلا جاتا جہاں اُسے پینٹنگ پر تحقیق شروع کرنا تھی۔ وہ طے کرچکے تھے کہ اب مزید رابطے ای میل اور فون پر رہیں گے۔

اُنہوں نے پیرس کی 'پاسکل کوٹی آف کلیو میرے ٹیکنالوجی' لیبارٹری سے اس تصویر کو بڑے سائز میں اسکین کروایا۔ یہ لیبارٹری آرٹ کے حوالے سے اس طرح کی خدمات نہایت اعلیٰ فنی معیار پر کرتی تھی۔ اُس لیبارٹری کا مالک کوٹی اُس کا پرانا شناسا تھا۔ وہ اس کے کام کو جانتا تھا۔ پروفیسر مارٹن کو یقین تھا کہ پینٹنگ کے تجزیے کے لیے وہی اسے بڑے سائز میں اس طرح اسکین کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو اُس کی ضرورت ہے۔

پینٹنگ اسکین ہوکر آگئی۔ پروفیسر مارٹن اس بار بھی اُس کے کام سے مطمئن تھا۔ اب اس کے لیے ممکن ہوچکا تھا کہ وہ اس تصویر کا زیادہ بہتر انداز میں بڑے سائز کے مانیٹر پر تجزیہ کرسکے۔ اسکین کے بعد وہ پینٹنگ کے ہر اسٹروک، لائن اور دیگر خد و خال کا نہایت باریک بینی سے تہ در تہ تجزیہ کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ پیرس سے واپسی کے بعد پروفیسر مارٹن نے اپنے دوسرے تمام کام کاج چھوڑ دیے تھے۔ اب وہ دن بھر کافی بڑے سائز کے مانیٹر کے سامنے بیٹھ کر ایک ایک لائن کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

جُوں جُوں دن گزر رہے تھے، اس کا من انجانی مسرت سے لبریز ہوتا جارہا تھا۔ "وہ تحقیق میرے لیے بہت ہی اہم کام تھا، اور ہے۔" اُن شب و روز کے حوالے سے پروفیسر مارٹن نے یہ بات پچھلے سال اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔

پروفیسر دن بھر گھنٹوں مانیٹر کے سامنے بیٹھ کر ماہرانہ نگاہوں سے پینٹنگ کے تجزیے میں مصروف رہتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُسے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ فن پارہ لیونارڈو ڈاونچی کی ہی تخلیق ہے۔ سائنٹیفک سے بنائے گئے پورٹریٹ میں دوشیزہ کے بال، گردن سے اوپر بندھا جوڑا، رنگوں کا نہایت خوبصورت امتزاج اور چہرے کے خد و خال ابھارنے کے لیے کھینچی گئی مشاقانہ لائنیں...... یہ سب پروفیسر مارٹن کے لیے اہم ثبوت تھے۔ وہ ایک اور اہم بات جان چکا تھا۔ پینٹنگ کے فیڈ ایریا کے اسٹروک بہت منفرد تھے۔ پروفیسر نے جان لیا تھا کہ وہ فیڈ اسٹروک بائیں ہاتھ سے دیے گئے تھے۔ یہ اُس کے نزدیک بہت ہی اہم ثبوت تھا۔ لیونارڈو ڈاونچی سیدھے کے بجائے ہر کام اُلٹے ہاتھ سے کرتا تھا۔ ایسے لوگ جنھیں ہم عرف عام میں 'کھبا' کہتے ہیں۔ لیونارڈو بھی 'کھبا' تھا۔

پورٹریٹ میں نظر آنے والی دوشیزہ بہت خوبصورت اور بہت بااعتماد نظر آرہی ہے مگر اس ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کا تاثر بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اُس پینٹنگ کو بنوانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی پھر بہت جلدی میں اُسے مصور کے سامنے لاکر بٹھادیا گیا تھا پھر یہ کہ وہ دوشیزہ مصور کے سامنے بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو بھی اُس ماحول میں ڈھال بھی نہیں پائی تھی کہ مصور نے کام مکمل کرلیا۔ یہ مصور کی مشاقی ہی تھی کہ اُس نے دوشیزہ کے حسن کو جہاں چرمی پارچے پر نہایت خوبصورتی سے منتقل کردیا تھا، وہیں اُس لمحے میں جو تاثرات اُس کے چہرے پر تھے، اُنھیں بھی پینٹنگ میں سمو کر دوام عطا کردیا تھا۔

"یہ فن پارہ اگر لیونارڈو ڈاونچی کے ہاتھ سے ہی بنا تھا، جیسا کہ میں کہتا ہوں کہ ہاں تو اس وقت میں یہ کہنے میں سو فیصد درست ہوں کہ یہ پورٹریٹ، ماڈل کے ذہنی تخیل اور چہرے کے تاثرات کو بیان کرتا منفرد فن پارہ ہے۔ یہ آسان کام نہیں۔ وہ بہت بڑا مصور تھا، وہی یہ سب کچھ کینوس پر اُتارنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ یہ مہارت ہر ایک مصور کے بس کی بات نہیں ہے۔" پروفیسر مارٹن نے بہت بعد میں اپنے ایک انٹرویو میں تحقیق کے دوران اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہی تھی۔

پروفیسر مارٹن اُس ثبوت کی تلاش میں تھا، جس سے اول تو ثابت کیا جاسکے کہ پورٹریٹ جس دور میں بنایا گیا، اُس وقت لیونارڈو ڈاونچی زندہ تھا۔ ڈاونچی کا دور 1452ء سے 1519ء پر محیط تھا۔ یہ ثبوت ملنے پر بنیاد ٹھہر جاتی کہ پورٹریٹ اُس کی زندگی میں ہی بنا تھا۔ اُس کے بعد مرحلہ تھا اُس کا لیونارڈو سے تعلق جوڑنے کا۔ جس نفیس چرمی پارچے پر پورٹریٹ بنایا گیا وہ بچھڑے کی کھال سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے کاربن ٹیسٹ سے ثابت ہوا کہ وہ 1440ء سے 1650ء کے دوران کسی وقت تیار ہوا تھا۔ پورٹریٹ پر کاسٹیوم ریسرچ نے ثابت کیا کہ سنہرے بالوں والی دوشیزہ نے جس انداز میں سر کے بال گوندھ کر گردن کے اوپر جوڑا اور پھر چوٹی باندھی ہے، وہ 1400ء کی دہائی میں، میلان کے اطالوی شاہی خاندان کا معروف فیشن تھا۔ بالوں کو چوٹی کی صورت گوندھنا اُس وقت شاہی خاندان کی عورتوں کا عام رواج تھا۔ اُس دور میں لیونارڈو بھی میلان میں مقیم تھا۔ اُس نے شاہی خاندان کی درخواست پر بطور شاہی مصور، اطالوی دربار سے وابستگی اختیار کرلی تھی۔ پورٹریٹ کے کناروں پر سوئی سے کی گئی سلائی کے نشانات واضح تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورٹریٹ کسی قلمی کتاب کا حصہ تھا اور سلائی کے نشانات جلد بندی کے دوران کی گئی سلائی کے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کسی شاہی شادی کی تصاویر پر مشتمل یادگاری قلمی کتاب یا البم ہو۔

پروفیسر مارٹن کی سراغ رسانی جاری تھی۔ اس سلسلے میں اسے ایک اور کامیابی ملی۔ پورٹریٹ پر دوشیزہ کا نام تھا "بیانکا" اور اصل حقیقی زندگی میں بھی اُس کا یہی نام تھا۔ پروفیسر کو تحقیق سے پتا چلا کہ یہ نام میلان کے ڈیوک کی ایک بیٹی کا تھا۔ بیانکا اُس کی ناجائز اولاد تھی۔ بیانکا کی شادی 1496ء میں گلیا ازو سیوریتو نام کے شخص سے ہوئی تھی جو میلان کے فوجی دستوں کا کمانڈر تھا۔ وہ میلان میں لیونارڈو کے فن کا بہت بڑا قدردان اور ایک طرح سے طبقۂ اشرافیہ میں اُس کا سرپرست بھی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یہ پورٹریٹ تیار کیا گیا، اُس وقت بیانکا فورزا کی عمر تیرہ، چودہ برس کے درمیان تھی۔

جب یہ پینٹنگ بنائی گئی، تب اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ پورٹریٹ اُسی سلسلے میں بنایا گیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ شادی کے صرف چند ماہ بعد ہی اُس کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت وہ حاملہ تھی اور حمل کی کچھ پیچیدگیوں کا شکار ہو کر عین عالم شباب میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اُس دور میں زچگی اور دورانِ حمل پیچیدگیوں کے باعث نوجوان عورتوں کی موت عام تھی۔ عام طور پر عوام کو صحت کی کوئی خاص سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ دورانِ حمل اور زچگی کے لیے عورتوں کو مہیا طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بیانکا بھی اسی کا شکار بن گئی تھی۔ جہاں ان طبی وجوہات کے باعث عام نوبیاہتا نوجوان عورتوں کی شرح اموات عام تھی، وہیں اس طرح کے حالات میں شاہی عورتوں کی شرح اموات بہت کم تھی۔ انہیں اپنے وقت کی بہت اچھی طبی سہولتیں حاصل تھیں مگر پھر بھی بیانکا اپنی جان سے گئی۔ اس تناظر میں بیانکا کی حمل کی پیچیدگیوں کے سبب موت بڑی عجیب سی بات لگتی ہے مگر تاریخ شاہی خاندان کی اس عورت کی مبینہ پُراسرار موت کے بارے میں خاموش ہے۔ ممکن ہے کہ موت کی جو وجہ بیان کی گئی ہے، وہ درست ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ویسے بھی طبقۂ اشرافیہ کی چار دیواری کی داستانیں محلاتی سازشوں سے ہمیشہ ہی سنوری رہی ہیں۔

خیر چھوڑیے یہ بات۔ پروفیسر مارٹن بدستور تحقیق میں مصروف تھا۔ وہ پُرعزم تھا۔ اُسے کامیابی مل رہی تھی۔ کئی مہینوں کی تحقیق کے بعد بیانکا فورزا کی شناخت ہوچکی تھی۔ اُس کا خاندانی پس منظر سامنے آچکا تھا۔ وہ اپنی دریافت پر بہت خوش تھا۔ اُس نے بے نام پینٹنگ کو اطالوی زبان میں ایک خوبصورت نام عطا کیا:

La Bella Principess جس کے معنی ہیں 'خوبصورت شہزادی'۔

لگ بھگ دو تین سال کی کڑی محنت اور عرق ریزی سے کی گئی تحقیق کے نتیجے میں پروفیسر مارٹن نے حیرت انگیز طور پر کئی دلچسپ حقائق دریافت کرلیے تھے۔ وہ اس بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا کہ 'بیانکا فورزا' دراصل لیونارڈو ڈاونچی کی ہی تخلیق ہے جو اس نے شاہی دربار سے وابستگی کے دوران بطور فرمائش تیار کی تھی۔ ممکن ہے کہ بیانکا کے ہونے والے شوہر کی فرمائش پر اُس نے یہ پورٹریٹ بنایا ہو۔ بات جو بھی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ پورٹریٹ بننے کے بعد یہ پینٹنگ لگ بھگ پانچ سو سال تک دنیا

PAKSOCIETY.COM

کی نظروں سے اوجھل رہی اور پھر اچانک کرسٹائیز آکشن میں نمودار ہوئی اور نیلامی کے بعد پیٹر تک پہنچی اور اب ایک سوئز بینک کے لاکر میں اُس وقت کی منتظر ہے، جب دنیا یہ تسلیم کرلے کہ یہ لیونارڈو کا ہی فن پارہ ہے۔

بیانکا فورزا بہت کم عمری میں دنیا سے چلی گئی تھی مگر لیونارڈو ڈاونچی کے ہاتھوں نے اسے اَمر کردیا تھا۔ موت کے پانچ سو برس بعد وہ ایک بار پھر زندہ ہوگئی تھی۔ اُس کا نام اب اگلی کئی صدیوں تک دنیا میں گونجنے والا تھا۔ پروفیسر مارٹن، ڈیوک آف میلان کی ناجائز بیٹی کے پورٹریٹ کو اب عظیم مصور لیونارڈو ڈاونچی کا اصل فن پارہ قرار دلوانے کے لیے بہت سے ٹھوس ثبوت حاصل کرچکا تھا۔ اب وہ ان ثبوتوں اور اب تک کی تحقیق پر مشتمل ثبوتوں اور انکشافات کی بنیاد پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

2010ء میں پروفیسر مارٹن کیمپ کی کتاب شائع ہوئی۔ کتاب میں دوٹوک انداز میں بیانکا فورزا کو لیونارڈو ڈاونچی کی تخلیق بتایا گیا تھا۔ پروفیسر مارٹن نے اپنی کتاب میں وہ تمام تر شواہد تفصیل سے بیان کیے جو اس چھوٹے سے پورٹریٹ کو دنیا کے سب سے بڑے مصور کا فن پارہ قرار دینے کے لیے، مصنف کے بقول 'ٹھوس دلیل' تھے۔

کتاب بہت مشہور ہوئی۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُن کے لیے یہ بہت دلچسپ کتاب تھی۔ انہیں یقین تھا کہ مونالیزا کے بعد، دنیا کے سامنے آنے والا یہ فن پارہ بھی بہت قدر و منزلت حاصل کرے گا۔ دنیا بھر کے موقر اخبارات، رسائل اور جرائد میں کتاب پر بے شمار تبصرے شائع ہوئے۔ عام لوگوں کے لیے بھی یہ بہت بڑا انکشاف تھا کہ عظیم اطالوی مصور کا گمشدہ فن پارہ دریافت ہوا ہے۔

جہاں دنیائے فنونِ لطیفہ سے شغف رکھنے والے اس کتاب کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کررہے تھے وہیں ناقدینِ فن کی متضاد آرا بھی سامنے آرہی تھیں۔ لیونارڈو ڈاونچی کے فن پر مستند سمجھے جانے والے کچھ ماہرینِ فن کا اتفاق تھا کہ مصنف کی تحقیق، رائے اور اخذ کردہ نتیجہ درست ہے لیکن اس کے باوجود ہر ناقد مصنف سے متفق نہیں تھا۔ اس کے برعکس زیادہ تر عام دلدادۂ فن مصنف کی بات پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کرتے نظر آرہے تھے۔ اس صورتِ حال نے کتاب کو ہی نہیں مصنف کو بھی متنازعہ بنادیا تھا۔

کارمین بمباچ نیویارک میٹروپولیٹن میوزیم میں مصوری کے شعبے کے نگراں اور فن پاروں کی دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔ انہوں نے بھی پروفیسر مارٹن کی کتاب پڑھی مگر وہ ان سے متفق نہیں تھے۔ کارمین نے ایک انٹرویو میں کہا "مجھے تو یہ لیونارڈو کے ہاتھوں تخلیق کردہ فن پارہ نہیں لگتا۔" ایک اور ناقد نے صرف یہ رائے دینے پر اکتفا کیا "پینٹنگ بہت دلکش ہے...... اور بس!"

ناقدین کی رائے ایک طرف، آرٹ کے سماج میں کئی سوالات اٹھ رہے تھے۔ پروفیسر مارٹن کی طرف انگلیاں اٹھنے لگی تھیں۔ کچھ لوگ پینٹنگ کو 'فراڈ' اور دنیائے آرٹ کی ایک بہت بڑی 'دھوکے بازی' کہہ رہے تھے۔ پروفیسر کی ذات ان سب کی تضحیک کا نشانہ تھی۔

ایک بہت اہم سوال اٹھا۔

پروفیسر مارٹن کا کہنا تھا کہ اُس کے دلائل ٹھوس اور پیش کیے گئے ثبوت ناقابلِ تردید ہیں مگر اس کی ہر دلیل کو رد کرنے والے سخت گیر ناقدین نے سوال اٹھایا کہ اگر یہ واقعی لیونارڈو ڈاونچی کی تخلیق کردہ پینٹنگ ہے تو لگ بھگ پانچ سو سال تک یہ کہاں غائب رہی، اب اچانک یہ کس طرح دریافت ہوئی؟ اس پینٹنگ کا ذکر لیونارڈو کے کام کی تفصیلات میں کہیں نہیں ملتا، اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسی پینٹنگ جو صدیوں تک غائب رہی کسی نے اس کا کوئی ذکر نہیں سنا وہ اچانک کس طرح منظرِ عام پر آئی؟

سوالات ٹھوس بنیادوں پر اٹھائے گئے تھے۔ پروفیسر مارٹن کی پوری تحقیق بیانکا کے پورٹریٹ کو لیونارڈو کی تخلیق ثابت کرنے کے لیے تھی۔ جو سوالات اٹھائے گئے تھے، اُن کے بارے میں کتاب لکھتے وقت پروفیسر نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب وہ اُن ناقدین کی رائے کو اہمیت دے رہا تھا جو یہ سوالات کررہے تھے۔ وہ اب خود ان سوالوں کے تناظر میں ایک بار پھر پینٹنگ پر کی گئی اپنی تحقیق کا جائزہ لے رہا تھا۔

یہ بہت اہم سوالات تھا۔ کرسٹائیز آکشن سے پہلے تصویر کہاں تھی؟ یہ بات نہ تو پیٹر جانتا تھا اور نہ ہی پروفیسر مارٹن کو اس بارے میں کچھ پتا تھا۔ پینٹنگ میں نظر آنے والی دوشیزہ کی تاریخ تو وہ دریافت کرچکے تھے مگر اس بات سے لاعلم تھے کہ صدیوں کی گمشدگی کے دوران وہ پینٹنگ کہاں کہاں رہی تھی۔ بظاہر یہ بات اُس وقت کسی کے علم میں نہیں تھی۔ پروفیسر کے پاس بھی ناقدین کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پروفیسر نے برسرِ عام اپنی اس لاعلمی کا اعتراف کیا "یہ درست ہے کہ فی الوقت میرے پاس اُن سوالوں میں سے ایک کا بھی جواب نہیں۔" اس نے ایک انٹرویو میں کہا مگر سائنس میں وہ ایک نئے حوصلے کا اظہار کررہا تھا۔ "مجھے

www.Paksociety.com

ہے کہ میں درست ہوں۔ پینٹنگ اصلی ہے۔ اس وقت میں لاجواب ہوں مگر بہت جلد اپنی نئی تحقیق شروع کر رہا ہوں۔ میں اُن سب ناقدین کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے سوالات اٹھائے۔ اب میری نئی تحقیق کا محور یہی سوالات ہوں گے۔ بہت جلد، سب کو اُن کے سوالوں کے تسلی بخش جوابات مل جائیں گے۔"

پروفیسر مارٹن کے اعتراف لاعلمی نے بیانکا فورزا کو دنیائے مصوری میں شاہکار کہلانے کے بجائے 'مشتبہ' اور 'دھوکا' جیسے القابات سے نواز دیا۔ وہ پروفیسر کی بات کو اہمیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ صرف معاملے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے نئی تحقیق کی بات بنا رہا ہے۔

یہ لمحات پروفیسر اور خود پیٹر کے لیے، بہت پریشان کن اور کٹھن تھے۔ حالات اُن کے مخالف ہو چکے تھے۔ پیٹر سلور مین کو تو اب ہاتھ آتی دولت خود سے بہت دور جاتی نظر آ رہی تھی مگر 'دھوکا دہی' جیسے الزامات نے پروفیسر کی تو پوری علمی ساکھ کو ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔

تنازعے کے بعد اب خود پروفیسر یہ بات جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ پینٹنگ کرسٹائیز آکشن سے پہلے کہاں تھی اور وہ کس طرح نیلامی کے لیے وہاں تک پہنچی؟ پروفیسر جانتا تھا کہ اگر ان سوالوں کے جوابات نہ ملے تو اُس کی دریافت تو ضائع ہو گی، ساتھ میں لیونارڈو کا ایک شہ پارہ دنیائے فن کے کباڑ میں دب کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا...... مگر یہ ماضی اور مستقبل کی باتیں، خدشات اور امکانات تھے۔ حال کی تلخ اور ٹھوس حقیقت یہ تھی کہ پروفیسر کی نیک نامی، دنیائے مصوری میں عزت اور علم کے شعبے میں اُس کی ساکھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہی تھی۔ اُسے 'فراڈ' اور 'دھوکے بازی' جیسے سنگین الزامات کا سامنا تھا۔ وہ اپنی ذات پر لگے الزامات کے ان سیاہ داغوں کو دھونا چاہتا تھا مگر اُسے کوئی کامیابی نہیں مل رہی تھی۔

اعتراف لاعلمی کے مشہور انٹرویو کے بعد پروفیسر مارٹن نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کسی بھی سوال، اعتراض اور الزام کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ وقت ضائع کیے بنا اپنی تحقیق کو ازسرِ نو مکمل کرنا چاہتا تھا مگر اُس کے مخالفین یہ بات نہیں جانتے تھے۔ کتاب اُس کے لیے شہرت کے بجائے بدنامی کا سبب بن گئی تھی۔ اسے کئی سالوں کی سخت محنت کے جواب میں لعن طعن کا سامنا تھا۔ وہ اٹھائے گئے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے خاموش ہوا تھا تاکہ اس کا وقت فضول بحث میں ضائع نہ ہو۔ ناقدین اُس کی خاموشی کو اعتراف جرم سے تشبیہ دے رہے تھے۔ اس کی خاموشی سے انھیں مزید شہ مل رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تھا اپنی تحقیق کے لیے مگر وہ نادان مخالفین کچھ اور سمجھ بیٹھے تھے۔

پروفیسر مارٹن تن دہی سے اپنی نئی تحقیق میں مصروف تھا مگر اب تک اس کے ہاتھ کوئی سرا نہیں لگ سکا تھا۔ پینٹنگ کے گمشدہ پانچ سو سال بدستور راز میں تھے۔ وہ جتنی محنت کرتا، اتنا ہی ناکامی اُس کا مقدر بن رہی تھی مگر اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ اپنے تئیں مطمئن تھا کہ اس کی دریافت درست ہے۔ وہ پُرعزم تھا کہ فن پارہ لیونارڈو کی ہی تخلیق ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تقدیر ضرور مہربان ہو گی اور پینٹنگ کے صدیوں پُرانے سارے راز اُس کے سامنے طشت از بام ہو جائیں گے۔

پروفیسر مارٹن کی عادت تھی کہ ہر شام چائے پینے کے بعد کچھ وقت کے لیے انٹرنیٹ کنیکٹ کر کے لیپ ٹاپ پر ای میلز چیک کرتا اور ان کے جوابات دیتا تھا۔ اسے روزانہ اپنے دوستوں کے درجنوں ای میلز موصول ہوتے تھے۔ اُس شام بھی وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھا ای میلز چیک کر رہا تھا۔ تقریباً سب دوستوں نے ایک ہی بات کی تھی کیونکہ وہ سب اُس پر لگنے والے الزامات سے پریشان تھے۔

"تقدیر پر بھروسا ہے، میں سچا ہوں، پینٹنگ سچی ہے...... ایک دن سب کچھ دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ میں تحقیق کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ کل نہیں تو پرسوں، پرسوں نہیں تو ہفتہ، مہینہ، سال بھر بعد میں ہر سوال کا، ہر اعتراض کا ٹھوس جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔ کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تک کوئی خاص کامیابی نہیں ملی مگر مجھے یقین ہے کہ راستہ مل جائے گا۔ تقدیر کبھی نہ کسی دن مجھ پر ضرور مہربان ہو گی...... مارٹن۔" اس نے اپنے ایک دوست کو جواب لکھا اور اگلی ای میل چیک کرنے لگا۔

جس وقت پروفیسر مارٹن اپنے دوست کی ای میل کا جواب لکھ رہا تھا، اس نے تقدیر کی خوش بختی کا ذکر کیا تھا۔ تقدیر کا وہ خاص دن آ چکا تھا اور وہ لمحۂ انکشاف میں تھا۔ بیانکا فورزا کے حوالے سے اس کی لاعلمی ختم ہونے والی تھی۔ اس کے نام آنے والی اگلی ای میل کسی اجنبی کی تھی۔ یہ ای میل ایڈورڈ رائٹ نے بھیجی تھی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے ای میل کھول لی۔ ایڈورڈ رائٹ امریکا کی یونیورسٹی آف ساؤتھ فلوریڈا کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر ایمریٹس تھا۔ وہ مارٹن سے نہ تو پہلے کبھی ملا تھا اور نہ ہی وہ دونوں ایک دوسرے کو کسی بھی حوالے سے جانتے تھے مگر اس کے باوجود ایڈورڈ نے پینٹنگ تنازعے کے تناظر میں اُسے ایک مفید مشورہ دیا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم درست ثابت ہو گے۔" اُس نے ای میل میں لکھا تھا۔ اُس کا اندازِ تحریر پُرخلوص دوست کا عکاس تھا۔ "ابھی حالات تمہارے لیے سازگار نہیں مگر بے فکر رہو۔" اس نے مارٹن کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔ "میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم پولینڈ جاؤ۔ وارسا میں 'نیشنل لائبریری آف پولینڈ' کے قلمی مخطوطات کے شعبے میں کئی صدیوں پرانی ایک قلمی کتاب موجود ہے۔ دراصل یہ کتاب نما کئی صدیوں پرانا شاہی خاندان کی قلمی تصاویر پر مشتمل البم ہے، جس کا نام Sforziad ہے۔ اسے بغور دیکھو، سائنسی بنیاد پر تجزیہ کرو۔ تمھیں کئی تشنہ سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔ مجھے امید ہے تم پینٹنگ کی گمشدہ صدیوں کا راز پا لو گے...... میرا فون نمبر بھی نیچے لکھا ہے۔ تمھیں جب میری ضرورت پڑے، بلا جھجک رابطہ کر لینا۔ تمہاری مدد کر کے مجھے بہت خوشی ہو گی۔ تمہارا مخلص...... ایڈورڈ رائٹ۔"

مارٹن نے ای میل پڑھی اور انٹرنیٹ کے ذریعے کچھ معلومات اکٹھی کیں۔ اس نے کچھ دیر بعد ایڈورڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صرف ایک سوال کیا کہ کیا وہ تصاویر کسی شادی کے موقع پر تیار کی گئی تھیں؟

ایڈورڈ رائٹ قلمی مخطوطات کا دلدادہ تھا۔ وارسا کی اُس لائبریری میں وہ کچھ عرصہ تحقیق میں گزار چکا تھا۔ وہ یورپ کے عہدِ نشاطِ ثانیہ کے قلمی مخطوطات کا ماہر سمجھا تھا۔ اُس نے مارٹن کو جس کتاب کا حوالہ دیا تھا، وہ اُس نے اسی تحقیق کے دوران دیکھی تھی۔ وہ جہازی سائز کی منقش اور نہایت آرائشی جلد بندی میں مشتمل رنگین باتصویر قلمی کتاب تھی۔ یہ کتاب کسی شاہی شادی کے دوران تیار کی گئی یادگار قلمی تصاویر پر مشتمل تھی۔

ایڈورڈ رائٹ نے فوراً جواب دیا۔ "وہ کتاب بیانکا فورزا کی شادی کے موقع پر بنائی گئی قلمی تصاویر پر مشتمل ہے۔ تم اس ڈرائنگ کا راز اُس سے پا لو گے۔ اُس میں شاہی دربار سے وابستہ مصوروں کی تیار کی گئی متعدد قلمی تصاویر ہیں۔ لیونارڈو بھی اس دور میں اطالوی دربار کا شاہی مصور تھا۔ ممکن ہے کہ بیانکا فورزا کی تصویر کشی اُس کے حصے میں آئی ہو۔"

ایڈورڈ رائٹ کے لیے یہ ایک امکان تھا مگر پروفیسر مارٹن کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی۔ اُسے اب خود کو درست ثابت کرنے کے لیے تحقیق کا نیا راستہ مل گیا تھا۔ اس نے فوراً پروفیسر ایڈورڈ کو جواب بھیجا:

"شکریہ میرے اجنبی دوست...... تم نے اندھیرے میں دیا جلایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اس چراغ کی روشنی میں، میں تاریک سرنگ میں بظاہر اپنا طویل نظر آنے والا سفر نہایت آسانی سے اور بہت جلد طے کر سکوں گا۔ تم نے جو کام کیا ہے، اُس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہے۔ ایک بار پھر شکریہ ...... مارٹن۔"

پروفیسر مارٹن کو اپنے سوالوں کے جوابات ...... کی تک پہنچنے کے لیے سراغ مل گیا تھا، جس کے سہارے اسے حقائق تک پہنچنے کا سفر شروع کرنا تھا۔

پروفیسر مارٹن نے اپنے طور پر ابتدائی تحقیق شروع کر دی تھی۔ لائبریری آف پولینڈ نے تصدیق کی کہ کتاب اُن کے پاس ہے لیکن وہ صرف اس تصدیق تک محدود نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ کتاب بیش قیمت تھی۔ پروفیسر جانتا تھا کہ لائبریری کسی بھی طور وہ کتاب اُسے مستعار نہیں دے سکتی۔ اس کے لیے اسے خود وہاں تک پہنچنا تھا۔ وہ تنہا نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کتاب پر باقاعدہ سائنسی بنیادوں پر تحقیق کی جائے۔ ایڈورڈ رائٹ نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔ اس کام کے لیے نہایت کارگر آدمی اُس کے پاس موجود تھا۔ یہ تھا 'پاسکل کوٹی' آف کلیو میرے ٹیکنالوجی پیرس' لیبارٹری کا مالک کوٹی۔ وہ نہ صرف آرٹ کا دلدادہ تھا بلکہ جب سے اس نے بیانکا فورزا کو اسکین کیا تھا، تب سے وہ تحقیق میں پروفیسر کا مددگار بھی رہا تھا۔ اور پروفیسر مارٹن کی متنازعہ کتاب کا وہ شریک مصنف بھی تھا۔ وہ پروفیسر کی رائے سے متفق تھا۔ اُسے بھی یقین تھا کہ بیانکا فورزا لیونارڈو ڈا ونچی کی ہی تخلیق ہے مگر جب سے اعتراض اٹھنے لگے تھے، تب سے وہ بھی دلبرداشتہ تھا۔ رہی سہی کسر پروفیسر کی ناکامی نے پوری کر دی تھی۔ کوئی بھی نہ دل سے چاہتا تھا کہ سچائی ثابت ہو اور وہ سرخرو ہوں۔

پروفیسر مارٹن نے جب ایڈورڈ کے ای میل اور وارسا لائبریری کی تصدیق سے کوٹی کو تفصیلی طور پر آگاہ کیا تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔ بطور شریک مصنف اسے یقین تھا کہ جو الزامات لگے ہیں، انہیں غلط ثابت کرنے کی بنیاد اسی کتاب پر رکھی جائے گی۔

مارٹن اور کوٹی، وارسا جانے کے لیے ...... بے تاب تھے مگر اب رکاوٹ تھی اخراجات کے لیے درکار رقم۔ مارٹن اور کوٹی نے اب تک کی تحقیق پر جو کچھ خرچ کیا، اپنے پلّے سے کیا تھا۔ رہا پینٹنگ کا موجودہ مالک پیٹر تو وہ پینٹنگ کو اسکین کروانے کے بعد دم سادھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے اس سارے معاملے کے دوران اب تک اپنے پاس سے ایک دھیلا بھی خرچ نہیں کیا۔ البتہ وہ یہ جاننے کے لیے ہفتہ دس دن میں پروفیسر کو ایک دو ای میل ضرور بھیج دیتا تھا کہ "کیا کچھ مزید پیش رفت ہوئی ہے؟" پروفیسر بھی اب اُس کے سوال سے تنگ آ چکا تھا۔ ایک تو وہ ویسے ہی پریشان تھا اوپر سے پیٹر کی ای میلز...... پروفیسر کا بھی

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

معروف نو مسلم ڈاکٹر آر ایل میلما

ماہر علم الانسان، مصنف اور محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر آر ایل میلما یورپ کے علمی حلقوں میں خاص عزت اور شہرت کے مالک ہیں۔ وہ ایمسٹرڈم کے استوائی عجائب گھر میں اسلامی شعبے کے صدر اور نگران ہیں انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک پاکستان کے بارے میں ہے۔ وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”میں نے 1919ء میں لیڈن یونیورسٹی سے مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع کی اور مشہور مستشرق اور عربی علوم کے ماہر پروفیسر سناؤک ہرگرونج کے لیکچروں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگا۔ میں نے عربی میں اس قدر استعداد حاصل کرلی کہ البیضاوی کی تفسیر قرآن اور غزالی کی ایک کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔ 1946ء میں ایمسٹرڈم کے رائل ٹراپیکل انسٹی ٹیوٹ میں تدریسی فرائض انجام دینے لگا۔ یہاں مجھے جاوی زبان میں اسلام پر ایک گائیڈ بک لکھنے کا حکم ملا۔ اسی ضمن میں مجھے اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والی ریاست پاکستان کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے رخت سفر باندھا اور 1954ء کے اواخر میں لاہور جا پہنچا۔ اب تک اسلام کے بارے میں میری معلومات کا ذریعہ یورپین لٹریچر تھا مگر لاہور میں مجھے اسلام کے بارے میں بالکل نئے پہلو سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ دل و دماغ پر اس کے تاثر کا یہ عالم تھا کہ میں نے اپنے مسلمان دوستوں سے نماز جمعہ میں شرکت کی اجازت طلب کی جسے انہوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیا۔

اس کے بعد میرے دوست مجھے ایک چھوٹی سی مسجد میں لے گئے، وہاں ایک ایسے صاحب خطبہ دیتے تھے جو روانی سے انگریزی بول سکتے تھے۔ انہوں نے نمازیوں کو بتایا کہ اس اجتماع میں انگریزی الفاظ زیادہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک دور دراز کے ملک ”نیدرلینڈ“ سے آیا ہوا ہمارا ایک بھائی اسلام کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرسکے۔ بہرحال خطاب ختم ہوا۔ میں اُٹھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ خطیب صاحب میری طرف متوجہ ہوئے، انہوں نے بتایا کہ لوگ میری زبان سے کچھ سننا چاہتے ہیں۔ خیر میں اٹھا اور مائیکروفون کے سامنے جا کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ میں انگریزی میں بات کر رہا تھا جبکہ علامہ صاحب اس کا اردو ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ میں نے بتایا کہ میں ایک ایسے ملک سے آیا ہوں جہاں بہت ہی کم مسلمان رہتے ہیں۔ میں ان کی جانب سے اور اپنی طرف سے آپ حضرات کو ہدیہ سلام و تبریک پیش کرتا ہوں کہ آپ اپنی آزاد و خود مختار اسلامی ریاست کے مالک ہیں اور اس ریاست نے گزشتہ سات برسوں میں خاصا استحکام حاصل کرلیا ہے اور خدا نے چاہا تو ایک روشن مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ میں اپنے وطن واپس جا کر بتاؤں گا کہ پاکستان میں مجھے مہمان نوازی اور محبت و اخلاص کے کس بے پایاں سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔

ان الفاظ کا اردو ترجمہ کیا گیا تو عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ سیکڑوں نمازی غیر معمولی اشتیاق اور کمال محبت کے ساتھ میری طرف لپکے، ان کے چہرے خلوص اور پیار کے نور سے چمک رہے تھے اور آنکھوں سے اخوت و یگانگت کی ایسی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جو دل و دماغ سے آگے میری روح میں اُترتی جارہی تھیں۔ میں نے مشاہدہ کرلیا کہ اسلام کا رشتۂ اخوت دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ ہے، سچی بات ہے اس روز میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

مرسلہ: عائشہ جونیجو، لاڑکانہ

اب ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ’کچھ خاص نہیں۔‘

وہ پیٹر سے تنگ آچکا تھا مگر اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ خود اس کی ساکھ داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بات درست ثابت کرنا چاہتا تھا۔ ایڈورڈ کے ای میل کے بعد بہت کچھ ’خاص‘ ہو چکا تھا لیکن پھر بھی پروفیسر کو یقین تھا کہ وارسا کے دورے اور تحقیق کے لیے درکار رقم کے حصول کے لیے پیٹر کی طرف دیکھنا فضول ہوگا۔ اس لیے اس نے پیٹر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

پروفیسر ایمان دار شخص تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بطور ماہر جب وہ کوئی کو ساتھ لے کر جائے تو اُسے اُن خدمات کا معاوضہ بھی ادا کرے لیکن وہ کیا کرسکتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ تھا اور پنشن پر گزارا کررہا تھا۔ آخر مارٹن اور کوئی کے طویل باہمی صلاح و مشورے سے ایک راستہ نکل آیا۔ انہوں نے نیشنل جیوگرافک سوسائٹی سے مالی اعانت کی درخواست کرنے کا فیصلہ کیا۔

مارٹن اور کوئی نے پراجیکٹ پروپوزل بنایا اور اسے سوسائٹی کے سامنے پیش کردیا۔ سوسائٹی نے فوراً اس پراجیکٹ کے لیے درکار فنڈز جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ ہی روز بعد پروفیسر مارٹن اور کوئی وارسا کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ کوئی تمام تر ضروری آلات اور کیمروں سے لیس تھا۔ انہیں لائبریری میں ہی اپنی تمام تر تحقیق کو سرانجام دینا تھا۔ اب نیشنل جیوگرافک سوسائٹی بھی اس مہم میں شامل ہوچکی تھی۔ پولینڈ میں لائبریری کا عملہ اُن کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ اُن کی تحقیق کے لیے کمرا آراستہ کرچکا تھا، جہاں وہ کسی بھی قسم کی غیر ضروری مداخلت کے بغیر اپنا کام یکسوئی سے سرانجام دے سکتے تھے۔

وہ بڑی دلچسپ کتاب تھی۔ جس دن پروفیسر مارٹن نے وہ کتاب پہلی بار دیکھی، دن بھر اس کے گہرے مشاہدے میں مصروف رہا۔ یہ کتاب دراصل قلمی تصویروں پر مشتمل تھی جس میں شادی کے کچھ مناظر اور دیگر شاہی خاندان کے ارکان کی پینٹنگ شامل تھیں۔ ایڈورڈ کی بات درست تھی۔ لباس اور چہروں کے خدوخال سے وہ سب لوگ اطالوی لگ رہے تھے۔ البتہ کتاب میں کوئی ایک بھی ایسی پینٹنگ نہیں تھی جسے دیکھ کر اسے ذرہ بھر بھی شبہ ہوتا کہ وہ لیونارڈو کے ہاتھ کی تخلیق ہوسکتی ہے۔ دوسری حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ کتاب ایک ایسی شادی کی تقریب کے حوالے سے قلمی تصاویر پر مشتمل تھی جس کی دلہن ’بیانکا فورزا‘ تھی مگر حیرت انگیز طور پر کتاب میں کوئی ایسی پینٹنگ نہیں تھی جس پر بیانکا کے ہونے کا شبہ ہوتا۔ اس کے لیے بیانکا کی پہچان کا حوالہ وہی پورٹریٹ تھا جو بینک لاکر میں محفوظ تھا مگر یہاں اس سے مماثل کوئی چہرہ نہیں تھا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ جس کی شادی کی تقریب کے حوالے سے یہ تمام قلمی تصاویر تیار کی گئی تھیں اور جس کے نام پر کتاب کا نام ہے، خود اس کی کوئی تصویر اس میں شامل نہ ہو۔ ایسا نہیں تھا۔ کتاب میں دلہن کا پورٹریٹ لگایا گیا تھا مگر یہ اور بات کہ اب وہ اس میں شامل نہیں تھا۔

پروفیسر یہ راز جان چکا تھا کہ جس پینٹنگ کو اس نے ’خوبصورت شہزادی‘ کا لقب دیا ہے، وہ بھی اس قلمی کتاب کا حصہ تھی مگر کسی آرٹ شناس چور نے اُسے نہایت صفائی سے اس کتاب سے چوری کرلیا تھا۔ پروفیسر پورٹریٹ کی حقیقت جان چکا تھا مگر ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا، جب وہ اپنی تحقیق کو دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ وہ نہایت خاموشی سے اپنی کوششوں میں مصروف تھا۔ ناقدین اُس کی خاموشی کو اعتراف جرم سے تشبیہ دے رہے۔ اس کی خاموشی سے انہیں مزید شہ مل رہی تھی۔

وارسا کی لائبریری میں پروفیسر کا تحقیقی کام شروع تو ہوگیا تھا مگر سائنسی بنیاد پر تجزیہ ابھی تک شروع نہیں ہوسکا تھا۔ کوئی اپنے تجزیے کے لیے تیاریوں میں مصروف تھا۔ اگرچہ کتاب کے تفصیلی مشاہدے کے بعد پروفیسر مارٹن کی تسلی ہوچکی تھی کہ وہ پورٹریٹ اس کتاب سے ہی علیحدہ کیا گیا تھا مگر جب تک کوئی کے سائنسی تجزیے کا نتیجہ سامنے نہیں آتا، تب تک پروفیسر کی بات مستند ہونے کے باوجود صرف ایک مفروضہ تھی۔ اب مفروضہ حقیقت تھا یا نہیں، یہ کام کوئی کو کرنا تھا۔ اسے آلات کی مدد سے کتاب کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ مرتب کرنا تھا۔

کوئی نے Sforziad کی تفصیلی مائیکروفلم بندی شروع کردی۔ مائیکروفلم کی تیاری کے بعد جب اُس کے ذریعے تجزیہ کیا گیا تو مارٹن کا خیال درست ثابت ہوا۔ فلم نے یہ راز کھول دیا تھا کہ کتاب میں سے ایک ایسی پینٹنگ کو نہایت صفائی سے علیحدہ کیا گیا تھا جو جلد بندی کی وجہ سے دوسری تصاویر کے ساتھ سی جاچکی تھی۔ مائیکروفلم نے چوری کا راز کھول دیا تھا۔ اس کے ذریعے وہ جگہ صاف نظر آرہی تھی، جہاں سے ایک پینٹنگ کو علیحدہ کیا گیا تھا۔ یہ انکشاف خود لائبریری انتظامیہ کے لیے بھی بہت حیران کن اور پریشان کردینے والا تھا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس سے وہ بھی ناواقف تھے۔

وارسا پہنچنے سے پہلے کوئی نے پینٹنگ کی ایک ایسی نقل تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی جو نہ صرف ہو بہو تھی بلکہ دونوں کے سائز میں ملی میٹر کے سوویں حصے کے برابر بھی فرق نہیں تھا۔ اس نے شبانہ روز کی محنت سے پینٹنگ کے کناروں کو بھی وہی حالت بخش دی تھی جو اصل پینٹنگ کے چرمی پارچے کے کناروں کی تھی۔ اُس نے نقل بھی بہت پرانے چرمی پارچے پر تیار کی تھی جس کی قیمت اُس کی توقع سے بھی کہیں زیادہ تھی مگر وہ اس تجزیے میں کسی بھی قسم کی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اب وقت آگیا تھا اس بات کا پتا چلانے کا کہ آیا جو پورٹریٹ اس صفحے سے کھینچ کر نکالا گیا، کیا یہ وہی پورٹریٹ تھا، جسے دنیا بیانکا فورزا کے نام سے جاننے لگی تھی۔

کوئی نے پورٹریٹ کی نقل کو عین اسی جگہ رکھا جہاں سے اُن کے خیال میں اُسے علیحدہ کیا گیا تھا۔ بظاہر وہ پورٹریٹ اُس

جگہ ایسے فٹ ہوگیا جیسے کہ وہ اُس کا حصہ ہو مگر اس کے باوجود انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ مزید تسلی کرنا چاہتے تھے۔ کتاب کے اُس حصے کی، جہاں پر پورٹریٹ کو سی کر جوڑا گیا تھا، اُس جوڑ کی مائیکرو فلم تیار کی گئی۔ فلم کا بہت بڑے مانیٹر پر باریک بینی سے جائزہ لیا گیا۔ پینٹنگ کی اُدھڑی جگہ سو فیصد درست طور پر وہاں فٹ ہوگئی تھی۔ انہوں نے پورٹریٹ جوڑنے کے بعد ایک بار پھر اُس جوڑ کی مائیکرو فلم بنائی۔ اُس کے بعد دونوں کا تقابل کیا گیا۔ کرسٹائیز آکشن کی بیانکا فورزا لائبریری آف پولینڈ کی Sforziad میں اُس طرح سما گئی تھی جیسے کہ اُسی کا حصہ ہو۔ ملی میٹر کے سوویں حصے کے برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

پروفیسر مارٹن کے لیے یہ بہت اہم بات تھی۔ ثابت ہوگیا تھا کہ پینٹنگ لیونارڈو ڈاونچی نے میلان کے شاہی دربار سے وابستگی کے دوران بنائی تھی اور وہ اُس شہزادی کی تصویر تھی جس کی شادی ہونے جارہی تھی۔ شادی بھی لیونارڈو کے سرپرست سے۔ یہ مارٹن کی حتمی دلیل تھی اپنی بات کو سچ کر دکھانے کی۔ اُسے پختہ یقین ہوگیا تھا کہ 'لا بیلا پرنسی پا' لیونارڈو نے ہی تخلیق کی تھی۔ پھر پورٹریٹ شاہی خاندان کی کتاب میں شامل ہوا۔ امتدادِ زمانہ اُسے پولینڈ کی اس لائبریری تک لے آیا اور پھر یہاں چور نے ہاتھ دکھادیا...... یوں وہ نایاب پینٹنگ نیویارک کے کرسٹائیز آکشن پہنچ گئی نیلام ہونے کے لیے۔ پروفیسر مارٹن نے نتیجہ اخذ کیا کہ یہ تخلیق اسی لیے دنیا کی نظروں سے پانچ سو سال تک اوجھل رہی تھی کہ اس دوران پہلے وہ اطالوی اور پھر پولش شاہی خاندان کا حصہ بنی رہی۔ اُس کے بعد کتاب پہنچی پولینڈ کی لائبریری میں جہاں سے پورٹریٹ کو چور نے چوری کیا۔ پیسے کمانے کے لیے وہ تصویر فروخت ہوکر نیلام گھر پہنچی اور اس طرح پانچ صدیوں بعد وہ پیٹر کے ذریعے دنیا کی نظروں کے سامنے نمودار ہوگئی۔

"شکریہ پیارے چور......" یہ سوچتے ہوئے مارٹن نے خودکلامی کی اور کتاب بند کرکے اُس پر نظریں جمادیں۔ "تم نے لیونارڈو ڈاونچی کی بدنصیب تخلیق کو پانچ سو سالہ قید سے رہائی دلوائی۔" وہ تہِ دل سے چور کا ممنون تھا۔ اگر وہ یہ فن پارہ چوری نہ کرتا تو دنیا بیانکا فورزا اور اس کی کہانی کو کبھی نہیں جان پاتی۔ وہ ہمیشہ قلمی تصاویر کے البم میں قید رہتی۔

تقریباً تمام سوالوں کے جوابات اُسے وارسا کی لائبریری سے مل گئے تھے مگر اب بھی ایک سوال باقی تھا۔ وارسا سے کامیاب پلٹتے ہوئے پروفیسر مارٹن سوچ رہا تھا کہ میلان شاہی محل سے پولینڈ کی لائبریری تک کا یہ سفر اُس کتاب کیسے طے کیا ہوگا؟ رہ رہ کر یہ بات اُسے مزید تحقیق پر اکسا رہی تھی۔ وہ ایڈورڈ رائٹ کا دل سے ممنون تھا۔ اگر وہ اشارہ نہ دیتا تو مارٹن کبھی یہ راز نہیں جان پاتا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاہی خاندان کی قلمی تصاویر کے اس البم تاریخی سفر کا راز جاننے میں بھی وہ اُس کی مدد کرسکتا تھا۔ پروفیسر مارٹن بالکل درست سوچ رہا تھا۔ ایڈورڈ واقعی بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ عمر گزری تھی اُس کی اس دشت کی سیاحی میں۔

مارٹن ایڈورڈ سے رابطے میں تھا۔ وہ ای میل پر اسے پیشرفت سے آگاہ کررہا تھا۔ اُس کے جوابات بھی حوصلہ افزا تھے۔ ان سے مارٹن کا عزم اور جواں ہوجاتا تھا۔ وارسا واپس آنے کے کچھ ہی روز بعد ایڈورڈ رائٹ سے ملنے کے لیے پروفیسر فلوریڈا چلا گیا۔ اُن کی پہلی ملاقات ہونے والی تھی۔ ایڈورڈ اُس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ یہ جان کر ایڈورڈ اور بھی خوش تھا کہ اب پروفیسر پر لگے الزامات خود بہ خود دم توڑنے والے ہیں۔ "مگر دو سوالوں کے جواب نہیں ملے؟" ڈنر کے بعد کافی پیتے ہوئے اس نے مارٹن نے سوال کیا۔

"وہ کون سے سوال ہیں؟" ایڈورڈ نے چونک کر پوچھا۔

"میلان کے شاہی خاندان سے یہ تصویر پولینڈ پھر یہاں سے نیویارک کے کرسٹائیز آکشن تک کیسے پہنچی؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "کہیں چوری کرکے تو نہیں" پروفیسر نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"یہ کتاب نہ تو چوری کرکے پولینڈ لائی گئی اور نہ ہی کسی اور غیر قانونی طریقے سے اُسے یہاں تک پہنچایا گیا ہے" ایڈورڈ نے جلدی سے جواب دیا۔ "کتاب کے یہاں تک پہنچنے کی کہانی بذاتِ خود بہت دلچسپ ہے۔" پروفیسر ایڈورڈ نے کہنا شروع کیا۔

"وہ کیا قصہ ہے؟" پروفیسر نے قطع کلامی کی۔ اسے یقین تھا کہ یہ قصہ اُس کی تحقیق کا وہ حصہ ہے جو اب تک گمشدہ ہے۔

"یہ سولہویں صدی کے کسی اوائلی برس کا ذکر ہے" ایڈورڈ نے کتاب کے سفر کا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ "بیانکا فورزا کے خاندان کی ایک شہزادی کی شادی پولینڈ کے شاہی خاندان کے ایک شہزادے سے ہوئی۔ جب وہ شہزادی میلان سے یہاں آئی تو قلمی تصاویر کا البم بھی اس کے ساتھ ہی وارسا پہنچا۔ یہ اُس شہزادی کے شاہی خاندان کا ایک ورثہ تھا جسے بطور

تحفہ اس کے حوالے کردیا گیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔

"وقت گزرتا گیا۔" مختصر سے وقفے کے بعد اس نے پھر بات شروع کی۔ پروفیسر مارٹن کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مبہوت ہوکر قصہ سن رہا تھا۔ "میلان کی وہ شہزادی اور پولینڈ کا شہزادہ، دونوں کب کے مرکھپ چکے تھے۔ ان دونوں کی وفات کے لگ بھگ دو سو سال کے قریب قریب گزر جانے کے بعد کی بات ہوگی۔ تب تک وہ قلمی تصاویر کا البم شاہی خاندان کی لائبریری میں محفوظ تھا۔ اب وہ پولینڈ کے شاہی خاندان کے تاریخی پس منظر کا ایک باب تھا۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود کتاب کی تمام تصاویر عمدہ حالت میں تھیں تاہم اُس کی جلد خستہ حال ہوگئی تھی۔ جسے تبدیل کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ سترہویں اٹھارویں صدی کی بات ہے جب کتاب کی نئی جلد بندی کروائی گئی۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔

"تو چوری لائبریری سے نہیں ہوئی تھی؟" پروفیسر مارٹن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" ایڈورڈ نے جواب دیا۔ "یہ پورٹریٹ نئی جلد بندی کے دوران علیحدہ کیا گیا تھا۔" اس نے وثوق سے کہا۔ "یہ کام لائبریری میں ہوتا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ کتاب لائبریری میں تو بہت بعد میں پہنچی تھی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر اپنی بات شروع کی۔ "از سرِ نو جلد بندی سے ہی تصویر کا وہ سفر شروع ہوا، جس کے نتیجے میں تم اُسے دیکھ پائے۔"

"وہ کیسے؟" مارٹن نے قطع کلامی کی۔

"جلد ساز کے ذریعے۔" ایڈورڈ نے مسکرا کر کہا۔ "وہ جلد ساز اطالوی تھا اور شاید لیونارڈو ڈاونچی کی قدر و قیمت سے اچھی طرح آگاہ بھی تبھی تو اُس نے صرف وہی تصویر علیحدہ کی۔ کوئی اناڑی یہ کام ہرگز نہیں کرتا۔ وہ اس پورٹریٹ کی قدر و منزلت سے اچھی طرح واقف ہوگا۔ دوسرا یہ کہ تب تک لیونارڈو دنیائے مصوری کے آسمانِ شہرت کو چھو چکا تھا۔ دنیا اس کے فن کو تسلیم کرچکی تھی۔ ایسے میں وہ جانتا تھا کہ یہ پورٹریٹ اس کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک بڑا سرمایہ ثابت ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر وہ کرسٹائیز آکشن تک کیسے پہنچی؟"

"اُس جلد ساز خاندان سے یہ تصویر ایک اطالوی تک پہنچ گئی تھی جو خراب شدہ قلمی تصاویر کو درست کرنے کا کام کرتا تھا۔" ایڈورڈ نے بتایا۔ "اُس کی موت کے بعد، اُس کی بیوہ نے وہ پورٹریٹ کرسٹائیز آکشن کو اونے پونے داموں فروخت کردیا تھا کئی اور دوسری پینٹنگز کے ساتھ۔"

پروفیسر مارٹن کو اپنے تمام تشنہ سوالوں کے جوابات مل گئے تھے۔ اس نے کرسٹائیز آکشن کا ریکارڈ بھی دیکھ لیا تھا۔ ایڈورڈ رائٹ کی بات درست ثابت ہوئی، تاہم ایک بات سے وہ لاعلم تھا کہ ایڈورڈ یہ سب کچھ کیسے جانتا تھا۔ اس لیے یہ سوال اُس سے بھی کیا تھا۔

"میں اس شعبے کا مستند ماہر ہوں۔ نشاۃ ثانیہ اور اس کے بعد کے عہد پر میری گہری نظر ہے۔" مارٹن کا سوال سن کر اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ جانتا ہوں، وہ ہر وقت، ہر کسی کو بتاتا پھروں۔" صاف ظاہر تھا کہ وہ مارٹن کے اس سوال کو نظر انداز کرنا چاہ رہا تھا۔ ویسے یہ بات اتنی اہم بھی نہیں تھی۔ پروفیسر مارٹن کے لیے جو کچھ جاننا ضروری تھا، وہ سب کچھ اُس کے علم میں آچکا تھا۔ بیانکا فورزا کی اصلیت کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے یہ معلومات بہت تھیں۔

لیونارڈو کے گمشدہ فن پارے کے تناظر میں دیکھیں تو وہ بہت دلچسپ وقت تھا۔ ایک طرف اُس کے گمشدہ فن پارے کی تہ در تہ کہانی کھل رہی تھی تو دوسری طرف مارٹن کے لیے بھی ساز گار وقت ظہور پذیر ہورہا تھا۔ مارٹن ایک بار پھر اپنی نئی تحقیق کو حتمی شکل دے رہا تھا۔

سردیاں شروع ہوچکی تھیں۔ لندن کے اُس خزاں رسیدہ ماحول میں ایک بار پھر لیونارڈو ڈاونچی آرٹ کے پرستاروں میں گفتگو کا موضوع بن گیا تھا۔ یہ نومبر 20011ء کی بات ہے۔ لندن کی ایک آرٹ گیلری میں لیونارڈو ڈاونچی کی بنائی ہوئی پینٹنگ Salvator Mundi کی نمائش ہورہی تھی۔ اس پینٹنگ میں بائبل کے تناظر میں ایک منظر پینٹ کیا گیا تھا جس میں حضرت عیسیٰ کی شبیہ بنائی گئی تھی۔ انہیں کھڑے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اُن کا ایک ہاتھ آگے کو بڑھا ہوا تھا جس کی ہتھیلی پر ایک بڑا سا گلوب رکھا ہوا تھا۔ یہ اُس عظیم مصور کا وہ شہ پارہ تھا جو کئی صدیوں تک غائب رہنے کے بعد نمودار ہوا تھا اور اب اس کی نمائش کی جارہی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے یورپ اور امریکا سے بھی لیونارڈو کے پرستار لندن پہنچ رہے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب نیشنل جیوگرافک سوسائٹی کی مالی اعانت سے فلورنس میں اُس کے ایک اور گمشدہ فن پارے کی تلاش کی جارہی تھی۔ کئی محققین لیونارڈو ڈاونچی کی ایک اور معروف پینٹنگ Battle of Anghiaria کی تلاش میں دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ یہ فن پارہ آخری بار

سولہویں صدی میں دیکھا گیا تھا، اُس کے بعد سے کسی کو علم نہیں کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ آخر جدید آلات کی مدد سے محققین نے اُس گمشدہ پینٹنگ کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ یہ بیش قیمت پینٹنگ اٹلی کے ایک قدیم محل کی دیوار کے اندر چھپائی گئی تھی۔ محققین کا کہنا ہے کہ فن پارہ کئی صدیوں سے اُس دیوار میں مدفون تھا۔

ایک طرف لیونارڈو ڈاونچی کے گمشدہ فن پاروں کے حوالے سے مذکورہ بالا دو اہم واقعات رونما ہوئے تھے تو دوسری طرف ایک تیسرا حیرت انگیز واقعہ اپنے حتمی مراحل میں تھا۔ اوپر جن دو پینٹنگز کی بات کی جاچکی ہے، مصوری کی تاریخ میں اُن کا پہلے سے ریکارڈ موجود تھا لیکن پروفیسر مارٹن کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ انہوں نے ایسا فن پارہ دریافت کیا ہے جسے اطالوی اور پولش شاہی خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کے سوا نہ تو کسی نے دیکھا تھا اور نہ ہی کہیں پر اُس کا کوئی ریکارڈ یا سرسری تذکرہ موجود تھا۔ پروفیسر مارٹن بیانکا فورزا کو اُس کا حق دلوانا چاہتا تھا۔ وہ لیونارڈو کی ہی پینٹنگ تھی مگر کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن اب اُسے یقین تھا کہ اسے تسلیم کرنے کے سوا دنیا کے پاس کوئی اور راستہ باقی نہیں بچے گا۔

پروفیسر مارٹن نے اپنی نئی تحقیق کو وہاں سے شروع کیا تھا، جہاں پر اُس کی کتاب ختم ہوئی تھی۔ اس بار اس نے اپنے مقالے میں اٹھائے گئے تمام الزامات اور تشنہ سوالوں کے تفصیلی جوابات دیے تھے۔ یہ وہ تمام ثبوت تھے، جنہیں سائنسی بنیاد پر پرکھ لیا گیا تھا۔

2011ء کے موسم خزاں میں اُس نے اپنی ازسرنو کی گئی تحقیق کو مقالے کی صورت میں حتمی شکل دی۔ جمع کیے گئے تمام تر ثبوت اُس کے ساتھ منسلک کیے اور دنیائے مصوری کے بڑے بڑے ناقدین کو اُس کی ایک، ایک نقل بھیج دی۔ وہ اپنی تحقیق کو شائع کرنے سے پہلے اُن سب کی تصدیق چاہتا تھا۔ پروفیسر مارٹن چاہتا تو دوسری کتاب لکھ سکتا تھا مگر اب اس نے طے کرلیا تھا کہ سب سے پہلے وہ لیونارڈو ڈاونچی کے کام پر مستند دسترس رکھنے والے تمام ماہرین کا اتفاقِ رائے حاصل کرے گا تاکہ سب سے پہلے پینٹنگ کو اُس کا جائز مقام مل سکے۔ اس کے بعد وہ اس تحقیق کے دوران پیش آنے والے واقعات و تجربات پر مبنی کتاب لکھے گا۔

پروفیسر مارٹن کو ہی نہیں، کوئی اور ایڈورڈ کو بھی یقین ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب دنیا یہ تسلیم کرلے گی کہ 'بیانکا فورزا' لیونارڈو ڈاونچی کا وہ فن پارہ ہے جس سے دنیائے فن کے تمام ماہرین و ناقدین بے خبر تھے۔

تمام ماہرین و ناقدین نے اس کی دریافت تو سے متعلق تازہ ترین ثبوتوں کی کاپیاں وصول کرلی ہیں لیکن ہر کوئی اس پر رائے دیتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ تقریباً دو ماہ ہونے کو آئے، ہر شخص رائے دینے سے کترا رہا ہے۔ اس کی نئی تحقیق کی خبریں عام ہیں مگر اب ہر ناقد خاموش ہے۔ مارٹن نے رپورٹ اتنی مضبوط لکھی ہے کہ اُس کے ہر لفظ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت موجود ہے مگر پھر بھی کسی ماہر یا ناقد نے نہ تو رائے کا اظہار کیا اور نہ ہی اِسے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ سب نے پروفیسر کو ایک ہی طرح کا جواب بھیجا ہے "تھوڑا سا انتظار کیجیے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔"

پروفیسر مارٹن نے بخوشی سب کو اجازت دے دی کہ وہ جتنا چاہیں وقت لے لیں۔ "کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اب اُن کے سامنے بیانکا فورزا کو لیونارڈو ڈاونچی کی تخلیق تسلیم کرنے کے سوا کوئی اور راستہ باقی ہی نہیں بچا ہے۔" پروفیسر مارٹن نے بڑے جوش سے کہا۔ "وہ جتنا چاہیں وقت لیں مگر مجھے معلوم ہے اُن کا جواب کیا ہوگا۔"

"کیا ہوگا؟"

"بیانکا فورزا لیونارڈو کا وہ گمشدہ فن پارہ ہے جو پہلی بار دنیا کی نظروں کے سامنے آیا ہے۔" پروفیسر مارٹن نے چمکتی آنکھوں، جوشیلے جذبے اور چہکتے لہجے میں جواب دیا۔

سوئزرلینڈ کے ایک بینک لاکر میں بیانکا فورزا اپنے تسلیم کیے جانے کی منتظر ہے۔ ڈیوک کی ناجائز اولاد جسے اپنی مختصر زندگی میں کبھی 'جائز اولاد' کا درجہ نہیں مل سکا مگر پروفیسر مارٹن کو اب یقین ہو چلا ہے کہ اب صرف چند ہفتوں اور مہینوں کی بات ہے۔ بیانکا فورزا کے پورٹریٹ کو دنیا لیونارڈو کی اصل پینٹنگ تسلیم کرلے گی۔

سوئزرلینڈ میں مقیم پیٹر سلور مین اس امید پر ایک ایک دن گزار رہا ہے کہ کب وہ وقت آئے گا جب یہ پینٹنگ اسے بہت مالدار بنا دے گی۔

"بہت جلد۔" پروفیسر مارٹن نے ایک انٹرویو میں بڑے یقین سے کہا۔ "وہ وقت بہت قریب ہے جب بیانکا فورزا میوزیم کی دیوار پر آویزاں ہوگی اور لیونارڈو کے پرستار ٹکٹکی باندھے اُس پورٹریٹ کی دلکشی میں کھوئے ہوں گے..... بہت ممکن ہے کہ 2012ء 'بیانکا فورزا' کے نئے جنم کا سال ہوگا۔"

☆☆☆

Sources:
1 National Geographicm
Feb:2012
2 Leonardo: The Life & Work
3 Referr many web sites.

قوالی

مختار آزاد

موسیقی میں جذبیت پیدا کرنے کا ہنر یونانیوں کو خوب آتا تھا مگر اس فن کو اوج پر پہنچانے میں مسلم ادوار کے بغداد کا بہت ہاتھ ہے، پھر یہ فن سفر کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ برصغیر پہنچا اور اس نے مقامی موسیقی کو جذب کرکے ایک نئی طرح ڈالی۔ ان میں سب سے نرالا انداز قوالی کا ٹھہرا۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے دل میں مدوجزر اُٹھانے کی خاصیت شامل ہوئی۔

[illegible]

برصغیر میں لوک سنگیت کے بعد موسیقی کی جس صنف نے زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں اپنی جگہ بنائی ہے وہ ہے قوالی۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی یہ صنفِ موسیقی نہ صرف اب بھی پاک و ہند میں یکساں طور پر مقبول ہے بلکہ اپنے اندر موجود لچک کے باعث جدید آلاتِ موسیقی کی سنگت میں اب مغرب میں بھی اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ حضرت امیر خسرو کلاسیکی قوالی اور اس کے قواعد و ضوابط کے موجد تھے تو نصرت فتح علی خان اسے جدت بخش کر شہرت

کے آسمان تک پہنچا گئے۔

علم موسیقی کے اسرار و رموز پر دسترس رکھنے والے صاحبانِ علم کہتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں آج گائیکی کی جتنی اصناف مثلاً غزل، گیت، کلاسیکی، نیم کلاسیکی گائیکی وغیرہ مروج ہیں، ان سب میں ہم قوالی کو مستند ترین گائیکی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل ہو یا گیت، رباعی ہو یا ترانہ...... ان تمام اصناف گائیکی کو قوالی رنگ میں گایا جاسکتا ہے اور گایا جاتا ہے۔ قوالی کی گائیکی میں جو وسعت پائی جاتی ہے، اسی کی وجہ سے یہ ہماری موسیقی کی مقبول ترین صنف ہے۔

قوالی اور اس کی گائیکی کیسے شروع ہوئی؟ اس سوال کا جواب ملتا ہے سیکڑوں سال پہلے کی تاریخ میں اور رشتہ جوڑا جاتا ہے سلسلۂ تصوف سے!

☆☆☆

مسرت قلبی کا معاملہ ہو یا پھر کائنات کے خالق کو پہچاننے کا مرحلہ، صوفی بزرگوں نے من کے اندر جھانکنے کی روایت ڈالی ہے۔ اولیائے اللہ، بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام نے عشق کا درس دیا ہے اور معرفت کا جام پی کر منزلِ عشق پر پہنچنے کا راستہ بتایا ہے۔ صوفی بزرگوں نے معرفت کی راہ سے گزر کر منزلِ عشق پر پہنچنے کی وارداتِ قلبی کو اپنے اقوال اور اشعار میں سمو دیا ہے۔ عطار ہو یا رومی، خواجہ نظام الدین اولیا ہوں یا امیر خسرو یا پھر شاہ بھٹائی، سچل سرمست، بابا فرید، بلھے شاہ...... آج کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی صوفیائے کرام کے وارداتِ قلبی کی ساعت جاری ہے اور زمانہ ہمہ تن گوش ہے۔ ان سب کے پیروکار خود کو فخر سے 'صُوفی' کہلواتے ہیں اور ان کے سلسلۂ عقیدت کو تصوف کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

اسلام میں تصوف کا ارتقا حالتِ خوف سے چل کر سب سے پہلے عشق اور پھر حالتِ فنا و اتصال تک کا سفر ہے۔

سلسلۂ تصوف کے عالم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں مذہب ایک سیدھا سادہ طریقِ زندگی تھا جس میں انسانی رویے کی تہ میں خوفِ خدا کا جذبہ ہی سب سے قوی تر تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی فقیرانہ زندگی اور کثرتِ قیام و سجود اور صحابہ کرام کا رویہ خدا خوفی و پارسائی، نیز وہ حدیث قدسی کہ "تم نماز اس طرح پڑھو جیسے تم خدا کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو سمجھو کہ جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"، یہ ایسے امور تھے جنہوں نے آگے چل کر اسلامی تصوف کے لیے بنیاد فراہم کی۔

کہتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے اسلامی دنیا کے لوگوں کی زندگیوں میں کافی تغیر واقع ہو چکا تھا۔ عبادات اور شعائر تو باقی تھے لیکن حیات پر ان کا اثر بہت زیادہ موثر نہ تھا۔ ان حالات میں زاہد اور متقی افراد کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جس نے دنیاوی زندگی کے شور و شر سے دامن چھڑا کر عبادت میں اپنے لیے پناہ ڈھونڈی اور خوفِ خدا کو اپنا شعار بنایا۔ اس عہد کی ایک مشہور ہستی حضرت حسن بصریؒ تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان پر خوفِ خدا اس قدر مسلط تھا کہ ان کا چہرہ ہر وقت زعفران کی طرح زرد رہتا تھا۔ یہ حسن بصریؒ ہی تھے جنہوں نے ایک ایسی انقلاب انگیز بات کہی جس نے آگے جا کر صوفی عقیدے اور فکر کے لیے سند کا کام دیا۔ انہوں نے فرمایا "اصل نیکی روح کی نیکی ہے اور سچی نیکی کا ایک دانہ نمازوں اور روزوں کے ہزار گنا وزن سے بڑھ کر ہے۔"

حسن بصری اصطلاحی معنوں میں صوفی نہیں تھے۔ وہ اس لیے کہ اُس وقت تک 'تصوف' کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی 'صُوفی' کی اصطلاح مروج ہوئی تھی لیکن ان کے فقر و زہد کے پیشِ نظر بعد کے صوفیائے کرام نے انہیں سلسلۂ تصوف کی ابتدائی کڑیوں میں شامل کیا ہے۔ 'صُوفی' کی اصطلاح کس طرح اور کن حالات میں رائج ہوئی؟ اس کا جواب اہلِ علم نے مختلف زاویوں سے دیا ہے:

علم و دانش کے بعض مکاتبِ فکر کے نزدیک 'صوفی' عابد و زاہد لوگوں کے اس گروہ کا نام پڑا جنہوں نے اپنے دور کے ریشم و حریر سے بنے آرام دہ لباس کو چھوڑ کر صرف اُون سے بنے لباس پہننے کو ترجیح دی۔ اون کو 'صُوف' کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ 'صُوفی' کہلائے۔ ایک اور مکتبۂ فکر کے مطابق 'صوفی' 'صفا' سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں 'قلب کی صفائی'

سلسلۂ صوفیائے کے مختلف مکاتب متفق ہیں کہ جب کوئی اپنے قلب کا آئینہ صاف کرنے کے لیے ریاضت کرتا ہے تو وہ 'صُوفی' کہلاتا ہے۔ بعض مکاتبِ فکر نے 'صُوفی' کا تعلق اصحابِ صفہ سے جوڑا۔ اصحابِ صفہ عہد نبوت ﷺ میں صحابہٗ کرام کا وہ گروہ تھا جو دنیا کے مشاغل سے الگ ہو کر دن اور رات کا زیادہ تر حصہ عبادت و ذکر اللہ میں بسر کرتا تھا۔ کچھ صاحبانِ علم و دانش کہتے ہیں کہ تصوف 'ذکرِ باطنی' کا نام ہے۔

علامہ شبلی نے اپنی مشہور و معروف تصنیف 'الغزالی' میں 'تصوف' پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تصوف کا لفظ اصل میں 'سین' سے تھا اور اس کا مادہ 'سوف' تھا جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں در آیا۔ چونکہ حضرات صوفیہ میں اشراقی حکماء کا انداز پایا جاتا تھا، اس لیے لوگوں نے ان کو 'سُوفی' یعنی 'حکیم' کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ 'سُوفی' سے 'صُوفی' ہو گیا۔"

ممکن ہے کہ لفظ 'صُوفی' کی یہی توجیہہ سب سے زیادہ معقول لگے۔

قطع نظر اس بات کے کہ تصوف کی ابتدا جس طرح سے بھی ہوئی ہو، ایک بات مسلمہ ہے کہ اس نے پہلے پُرجوش عقیدت اور پھر عشق و محبت کا رُوپ اختیار کیا۔ ایک صُوفی کے نزدیک بُرائی سے اجتناب اور نیکی کا ارتکاب اس لیے ضروری نہیں تھا کہ اس کے بدلے میں انسان سے جنت کا وعدہ ہے بلکہ اس لیے کہ یہ اس عمیق اور ازلی محبت کا ایک ادنیٰ تقاضا تھا جو ایک بندے کو اپنے رب کے ساتھ ہونی چاہیے۔

بندے اور رب کی محبت کے تقاضے ابتدا میں کچھ دُور تک تو شریعت کے ساتھ ساتھ چلے لیکن آگے جا کر یہ ان سے بچھڑ گئے اور علمِ ظاہر اور علمِ باطن کی 'دوئی' کے تصور نے جنم لیا۔ صوفیہ کے نزدیک علم کا ذریعہ نقل و روایت نہیں بلکہ وہ وجدان ٹھہرا ہے جس کے ذریعے ایک بندے کو براہِ راست 'حقیقتِ مطلق' کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری صدی ہجری میں بصرے کی ایک زاہد و عابد ہستی تھیں جن کا نام تاریخ میں حضرت رابعہ عدوی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے من میں موجود خدا کی محبت ہر جذبے پر غالب آ چکی تھی۔ ان سے منسوب ایک روایت کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے ایک رات خواب میں رسولِ خدا ﷺ کو دیکھا، فرمانے لگے "رابعہ کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟"

میں نے عرض کیا "اے رسول خدا! کون ہے جو آپ سے محبت نہ رکھے گا لیکن بہ خدا حق تعالیٰ کی محبت نے مجھے اپنے اندر اتنا جذب کر لیا ہے کہ میرے دل میں نہ کسی سے محبت کرنے کی گنجائش باقی ہے، نہ کسی سے نفرت کرنے کی۔"

تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ تصوف جو ابتدا میں صرف زہد و فقر کا نام تھا، رفتہ رفتہ ایک عمیق، سربستہ اور مبہم رویے کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ بعد کے زمانے کے ایک ممتاز صوفی بزرگ حضرت سہروردیؒ نے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "تصوف نہ محض فقر ہے، نہ محض زہد...... بلکہ اس میں فقر و زہد دونوں شامل ہیں اور ان کے سوا کچھ مزید بھی۔"

نصرت فتح علی خاں کہتے ہیں، جب میں بچہ تھا تو میرے والد کی خواہش تھی کہ اگر میں روؤں بھی تو سُر میں روؤں۔ اگر سُر میں نہ روتا تو ڈانٹ پڑتی تھی۔ مہدی حسن بچپن میں ایسے سُروں میں روتے تھے کہ ان کے والدین ان کو چپ کرانے کے بجائے [illegible] البتہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی والدہ عطاء اللہ کو [illegible] کرتی تھی۔ اسٹیج پر گاتے ہوئے مختار بیگم کا یہ انداز [illegible] گاتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرتیں اور اپنے [illegible] اتار دیتی تھیں۔ پتا نہیں سننے والے کیسے ہوتے تھے [illegible] گلوکارہ جوتے اتار لیتی تھی، بہرحال نور جہاں بیگم نے جوتے اٹھالیا کرتی تھی۔ ہمارے ملک پاکستان میں اتنا احترام ہم نے گلوکاروں کا دیکھا ہے یا پھر نمازیوں کا۔

ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب "مزاح پرسی" سے اقتباس

پسند: حسن جی، نارتھ کراچی والے

سلسلۂ تصوف کا بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ اس 'کچھ مزید' میں وہ تمام منزلیں شامل ہیں جو ایک صوفی کو خدا کی جانب راہِ سفر میں پیش آتی ہیں۔

مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں تصوف خوف کی منزل سے چل کر 'محبت و عشق' کے مقام تک پہنچا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں، بالخصوص عباسی عہدِ خلافت کے اوائل میں نقل و ترجمہ کی بدولت اسلامی دنیا میں یونانی علم و فکر کی آمد ہوئی اور پھر اسلامی فلسفہ و سائنس تشکیل پانے لگا، تب اسلامی تصوف نے بھی فکرِ یونان میں اپنے لیے بہت سا مفید مواد پایا۔ یہاں سے تصوف 'محبت و عشق' کے مقام سے آگے بڑھ کر 'معرفت' کی پُرپیچ راہوں میں داخل ہو گیا۔ ایک صوفی کی ریاضت کا مقصد اب یہ قرار پایا کہ وہ حقیقت الوہی کی جستجو میں اس آخری مقام تک پہنچ جائے جس کے بعد اور کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شہود و عیاں کی منزل سامنے آ جاتی ہے۔

معرفت کی راہ پر چلتے ہوئے حضرات صوفیہ بالآخر 'وحدت الوجودیت' کی منزل تک آ گئے تھے۔ تیسری صدی کے تصوف کے اس ارتقا کی کیفیت ہمیں اس زمانے کے مشہور صوفیہ کے اقوال میں بخوبی نظر آ سکتی ہے۔

حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں:

"خدا کے اولیاء کی تین نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال خدا کے حضور میں رہتا ہے، ان کا رہن سہن خدا کے ساتھ ہوتا

ہے، ان کا سارا کاروبار بھی خدا ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔"
اُسی عہد کے بزرگ ابوسلیمان دارائی فرماتے ہیں:
"جب عارف کی روحانی آنکھ کھل جاتی ہے تو اس کی جسمانی آنکھ بند ہو جاتی ہے۔ وہ ذاتِ حق کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔" آگے چل کر انہوں نے فرمایا "خدا کی معرفت وجد سے حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت ذوالنون مصریؒ کا عہد بھی تیسری صدی ہجری کا تھا۔ انہوں نے فرمایا!
"وہ جو خدا کی سب سے زیادہ معرفت رکھتا ہے، وہی ہے جو اس میں سب سے زیادہ گم ہے۔"

تصوف اور معرفت کا یہ پیغام جب عام لوگوں تک پہنچا تو صوفیائے کرام سے عقیدت کا عوامی سلسلہ شروع ہوا۔ صوفیوں نے وارداتِ قلبی کو اشعار میں بیان کرنا شروع کیا تھا، خوش لحن اور خوش گلو لوگوں نے انہیں گنگنانا شروع کر دیا۔ سلسلہ اور آگے بڑھا تو معرفانہ کلام باقاعدہ گایا جانے لگا، روحانی محفلیں جمنے لگیں اور یوں سماع یا قوالی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ تصوف میں معرفت تک پہنچنے کے جو کئی راستے بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ سب راستے اُس باطنی علم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو من کو دھونے کا نام ہے۔ انہی میں سے ایک راستہ سماع یا قوالی کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔

برِصغیر میں قوالی یا سماع کی ابتدا کس عہد میں ہوئی؟
اس سوال کا جواب تاریخ تصوف کی کتابوں میں موجود ہے۔ جن کے مطابق سماع کی ابتدا کے تاریخی حوالے آٹھویں صدی عیسوی کے فارس سے ملتے ہیں۔

سماع یا قوالی کو اسلامی تعلیمات کے فروغ اور ترویجِ علم کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس پر دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ سماع، مذہب اور روحانی موسیقی کے حسین ترین امتزاج پر مشتمل ترسیلِ علم کا وہ باطنی ذریعہ ہے جس کے بارے میں ابتدائی حوالے نویں صدی عیسوی کے عرب دانشور اور ماہرِ علم موسیقی الکندی اور الفارابی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں الغزالی نے اپنی کتاب 'آداب السماع والوجد' میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ نیز کتاب کی آٹھویں فصیل 'احیائے علوم الدین' میں سماع کو روحانی علم کے حصول کا ذریعہ بتایا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں جب اسلامی دنیا کے متعدد ممالک میں صوفی سلسلے کافی مضبوط ہو چکے تھے، اُس وقت فارس سے بڑے پیمانے پر ہجرت کا عمل شروع ہوا۔ یوں سماع بھی اپنے اصل وطن کی سرحدوں سے باہر نکل کر برِصغیر اور وسط ایشیا میں داخل ہوئی۔ آج کے وسط ایشیا اور ترکی میں ذکرِ حق پر مشتمل اُس روحانی محفل کے لیے لفظ 'سماع' کا ہی استعمال کیا جاتا ہے جس کا انداز برِصغیر کی قوالی سے بہت ملتا جلتا ہے۔

برِصغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین سے لوگوں کی محبت اور عقیدت کا جو روحانی تعلق قائم ہے، وہ بیان کے لیے لفظوں کا محتاج نہیں۔ اس خطے میں صوفیائے کرام، بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کی عقیدت میں سرشار ہر مذہب و عقائد کے افراد شامل ہیں۔

صوفیائے کرام کی تعلیمات میں معرفت کا جو سلسلہ صدیوں پہلے شروع ہوا تھا، اُس داستانِ عشقِ حقیقی کا بیان آج بھی جاری ہے۔ جس محفل میں ذکرِ معرفت ہوا سے ہم محفلِ سماع کہتے ہیں۔ برِصغیر میں سماع کو قوالی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت امیر خسرو برِصغیر کی وہ بزرگ ہستی ہیں جنہوں نے ملکِ فارس اور ہندوستان کے روایتی سازوں کو کلام سے ہم آہنگ کر کے اس جدید اندازِ سماع کی بنیاد ڈالی جو لگ بھگ آٹھ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، وغیرہ میں مروج ہے۔

برِصغیر میں قوالی کی مقبولیت کا سہرا عظیم صوفی شاعر اور موسیقار حضرت خواجہ امیر خسرو کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے صاحبانِ علم و دانش میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں، تاہم اس کے باوجود موسیقی کے تمام مکاتبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ برِصغیر میں منظم قوالی کا سہرا اگر کسی کے سر باندھا جائے تو وہ شخصیت صرف حضرت امیر خسرو کی ہی ہے۔

اگرچہ ایک مکتبۂ فکر دعویدار ہے کہ برِصغیر میں قوالی کے موجد حضرت امیر خسروؒ ہیں۔ دوسری رائے اس کے برعکس ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے حامی عالموں کا کہنا ہے کہ قوالی اُن سے بھی بہت پہلے ہند میں اپنا وجود رکھتی تھی۔ ادیب و محقق رشید ملک اپنی تصنیف 'حضرت امیر خسروؒ کا علمِ موسیقی' میں قوالی کے حوالے سے کئی سوالوں کے جواب دیے ہیں، وہ رقم طراز ہیں:

"قوالی کی ترکیب قول سے نہیں بلکہ قول رباعی گانے کا ایک انداز ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے بقول چونکہ قصیدہ اور مثنوی گانے کی چیزیں نہیں تھیں اور شاعری کی یہ اصناف تصوف اور حکیمانہ نظریات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے

رباعی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رباعی کا ایک نام 'قول' بھی تھا اور غالباً اسی سے مشتق کر کے صوفیوں میں قوال کے معنی گویوں کے ہیں کیونکہ غالباً اس کے ابتدائی معنی قول گانے والوں کے ہوں گے۔ بعد میں ہر صوفیانہ مطرب کو لوگ قوال کہنے لگے۔"

حضرت امیر خسروؒ کے زمانے سے پہلے ہندوستان میں قوالی کے وجود کو ثابت کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:
"ایک روایت کے مطابق حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وصال ایک محفلِ سماع میں ہوا تھا۔ اس محفل کے قوال کا نام صلاح الدین اور اس کے بیٹوں کے نام کریم الدین اور نصیر الدین تھے۔" واضح ہو کہ یہ زمانہ حضرت امیر خسروؒ سے پہلے کا ہے۔

برِصغیر میں حضرت امیر خسروؒ سے قبل قوالی کی موجودگی کا ایک اور حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ 'تاریخ فرشتہ' میں عبداللہ نامی ایک قوال کا ذکر ملتا ہے جو ترکی سے سفر کر کے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ فارسی زبان کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان، جو لاہور میں پیدا ہوئے تھے، اپنے اشعار میں عثمان اور باتوئے قوال کا ذکر کیا ہے۔ خود حضرت امیر خسروؒ نے اپنی تصنیف 'اعجازِ خسروی' میں خواجہ لطیف قوال اور شعبان قوال کا ذکر کیا ہے۔

ان تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امیر خسروؒ سے پہلے بھی برِصغیر میں قوالی مروج اور قوال موجود تھے لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج برِصغیر میں قوالی کی جو اصناف رائج ہیں، وہ بلاشبہ حضرت امیر خسروؒ کی ہی ایجاد ہیں۔ ان سے پہلے گو کہ برِصغیر میں قول اور قوال کا وجود موجود تو تھا لیکن بجز اس کہ اسے سات آٹھ گویے مل کر گاتے تھے، اس کے سوا اس کا کوئی اصول اور قاعدہ موجود نہیں تھا۔ یہ حضرت امیر خسرو ہی تھے جنہوں نے قوالی کے وہ قواعد و ضوابط ایجاد کیے جن پر آج تک قوالی کا وجود استوار ہے۔

برِصغیر میں قوالی کی ابتدا کی ایک دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے۔

موسیقی کے حلقوں میں یہ روایت عام ہے کہ شہنشاہِ ہند سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں ایک شخص پنڈت گوپال داس نام کا تھا۔ وہ ہندو تھا اور علمِ موسیقی کا ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے مسلمانوں پر یہ کہہ کر طنز کرنا شروع کیا کہ علمِ موسیقی سے تو مسلمانوں کا دور دور تک کا واسطہ نہیں ہے۔ اس

معروف نو مسلم یوسف مظفر الدین

32 سالہ یوسف مظفر الدین شمالی امریکا کی اسلامک پارٹی کے بانی چیئرمین ہیں جس کی بنیاد 1971ء میں رکھی گئی۔ وہ پولیٹیکل سائنس کے استاد رہے ہیں اور پیشے کے اعتبار سے پبلشر ہیں۔ ذیل کی تحریر ان کے انٹرویو سے ماخوذ ہے۔

"میرا تعلق امریکا میں آباد ایک افریقی خاندان سے ہے جس نے صدیوں پہلے مسیحیت قبول کر لی تھی۔ میرے والد اور والدہ دونوں مشنری تھے اور مذہب سے گہری وابستگی رکھتے تھے، میں خود بھی خدا کے وجود اور محض انسانیت کی فلاح پر اعتقاد رکھتا تھا۔ چنانچہ نو عمری ہی میں، میں نے افریقیوں کی تحریکِ آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا یہیں سے اس کشمکش کا آغاز ہوا جو بالآخر مجھے اسلام کے دامن میں لے گئی۔ مسیحی مذہب بائبل کی ہدایت کے مطابق مجھے سیاست میں حصہ لینے سے روکتا تھا کہ محض عبادت اور خدا سے تعلق کا نام ہے، میرے سامنے دو راستے تھے تنہا عیسائی بن کر ہمیشہ کے لیے سیاست کو خیر باد کہہ دیتا یا قوم پرست بن کر مذہب سے ناتا توڑ لیتا۔ لیکن میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا، میں تضادات کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتا۔ میں نے دوسرے مذاہب اور کمیونزم کا مطالعہ شروع کیا۔ کمیونزم کے سلسلے میں تو مجھے وہی پہلی دقت پیش آئی کہ وہ میرے روحانی تقاضوں کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسلام کا مطالعہ کیا تو راستے روشن ہونے لگے، مسلمانوں کے ساتھ اپنے رابطے اور مطالعے سے معلوم کیا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مکمل نظامِ زندگی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اب تک ساری زندگی میں نے تاریکی میں گزاری ہے حقیقی راستہ تو وہ ہے جو اب نظر آیا ہے اسلام کی صورت میں مجھے منزل کا سراغ مل گیا۔

مرسلہ: عائشہ جونیجو، اڑکانہ

دورِ حال کے وسیع نظر صاحبانِ علم و دانش نے اُس دور کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے اپنے مرید خاص حضرت امیر خسرو کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ پنڈت گوپال داس کے اس سوال کا جواب دیں۔ حضرت امیر خسرو کے لیے یہ ایک چیلنج تھا۔ پنڈت گوپال داس کی بات میں وزن تھا، جس کا برابر کی قوت سے جواب دینے کے لیے وقت درکار تھا۔ انہوں نے ہامی تو بھرلی لیکن جواب دینے کے لیے چھ ماہ کی مہلت طلب کی۔ حضرت امیر خسرو کو اولیا اللہ کے دربار سے یہ مہلت مل گئی۔

چھ ماہ کی مدت ویسے تو کم نہ تھی لیکن چیلنج بھی کچھ کم نہ تھا۔ واپس آکر حضرت امیر خسرو کچھ روز تو غور و فکر میں معروف رہے اور پھر اس کے بعد انہوں نے تلاش شروع کی۔ بہت جلد انہوں نے بارہ خوش گلو نوجوانوں کا انتخاب کیا اور انہیں رسولِ اکرم ﷺ کی حدیثِ پاک 'من کنتُ مولا' منی ہذا علی مولا، ایک خاص انداز لحن سے یاد کروائی۔ جب خوش گلو نوجوانوں کی ٹولی کئی ماہ کی ریاضت کے بعد انداز گائیکی میں ہر لحاظ سے پختہ ہوگئی تو پھر گوپال داس کے سوال کا جواب دینے کی باری آئی۔ شہنشاہ ہند علاء الدین خلجی کا دربار سجایا گیا۔ بھرے دربار میں جہاں شہنشاہ کے علاوہ سیکڑوں عالم اور درباری اشتیاق سے جواب کے منتظر تھے، وہیں گوپال داس بھی متجسس تھا کہ اُس کے سوال کا جواب کس طرح ملتا ہے۔

حضرت امیر خسرو کی ٹولی دربار میں پہنچی اور پھر اس نے بھرے دربار میں جب اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو لوگوں کے دل بھر آئے، آنکھوں سے اشک رواں ہوئے اور دلوں پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ گوپال کو صرف جواب ہی نہیں ملا بلکہ وہ لاجواب بھی کر دیا گیا۔ حضرت امیر خسرو کی سجائی ہوئی اس محفلِ سماع نے اس کی حالت قلب ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ محفل کے کچھ روز بعد تک وہ گومگوں کے عالم میں رہا۔ آخر اس نے دل کی بات مانی۔ توحید کا اقرار کیا اور صرف خود ہی کلمہ نہیں پڑھا بلکہ اپنے کئی سو ساتھیوں سمیت مسلمان ہوگیا۔ تاریخ ہند میں عہد نظامی و خسروی کا پنڈت گوپال داس عبدالعزیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حضرت امیر خسرو کی پہلی قوال ٹولی کا سربراہ صامت بن ابراہیم بن مخدوم بن محمد تھا۔ ان بارہ کے بارہ نوجوانوں کے نام تو ہمیں تاریخ میں نہیں ملتے لیکن اس دور میں لکھے جانے والے موسیقی کے مختلف تذکروں اور زبانی روایات کے مطابق اُن نوجوانوں میں سے چند کے نام تاتار بہلول، حسن، ساونت، باقر اور غفانی تھے۔ حضرت امیر خسرو کی ترتیب دی گئی اس پہلی قوال ٹولی سے برِ صغیر میں موسیقی کے پہلے گھرانے 'قوال بچوں' کی بنیاد پڑی۔ پاکستان میں آج بھی اس گھرانے کے قوال موجود ہیں، جن کا فن کسی تعریف کا محتاج نہیں۔

اگرچہ ایک مکتبۂ فکر حضرت امیر خسرو کو برِ صغیر میں قوالی کا موجد قرار دیتا ہے لیکن دوسرا اس خیال کا حامی ہے کہ اس خطے میں قوالی ان سے پہلے ہی وجود پا چکی تھی۔ اس بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے کئی تاریخی حوالے بیان کیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برِ صغیر میں قول کا وجود تو موجود تھا لیکن بجز اس کے کہ قول کو گانے والے سات آٹھ افراد کی ٹولی ہوتی تھی، گائیکی کے کوئی باضابطہ اصول اور قواعد موجود نہیں تھے۔ حضرت امیر خسرو نے قوالی کی گائیکی کے قوانین بنائے اور اس اسلوب گائیکی کو مختلف اصناف میں تقسیم کیا۔ جن میں اہم ترین اصناف یہ ہیں:

قلبانہ، نقش، گل، ترانہ، ہوا، تلانہ، سہیلہ، بسیط، تروٹ اور رنگ۔

حضرت امیر خسرو کے کمالِ فن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً آٹھ سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی قوالی کی یہ تمام اصناف اسی طرز میں گائی جاتی ہیں جو انہوں ایجاد کی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف قوالی کو ایک مربوط اور منظم شکل دی بلکہ اس کو گائیکی کی مختلف اصناف میں تقسیم کرنے کے علاوہ مختلف تالیں بھی ایجاد کیں۔ ان سے سترہ تالیں منسوب کی جاتی ہیں۔ ان تالوں میں تیسری تال قوالی ہے اور جس قول سے قوالی کی ابتدا ہوتی ہے، وہ اسی تال میں گایا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ برِ صغیر کی کلاسیکی موسیقی کی ابتدا قوالی سے ہی ہوئی ہے لیکن تمام تر عوامی مقبولیت کے باوجود ابتدا میں اسے موسیقی کے تذکروں میں وہ مقام نہیں ملا جس کی یہ حقدار تھی۔ موسیقی کی تاریخ کے تذکروں میں علاء الدین خلجی سے لے کر مغل شہنشاہ شاہجہاں کے پہلے عہد حکمرانی تک، قوال اور قوالی کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ملتا ہے۔ شاہجہاں کے پہلے دورِ حکومت تک یہی صورتِ حال برقرار رہی تاہم اس کے دوسرے دورِ حکومت میں حالات بدل گئے۔ شاہجہاں کے دوسرے عہد حکمرانی سے لے کر اب تک، تاریخ ہند کے صفحات میں قوالی کا تذکرہ بدستور چلا آرہا ہے اور ہر عہد میں فنِ موسیقی کے باب میں یہ نمایاں ہے۔ انہی تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کے عہدِ شاہجہانی میں دو بڑے نامور قوال تھے کبیر اور روضہ۔ کبیر صوفیانہ موسیقی کے نامور موسیقار شیر محمد کے شاگرد

تھے۔ شیر محمد کی علمیت اور موسیقی اور ان کی دسترس کے بارے میں موسیقی کی مشہور تصنیف 'راگ درپن' کے مصنف فقیر اللہ نے لکھا ہے "شیر محمد اتنے طباع ذہن کے مالک تھے کہ انہوں نے اپنی اپج سے قوالی کو ایک نیا رنگ و روپ دیا۔" تاریخ کے صفحات میں قوالوں کے یہ دو نام اہم سنگِ میل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سیاسی اور سماجی اعتبار سے ہندوستان کے رنگین مزاج حکمران محمد شاہ رنگیلا کا عہد چاہے کتنا ہی انحطاط پذیر قرار دیا جائے تاہم یہ حقیقت ہے کہ اُس عہد میں فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی کو بڑا عروج ملا۔ اس دور میں ہندوستان کے کئی قوالوں نے شہرت پائی۔ ان میں نیازی اور تاج خان خاصے معروف ہوئے۔ اُس دور کی ایک دلچسپ اور اہم ترین بات یہ تھی کہ ایک خاتون قوال نے بھی قوالی کی گائیکی میں بہت نام پایا۔ اُن کا نام اللہ بندی تھا۔ تاریخ کے حوالوں سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہندوستان کی وہ پہلی معروف خاتون قوال تھیں، جن کے نام سے مورخینِ ہند صرفِ نظر نہ کر سکے۔

آخری مغل تاجدار ہند شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے دور میں بھی قوالی بدستور پھولی پھلی۔ تاریخ کے صفحات سے اس سلسلے کا ایک اور بڑا نام ملتا ہے اور وہ ہے میاں قطب الدین تان رس خاں صاحب۔ ان کا نسبی تعلق حضرت امیر خسرو کی ترتیب دی گئی اس قوال ٹولی سے تھا جو 'قوال بچوں' کے نام سے مشہور ہوئی تھی۔ بعد کے اَدوار میں قوال بچوں کے گھرانے کے میاں تان رس کی نسل سے جن لوگوں نے قوالی سے رشتہ برقرار رکھا، وہ آج بھی 'تان رسیوں' کے نام سے مشہور ہیں۔ پاکستان میں استاد منشی رضی الدین خاں، فرید ایاز الحسینی، منظور احمد خاں نیازی، بہاء الدین، نصیرالدین، نظام الدین اور مسرور احمد خاں نیازی کا تعلق اسی قوال گھرانے سے ہے۔

☆☆☆

اُنیسویں صدی کے آخر تک قوالی کا تعلق محفل اور اس کی مقبولیت سینہ بہ سینہ سفر کرنے والی عوامی رائے سے جڑی ہوئی تھی لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں ریکارڈنگ، مائیک، گراموفون اور ریکارڈ برِ صغیر میں متعارف ہوئے۔ یوں قوالی کی مقبولیت نے جدید ترقی کے ہمراہ وہ سفر شروع کیا جس میں قوالی سننے کے لیے محفل کے انعقاد اور اس میں موجودگی لازم نہیں رہی۔ قوالی کے سفر کا یہ اہم سنگِ میل تھا۔

گراموفون کے اس عہد میں برِ صغیر کے جن قوالوں کے نام سامنے آتے ہیں اُن میں کالو قوال، پیارو قوال، عظیم پریم

نیوٹرون بم کے علاوہ اب تک دنیا میں جتنے بھی بم تیار کیے گئے ہیں، ان کی ہلاکت خیزی جاندار اشیا کے ساتھ بے جان عمارتوں، مکانوں، سڑکوں، پلوں غرضیکہ ہر شے کو متاثر کرتی تھی لیکن نیوٹرون بم کی خاصیت یہ ہے کہ اسے جہاں بھی گرایا جائے گا، وہاں عمارتیں، سڑکیں اور دیگر بے جان چیزیں تو بالکل محفوظ رہیں گی مگر جتنے بھی جاندار خصوصاً انسان اس کے دائرۂ اثر میں آئیں گے، وہ آناً فاناً اس طرح ہلاک ہو جائیں گے جیسے جراثیم کش ادویات چھڑکنے سے مچھر، مکھی، کھٹمل، لال بیگ وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔

ایک نیوٹرون بم زمین سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹ جائے تو اطراف کے ایک ایک ہزار فٹ کے علاقوں میں موجود انسانوں کو قے ہونا شروع ہو جائے گی۔ وہ اپنا جسمانی توازن کھو بیٹھیں گے اور ناکارہ ہو کر دو دن کے اندر اندر ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر نیوٹرون بم فضا میں پھٹنے کے بجائے زمین پر گرے تو سیکڑوں میل تک بلند و بالا عمارتیں اور لہلہاتے کھیت تو نظر آئیں گے، کوئی جاندار ہستی نظر نہیں آسکے گی۔

نیوٹرون بم بنانے والی سپر پاورز کو دوسرے مہلک بموں کے مقابلے میں نیوٹرون بم میں کچھ خوبیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً اس کی زد میں آنے والی عمارتیں اور فصلیں محفوظ رہیں گی۔ اس سے خارج ہونے والی مہلک شعاعیں جلد بے اثر ہو جائیں گی۔ اس کے ذریعے تابکاری بھی نہیں پھیلے گی۔ اس بم کی تیاری میں نہ ری ایکٹرز کی ضرورت ہے، نہ پیچیدہ تنصیبات کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اخراجات بھی بہت کم ہوں گے۔

مرسلہ: شمیم فاخر، جیکب آباد

راگی اور کلن خان قوال کے علاوہ ایک نام ایسا بھی ہے جو اُس وقت گمنام تھا لیکن پھر پاکستان کا نام ور قوال کہلایا۔ یہ تھے غلام فرید صابری قوال۔

پیارو قوال اور کالو قوال کی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کی گئی قوالیوں کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ انہیں 1920ء کے عشرے میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اُن دنوں گراموفون ریکارڈنگ کے حوالے سے کلکتہ مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ دونوں قوال وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔

معروف براڈ کاسٹر رضا علی عابدی اپنی کتاب 'نغمہ گر' میں لکھتے ہیں:

''پرانی قوالیوں کا مشاہدہ بہت مختلف اور دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ پیارو، کالو اور عظیم پریم راگی کسی پارٹی کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا گاتے تھے اور ان کے ساتھ ہمنواؤں کا تالیاں بجانے کا بھی رواج نہیں تھا۔ کہیں کہیں پر اُن کے ہمراہ اُس وقت کے جدید مغربی ساز بھی سنائی دیتے تھے۔ کلن خان کی قوالی کے ساتھ تالیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ایک ہمنوا ہوا کرتا تھا۔ کلن کے ہر ریکارڈ پر یہی لکھا ہوتا تھا 'کلن قوال اور ہمنوا۔' مجھے تو یاد نہیں کہ کہیں اُس غریب ہمنوا کا نام بھی دیا گیا ہو حالانکہ وہ کلن کے ساتھ اپنی آواز اور اپنے سُر اس خوبی سے ملاتا تھا کہ بعض اوقات پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب کلن گا رہے ہیں اور کب ہمنوا۔ بہت بعد میں حال کھلا کہ وہ پیچھے پیچھے چلنے والا قوال آگے چل کر بہت آگے نکل گیا اور بڑا قوال بنا اور وہ تھے بڑی بڑی زلفوں والے اور بیچ میں اپنی پاٹ دار آواز میں 'اللہ' کا نعرہ لگانے والے غلام فرید صابری قوال۔

کلن خان ہندوستان کے مشہور شہر میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ کلن نے بھی غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ایک بار پاکستان بھی آئے جہاں ای ایم آئی ریکارڈنگ کمپنی نے ان کا لانگ پلے ریکارڈ تیار کیا۔ زیادہ تر قوالیوں میں تنہا وہ خود اور ایک ہمنوا ہے۔ چند ایک میں ان کی پارٹی بھی ہے جو عام روایت کے مطابق تالی سے سنگت کرتی ہے...... عظیم پریم راگی بھی اپنے وقت کے بڑے قوال تھے۔ شاعر تھے اور اپنا کلام خود گاتے تھے۔ ان کی ایک قوالی 'سکھی ری ڈولی میں ہو جا سوار' نے وہ شہرت پائی کہ سب سے بڑی گراموفون کمپنی جو ہز ماسٹرز وائس کے نام سے ریکارڈ بناتی تھی، نے عظیم پریم راگی کے ریکارڈ بنانا چاہے مگر ہمارے قوال کو یہ بات پسند ہی نہ تھی ان کے دینی کلام کے ریکارڈ پر کتے کی تصویر بنی ہو، چنانچہ معاملہ طے نہ ہو سکا۔ بمبئی کی ایک اور ریکارڈنگ کمپنی نے ایسے ریکارڈ بنانے کی پیشکش کی جس پر ڈاک کے ٹکٹ کی طرح خود عظیم میاں کی تصویر چھپی ہو۔ اس کے بعد ان کے سارے ریکارڈ اسی شان سے بنے۔ عظیم پریم راگی نے درجنوں قوالیاں ریکارڈ کرائیں۔ ان کی ایک قوالی کے بارے میں مشہور ہے کہ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی فرمائش پر لکھی گئی جس کا مقصد برِصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کا پورا کنبہ پاکستان میں آباد ہوا۔ ان کے ایک بیٹے پریم راگی ثانی کراچی میں وکالت کرتے ہیں اور دوسرے بیٹے سلیم شہزاد موسیقار اور گلوکار رہیں۔''

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کی ابتدا میں برِصغیر میں سنیما اور فلم کا وجود ظہور پذیر ہوا۔ تفریح کے اس انوکھے ذریعے نے بہت جلد ہندوستان کی عوام کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ کچھ ہی عرصے میں خاموش فلموں کو زبان عطا ہوئی تو اُن کی شہرت دو چند ہو گئی۔

فلم، سماج سے مستعار لی گئی کہانیوں کو ترتیب سے عکس بند کر کے بڑے پردے پر پیش کرنے کا نام ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے فلمی پردے پر جس سماج کی منظر کشی کی جا رہی ہو، اُس میں عظیم تہذیبی روایات نہ پیش کی جائیں۔ فلم کے اس ارتقائی دور میں فلم سازوں نے قوالی کو بھی بڑے پردے پر پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ قوالی کی عوامی سطح پر پذیرائی اور مقبولیت تھی کہ ہر فلم میں ایک قوالی ضرور ہوتی تھی جسے کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ یوں 'فلمی قوالی' کی اصطلاح مشہور ہوئی۔

فلمی قوالی نے بھی انداز کے کئی چولے بدلے۔ محبوبِ مجازی کی شان میں مدح سرائی اور ہجر کے شکووں اور وصال کی تمنا کے اظہار سے فلمی قوالی کا ایک نیا انداز متعارف ہوا۔ اللہ بندی برِصغیر کی شاید پہلی قوال خاتون تھی لیکن فلمی قوالی کی عوامی پذیرائی نے سیدھے سادے فلمی گائیکوں کو مجبور کر کے قوال کے تخت پر لا بٹھایا۔ اگرچہ تقسیمِ ہند سے قبل برِصغیر میں فلمی قوالی خاصی مقبول ہو چکی تھی لیکن تقسیم کے بعد بھی اسے مدتوں زوال نہیں آیا۔ ستر کی دہائی کے آخر تک فلمی قوالی ہندوستان و پاکستان کی اکثر فلموں کا جان دار حصہ ہوا کرتی تھیں۔ یوں ایک طویل عرصے تک عشقِ مجازی کے رنگ میں رنگی قوالی فلم کے پردوں پر جلوہ گر ہو کر اپنے ناظرین کو لبھاتی رہی۔ یہی نہیں، فلمی قوالی کی شہرت نے ہندوستان میں خاتون قوالوں کی ٹولیوں کو بھی جنم دیا۔ قوالی میں تکرار کی رسم ایجاد ہوئی تو مرد و زن قوال ٹولیاں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ یوں مرد و عورت کے ازلی تعلق اور باہمی تکرار نے موسیقی کے سُروں اور تال کی لے پر ایک نئے حوالے سے عوامی پذیرائی حاصل کی۔

تقسیم کے وقت برِصغیر پاک و ہند میں جن روایتی قوالوں کو ملک گیر مقبولیت حاصل تھی، ان میں مبارک علی خاں، فتح علی خاں، منظور احمد خاں نیازی، کلن خاں، بچے خاں، عظیم پریم راگی، رشید احمد فریدی، آغا بشیر احمد، محمد علی فریدی، سنتو خاں، حافظ عطا محمد، صالح محمد اشرفی، فاروق احمد خاں نظامی اور شنکر شمبھو قوال نمایاں ہیں۔

آج برِصغیر میں روایتی قوالی کی گائیکی کے جو مختلف انگ مروج ہیں، انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا روایتی یا کلاسیکی انگ، دوسرا پنجاب انگ، تیسرا بمبئی انگ۔ اس کے علاوہ ایک چوتھا انگ بھی ہے جس کی انتہا پاکستانی قوال نصرت فتح علی خاں کے ساتھ عالمی شہرت کی بلندیوں تک پہنچی۔ اس انگ کو کوئی سا بھی نام دے لیں تب بھی تاریخ میں یہ عہد نصرت فتح علی کے نام سے ہی جانا جائے گا۔ یہ وہ دور ہے جب قوالی میں روایتی سازوں کے ساتھ آرکسٹرا اور جدید آلات پہلی بار استعمال کیے گئے اور یوں مشہور ہوئے کہ تاریخِ قوالی پر انمٹ نقش چھوڑ گئے۔ برِصغیر کی روایتی قوالی کا یہ جدید رنگ اپنی جغرافیائی حدود سے نکل کر مغرب کی بے ہنگم موسیقی کے میدانوں میں جا کر اُن پر فاتح بن بیٹھا۔

ناقدینِ موسیقی اس بات پر متفق ہیں کہ نصرت فتح علی خاں نے قوالی کو جدید رنگ بخشا ہے۔ انہوں نے روایتی آلاتِ موسیقی کے ساتھ ساتھ جدید سازوں بالخصوص ڈیجیٹل آلاتِ موسیقی کے استعمال کی وہ روش ڈالی جو اُن کی موت کے پندرہ برس گزر جانے کے باوجود بدستور مستعمل ہے۔ نصرت فتح علی خان کا اندازِ گائیکی اور استعمال کیے جانے والے آلاتِ موسیقی آج بھی نئی نسل میں مقبول ہیں۔ نصرت فتح علی خاں کے بعد ان کے جانشین راحت فتح علی خان اور ایاز صابری نے بھی اس اسلوب کو اپنایا اور بدستور شہرت کی بلندیوں کی جانب گامزن ہیں۔

پاکستان میں روایتی قوالی کی گائیکی کے حوالے سے گزشتہ چند دہائیوں کے دوران جو نام معروف ہوئے اور عالمی شہرت کی بلندیوں کو چھوا، اُن میں صابری برادران اور عزیز میاں قوال کی گائیکی اور اسلوب کے بہت چرچے ہیں۔ ان کا انداز، ساز اور بول...... ہر لحاظ سے برِصغیر کی اُس کلاسیکی قوالی کی نمائندگی کرتے رہے تھے جس میں عشقِ حقیقی اور تصوف غالب رہا ہے۔

سلسلۂ تصوف میں قوالی یا سماع کو روحانی بالیدگی کا ایک اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے۔ روحانی سلسلۂ چشتیہ میں قوالی کو نہایت اعلیٰ مقام پر فائز کیا جاتا ہے۔

سلسلۂ تصوف میں سماع کے آداب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ محفلِ سماع کے لیے بیان کردہ شرائط طویل ہیں۔ ان میں قوال کی اہلیت کو بھی طے کر دیا گیا ہے جس کے مطابق لازم ہے کہ قوال شریعت کا احترام کرنے والا ہو۔ دل دنیا کے دھندوں سے خالی اور طبیعت لہو و لعب سے متنفر ہو۔ سماع کے دوران سامع کو طبیعت کے زور اور وجد کی جلن میں فرق کرنا سیکھنا چاہیے۔ سننے والے کو اتنی دانش ہونی چاہیے کہ فیضانِ حق کو قبول کر سکے۔ روایتی طور پر سلسلۂ تصوف میں سماع کے لیے پیر کی جسمانی موجودگی ضروری ہے تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان پابندیوں میں بھی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اب عام طور پر منعقدہ محفلِ سماع میں اب یہ تکلف بہت کم دیکھنے میں آتا ہے تاہم اب بھی بعض درگاہوں پر ہر ہر جمعرات کو منعقدہ ہفتہ وار یا سالانہ عرس کے موقع پر ہونے والی قوالی میں پیر یا سجادہ نشین کی موجودگی لازم ہوتی ہے۔

سماع یا قوالی میں وہ ساز استعمال ہوتے ہیں جن کی سنگت سے پیغامِ حق سامع کو عالمِ وجد میں لے جاتا ہے۔ روایتی طور پر سماع کے لیے طبلہ اور ڈھولک لازم آلات ہیں لیکن سولہویں صدی عیسوی میں ہارمونیم بھی اس میں شامل ہو گیا۔ اب اسے قوالی کے آلاتِ موسیقی میں لازمی سمجھا جاتا ہے۔

سلسلۂ تصوف میں سماع یا قوالی کو روح کی طہارت اور خود کو پہچاننے کا راستہ بتایا گیا ہے۔ فنِ موسیقی اور گائیکی کے ناقدین کہتے ہیں کہ سماع صرف لذتِ سخن اٹھانے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک باقاعدہ فن ہے جو بندے کو خدا سے ملانے کا روحانی ذریعہ ہے...... یہ وہ مکالمہ ہے جو بندے اور خالق کے درمیان ہوتا ہے...... یہ وہ گہرائی ہے جو قلب کو گداز بناتی ہے، روح کو سکون، پاکیزگی اور احساسِ مسرت بخشتی ہے۔

جس شے کا تعلق خالق اور معبود...... اُن جانے سے جاننے اور...... روح کو مسرت سے مالا مال کر دینے سے ہو، وقت کی گردش اس پر کبھی بھی گرد نہیں ڈال سکتی۔ یہ صنف صوفی شعرا کے پیغامِ محبت کو عام کرنے کا سب سے مقبول عوامی ذریعہ ہے۔ کئی صدیوں سے صوفی قول، قوال اور محفل کا تعلق قائم ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید مضبوط ہوا ہے۔ جب تک انسان میں خود کو جاننے کی روحانی تڑپ موجود ہے جسم کا روح کے سنگ، یہ روحانی سفر بھی جاری رہے گا۔

www.paksociety.com

عزم کی پیکر

زین مہدی

وہ ایک کھلنڈری لڑکی تھی مگر کچھ کردکھانے کے عزم سے سرشار تھی۔ اس نے صرف 14 سال کی عمر میں پاکستان کے بڑے بڑے اخباروں میں مضامین لکھنا شروع کردیا پھر امریکا پہنچی تو وہاں کے اخباروں میں بھی دھوم مچادی۔ اس کی ہر تحریر چونکادینے والی ثابت ہوتی۔ مگر جلد ہی اس نے اندازہ لگالیا کہ وہ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے زیادہ بڑے حلقے تک اپنی بات پہنچاسکتی ہے۔ اس شعبے میں آتے ہی اس نے وہ کچھ کردکھایا جس کا خواب ایک دنیا دیکھتی ہے، خود بمبئی کی فلم نگری والے بھی پچاس سال سے یہ خواب دیکھ رہے ہیں۔

[illegible] آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والی دوشیزہ کی روداد حیات

وہ فطرتاً مہم جو تھی، بچپن سے ہی خطروں سے کھیلنے کی عادی۔ ہر وہ کام کرجاتی جس کو سن کر لوگ لرز جاتے تھے۔ ابھی وہ اسکول ہی میں تھی، کراچی گرامر اسکول میں اور عمر بھی کیا تھی؟ صرف 14 سال، اس چھوٹی سی عمر میں اس نے بڑے حوصلے کا کام کر دکھایا۔ بہت بڑی جسارت کردی، ایسا کام کر دکھایا جس سے ایک ہل چل سی مچ گئی۔ چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ جو اس اقدام سے متفق تھے وہ بھی اسے ڈرا رہے تھے۔ کھلے عام کہہ رہے تھے۔ یہ جسارت اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا عقل مندی نہیں ہے۔ اس سے جان کا بھی خطرہ ہے۔ اسے یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔

دشمن تو پھر دشمن ہوتے ہیں۔ وہ تو سراپا بھڑک اُٹھے تھے۔ دھمکیوں پر دھمکیاں دینے لگے تھے۔ کیونکہ وہ صاحب قوت تھے۔ بااثر تھے۔ ان کی پہنچ دور تک تھی۔ وڈیرے اور صاحب اقتدار تھے۔ اس بچی نے ان کو للکار دیا تھا۔ ان کے سپوتوں کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس نے آرٹیکل کے

ذریعۂ اخبار کا سہارا لے کر عوام پر ایک ایک راز آشکار کر دیا تھا کہ ان صاحب ثروت لوگوں کے لاڈلے کیا کیا گل کھلا رہے ہیں۔ اخبار کوئی معمولی نہیں تھا کہ اس پر ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتے، اسے دھونس اور دھمکیوں سے تصحیح شائع کرنے پر مجبور کر دیتے۔ یہ انگریزی کا سب سے بڑا اخبار تھا اس لیے وہ لوگ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ڈر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ ان کے پاس ثبوت ہے، اگر چوں بھی کیا تو اخبار والے ناطقہ بند کر دیں گے۔ اس لیے انہوں نے چھپ کر تیر چلانے کا پلان بنا لیا اور وال چاکنگ شروع کردی۔ کسی لڑکی کے خلاف وال چاکنگ کی جائے تو وہ اس کی بدنامی کا سبب بنتا ہے۔

وال چاکنگ کی اطلاع کسی اور نے نہیں خود اس کے والد نے دی تھی۔ کسی جوان لڑکی کا نام دیواروں پر غلط انداز میں لکھا جائے تو ہر باپ کے لیے دل شکنی کا سبب بنتا ہے۔ ان کا دل بھی دکھا ہوگا۔ وہ غصے میں بھرا تھے تھے۔ مگر بے وقوف نہ تھے۔ انہوں نے بیٹی سے حقیقت پوچھی پھر کہا" تم میں اگر حوصلہ ہے، حق پر ہو تو ڈٹی رہو۔ میں حق کے ساتھ رہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ہوں۔"

باپ کے ایک جملے نے اس میں تازگی بھر دی۔ وہ خود کو قوی تر محسوس کرنے لگی اور ایک نئے عزم کے ساتھ سینہ سپر ہوگئی۔ جرم کرنے والے کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں، کتنی ہی بہادری کا مظاہرہ کیوں نہ کریں۔ فطرتاً بزدل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کا نہ تو کچھ بگاڑ سکے اور نہ اسے روک سکے۔ کچھ دن پاگل کتوں کی طرح بھونکتے رہے پھر خاموش ہوگئے۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ اس نے اے لیول کرلیا۔ اب اسے آگے کی تعلیم کی فکر تھی۔ اسے کچھ کر دکھانے کی امنگ تھی اسی لیے اس نے خاندانی روایت سے بغاوت کر

دی۔ اس نے وہ فرمائش کردی جو آج تک خاندان کی کسی لڑکی نے نہیں کی تھی۔

وہ لڑکا تو تھی نہیں کہ جب چاہتی جہاں چاہتی اکیلی چلی جاتی' اکیلی رہ لیتی۔ ایک لڑکی' خاص کر پاکستانی لڑکی کا گھر سے ایک رات بھی باہر گزارنا ناممکن سی بات ہے۔ مگر وہ اڑ گئی تھی کہ امریکا میں ہی تعلیم حاصل کرے گی۔ کسی لڑکی کے لیے گوروں کے دیس میں جاکر تعلیم حاصل کرنا آسان نہیں۔

پانچ بہنوں اور ایک بھائی میں وہ سب سے بڑی تھی۔ اس کا فیصلہ اس کی چھوٹی بہنوں پر بھی اثر انداز ہوتا (بعد میں یہ ثابت ہوا۔ کیونکہ بہنیں بطور بزنس ویمین بن کر ابھریں) اس لیے والد نے صاف لفظوں میں منع کر دیا۔ تب اس نے ماں کی منتیں شروع کردیں۔ ماں کا دل موم ہوتا ہے۔ وہ پگھل گئیں' مگر والد ہنوز اپنی بات پر اڑے رہے۔ کسی طور مان کر نہیں دے رہے تھے۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ وہ باپ جو اس کی ذرا سی ضد پر اس کے آگے جھک جاتا تھا۔ وہ اس کی اس بات پر کسی طور راضی نہیں ہورہے تو اس نے ایک نئی راہ کا انتخاب کرلیا۔ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ نوکرانیوں کو جھڑک کر بھگا دیا۔ بہنوں کی التجا کو ٹھکرا دیا۔ ماں کی منتوں کو مسترد کر دیا۔

گھنٹے پہر میں بدلے اور پہر نے رات کا چولہ پہن لیا۔ سب بے چین تھے مگر وہ دروازہ بند کیے پڑی رہی۔ وہ رات گزری صبح ہوئی اور پھر سب کی منتیں شروع ہوگئیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور تیسرا دن شروع ہوگیا۔

تین دن کی بھوک اب اس کی طبیعت بگڑنے لگی تھی۔ وہ باپ جو اس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہوجایا کرتا تھا۔ اس خبر پر اسے بے چین ہونا ہی تھا۔ انہوں نے بیٹی کو طلب کرلیا۔

''یہ کیا شروع کیا ہے؟''

سوال کا جواب دینا ضروری تھا۔ وہ بولی ''میں نے تو بس ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا بھی تو ضروری ہے۔''

''ہاں یہ تو ضروری ہے۔'' انہوں نے رسان سے جواب دیا ''یہی میں کہہ رہا ہوں کہ جس یونیورسٹی میں کہو میں داخلہ دلا دیتا ہوں۔''

''مگر میں پاکستانی یونیورسٹی میں پڑھنا نہیں چاہتی۔ پرائیویٹ امتحان بھی نہیں دینا چاہتی۔ میں امریکی یونیورسٹی میں داخلہ لوں گی۔ وہاں جاکر

شرمین عبید چنائے

☆......پہلی غیرامریکی ہیں جنہیں لیونگ اسٹون ایوارڈ ملا۔

☆......پہلی پاکستانی ہیں جن کی فلمیں عالمی پیمانے پر اہم مانے والے جانے تمام بڑے چینلز پر دکھائی گئیں' جن میں CNN-P.B.S-H.B.O۔ چینل 4 اور الجزیرہ شامل ہیں۔

☆......پہلی مسلم دنیا کی خاتون ہیں جنہیں آسکر اور Emmy دونوں بڑے ایوارڈ ملے۔

☆......پہلی پاکستانی ہیں جنہیں 2007ء کی دس خواتین میں پہلا نمبر ملا۔

☆......پہلی پاکستانی خاتون ہیں جنہیں عالمی پیمانے پر خطروں سے کھیلنے والی فلم ساز تسلیم کیا گیا۔

☆☆☆

وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے پاکستان کی پہلی آسکر ایوارڈ جیتنے والی خاتون شرمین عبید چنائے ملک کا اعلیٰ سول ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے علاوہ شرمین نے مندرجہ ذیل ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

2003ء......اوورسیز پریس کلب ایوارڈ' نیویارک

2004ء......سینے گولڈن ایگل ایوارڈ' واشنگٹن

پڑھوں گی۔'' اس نے اپنا مطالبہ پھر سے دُہرا دیا۔

''مگر یہ تو سوچو ایسا کیسے ممکن ہے؟ یورپ جاکر تم کسی یونیورسٹی میں داخلہ لو۔ کسی ہاسٹل میں اکیلے رہو، گھر والوں

سے اتنی دور جانے کی اجازت میں کیسے دے دوں؟''

''کیوں اس میں کیا قباحت ہے؟''

''کیونکہ تم ایک لڑکی ہو۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔''

''مگر آپ تو خود کہتے ہیں کہ یہ میری بیٹیاں نہیں میرے پانچ بیٹے ہیں۔ انہیں کوئی بیٹی نہ کہے۔ اب ایسی پابندی لگا کر آپ ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ جب آپ مطمئن ہیں تو پھر دوسروں کی باتوں کی پروا کیوں کرتے ہیں؟''

اس نے کچھ اس طرح کہا' اور حالات کچھ اس طرح بنا دیے تھے کہ الہ آباد یوپی سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے معزز خاندان کے فرد شیخ عبید کو جھکنا ہی پڑا۔ باپ کو اجازت دینا ہی پڑی۔ جوس کا گلاس تھما کر شکست تسلیم کرنا ہی پڑی۔

انسان خوش ہو تو بھی آنسو نکل آتے ہیں اور غم میں بھی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی سچائی ہے کہ جب خوشی سے آنسو نکلتے ہیں تو پہلا قطرہ داہنی آنکھ سے ٹپکتا ہے مگر جب غم سے آنکھیں برستی ہیں تو بائیں آنکھ سے پہلا قطرہ ٹپکتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بھی جو پہلا قطرہ ٹپکا تھا وہ داہنی آنکھ سے نکلا تھا۔ پھر تو ایک سیلاب سا امڈ پڑا۔ وہ روئی تو پورا گھر رو پڑا۔ اس کو سب نے حوصلہ دیا اور وہ نئے سفر پر چل نکلی۔ اس نے اسمتھ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ وہ اکنامکس کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

ہر سال ایک بہت بڑی تعداد میں لوگ گوروں کے اس دیس میں آتے ہیں۔ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ مگر وہ ایسا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہاں بھی اس نے غیر نصابی سرگرمیوں کو اپنائے رکھا کیونکہ وہ اپنا

Transgendars

یہ ایک ایسے موضوع پر بنائی گئی فلم ہے، جس طرف عام لوگوں کی توجہ جاتی ہی نہیں ہے اور نہ عام قاری اس موضوع کو چھیڑتے ہیں۔ دنیا بھر میں بہت کم ہی اس سے دیکھی جانے والی اس صنف پر بہت کم لکھا گیا ہے چہ جائیکہ فلم بنانا، اس تیسری صنف پر طویل کہانی پہلا حصہ 2011ء از سسپنس کو حاصل ہے یا پھر سرگزشت کو جو ان سے دور دور کو، ان کی زندگی کی باریکیوں کو نہایت چابک دستی سے سامنے لایا۔ شرمین عبید چنائے نے بھی اپنی فلم میں ان کے دکھ درد کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ زبان سے تعریفی کلمات بے ساختہ نکل آتے ہیں۔ تین زنخے جو الگ الگ جگہ کے، الگ الگ خواب آنکھوں میں سموئے ایک ساتھ رہ رہے ہیں، ان کے گرد کہانی کو گھماتے ہوئے ان کے مسائل اور دکھ درد کو سامنے لایا گیا ہے، کچھ ایسے انداز میں کہ ہر دردمند آنکھیں بھر آئیں۔ شرمین کی یہی خوبی ہے کہ وہ دستاویزی فلموں میں بھی کہانیت کا عنصر رکھتی ہے اور یہی بات اس کی کامیابی کی دلیل بنتی ہے، اسے ممتاز ثابت کرتی ہے۔ فلمی صحافت میں نمایاں مقام رکھنے والے صحافیوں کا کہنا ہے کہ شرمین کی اس خوبی کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ کمرشل فلمیں بنانے لگی تو ممبئی کی فلموں سے اچھا بزنس کرے گی کیونکہ وہ انسانی نفسیات کا بھرپور ادراک رکھتی ہے۔

تشخص چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی۔ یوں بھی وہ فطرتاً مہم جو تھی۔ نت نئے تجربے کرنا' معرکے سر کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اس لیے اس نے اس مشکل ترین امر کو بھی سہل کرلیا تھا۔ پھر سے اپنے شوق کی تکمیل کرنے لگی تھی۔ قلم کاغذ سے رشتہ استوار کرلیا تھا۔

یورپ میں قلمکاری آسان نہیں' وہاں کے قارئین بالغ النظر ہیں۔ ہر نقطے سے نکتہ نکالتے نہیں تھکتے۔ ایسے قارئین کے لیے مواد فراہم کرنا کار ہائے دشوار ہے مگر وہ اپنی کوشش میں معروف رہی۔ دماغ دار قلمکاروں کے درمیان اپنی جگہ بناتی رہی۔ ایک کے بعد ایک گہرائی گیرائی سے بھرپور آرٹیکل لکھتی رہی۔

اس کے مضامین پسند بھی کیے جا رہے تھے کیونکہ اس کے آرٹیکل اس رُخ کو سامنے لاتے جو امریکی صحافی لانے سے کتراتے تھے۔ وہاں والے افغانستان کو

www.paksociety.com

صرف دہشت گردی کے نام پر پہچانتے تھے۔ اس لیے کہ یہ ایک سازش تھی جس کے تانے بانے بُنے جارہے تھے۔ وہ مسلمانوں کے کردار کو مسخ شدہ دکھانے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ بات اسے کھل رہی تھی۔ اس نے افغانستان کے اصل مسائل کو اُٹھانا شروع کیا۔ جنگ و جدل کی وجہ سے وہ ملک مسائل کا گڑھ بن چکا ہے اس بات پر وہ زور دیتی۔ امریکا میں رہ کر وہ پاکستان اور مسلمانوں کا دفاع کر رہی تھی۔

وہ امریکا میں رہ رہی تھی۔ اسمتھ کالج سے اکنامکس میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کرچکی تھی۔ اس کے بہت سارے آرٹیکل پذیرائی پاچکے تھے۔ لوگوں میں پہچان بن چکی تھی۔ وہ یہاں آکر خوش تھی کہ یکایک اس شہر کا ماحول بدل گیا۔ وہی ملک جہاں مسلمانوں کو خوب عزت ملتی تھی۔ ایک لمحے میں وہ شہر بدل گیا۔ ہر ایک کی نگاہیں بدل گئیں۔ ہر آنکھ میں نفرت اُتر آئی۔ ٹوئن ٹاور کی تباہی برسوں کی دوستی، یاری، شفقت محبت کی تباہی بن گئی۔ آپسی میل ملاقات تک بند ہو گئی، اس گھٹن بھرے ماحول سے وہ بھی گھبرا گئی اور لاتعداد پاکستانیوں کی طرح وہ بھی پاکستان لوٹ آئی۔

وہ دسمبر 2001ء میں پاکستان آئی تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر بھی اس کا بے چین دل رام نہ ہوا۔ اسے صحافت کا چسکا پڑ ہی چکا تھا۔ ہر صحافی کی طرح وہ بھی ہر تصویر کا دونوں رُخ نظروں میں رکھتی۔ تاریک رُخ پر زیادہ توجہ دیتی۔ مسائل کو ڈھونڈنے میں لگی رہتی۔ افغانستان کی خانہ جنگی نے کس طرح لوگوں کی زندگی کو داغدار کردیا ہے وہ اس بارے میں زیادہ غور کرتی۔ اسی دوران اس نے کراچی کی سڑکوں پر بج بجاتے افغان بچوں کو دیکھا۔ ان بچوں کو جو کچرے سے رزق تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کل تک آرام و آسائش بھری زندگی گزار رہے تھے مگر آج زندگی بچانے کے لیے۔ زندہ رہنے کے لیے کچروں سے رزق تلاش کررہے تھے۔ اس نے ان کی زندگی میں جھانکنا شروع کردیا۔ ان کے انٹرویو کیے۔ حالات سے اور مسائل کو اُجاگر کرنے کے لیے قلم کا سہارا لیا۔ اسی دوران اس نے سوچا کہ پرنٹ میڈیا کا حلقہ محدود ہوتا جارہا ہے۔ اگر کچھ لکھا جاتا ہے تو اسے قاری پڑھ کر صرف تصور میں پس عکس دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اسے سلولائیڈ پر لایا جائے تو وہ زندہ نظر آتا ہے۔ ان مسائل کو اسکرین پر لانا زیادہ اہم ہے، اس خیال کے آتے ہی اس نے لائحہ عمل کی تیاری شروع کردی۔

کسی کام کو کرنا ہے یہ سوچ لینا بہت آسان ہے مگر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل ہے۔ جس کام کو کرنے کا اس نے سوچا تھا اس کے لیے وسائل کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ لکھنے کے لیے قلم اور کاغذ کافی ہے مگر الیکٹرونک میڈیا کے لیے کچھ تیار کرنے کے لیے بہت زیادہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ پورا گھڑاگ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں امریکا کے تقریباً سو سے زائد میڈیا آرگنائزیشن سے استدعا کی لیکن کوئی بھی اس کی بات سننے پر تیار نہ ہوا۔ سب نے اس کی ون لائن اسٹوری کو ریجیکٹ کر دیا جس کا ذکر وہ لیلیٰ کاظمی کو دیے گئے انٹرویو میں کرتی ہے "میری درخواست اس لیے مسترد ہورہی تھی کہ میں امریکی شہری نہیں تھی اور نہ میرے پاس فلمی صنعت کا کوئی تجربہ تھا۔"

وہ مایوس ہورہی تھی کیونکہ روس کے چلے جانے کے بعد مغربی میڈیا کی افغانستان میں دلچسپی صفر ہوگئی تھی۔ اس نے لاکھ کہا کہ افغانستان صرف جنگی میدان نہیں، بہت سے مسائل کی آماجگاہ بھی ہے، ان مسائل کو ناظرین تک پہنچنا چاہیے مگر اس کی ون لائن اسٹوری کہیں سے منظور ہوکر نہیں دے رہی تھی، لیکن اس نے تو ہار ماننا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنی کوشش میں لگی رہی۔ اس نے نیویارک ٹائمز ٹی وی کو ایک ای میل بھیجا۔ میل میں اس نے ون لائن بھیجی تھی۔ ان لوگوں کی بھی سمجھ میں ون لائن نہیں آئی۔ انہوں نے گزارے لائق سمجھ کر اخراجات کا صرف تھوڑا سا حصہ دینے کی منظوری دے دی، پھر اس کے کالج نے بھی معمولی سی مدد دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس نے اسی کو بہت سمجھا اور میدان میں اُتر گئی۔ مگر اس سے پہلے اس نے نیویارک ٹائمز ٹیلی ویژن ڈویژن سے دو ہفتے کا کریش کورس کیا کہ کیسے ڈائرکشن دی جاتی ہے، کیمرے اور آواز کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کی دلچسپی دیکھ کر اسی وقت پروفیسر ٹیڈ گلیسر نے اندازہ لگالیا تھا جس کا اظہار بھی کیا کہ یہ لڑکی بہت آگے جائے گی کیوں کہ اس میں لگن بھی ہے اور آگے بڑھنے کا جذبہ بھی۔

اب اجازت ملی تو وسائل کی کمی آڑے آنے لگی۔ اس کے پاس ٹیم نہیں تھی۔ تجربے کار لوگ نہیں تھے۔ جن سے بھی اس نے کام لینا چاہا وہ انکار کرگئے۔ اس کا ذکر اس نے یوں کیا "جب میں چھوٹی سی تھی تو محسوس کرتی تھی کہ ہم پاکستانی ہوکر بھی پاکستانی فلمیں نہیں دیکھتے، عام لوگ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ پاکستانی فلمیں کمزور

پٹنے لگی تھیں۔ تکنیکی اعتبار سے انتہائی ناقص، کہانیت پر بھی زور نہیں دیا جارہا تھا۔ میں نے انہی خامیوں کو مدنظر رکھا اور ان خامیوں سے بچنے کی خاطر اچھے لوگوں کی تلاش شروع کردی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ایکوپمنٹ کی تلاش میں لگ گئی۔"

بڑی مشکل سے اسے ایک کیمرا مین ملا مگر وہ ان معنوں میں کورا تھا کہ اس نے اب تک ایک بھی دستاویزی فلم نہیں بنائی تھی۔ اس کا اسے ذرا بھی تجربہ نہیں تھا، عام فلموں میں اسکرپٹ پہلے تیار ہوجاتی ہے اور اس پر ہی کام ہوتا ہے مگر دستاویزی فلموں میں اُلٹ ہوتا ہے۔ شوٹنگ پہلے ہوتی ہے اور اسکرپٹ بعد میں لکھا جاتا ہے۔ یعنی اس انداز میں کیمرا مین نے کام نہیں کیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ ملا تھا اس لیے بہ حالت مجبوری اس نے اسی کیمرا مین کو ساتھ لیا اور کام کو فائنل کرنے لگی۔

اب اسے ایک ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی ضرورت تھی۔ بڑی تلاش کے بعد جو ساؤنڈ مین ملا تو وہ بھی کورا نکلا۔ اس کے لیے بھی یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس نے کلیدی کام کے لیے تو باہر کے لوگوں کو بلالیا مگر دیگر امور کے لیے اس نے اپنے ہم وطنوں کو ترجیح دی۔ مگر انفرادیت بھی قائم رکھی۔ اس نے یونیورسٹیز سے آنے والوں کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ نئی پود تجربے کرنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ گویا تجربے سے عاری لوگوں کی ٹیم بن گئی۔

شوٹنگ شروع ہوئی۔ وہ پوری محنت سے اپنے کام میں لگی رہی۔ محنت اور لگن سے اس نے خود بھی کام کیا اور دوسرے لوگوں سے بھی کام لیا لیکن جب ایڈیٹنگ کا مرحلہ آیا۔ پروسیسنگ کی ضرورت پڑی تو اس نے پھر سے امریکا کا رُخ کیا کیونکہ وہ عالمی پیمانے کا کام چاہتی تھی جس کے لیے پاکستان کی کسی لیبارٹری میں سہولت نہیں تھی۔ مجبوراً ہی کی اسے غیر ملکی ٹیکنیشن پر بھروسا کرنا پڑا۔

تین ہفتے کی محنت کے بعد وہ لوٹ کر امریکا آئی تھی۔ اپنی محنت نیویارک کی لیبارٹری میں جمع کرائی تھی تاکہ وہ مکمل ہوسکے اور نتیجہ دیکھنے کے لیے بے چینی سے وقت گزارنے لگی تھی کہ اسے نیویارک سے ایک دلچسپ کال آئی کہ اس میں تو آواز ہی نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ بہ حالت مجبوری وہ بے نیل و مرام واپس پاکستان گئی اور پھر سے سب کچھ شوٹ کیا۔ اس نے فلم تیار کی۔ اسے پیش کیا تو سب حیرت سے اُچھل پڑے۔ افغان جنگ کا یہ رُخ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ سب کے سب

فرنٹ لائن

ایڈورڈ آر مرو ایوارڈ۔

امریکن ویمن ان ریڈیو اینڈ ٹیلی وژن ایوارڈ،

ساجا ایوارڈ، نیویارک

بنف ٹی وی روکی ایوارڈ، بنف، کینیڈا

2005ء۔۔۔۔۔ لیوکنسٹن ایوارڈ، نیویارک

ون فیوچر پرائز، میونخ انٹرنیشنل فلم فیسٹول، جرمنی

امریکن ویمن ان ریڈیو اینڈ ٹیلی وژن ایوارڈ،

2006ء۔۔۔۔۔ ساؤتھ ایشین جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ، نیویارک

2007ء۔۔۔۔۔ بیسٹ آف ایشیا، سان فرانسسکو

ون ورلڈ میڈیا ایوارڈ، براڈ کاسٹ جرنلسٹ آف دی ائر، لندن

2009ء۔۔۔۔۔ اے آئی بی ایوارڈ فار بیسٹ کرنٹ افیئر ڈاکومینٹری، لندن

2010ء۔۔۔۔۔ انٹرنیشنل ایمی ایوارڈ، نیویارک

الفریڈ ڈیونٹ ایوارڈ، نیویارک

2012ء۔۔۔۔۔ آسکر ایوارڈ، لاس اینجلس

نے اس کے کام کو سراہا اور ایوارڈ کا مستحق قرار دیا۔ انٹرنیشنل میوزیم فار ویمن نے اس فلم پر آن لائن مباحثے کا اہتمام کیا۔ اوورسیز پریس کلب ایوارڈ۔ امریکن ویمن اینڈ ریڈیو اینڈ ٹی وی ایوارڈ۔ ساؤتھ جرنلسٹ ایسوسیشن ایوارڈ جیسے اہم ایوارڈز اس کے حصے میں آئے۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایسی کامیابی کہ جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

پہلی کامیابی کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ بھی لڑکی ذات کے لیے۔ لڑکی بھی ایسی جس کے پاس تجربہ نام کا کچھ نہ ہو۔ وہ تو پھولوں نہیں سمارہی تھی۔ بغیر کسی تجربہ کے وہ اس لائن میں اُتری تھی اور اس نے میدان مارلیا تھا۔ 2001ء میں وہ پاکستان آئی تھی، اسی قلیل وقفے میں اس نے بھاگ دوڑ کی تھی، فلم کی تیاری مکمل کی تھی اور 2002ء میں اسے ریلیز بھی کردی تھی۔ اتنے کم وقت میں اتنا اعلیٰ کام، لوگ تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے۔

اس کامیابی پر خوشیاں منانے، جشن برپا کرنے کی بجائے وہ مزید کی کوشش میں لگ گئی۔ ابھی لوگ Terror's Children کے سحر سے نکلے

نہیں تھے کہ اس نے ایک اور دھماکا کر دیا۔ یہ دھماکا گو کہ پہلی فلم کا تسلسل تھا مگر وسعت میں اس سے زیادہ تھا۔ اس فلم کا نام اس نے Reinventing دیا تھا۔ اس اعلان پر لوگ چونک گئے۔ اس لیے کہ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ پہلی کامیابی سے وہ خود کو بہت بہادر سمجھنے لگی تھی۔ یہ تک بھول گئی تھی کہ تیراک اتھلے پانی میں ڈوبتے ہیں۔ کسی کے بھی سمجھانے سے وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔ اپنی ضد پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تھی، وہ دیکھ رہی تھی کہ مغربی میڈیا اسلام کا چہرہ مسخ کرنے میں مشغول ہے۔ اسی اثر کو وہ کم کرنا چاہتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اس کام میں خطرہ بہت زیادہ تھا۔ مگر وہ تو سر پھری ٹھہری۔ اس نے ٹیم بنائی اور ریفوجی کیمپ میں پہنچ گئی۔

پاکستانی اور افغانی معاشرت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک لڑکی یوں کھلے عام گھومے یہ بات بہت لوگوں کو بُری لگی۔ ابھی وہ کیمپ کے اندر پہنچی ہی تھی کہ ایک آدمی نے روک کر اس سے پوچھا ''اے تم ہو کون؟''

''میں ایک اخبار سے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس کے ساتھ آنے والے پہلے ہی خوفزدہ تھے۔ اب لوگوں کو اس طرح اپنی جانب دیکھتا پا کر مزید خوف زدہ ہو گئے۔ مگر وہ پتھریلی چٹان کی طرح ثابت قدم رہی۔ اس نے ٹوکنے والے سے ہی کہا کہ مجھے مولوی صاحب سے ملوا دیں۔ میں نے پہلے ہی انہیں اپنے آنے کی خبر بھیج دی ہے۔ وہ ملنے کا وقت بھی دے چکے ہیں۔

اس بات نے اس شخص کو نرم کر دیا۔ وہ اسے ساتھ لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچا گیا۔

وہ ایک بہت بڑے خطرے کو ٹال کر آئی تھی۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کیمپ کے اندر پاکستانی حکم نہیں چلتا تھا۔ ان کا اپنا قانون تھا۔ وہ اگر کوئی قدم اٹھا لیتے تو باہر والوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا کہ قسمت میں جو لکھ گیا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس دن کچھ نہیں ہونا تھا نہیں ہوا۔ جو ہونا تھا وہ تو دلی میں ہونا تھا اس لیے وہ اپنا کام کر کے بہ حفاظت آ گئی۔ اس نے خیبر پختون خواہ کا سفر کیا۔ ایم ایم اے کے لیڈروں سے ملاقات کی۔ غیر قانونی اسلحے کی دکانوں کی فلم بندی کی۔ عام لوگوں سے ملی اس ایک فلم میں اس نے بہت کچھ دکھاتے ہوئے ہوشیار کیا کہ ابھی وقت ہے اگر توجہ نہ دی تو حالات کسی اور رُخ پر مڑ سکتے ہیں۔

اس نے ریفوجی کیمپ میں دو بچوں کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے جگری دوست تھے۔ ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کا مدرسہ میزائل کے حملے میں تباہ ہو گیا تھا۔ جب سے وہ دونوں اس کیمپ میں تھے۔ میزائل اس وقت ان کے مدرسے سے ٹکرایا تھا جب وہ لوگ پڑھ رہے تھے۔ کئی بچے اس حملے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کا غصہ ان کے اندر تھا۔ ان سے جب شرمین نے پوچھا بڑے ہو کر تم کیا کرو گے تو ان میں سے ایک نے کہا 'میں جہاد کروں گا جب کہ دوسرے نے کہا میں پاک فوج کا سپاہی بنوں گا اور خوں ریزی کرنے والے دہشت گردوں سے لڑوں گا۔ اپنے مدرسہ کو تباہ کرانے والوں سے بدلہ لوں گا۔

اس چھوٹے سے منظر نامے کے ذریعہ اس نے بہت بڑا پیغام دیا تھا کہ نئی نسل صرف خوں ریزی کے متعلق سوچتی ہے۔ اسے اس گرداب سے نکلنا ہو گا۔ عوام ایک دوسرے کے مقابل آ رہے ہیں۔ یہ کئی صدی کی لڑائی بن جائے گی۔ یہ فلم ابتدا سے انتہا تک پیغام تھی۔

اس فلم کو بھی خاصی شہرت ملی۔ 2003ء میں اسے ڈسکوری چینل سے نشر کیا گیا۔ جسے زبردست پذیرائی ملی۔

اب اس کا حوصلہ بہت بلند ہو چکا تھا۔ اب اس نے ایک دوسرے خط پر سفر شروع کیا۔

2004ء میں انڈیا پاکستان کے درمیان سرد جنگ عروج پر تھی۔ ایٹم بم کے تجربے اور دیگر معاملات نے کشیدگی آسمان پر پہنچا دی تھی۔ مغرب میں بیٹھے لوگ منتظر تھے کہ اب ایٹمی جنگ چھڑی کہ اب چھڑی۔ ایک دو اخبارات نے تو ایٹمی جنگ کے بعد دونوں ملکوں کے حالات کیا ہو گے اس پر بھی مضامین دینا شروع کر دیا تھا۔ آزادی کے بعد سے ان دو ممالک کے درمیان بڑھتی سرد جنگ کو اس نے موضوع بنایا اور The razor`s edge کی تیاری شروع کر دی۔ اس فلم کے لیے اس نے بطور پروڈیوسر Ed Robbins کو لیا تھا جو کہ خاصہ تجربہ رکھتا تھا۔ دراصل وہ بتانا چاہتی تھی کہ دونوں طرف کے عوام اس کشیدگی کو پسند نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں وہ فرور 2004ء میں بھارت سے ٹرین کے ذریعہ پاکستان آئی۔ راستے میں لوگوں کے خیالات شوٹ کرتی رہی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے درمیان ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہا۔ دہلی میں فسادات ہوں یا آپسی لڑائی یا گروہی جنگ وہاں اب بھی روایتی ہتھیار استعمال ہوتے ہیں۔ چاقو، تلواریں اور بڑے بڑے پتھر ایک دوسرے پر پھینکے جاتے ہیں۔ ایک پتھر پھینکا گیا۔ قسمت کی خرابی وہ جہاں کھڑی تھی وہیں وہ پتھر آ کر گرا۔ اگر لمحہ بھر پہلے اسے ایک ساتھی کھینچ نہ لیتا تو وہ پتھر اس کے سر پر لگتا۔ اتنا بڑا پتھر لگتے ہی اس کا کام تمام ہو جاتا۔ خطروں سے کھیلنے والی ایک اور خطرے سے بچ گئی تھی۔

اس فلم کو بھی خاصی پزیرائی ملی۔ اسے PBS Frontline نے پیش کیا تھا۔ اس فلم نے مغرب میں اس خیال کو رَد کیا کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس فلم میں اس نے صاف صاف بتایا کہ عوام جنگ نہیں امن چاہتے ہیں اور پاکستان ایک امن پسند ملک ہے۔ اسی سال اس کی زندگی میں ایک اور تبدیلی آئی۔ اب تک وہ زندگی کا سفر اکیلے طے کر رہی تھی مگر اسی مبارک سال میں اس کی زندگی میں فہد چنائے آ گئے۔ وہ تجارتی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر بیگم کے کسی کام میں مداخلت نہ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ بلکہ اس کے ہر کام میں معاونت بھی کرتے ہیں۔

جب میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی ہو تو زندگی بہت خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اس کا پورا پورا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں کی زندگی خوشیوں سے بھر اٹھی تھی۔ اب وہ ایک نئے جوش سے کام کرنے لگی تھی۔

2005ء میں جب وہ ایوارڈ لینے کے لیے لیونکس ایوارڈ فنکشن میں پہنچی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی حالانکہ اس سے قبل وہ 2003ء میں اوورسیز پریس کلب ایوارڈ لے چکی تھی۔ 2004ء میں سینے گولڈن ایگل ایوارڈ' واشنگٹن' ایڈورڈ آر مرّ دا ایوارڈ۔ امریکن ویمن ان ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن ایوارڈ' نیویارک۔ ساؤتھ ایشیا ایوارڈ نیویارک۔ جف ل دی روکی ایوارڈ' جف کینیڈا لے چکی تھی' پھر بھی بہت زیادہ خوشی ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ وہاں کرسٹینا امن پور بھی موجود تھیں۔ سی این این کی چیف انٹرنیشنل کرسپونڈنٹ اس کی رول ماڈل رہی ہیں۔ بہ قول اس کے ''میں بچپن سے ان کی کارگزاری دیکھ رہی ہوں۔ گلف وار کے وقت ان کا کام دیکھ کر میں نے سوچ لیا تھا کہ میں بھی ان جیسی بنوں گی۔ وہ بھی مشرق سے آئی ہیں یعنی ایرانی ہیں تو میں بھی پاکستانی ہوں۔ ان سے پیچھے نہیں رہوں گی۔''

اس فنکشن سے آ کر وہ بہت خوش تھی۔ خود اس نے اب تک جتنا کام کیا تھا سب قابلِ تعریف ٹھہرا تھا بعد میں بھی جو کچھ پیش کیا سب قابلِ تعریف ٹھہرا۔ پھر بھی وہ اپنے کام سے مطمئن نہیں تھی۔ تصادم' ہر طرف پھیلتی انارکی' وحشت ناکی، وہ دہشت گردی کے نتیجے میں پھیلنے والی تباہی' بدامنی کا شکار ہونے والے معصوم عوام۔ یہ سب کچھ اس کے دل میں غم و غصے کا طوفان اٹھا دیتے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ اس ہنستی مسکراتی دنیائے رنگ و بو کو لوگ کیوں غموں سے بھر دیتے ہیں؟

یہ سب ایسے حساس موضوع تھے کہ انہیں چھیڑنا' خود کو پریشانیوں میں ڈالنا ہے۔ مگر اس کی پارہ صفتی اسے چین نہ لینے دیتی تھی۔ یوں بھی اس کی حالاتِ زندگی سے عیاں ہے کہ وہ یقین رکھتی تھی کہ ہموار سڑک اچھا ڈرائیور، پُرسکون سمندر اچھا ملاح' صاف آسمان اچھا پائلٹ نہیں بنا سکتا۔ آسان زندگی کبھی قابلِ تقلید نہیں بناتی۔ جو چیلنج قبول کرتے ہیں انہی کی زندگی قابلِ مثال ہو سکتی۔ اس لیے وہ زندگی سے کبھی شکوہ کناں نہیں رہی کہ ''میں ہی کیوں'' بلکہ وہ ثابت کرتی کہ ''میں ہی ہوں'' جو چیلنج قبول کر سکتی ہے۔ اس نے "Terrors Children" "Taliban generation" اور "Afghanistan unveiled" جیسی اہم فلم بنا کر ثابت کیا تھا کہ وہ کسی پریشانی سے ڈرنے والی نہیں ہے۔ اب پھر ایک بار خود کو ثابت کرنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ اچھوتا خیال' بے مثال ولا جواب کہانی انسانی زندگی

مونالیزا

مونالیزا 1479ء میں پیدا ہوئی اور 1528ء میں جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔ اس کی 1495ء میں اپنے دور کے معروف شخص فرانسسکو ڈل جیوکونڈو (Francosco del Giocondo) سے شادی ہوئی' یوں مونالیزا سے La Gioconda کہلانے لگی۔

مونالیزا کا شاہکار پورٹریٹ بنانے والے لیونارڈو ڈاونچی کو اپنی اس پینٹنگ سے اس قدر پیار تھا کہ وہ ہر جگہ اسے ساتھ رکھتا۔ آخر کار فرانس میں یہ فروخت کر دی گئی۔ اسے فروخت کرنے والا کون تھا؟ خود آرٹسٹ یا پھر کوئی اور...... یہ واضح نہیں ہے۔

اس شاہکار کی بہت سی نقول بھی معرض وجود میں آتی رہیں۔ اس پورٹریٹ کو اس وقت مزید شہرت ملی جب 1911ء میں Louvre کے میوزم سے یہ پُراسرار طور پر چوری ہو گئی۔ دو سال بعد فلارنس (اٹلی) کے ایک ہوٹل سے بازیاب کرائی گئی۔

کوکب خواجہ کے سفرنامے ''کاش'' سے اقتباس

مرسلہ: اظہر جمیل صدیقی' کراچی

میں تلاشنے لگی۔کافی غور وخوض کے بعد بھی کوئی آئیڈیا نہیں سوجھا۔ جب کہ وقت کا زیاں اسے گوارہ نہ تھا۔ وہ اس قبیل کی تھی کہ جیسے اسے گھڑی کی ٹک ٹک پکار رہی ہو۔ ہشیار کر رہی ہو کہ یہ ٹک ٹک نہیں کوئیک کوئیک کہہ رہی ہے۔ جلدی کرو۔ وقت گزر جائے گا۔ اس زیاں پر تا عمر ماتم کناں رہو گی۔ کیونکہ گزرا وقت واپس نہیں آتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مسلسل غور کر رہی تھی۔

بالآخر اس نے Pakistan double game کا خاکہ تیار کرلیا۔ خطرناک حالات مقام پر جا کر شوٹ کیا اور پھر سے ثابت کر دیا کہ وہ دوسروں سے الگ ہے۔ گو کہ اس میں اس کی شمولیت بہ حیثیت رپورٹر تھی۔ اسی سال اس نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ سعودی عرب کے قانون کے مطابق عورتوں کو مرد گارجین کی اجازت سے ہی تعلیم گاہ میں داخلہ ملتا ہے۔ نوکری اور سفر کر سکتی ہے ڈرائیونگ پر بھی پابندی ہے۔ اس ناانصافی کے خلاف وہاں کی عورتوں نے ایک تحریک شروع کی تھی۔ اس کو مرکزیت دے کر اس نے Women of kingdom holy بنا ڈالی۔ پھر ایک اور فلم بھی مکمل کر لی جسے الجزیرہ نے دکھایا۔ یہ فلم سویڈن میں مہاجر مسلمانوں اور مقامی افراد کے درمیان چل رہی رسہ کشی کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا۔ اس فلم کا نام بھی اسی لحاظ سے Assimilation no, yes.Integration پیش کر دیا۔ اسی سال الجزیرہ کے لیے اس نے Highway of tear بنائی۔ برٹش کولمبیا کی اس ہائی وے پر 32 عورتیں کھو چکی ہیں اسی لیے اسے ہائی وے آف ٹیر کا نام دیا گیا ہے۔ ابھی وہ آرام سے بیٹھی بھی نہ تھی کہ آدھے پاکستان میں زبردست زلزلہ آگیا۔ اس زلزلے کو مرکزیت دے کر اس نے Cold comfort بنالی۔ اس فلم کو پی بی ایکس نے دکھایا تھا۔ اسی سال اس نے City of guilti بنائی۔ جس میں فلپائنی عورتوں کے بہت سارے مسائل اٹھائے گئے تھے۔ اسے بھی چینل فور نے نشر کیا تھا۔

ایک کے بعد ایک کامیابی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ۔۔۔ بےخطر آتش خطرات میں کود پڑتی تھی۔ جب ساؤتھ افریقا میں نسلی فسادات پھوٹ پڑے اور اس درجہ عروج پر پہنچ گئے کہ انسان مچھر سے زیادہ بے حقیقت بن گیا۔ ایک ایک دن میں ہزار ہا لوگ قتل کیے جانے لگے۔ کون کس کو قتل کر رہا ہے اس کا علم خود قتل کرنے والے کو بھی نہ تھا۔ بس سامنے والے کو قتل کر دو یہی خیال ہر ذہن میں پنپنے لگا تھا۔ ابتدا میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے افراد کا خون بہا رہا تھا۔ پھر یہ بات بھی پس پشت چلی گئی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار آگیا تھا اس لیے لوگ بے سوچے سمجھے قتل کرنے لگے تھے۔ ان حالات میں کسی تہذیب یافتہ قوم کے فرد کا ان وحشی قبائل کے درمیان جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ مگر وہ عورت ہو کر بھی اپنی ٹیم کو لے کر وہاں پہنچ گئی۔ زمباوے کے دراندازوں پر مبنی اس فلم میں حقیقت کو فلمایا گیا اور اسے New apartheid کے نام سے چینل فور اور اے بی سی آسٹریلیا کے ذریعہ ناظرین تک پہنچایا گیا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے لیے وہ ایسے ایسے خطرناک علاقوں میں پہنچ گئی تھی جہاں جاتے ہوئے لوگ ہزار بار سوچتے۔ یہی وجہ تھی کہ دیگر فلموں کی طرح اسے بھی خاص پذیرائی ملی تھی۔

گزشتہ سال نیویارک میں اسے یورڈل لیڈرشپ ایوارڈ ملا تھا اور اس سال ساؤتھ ایشین جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ نیویارک میں ملا۔ گویا اس کے ہر کام کو پذیرائی مل رہی تھی۔ اب اس نے پھر سے کسی ایسے ہی دھماکے دار سبجکٹ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس کی نظر ایک بار پھر افغانستان پر جا ٹھہری۔ افغانستان میں امریکا کے آجانے کی وجہ سے وہاں کی زندگی، خاص کر عورتوں کی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے اس بارے میں حقیقت پیش کرنے کے لیے وہ Afghanistan unveiled/Lifting the veil کے نام سے فلم بنانے پہنچ گئی۔ اس فلم نے بھی پرانی روایت کو زندہ رکھا کہ اسے بھی بے پناہ پذیرائی ملی۔ گویا اب وہ ایک قدآور جرنلسٹ بن چکی تھی۔

وطن واپس آئی تو اس نے ایک بار پھر مقامی چینلز والوں سے بات کی۔ کیوں کہ اب یہاں چینلز کا سیلاب سا آگیا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر چینل ہوتے ہوئے بھی کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا۔ انوسٹیگیٹو جرنلزم پر کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ وہ تو بس اسی میں خوش تھے کہ ٹاک شو کرا لیے۔۔۔۔ بس کافی ہے۔ باقی وقت اِدھر اُدھر کے پروگرام اور فلموں سے وقت پورا کر لیا۔

اسے بیسٹ آف ایشیا ایوارڈ سان فرنسیسکو اور ورلڈ ایوارڈ لندن حاصل کر چکی تھی۔ درجن بھر سے زائد ترین ایوارڈز حاصل کر چکی تھی، جنہیں کسی طور نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔ ان میں ایسے ایوارڈ بھی تھے جن کو حاصل کرنے کا خواب ایک دنیا دیکھتی ہے۔ خود پڑوسی ملک، جہاں کی فلم انڈسٹری ترقی کے معراج پر ہے۔ جہاں کی مارکیٹ بھی بڑی ہے اور جہاں وسائل بھی بے انتہا ہیں مگر وہاں والے بھی ایسے کئی ایوارڈز حاصل نہیں کر سکے تھے۔

ایک دنیا اس کے کام کو سراہا رہی تھی۔ ہر طرف واہ واہ ہو رہی تھی۔ تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے۔ مگر یہاں کسی کو اتنی توفیق بھی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بھرپور انداز میں اس کے کام کو عوام تک پہنچائے۔ اس کے کام سے فائدہ اٹھائے۔ بتائے کہ ہمارے ملک کی ایک بیٹی جو بغیر کسی ٹریننگ کے اپنی راہ خود بناتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئی ہے۔

پاکستان آنے کے بعد اس نے ایک اور اہم کام شروع کیا تھا جو اپنے آپ میں منفرد تھا Citizen's Archive of Pakistan کے نام سے ایک گویا تحریک شروع کر دی تھی۔ اس تحریک کے تحت وہ پاکستانی تاریخ کو محفوظ بناتی چلی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے 600 سے زائد فوٹو جمع کیے اور چالیس ہزار سے زائد تصاویر اکٹھا کر چکی تھی جو پاکستانی تاریخ کے حوالے سے نہایت اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اس پروگرام کے تحت وہ اسکول کالجز تاریخ کے حوالے سے کلاسز بھی لینے کا انتظام کرتی رہی۔ گویا وطن کا نام ہی وہ اوپر نہیں لا رہی تھی بلکہ وطن واسیوں کو وطن کی تاریخ یاد کرا کر وطن دوستی کا سبق بھی دیتی جا رہی تھی۔ مگر فلم سے بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ اب اس نے ایک نیا پلان بنایا۔ ایک ایسی فلم بنانے پر غور کرنے لگی جو اس کی دیگر فلموں سے زیادہ لوگوں کی توجہ حاصل کر سکے۔ اس نے ٹیم بنائی۔ ابتدا سے ہی وہ چھوٹی ٹیم کی عادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیم جتنی بڑی ہوگی مسائل اتنے بڑھیں گے۔ ضرورت کے مطابق ہی۔ پھر چھوٹی ٹیم میں کارکردگی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ بچپن سے اوائل جوانی تک اس نے شوبز میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ جسے فلمیں زیادہ دیکھنے کا بھی شوق نہ تھا، جو اتفاقیہ طور پر اس لائن میں آگئی تھی اپنی محنت سے اتنا آگے بڑھ گئی تھی۔ اتنی کامیابی کے بعد بھی وہ سب سے زیادہ کچھ کر دکھانا چاہتی تھی۔ ایسا کام کرنا چاہتی تھی جو اسے مزید کامیاب ثابت کر سکے۔ انڈونیشیا میں بنی ہوئی Birth of nation وہ داستان تھی جس کے بعد ایسٹ تیمور نامی ملک کا جنم ہوا۔ Iraq.lost genration میں موجودہ عراق کی صورت حال پر روشنی ڈال چکی تھی۔ وہاں جاری جنگ و جدل اور اس کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے چالیس لاکھ سے زیادہ افراد کو درپیش مسائل کو اُجاگر کر چکی تھی اس کے کام کو دیکھ کر سب حیران تھے۔ اس موضوع پر وہ فلم بنانا چاہ رہی ہے۔ ابھی بنائی نہیں ہے۔

اب اسے اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والے پلاٹ کی فکر تھی۔ ان تمام فلموں میں ایک بات مشترک تھی کہ ان میں عورتوں بچوں کے مسائل کو اہمیت دی گئی تھی یہ مسائل یکجا ہو کر کیسی گمبھیر صورت اختیار کر لیتے ہیں اس نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیے تھے۔ لیکن اب وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتی تھی جو اب تک حاصل شدہ کامیابی کو ماند کر کے نئی تاریخ رقم کر دے۔ زیادہ پسند کی جائے۔

انہی دنوں وہ دنیا کے سب سے بلند درجے پر فائز ہوئی جسے ماں کا درجہ کہتے ہیں۔ مگر اب اس کی بیٹی ایک سال کی ہو چکی تھی اس لیے وہ پھر سے اپنے خوابوں کی تکمیل کی راہ تلاش کرنے لگی۔ بچی کی وجہ سے جو وقت وہ اپنے کام کو نہیں دے سکی تھی اب اس کی بھرپائی کرنا چاہ رہی تھی۔ کوئی ایسا کام کارنامہ کرنا چاہ رہی تھی جو مداوا ثابت ہو جائے۔ کیونکہ اس کا ماننا تھا کہ کہانی اور خیال قوی ہو، ایسے مناظر ضرور ہوں جس پر دل میں درد ہچکولے کھائے ساتھ ہی

مکتبہ اہلاً وسہلاً
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME
BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

میر ظفر علی

2007ء میں آسکر ایوارڈ جیتنے والے 2007ء میں فلم ''گولڈن کمپاس'' کو بہترین بصری اثرات پر آسکر ایوارڈ ملا تھا۔ گر دیکھا جائے تو وہ پہلے پاکستانی ہیں جنھیں آسکر ایوارڈ ملا مگر میڈیا نے انہیں شہرت اس لیے نہیں دی کہ انہوں نے برطانوی سرزمین پر اور وہاں سے جڑے مسائل پر مبنی کام پر ایوارڈ حاصل کیا۔ میر ظفر علی بصری اثرات دینے والی ٹیم کے معاون ڈائریکٹر تھے۔ اس فلم نے ''برٹش اکیڈمی آف فلم اینڈ ٹیلی وژن آرٹ'' (B.A.F.B.A) ایوارڈ بھی جیتا تھا۔

میر ظفر علی 2000ء سے بننے والی 16 بہترین ٹیم کا حصہ رہے۔ وہ امریکا میں ڈیجیٹل بزنس کا ایک معروف نام ہیں۔

اب تبدیلی آرہی ہے۔ نوجوان نسل جو کبھی فلم سازی کی طرف راغب نہ تھی، اب وہ بھی فلم سازی کی طرف راغب ہورہی ہے۔ پاکستان میں لولی ووڈ تنزلی کی جانب تھا۔ اس کی اداکارائیں زیادہ تر ریڈ لائٹ ایریا سے آتی تھیں، اس وجہ سے اس کی شبیہہ بہتر نہ تھی۔ آزاد فلم ساز کہتے ہیں کہ ہم لولی ووڈ سے فلم نہیں بنائیں گے۔ لولی ووڈ کے مقابلے میں ان کی فلمیں زیادہ کامیاب ہورہی ہیں۔ میں نے جو ڈاکیومینٹریز بنائیں۔ اس میں تمام کے تمام ساتھی پاکستانی ہیں۔ میں انہیں اپنے ساتھ لیتی ہوں جو بالکل نئے ہوتے ہیں، ان میں سے بہت سارے آج جیو اور انڈس پر کام کررہے ہیں۔

(مئی 2004ء میں لیلیٰ کاظمی کو دیے گئے انٹرویو سے اقتباس)

ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آجائے۔ بہت غور کرنے کے بعد اسے ایک آئیڈیا آگیا۔ وہ تو پہلے ہی صنف نازک پر ہونے والے مظالم پر احتجاج کرتی رہی تھی۔ اسی لیے اس بار بھی اس نے عورت پر ہونے والے مظالم کو منتخب کیا۔ اور اسی وجہ سے اس کی نظر جنوبی پنجاب کے اس حصے پر ٹک گئی جہاں جہالت و غربت پنجے گاڑے ہوئے تھی۔ وہاں ایک خاص رجحان بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔

مرد ہو یا عورت اگر اس کے گلے پر چھری چل جائے تو وہ فی الفور موت کی نیند سو جاتا ہے۔ ہر غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مگر وہ عورت جو حسین ہو اس سے اس کا حسن چھین لیا جائے تو وہ جیتے جی مر جاتی ہے۔ کہ چہرہ ہی تو اس کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس علاقے میں یہ رجحان پھیل رہا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر، معمولی معمولی رنجشوں پر لڑکیوں کے چہرے خراب کردیے جاتے۔ عورت ہونے کے ناتے اس نے ان مظلوم عورتوں سے ہمدردی زیادہ محسوس کی۔ اور ان کا درد کو دنیا والوں سے شیئر کرنے کی ٹھان لی۔ تیاری شروع کردی مگر ذرا الگ انداز سے۔

مرکزی کردار کے لیے اس نے اس محبِ وطن ڈاکٹر کو منتخب کیا جو وطن سے دور رہ کر بھی اہلِ وطن کی خاطر قربانی دیتے ہوئے اپنے پیشے کو کام میں لا رہا تھا۔ اس مسئلے کو اس نے اس انداز میں اُٹھایا کہ لوگ سسک اُٹھے۔ اس کے اس کارنامے کو دنیا نے اس طرح سراہا کہ اس کی اس Saving face کو 26 فروری 2012ء کے روز اسے فلمی دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ آسکر سے نوازدیا

آسکر ایوارڈ کو فلمی دنیا کا نوبل پرائز سمجھا جاتا ہے۔ اس ایوارڈ کا باضابطہ نام اکیڈمی ایوارڈ ہے اور امریکا کی Academy of motion picture art کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز 1929ء میں ہوا تھا۔ اور پہلے برس 1927-1928ء دو سال کی فلموں کو آٹھ ایوارڈ دیے گئے تھے۔ آغاز سے اب تک کوئی 3000 فنکاروں اور ٹیکنیشن کو انعامات دیے جا چکے ہیں۔ جن میں سے 300 اداکار تھے۔ ایوارڈ کے مستحق کا انتخاب اکیڈمی کے چھ ہزار ارکان کرتے ہیں۔ مختصر دورانیہ کی دستاویزی فلموں پر ایوارڈ کا سلسلہ 1941ء میں شروع ہوا۔ ہمارا پڑوسی 1957ء سے اس ایوارڈ کے لیے کوشاں ہے۔ ہدایت کار محبوب کی فلم مدر انڈیا کو غیر ملکی زبان کے زمرے میں شامل کیا گیا تھا مگر وہ بھی انعام حاصل نہ کرسکی۔ پھر بمل رائے کی فلم مدھومتی، ستے جیت رائے کی آپور سنسار نامزد ہوئی۔ ملا کر 45 فلمیں نامزد ہوچکی ہیں۔ مگر انعام کوئی بھی حاصل نہ کرسکی۔

2008 میں بمبئی میں بنی انگریزی فلم سلم ڈاگ نے آٹھ ایوارڈ حاصل کیے۔ لیکن وہ بھی برطانوی فلم تھی۔ 6000 ارکان پر مشتمل بورڈ سے سند حاصل کرنا آسان نہیں۔ پھر بھی اس نے اپنے کام اور کڑی محنت کی بدولت ایوارڈ حاصل کرلیا۔ اس نے پاکستان کا نام روشن کردیا۔ ثابت کردیا کہ ''ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتیں گے۔''

بدقسمت

ابنِ کبیر

وہ دنیا کا کامیاب ترین ناول نگار تھا۔ اس کے ناول دکانوں پر پہنچتے ہی بک جاتے تھے مگر اس کی قسمت کالی تھی۔ ہر گام پر ٹھوکریں، ہر راہ میں کانٹے اس کا مقدر ٹھہرے۔ لوگ کہتے ہیں خود اس کی زندگی بھی کسی دکھ بھرے افسانے کا بھرپور پلاٹ ہے۔ اس نے زندگی کے ہر رُخ کو دیکھا، بھگتا مگر قرار نہ ملا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے باپ کی زندگی تھی، وہی کچھ اس کے ساتھ ہوا۔ وہ دولت لٹاتا رہا مگر چین نصیب نہ ہوا۔ بالآخر اپنے ہی ہاتھوں اس نے اپنی زندگی کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔

ناولوں کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کی رودادِ حیات

یہ 2 جولائی 1961ء کی صبح ہے، جو آزردگی کی لپیٹ میں ہے۔ امریکی ریاست ایڈاہو کے شہر کیچم (Ketchum) میں زندگی سست روی کے ساتھ حرکت کررہی ہے۔ شہری سامنے ہوئے انداز میں اپنے معمولات انجام دے رہے اور ایسے میں زندگی کی بیزار کن یکسانیت سے بے نیاز ایک شخص بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سبزہ زار کو تک رہا ہے۔

وہ ڈرا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ پریشان ہے، گو کہ جان لیوا مصائب کی صورت ایک طویل عرصے سے اس کے تعاقب میں ہے۔ لیکن آج ٹھیک اس لمحے وہ مطمئن نظر آتا ہے۔

گزشتہ دنوں علاج کی غرض سے من ویلی اسپتال میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ بجلی کے روح میں اُتر جانے والے جھٹکوں سے گزرا، جن کا تصور ہی انسان کے وجود پر کپکپی طاری کردیتا ہے۔ ان جھٹکوں کا تلخ ذائقہ تاحال اس کے ذہن پر نقش ہے کہ دو روز قبل ہی علاج کے اذیت ناک مراحل سے گزر کر گھر لوٹا ہے، لیکن آج ٹھیک اس لمحے وہ مطمئن ہے، بالکل مطمئن ہے... جس کا سبب واضح ہے، وہ فیصلہ کرچکا ہے۔ اُن نحوست زدہ سرگرشیوں سے آزادی حاصل کرچکا ہے، جنھوں نے اس کی زندگی اجیرن کررکھی تھی

کچھ دیر تک سبزہ زار کو تکنے کے بعد وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اب وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے۔ چند ساعتیں یوں ہی گزریں، پھر اُس کے لب وا ہوئے ”میں تیار ہوں!“

اب وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر رہا ہے۔ اس کے قدم بیس منٹ کی جانب بڑھ رہے ہیں، جہاں کچھ ایسا رکھا ہے، جو اس کے دل کے بہت قریب ہے، جو اسے بہت پسند ہے جو برسوں سے اس کی ملکیت ہے۔ جس کے طفیل وہ اُن ہزاروں پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے والا ہے، جو برسوں سے اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

بیس منٹ کی چابی اُس نے بڑی خاموشی سے کل رات اپنی بیوی کی الماری سے چُرائی تھی۔ سو وہ بہ آسانی تالا کھول کر سیڑھیوں پر قدم جماتا ہوا اُس نیم تاریک نیم سرد کمرے میں اتر آگیا۔

چند لمحات یوں ہی بے حس و حرکت کھڑا رہا، تاکہ اُس کی آنکھیں، اندھیرے سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور جب وہ تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا، اُس نے نظریں گھمائیں، چاروں طرف دیکھا، اس شے کی تلاش میں جس کے حصول کے لیے وہ یہاں تک آیا تھا۔ بالآخر اُس نے اسے پالیا۔

وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا، اسے چھوا، اُٹھایا اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا، سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔ بیس منٹ سے باہر آنے کے بعد اب اسے بڑی ہی خاموشی سے مکان کے اوپری حصے کی جانب جانا تھا کیونکہ اگر اس کی بیوی کو پتا چل جاتا، تو وہ اس کے منصوبے کو غارت کر دیتی۔

خوش قسمتی سے یہ مرحلہ بھی بہ آسانی طے ہو گیا۔ جب وہ گھر کے اُس حصے میں پہنچ گیا، جہاں پہنچنے کا اس نے منصوبہ بنایا تھا، اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی جانب دیکھا، جس میں وہ شے تھی، جسے وہ بڑی کامیابی سے بیس منٹ سے چُرا لایا تھا۔ وہ ایک شاٹ گن تھی، اس کی پسندیدہ شاٹ گن! جسے خطرے کے پیشِ نظر چھپا دیا گیا تھا لیکن وہ اُسے ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔

اُس نے شارٹ گن میں دو گولیاں ڈالیں۔ اسے اُٹھا کر اپنے چہرے کے سامنے کیا، چند لمحات تک نال کو تکتا رہا۔ منصوبے کے عین مطابق اُس نے اپنی زندگی، اپنے ماضی کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ نال اپنے منہ میں ڈال لی۔

اگلے ہی لمحے زوردار دھماکا ہوا۔ اس کا بھیجا اُڑ چکا تھا۔

شہر پر چھائی دوپہر کی آزردگی کو مہمیز کرنے والی خبر جنم لے چکی تھی اور شارٹ گن کے فائر کی بازگشت جلد پوری دنیا میں سُنی جانے والی تھی۔

ہیمنگ وے، وہ شخص جو سخت ترین مقابلے کے باوجود خود کو انگریزی کا نمائندہ ادیب تسلیم کروانے میں کامیاب رہا، نوبل انعام کا حق دار ٹھہرا، اب ختم ہو چکا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

☆☆☆

جب ارنسٹ پیدا ہوا، بیسویں صدی فقط پانچ ماہ کے فاصلے پر تھی اور پوری دنیا بیک وقت خوف اور جوش کے زیر اثر انیسویں صدی کو الوداع کہنے کی تیاریوں میں معروف تھی کیونکہ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ نئی صدی جہاں انسانی ترقی کے امکانات پیدا کرے گی، وہیں وہ تباہی بھی لائے گی، ایسی ہولناک تباہی جو دنیا کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے گی۔

21 جولائی 1899ء کی صبح اپنی پیدائش کے فوراً بعد رونا جسم کی پوری قوت لگا کر رونا شروع کر دیا، تاہم اگر اُس وقت اُسے اندازہ ہوتا کہ آنے والے برسوں میں اپنی تمام تر کامیابیوں کے باوجود اُسے کس قسم کے المیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، تو وہ اور زور سے روتا کیونکہ بدنصیبی، بیماریوں، حادثوں اور عشق میں ناکامی کی صورت اُس کے تعاقب میں تھی جو اُسے کسی صورت کامرانیوں کا جشن منانے کا موقع فراہم نہیں کرنے والی تھی۔

ٹھیک ارنسٹ کے مانند شکاگو شہر کے مضافاتی علاقے اوک پارک (ریاست الینوئس) میں مقیم اُس کے ماں باپ بھی اِس بات سے یکسر لاعلم تھے کہ اُن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ عجیب و غریب تقدیر لے کر پیدا ہوا ہے۔ بلکہ وہاں معاملہ ہی کچھ اور تھا۔

ارنسٹ کا باپ کلیرنس ہیمنگ وے جو ایک معالج تھا، بیٹے کی پیدائش پر اتنا خوش تھا کہ اُس نے گھر کے باہر بگل بجا کر باقاعدہ اس بات کا اعلان کیا۔

”میرے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے، میں آج بہت خوش ہوں۔“ وہ مسرت سے لرز رہا تھا۔

محلے داروں نے اُسے مبارکباد دی اور نومولود کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

اس کی ماں گریس ایک موسیقار تھی۔ میاں بیوی دونوں ہی پڑھے لکھے اور معاشی طور پر مستحکم تھے اور اپنے علاقے کے سماجی حلقوں میں خاصے مقبول اور پسندیدہ خیال کیے جاتے تھے۔

جس علاقے میں اس نے آنکھ کھولی، وہ گرجا گھروں کے حوالے سے شہرت رکھتا تھا۔ وہاں کئی گرجا گھر تھے۔ ارنسٹ کا باپ کلیرنس مذہبی رجحان کا حامل تھا، تاہم اُس کی ماں زیادہ مذہبی نہیں تھی، البتہ وہ دونوں ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے تھے۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

”نام کے بارے میں کیا سوچا ہے جان!“ بچے کی پیدائش کے دوسرے روز گریس نے اپنے شوہر کے دمکتے ہوئے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”تم بے فکر ہو جاؤ، میں نے سوچ لیا ہے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

دراصل کلیرنس نے شادی کے بعد کا ابتدائی زمانہ اپنے سسر ارنسٹ ہال کے گھر گزارا تھا جس کے اخلاق اور کردار نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اِسی باعث جب اس کے گھر پہلے بچے کی پیدائش ہوئی، اُس نے اعلان کر دیا ”اِس کا نام میرے نیک فطرت سُسر کے نام پر ارنسٹ ہوگا۔“

یہ نام اُس دور میں بہت مشہور تھا، جس کا بنیادی سبب 1895ء میں پیش کیا جانے والا نامور آئرش ادیب اور شاعر، آسکر وائلڈ کا تحریر کردہ ڈراما The Importance of Being Earnest تھا جس کا مرکزی کردار ارنسٹ ایک سیدھا سادہ، بلکہ ایک حد تک بے وقوف انسان ہوتا ہے۔

شعور کی وادی میں قدم رکھنے کے بعد ارنسٹ کو کبھی اپنا نام اچھا نہیں لگا اور ایک دن اس نے اپنے باپ کلیرنس کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا ”آپ نے میرا نام نانا کے نام پر ارنسٹ رکھ دیا، میں آسکر وائلڈ کے ارنسٹ کی طرح نہیں ہوں، میں تو بالکل آپ کی طرح ہوں۔“

جس معصومیت کے ساتھ اس نے یہ کہا اس نے کلیرنس کے دل کو شفقتِ پدری سے بھر دیا اور اس نے آگے بڑھ کر صاحب زادے کو بانہوں میں بھر لیا۔

”ہاں، تم بالکل مجھ جیسے ہو!“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

کلیرنس یقینی طور پر لاعلم تھا کہ ایک معاملے میں اس کا بیٹا بالکل اس جیسا ہے۔ وہ بدنصیبی جو اُس کے وجود کا جزو تھی، وراثت میں اُس کے بیٹے کو مل گئی ہے!

☆☆☆

”تم ہمارے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں؟“

اس کے ساتھی اکثر سوال کرتے لیکن وہ خاموش رہتا اور الگ تھلگ بیٹھا رہتا۔ اُس کے دوستوں کی تعداد محدود تھی۔

چھ بہن بھائیوں میں دوسرا ارنسٹ بچپن ہی سے تضادات کا شکار رہا جس کی وجہ اُس کی ماں تھی جس سے وہ بیک وقت محبت بھی کرتا تھا اور نفرت بھی۔

اُس کی کم سنی کا زمانہ اوک پارک کے جس متمول محلے میں گزرا، وہیں وہ میوزک اسٹوڈیو بھی تھا جہاں اُس کی ماں گریس کا وقت صرف ہوتا تھا۔ گریس مضافات میں ہونے والے میوزیکل کنسرٹس میں باقاعدگی سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی۔ وہ توانائی اور امید سے بھرپور عورت تھی جس نے اپنے بچوں کو بھی امید پرست بننے کی تربیت دی، تاہم وہ قنوطیت پسندی جو ارنسٹ کو اپنے اجداد سے وراثت میں ملی تھی، ہمیشہ اس پر حاوی رہی اور گریس کی توانائی اپنے بیٹے کے وجود میں روز تی خاموش سیاہی کا علاج کرنے میں ناکام رہی۔

وہ چاہتی تھی کہ ارنسٹ موسیقی میں دلچسپی لے اور وائلن بجانا سیکھے لیکن اُس کے ارادے یکسر مختلف تھا۔

”میں وائلن سیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔“ وہ منہ بسورتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ اُسے تو اپنے باپ کے ساتھ شکار پر جانا اور جھیلوں کے نزدیک کیمپ لگانا زیادہ پسند تھا۔

”بیٹا، موسیقی ہماری روح کو سکون عطا کرتی ہے، اپنی روح کو موسیقی کی لے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرو۔“ یہ کہتے ہوئے گریس کی آنکھوں میں محبت اور امید دمک رہی ہوتی۔

”نہیں!“ وہ ٹھوس لہجے میں دوٹوک جواب دیتا۔

اگرچہ ارنسٹ باپ کا لاڈلا تھا لیکن اس معاملے میں اس کا باپ اپنی بیوی ہی کی حمایت کرتا ”تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے، خواہ موسیقار نہ بنو لیکن وائلن بجانا تو سیکھ لو۔“ اس کے لہجے میں نصیحت سے زیادہ ہدایت کا عنصر تھا۔ بادلِ ناخواستہ ارنسٹ کو وائلن سیکھنا پڑا اور یہی معاملہ اس نفرت کا نقطۂ آغاز تھا، جس نے ساری زندگی اسے اپنی ماں سے متنفر رکھا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ موسیقی ہی مستقبل قریب میں لکھنے کے عمل میں اُس کی معاون بنی جس کا ارنسٹ نے بالغ ہونے کے بعد اعتراف بھی کیا۔

☆☆☆

”آج ہم پکنک منانے جائیں گے۔“

ایک صبح کلیرنس نے اعلان کیا اور تمام بچے خوشی سے جھوم اُٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی میں سوار مشی گن کے شہر پٹوسکی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہاں ویلون جھیل کے نزدیک ارنسٹ کے خاندان کا ایک مکان تھا جہاں وہ چھٹیاں

گزارا کرتے تھے۔
فراغت کے ان ہی دنوں میں ننھے ارنسٹ نے مچھلی کا شکار کرنا اور گھر سے دور انجان مقامات پر راتیں بسر کرنے کا گر سیکھا۔ ان معنوں میں کیمپنگ کے تجربات اس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئے۔ جب اُس نے پہلی بار جھیل کے کنارے اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے مچھلی کا شکار کیا، اُس وقت اس کی عمر فقط تین برس تھی۔
"شان دار!" اُس نے خود سے کہا۔ "بڑے ہونے کے بعد میں خود کو گھر میں قید نہیں رکھوں گا بلکہ خوب گھوما پھرا کروں گا۔"
البتہ اُس کی یہ خواہش کم از کم ابتدائی برسوں میں تو پوری نہیں ہوسکی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُسے اسکول میں داخل کروانا لازم تھا جہاں کے ضابطوں میں قید ماحول سے وہ کبھی خود کو ہم آہنگ نہیں کرسکا لیکن اپنے باپ کی سخت ہدایت کے باعث وہ مجبور تھا۔
"میں اسکول نہیں جانا چاہتا۔" ایک بار اس نے ہمت کرکے اپنے باپ سے کہہ ہی دیا جو چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔
اُس نے چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹایا، ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھا، پھر کہا "اس معاملے میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں!" یوں فیصلہ ہوگیا۔
1913ء سے 1917ء تک وہ اوک پارک اینڈ ریور فارسٹ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم رہا جہاں پڑھائی سے زیادہ اسے کھیلوں میں دلچسپی تھی۔ وہ باکسنگ اور فٹبال کے مقابلوں میں آگے آگے رہتا جن میں اس کی کارکردگی شان دار رہی۔ دراصل یہ اس کا غصہ اور احتجاج تھا جس نے اسے بہ طور کھلاڑی بہتر سے بہتر پرفارم کرنے کی تحریک دی۔
دیگر مضامین تو اسے پسند نہیں تھے البتہ انگریزی کے مضمون میں اُس نے ہمیشہ اچھے نمبر حاصل کیے۔ وہ دو برس تک اسکول کے آرکسٹرا کا حصہ رہا جہاں وہ اپنی بہن مارسلین کے ساتھ پرفارم کیا کرتا تھا۔ حالانکہ اسے یہ کام قطعی پسند نہیں تھا۔ ایک بار جب ایک دوست نے اس کی پرفارمنس کی تعریف کی، اس نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا "رہنے دو دوست، میں اس کام سے بالکل بھی لطف اندوز نہیں ہوتا!"

☆☆☆

ایک روز اس نے اچانک کہا "میں بڑے ہوکر صحافی بنوں گا!"
جب ساتھی طالب علموں نے یہ سنا تو چونک اُٹھے۔ بے شک انہوں نے بھی ارنسٹ کی طرح صحافت کا مضمون رکھا تھا تاہم کبھی صحافت کو بہ طور پیشہ اپنانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ جہاں تک ارنسٹ کا تعلق ہے، وہ حتمی فیصلہ کرچکا تھا جس کا سبب اُس کا قابل استاد فینی بگو تھا جس کے پڑھانے کا انداز اُس کے دل میں گھر کر گیا۔
"بچو، اسے کلاس نہیں بلکہ اخبار کا دفتر سمجھو اور خود کو اخباری نمائندہ!" وہ شفیق لہجے میں کہتا۔ "تو چلو، خبریں جمع کرو، مضامین لکھو، کہانیاں لکھو۔"
اس کے طرزِ تدریس نے کئی طلبا و طالبات کو توانائی سے بھر دیا جن میں ارنسٹ اور اُس کی بہن مارسلین سرِفہرست تھے۔
دونوں ہی نے اسکول سے نکلنے والے اخبار The Trapeze کے لیے مضامین لکھے۔ یہ ایک لکھاری کی حیثیت سے ارنسٹ کے سفر کا آغاز تھا۔
جب جنوری 1916ء میں اس کا تحریر کردہ پہلا مضمون The Trapeze میں شائع ہوا وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اخبار کی کاپی اُٹھائے گھر سے باہر نکل گیا اور گلی محلے میں والے ہر شخص کو اپنی کامیابی کی بابت آگاہ کرتا رہا۔
اس ضمن میں اساتذہ نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ یوں اسے صحافی بننے کا اپنا سپنا سچ ہوتا نظر آنے لگا۔
وہ نہ صرف اُس اخبار کے لیے باقاعدگی سے لکھتا بلکہ جلد اُس کی ادارتی ٹیم کا بھی حصہ بن گیا۔
ایک دن شفیق استاد نے مشورہ دیا "ارنسٹ، اب بڑے ہورہے ہو، اسکول کے اخبار کے علاوہ دیگر اخبارات کے لیے بھی لکھنے کی کوشش کرو۔"
مشورہ دل کو لگا جس پر عمل کرتے ہوئے اُس نے علاقائی اخبارات میں بھی قسمت آزمائی جہاں کامیابی اس کے قدم چومے اور جلد ہی وہ اسپورٹس رپورٹر کے طور پر رنگ لارڈنر جونیئر کے قلمی نام سے چھپنے لگا۔
"خوب ارنسٹ۔" اس کے دوست کہا کرتے تھے۔ "ہمیں یقین ہے کہ آنے والے چند برسوں میں تم سب سے مشہور صحافی بن جاؤ گے۔"
وہ اپنی تعریف سن کر جھینپ جاتا۔ اسے قطعی علم نہ تھا کہ آنے والے برسوں میں اس کی شہرت کسی شہر یا ملک تک محدود نہیں رہے گی بلکہ پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔

☆☆☆

وہ رسمی تعلیم کا ویسے ہی قائل نہیں تھا اور اپنے خوابوں کو مقدم جانتا تھا، سو اسکول چھوڑنے کے بعد والدین کی مخالفت کے باوجود وہ کنساس سٹی چلا گیا جہاں وہ "اسٹار" نامی اخبار سے کلب رپورٹر کی حیثیت سے وابستہ ہوگیا۔
گو کہ وہ وہاں فقط چھ ماہ رہا لیکن اس عرصے میں اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا بلکہ یہ کہا جائے کہ اُن ہی چھ ماہ نے اس ناول نگار کی تربیت کی جو آنے والے برسوں میں انگریزی ادب پر چھا جانے والا تھا تو غلط نہیں ہوگا۔
اُس نے اپنے اخبار کے کہنہ مشق ایڈیٹر کی ہدایات ہمیشہ یاد رکھیں "مختصر جملے لکھو۔ پہلا پیراگراف زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے، زبان پُراثر ہونی چاہیے اور اُس سے مثبت فکر جھلکنی چاہیے۔"

☆☆☆

"میدانِ جنگ مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے!"
ایک دن اس نے اپنے ایڈیٹر سے کہا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب یورپ کا بڑا حصہ پہلی جنگِ عظیم کی لپیٹ میں آچکا تھا اور دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔
اس کے زمانہ شناس ایڈیٹر نے عینک کے پیچھے سے اسے گھورا پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "کیا ارادے ہیں نوجوان؟"
"میں..." ارنسٹ تذبذب کا شکار تھا۔ "میں فوج میں جانا چاہتا ہوں۔"
"خوب!" ایڈیٹر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "جنگ عروج پر ہے اور تم موت کے منہ میں جانا چاہتے ہو۔ پھر صحافتی کیریئر کا کیا ہے گا؟"
"میں نہیں جانتا۔" اس نے سر جھٹکا۔ "لیکن میں نے فوج میں جانے کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔ میں یہ نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں۔"
چند ساعت ایڈیٹر خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "اگر تمہاری یہی خواہش ہے، تو یہی سہی۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس تجربے سے بہت کچھ سیکھو گے لیکن یاد رکھنا تم ایک قلم کے سپاہی ہو۔ یہی تمہاری قسمت ہے!"
"اسٹار" کی ملازمت چھوڑنے کے بعد اس نے فوراً فوج میں بھرتی کے لیے نام لکھوا دیا لیکن شومئی قسمت اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی جس کی وجہ اس کی کمزور بینائی تھی لیکن وہ اپنی خواہش سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا، اس کی کوششیں جاری رہیں اور بالآخر 1918ء ریڈ کراس کے ساتھ ایمبولینس ڈرائیور کے طور پر وابستہ ہوگیا۔
"مجھے اٹلی جانا ہوگا!" جب اُس نے اپنے والدین کو یہ اطلاع دی تو ان کے چہروں پر اندیشے چھا گئے کیونکہ وہاں جنگ اپنے عروج پر تھی۔
اسے روکنا ممکن نہیں تھا اس .... لیے گھر والوں نے اسے دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔
اس سفر میں پہلا پڑاؤ پیرس تھا جو خوشبوؤں کا شہر کہلاتا ہے لیکن اُس وقت وہ شہر جرمن فوج کی بمباری کی زد میں تھا۔
یہ تباہی سے روبرو ہونے کا پہلا موقع تھا۔
"تو جنگ ایسی ہوتی ہے۔" اس نے خود سے کہا۔
وہ محاذ سے دور کسی ہوٹل یا محفوظ مقام پر قیام کرنے میں قطعی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے سپروائزر سے کہہ دیا "میں جلد از جلد اٹلی جانا چاہتا ہوں!"
اس کی خواہش پوری ہوئی اور چند ہی روز بعد اسے اٹلی کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ وہ میلان پہنچا جہاں اسے پہلی بار جنگ کی حقیقی ستم رانیاں دیکھنے کا موقع ملا۔
ڈیوٹی کے پہلے ہی روز یہ خبر اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی کہ اسلحہ فیکٹری میں دھماکا ہوا ہے جس میں کئی افراد ہلاک ہوگئے ہیں۔
وہ ایمبولینس دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچا اور پہلی بار موت کو کٹی پھٹی، تباہ حالوں لاشوں کو اتنے قریب سے دیکھا۔
اس خونیں دوپہر کو ادھڑے ہوئے جسموں کو ملبے سے نکالنے کے عمل نے ارنسٹ کو توڑ کر رکھ دیا، اسے اپنے بیان کی تصحیح کرنے پر مجبور کردیا۔
"حقیقتاً جنگ ایسی ہوتی ہے۔" اس نے ایمبولینس میں رکھی لاشوں کی باقیات کو دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ارنسٹ جنگِ عظیم اوّل کے دوران اٹلی کی سرزمین پر زخمی ہونے والا پہلا امریکی تھا اور اس "اعزاز" کو حاصل کرنے کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا!
اسلحہ فیکٹری میں ہونے والے دھماکے کے بعد وہ خود کو ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں مصروف ہوگیا تھا اور اس سانحے کے بد اثرات سے باہر آنے میں کامیاب بھی رہا لیکن قسمت نے تبدیلی کا پہیہ چلانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔
8 جولائی کے روز اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران ایک مارٹر گولا لگنے سے وہ شدید زخمی ہوگیا۔
اُس تلخ دوپہر اپنے زخموں کی پروا نہ کرتے ہوئے ایمبولینس میں موجود اطالوی فوجی کو محفوظ مقام پر پہنچا کر ہی اس نے دم لیا۔
اس حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں شدید متاثر ہوئی تھیں۔ اس کا فوری آپریشن کیا گیا۔ پانچ روز بعد اسے میلان

میں موجود ریڈ کراس کے اسپتال پہنچا دیا گیا جہاں وہ چھ ماہ زیرِ علاج رہا۔

ہاں، اُس کے جرأت مندانہ اقدام کو سراہتے ہوئے اطالوی حکومت کی جانب سے اسے تمغۂ برائے بہادری سے ضرور نوازا گیا، تاہم بہ طور ایمبولینس ڈرائیور اُس کا کیریر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اختتام کو پہنچ گیا۔

جب زخموں سے سنبھلنے کے بعد اُس نے اپنے باپ کو یہ اطلاع دی تو اس نے کہا" بے شک تمہیں ایک تمغہ ملا ہے، یہ اچھی بات ہے لیکن تمہیں ایک زخم بھی تو ملا ہے جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔"

ارنسٹ اپنے باپ کی رائے سے متفق تھا۔ اس حادثے کے باعث اسے ایک ایسے تجربے سے گزرنا پڑا جس نے اس کے ذہن پر اَنمٹ نقوش چھوڑے اور فقط 18 برس کی عمر میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کروادیا۔

زخمی ہونے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا" جب آپ ایک نوجوان کی حیثیت سے جنگ میں شرکت کرتے ہیں تو آپ اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ آپ لافانی ہیں۔ جنگ میں شریک ہر شخص موت کا ذائقہ چکھ سکتا ہے مگر آپ نہیں، لیکن جب پہلی بار آپ شدید زخمی ہوتے ہیں، تکلیف محسوس کرتے ہیں، تب آپ کو پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ لافانی نہیں۔ آپ بھی اوروں کی طرح مر سکتے ہیں۔"

☆☆☆

اسپتال میں زیرِ علاج رہنے کا ابتدائی دورانیہ بیزاری اور اُکتاہٹ سے بھرپور تھا۔ وہ نوجوان تھا اور توانائی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن اب وہ ایک بستر پر دراز تھا اور اس کے پاس کوئی ایسی سرگرمی نہیں تھی جو اس کی متحرک طبیعت کو پُرسکون رکھنے میں معاون ہوتی ماسوائے مطالعے کے۔

نہیں، اسپتال کے بستر پر دراز صحت یابی کے انتظار کی اذیت برداشت کرتے ہوئے ہوئے اسے شراب نوشی کی لت پڑی جو آنے والی زندگی میں اس کے ساتھ رہی۔

اور وہیں میلان کے اس اسپتال میں پہلی بار اُس نے محبت کا ذائقہ چکھا، جو خاصا تلخ تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اسپتال میں اُس کی ملاقات اگینز کروسکی نامی ایک نرس سے ہوئی جو اس سے سات برس بڑی تھی لیکن محبت عمر کہاں دیکھتی ہے!

ارنسٹ اس خوبصورت عورت کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اسپتال کی تاریک سرد راہداریوں میں جو باہر ہو والی خونریزی کے اثرات سے پاک تھیں، ان کا عشق پروان چڑھتا رہا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے وعدے کیے۔

جنوری 1919ء میں ارنسٹ مکمل صحت یاب ہوکر امریکا لوٹنے کی تیاریوں میں جٹ گیا اور وہ خاصا مطمئن تھا کیونکہ اگینز نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی اپنے پیشہ ورانہ فرائض مکمل کرتے ہی اس کے پیچھے پیچھے امریکا پہنچ جائے گی جہاں وہ دونوں شادی کے رشتے میں بندھ جائیں گے۔

وہ خوشی خوشی امریکا پہنچا۔ اہلِ خانہ نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا لیکن جب اُس نے انہیں مطلع کیا کہ اُس کی ہونے والی بہو بھی کچھ روز میں یہاں پہنچنے والی ہے، اُن کے رویوں میں سرد مہری آگئی، خصوصاً اس کے والدین نے اس فیصلے کو سخت ناپسند کیا۔

"یہ حماقت ہے!" کلیرنس نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"کیوں؟" ارنسٹ نے سوال کیا۔ "آپ نے بھی محبت کی شادی کی تھی۔"

"وہ دوسرا معاملہ تھا ارنسٹ!" اس کی ماں گریس نے کہا۔ "مجھے کہنے دو، مجھے تمہارا یہ فیصلہ قطعی پسند نہیں آیا۔"

اُسے اپنی ماں کا لہجہ اچھا نہیں لگا لیکن وہ خاموش رہا کیونکہ اس وقت وہ اپنی محبت کا منتظر تھا اور یقین رکھتا تھا کہ جلد ہی تمام تلخی ختم ہوجائے گی لیکن وہ غلط تھا، یہ تو تلخیوں کا نقطۂ آغاز تھا۔

چند روز انتظار کرنے کے بعد اس کے نام اگینز کا خط آیا، جس میں اس نے ارنسٹ کو مطلع کیا کہ وہ اب اسے بھلا چکی ہے اور ایک اطالوی فوجی کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔

"میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں، یہی بہتر ہے ارنسٹ!" خط کی آخری سطر تھی جس نے اسے غم و غصے سے بھر دیا اور جوں جوں وقت گزرتا رہا، اس عورت کے خلاف نفرت بڑھتی گئی جس نے نہ صرف اس کا دل توڑا، بلکہ اس کی آنے والی زندگی میں بھی اذیت کے بیج بو دیے۔

اُس روز اگینز کا خط پڑھنے کے بعد پہلی بار خودکشی کی خواہش نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی" تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔" لیکن سرگوشی بہت دھیمی تھی، وہ سن نہیں سکا کیونکہ وہ تو غصے سے کانپ رہا تھا۔

"آیندہ میں کسی عورت کو یہ موقع نہیں دوں گا کہ وہ مجھے اذیت پہنچائے۔" یہ اس کا فیصلہ تھا، جو مستقبل میں

ازدواجی زندگی کے لیے عذاب بن گیا۔

واضح رہے کہ 1925ء میں شائع ہونے والی ارنسٹ کی پہلی کہانی A very Short story اِسی ناکام محبت کے گرد گھومتی تھی۔

☆☆☆

اب ارنسٹ اپنے آبائی علاقے اوک پارک میں تھا جہاں کی یکسانیت اس کی اُکتاہٹ میں اضافے کا سبب بن رہی تھی۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، فقط 20 برس! اور اس کم عمری ہی میں وہ نہ صرف جنگ کی ہولناکی کا مشاہدہ کر چکا تھا، بلکہ موت کا سامنا کرنے کے تجربے سے بھی گزر چکا تھا۔ محبت میں ناکامی کا تلخ ذائقہ بھی چکھ لیا تھا۔ اس پر مستزاد اب وہ بے روزگار تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ دکھی تھا لیکن اپنا دکھ کسی سے بانٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ اکثر تنہائی میں یہ سوچ کر رو دیا کرتا تھا کہ کوئی اُس کا کرب نہیں سمجھتا۔

یکسانیت سے اُکتا کر ایک روز وہ اکیلا ہی مچھلی کے شکار کو نکل گیا۔ اس دوپہر دریا کے کنارے اس نے بڑے عرصے بعد بہت مسرت کی خفیف سے رو خود میں دوڑتی محسوس کی۔ آنے والے دنوں میں اُس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ قریب کے پہاڑی علاقوں کا بھی سفر کیا، جہاں انہوں نے کبھی جنگلات میں اور کبھی پہاڑوں کے دامن میں کیمپ لگائے اور کیمپ فائر کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر شراب نوشی کرتے رہے۔ اس سرگرمیوں کے طفیل وہ دھیرے دھیرے زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔

پھر ایک روز جب وہ مچھلی کے شکار کی غرض سے گھر سے نکل رہا تھا، اس کا سامنا جون سے ہوگیا۔ جون اس کے اسکول کے زمانے کا دوست تھا اور کسی دور میں اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

اس روز پہلی بار ارنسٹ نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا اور آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان اسے اپنی کہانی سنائی۔ "میں کبھی اپنے والدین کو یہ نہیں بتا پاؤں گا کہ پہلی بار جب میں نے اپنے خون سے لتھڑے گھٹنے دیکھے تو کیا محسوس کیا۔ اس وقت جب ایک ایسا سرجن میرے زخم کا علاج کر رہا تھا جس کی زبان میں سمجھنے سے قاصر تھا، میں کرب کی کس کیفیت سے گزرا، میں کتنا خوف زدہ تھا۔ اور جب اس لڑکی نے مجھے چھوڑ دیا، میں نے تاریکی کی اذیت کا کیسا سامنا کیا۔ میں یہ سب انہیں کبھی نہیں بتا سکتا... کبھی نہیں!"

جون ایک اچھے دوست کی طرح خاموشی سے اس کی کہانی سنتا رہا۔ پھر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔

"تم ایک بہادر انسان ہو ارنسٹ۔ میں تمہیں سمجھ سکتا ہوں، لیکن تمہیں بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ وہ تمہارے والدین ہیں، وہ تم سے مخلص ہیں، تمہیں انہیں اپنا دکھ بتانا ہی ہوگا۔"

اس رات جب مضمحل ارنسٹ گھر لوٹا، اس کا باپ کلیرنس باہر باغ میں بیٹھا تھا۔ اس نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔ ارنسٹ خاموشی سے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا باپ چند ساعت کچھ سوچتا رہا، اس دوران خاموشی قائم رہی۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے بیٹے سے آج کے دن کے تجربات کے بارے میں پوچھنے لگا۔

ابتدا میں تو ارنسٹ نے مختصر جوابات دیے لیکن دھیرے دھیرے موضوع پھیلتا گیا۔ اب اس کا باپ اس کے بچپن کے بارے میں بات کر رہا تھا، جب وہ دونوں ساتھ ساتھ شکار پر جایا کرتے تھے۔ ارنسٹ کی بھی پُرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ رات گہری ہوتی جارہی تھی، لیکن اس کے باپ کو اس کی پروا نہیں تھی۔

"تم مجھے جنگ کی کہانی کیوں نہیں سناتے؟" بالآخر اس نے کہا۔

"اوہ ہاں، کیوں نہیں!" ارنسٹ نے جواب دیا اور اب وہ اٹلی میں تھا، اسلحہ فیکٹری کے پاس، لاشوں کی باقیات تلاش کرتے ہوئے، زخمیوں کو اسپتال پہنچاتے ہوئے۔ وہ اس سانحے کی کہانی سنا رہا تھا جس میں وہ زخمی ہوا، اس بے وفائی کے قصے کو الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس نے اسے توڑ دیا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے دیکھا، اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا اور آگے بڑھ کر اپنے باپ کے سینے سے لگ گیا۔ اس رات وہ ایک طویل عرصے بعد پُرسکون سویا اور صبح ہشاش بشاش بیدار ہوا۔

☆☆☆

"نوجوان تمہارے لیے ایک ملازمت ہے، ٹورنٹو میں۔ کرو گے؟" ایک روز اُس کے والد کے ایک دوست جیمز فری نے اُسے ایک ایسی نوکری کی پیشکش کی جو اُس کے مزاج سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن چونکہ وہ فارغ تھا، اس لیے اُس نے وہ پیشکش قبول کرلی۔ کچھ روز بعد وہ ٹورنٹو میں تھا جہاں کے نئے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں اسے خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

صحافت میں دلچسپی ہنوز قائم تھی، سو اس نے ایک بار پھر

www.Paksociety.com

اس پیشے کو اپنانے کا فیصلہ کیا اور کینیڈا کے معروف ہفتہ وار اخبار "ٹورنٹو اسٹار" سے بہ طور فری لانسر منسلک ہوگیا۔

"وقت گزارنے کو یہ کام اچھا ہے۔" اُس نے خود سے کہا اور اپنے فارغ وقت کو کلی طور صحافتی سرگرمیوں کے لیے وقف کردیا۔

اس زمانے میں ارنسٹ کے لیے کہیں ٹک کر بیٹھنا مشکل تھا۔ جب زندگی ہمکتی ہوئی اس کی جانب آئی تو گھومنے پھرنے کی خواہش نے پھر انگڑائی لی۔ وہ ٹورنٹو سے جلد ہی لوٹ آیا۔ کچھ وقت مشی گن میں صرف کیا، پھر شکاگو چلا گیا، جہاں اس نے اپنے دوستوں کے گھر قیام کیا۔ اس عرصے میں بھی وہ ٹورنٹو اسٹار کے لیے لکھتا رہا۔

شکاگو میں قیام کے زمانے میں وہ ایک ماہنامے "کوآپریٹو کامن ویلتھ" کا ایسوسی ایٹ ایڈیٹر بھی رہا۔ وہیں اُس کی معروف ناول نگار شیروڈ اینڈرسن سے ملاقات ہوئی۔ جلد ہی دونوں میں دوستی ہوگئی۔

محبت ایک بار پھر دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ایک روز اُس کی سرخ بالوں والی خوب رو ہیڈلی رچرڈسن سے ملاقات ہوئی جو شکاگو میں مقیم ارنسٹ کی بہن کی دوست تھی۔ ارنسٹ پہلی ہی نظر میں اسے دل دے بیٹھا۔ حالانکہ وہ عمر میں اس سے بڑی تھی۔

اُس نے اپنی بہن سے کہا "اسے دیکھتے ہی میرا دل یہ پکار اُٹھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا واقعی ایسا ہے؟" بہن کی آنکھوں میں حیرت تھی، جس کا سبب واضح تھا۔ دراصل ہیڈلی میں وہ پختگی نہیں تھی جس کی عام طور سے اِس عمر کی عورتیں حامل ہوتی ہیں۔

"وہ اتنی میچور نہیں ہے۔ وہ اگینزر جیسی نہیں ہے جس سے تم ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔" بہن نے اسے متنبہ کیا، لیکن وہ اب کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"وہی میری منزل ہے۔ اور یاد رکھو میں اگینزر کو بھلا چکا ہوں۔" ارنسٹ نے کہا اور اس کی بہن کاندھے اُچکا کر رہ گئی۔

چند روز بعد وہ سرخ گلاب ہاتھ میں لیے اپنے گھٹنے پر بیٹھا ہیڈلی کو شادی کی پیشکش کررہا تھا۔

اس نے ہاں کردی اور وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔

"ہمارا ارادہ شادی کے بعد یورپ گھومنے کا ہے۔" اس نے فون پر اپنے گھر والوں کو مطلع کیا "ہم روم دیکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ اور ہیڈلی روم جانے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے لیکن پھر ارنسٹ کے دوست اینڈرسن نے مشورہ دیا کہ اگر وہ واقعی دنیا دیکھنا چاہتا ہے، تو پیرس کا رُخ کرے۔

ارنسٹ تیار نہیں تھا کیونکہ وہ جنگ عظیم اول کے زمانے میں کچھ وقت وہاں گزار چکا تھا اور وہ یادیں زیادہ خوش گوار نہیں تھیں لیکن اینڈرسن نے اپنے جادوئی اسلوب میں تحریر کردہ خطوط سے اُسے قائل کر ہی لیا کہ دنیا میں دیکھنے لائق اگر کوئی شہر ہے، تو وہ پیرس ہی ہے۔

اُس نے لکھا "یہ اتنا مہنگا شہر نہیں، جتنا تم خیال کرتے ہو۔ پھر ادب سے وابستہ تمام بڑے لوگ یہیں بستے ہیں۔ میرا یقین رکھو، تم جیسے نوجوان لکھاری کے لیے یہ بہترین مقام ہے۔"

3 ستمبر 1921ء کو جب ارنسٹ اور ہیڈلی کی شادی ہوئی، وہ پیرس جانے کے منصوبے کو حتمی شکل دے چکے تھے۔

شادی اس کے لیے خوش بختی لائی۔ جلد ہی "ٹورنٹو اسٹار" نے اسے غیر ملکی نامہ نگار کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ یوں اُس نے آنکھوں میں سپنے سجائے پیرس کے لیے رختِ سفر باندھا، اپنی بیوی اپنی محبوبہ کے ساتھ، جو ارنسٹ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اسے شکایت تھی تو بس یہ کہ شادی کے بعد وہ جس اپارٹمنٹ میں رہ رہے تھے، وہ خاصا شکستہ اور تاریک تھا لیکن جب پیرس جانے کا منصوبہ حتمی ہوگیا، اس شکایت کرنی چھوڑ دی۔

اب وہ خوشبوؤں کے شہر کی جانب بڑھ رہے تھے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے، جہاں شہرت اور کامیابی اس کی منتظر تھی۔ اور اس وقت ارنسٹ واقعی اپنی پہلی محبوبہ اگینزر کو بھلا چکا تھا۔

☆☆☆

اینڈرسن صحیح تھا۔ پیرس واقعی اس زمانے میں اتنا مہنگا شہر نہیں تھا۔ پھر یہیں ارنسٹ کی جیمز جوائس، ایذرا پاؤنڈ اور گرٹروڈ اسٹین سے ملاقات ہوئی، جنہوں نے اُس کے ادبی کیریر کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

چونکہ وہ ایک طویل قامت، بھوری آنکھوں والا وجیہہ نوجوان تھا، اس پر مستزاد جنگ کا تجربہ بھی رکھتا تھا، اس لیے ادبی حلقوں میں اسے خصوصی توجہ دی گئی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہا کرتا تھا۔ اُس نے ساتھ والی بلڈنگ میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا جہاں بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا۔

"میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے بڑے لوگوں کی رفاقت

میسر ہے۔" وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔ اور وہ درست تھا، اسے کئی قد آور لوگوں کی توجہ حاصل تھی۔ یورپ میں جدیدیت کی تحریر متعارف کروانے والی گرٹروڈ اسٹین تو اس پر خصوصی طور پر مہربان تھی۔

دھیرے دھیرے اس کے خیالات گرٹروڈ اسٹین کے نظریات سے ہم آہنگ ہوگئے۔ اسی نے ارنسٹ کو جلا وطن فنکاروں اور لکھاریوں کے ایک گروہ سے متعارف کروایا، جسے وہ "گم شدہ نسل" کہا کرتی تھی۔

بعد میں اُس نے ناول کی طرز پر قلم بند کی جانے والی یادداشتوں The Sun Also Rises میں اس ترکیب "گم شدہ نسل" کو بڑی خوبی سے برتا۔

اس عرصے میں وہ پکاسو سمیت پیرس میں مقیم کئی قد آور مصور سے بھی ملا۔

☆☆☆

جب قسمت آپ کے ساتھ ہو تو آپ کے پسندیدہ افراد از خود آپ کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور کچھ ایسا ہی ارنسٹ کے ساتھ ہوا۔

یہ 1922ء کا ذکر ہے۔ ایک روز اتفاقیہ طور پر اس کی ملاقات معروف امریکی شاعر ایذرا پاؤنڈ سے ہوگئی، جو امیجزم کے نظریے کا بانی تصور کیا جاتا تھا۔ جلد ہی ان میں گاڑھی چھننے لگی۔ انہوں نے ساتھ ساتھ اٹلی کا بھی دورہ کیا۔ اُن کے گھر بھی قریب قریب تھے۔

ایذرا نوجوان ارنسٹ کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اسی نے اس کی ملاقات معروف آئرش ادیب، جیمز جوائس سے کروائی۔

ان ہی دنوں جیمز کا شہرہ آفاق ناول Ulysses شائع ہوا تھا جس پر امریکا میں پابندی عائد کردی گئی تھی جس کا مصنف کو بہت قلق تھا۔ اس نے ٹورنٹو میں مقیم اپنے دوستوں سے رابطہ کیا اور غیر قانونی طور پر اس ناول کو امریکا پہنچانے کا انتظام کردیا۔

جب ارنسٹ نے جیمز کو اپنے کارنامے سے آگاہ کیا، اس کی آنکھیں خوشی سے دمک اُٹھیں۔ اس واقعے کے بعد اُن دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ بعد میں ارنسٹ نے اپنی یادداشتوں میں بھی جیمز جوائس سے ہونے والی یادگار ملاقاتوں کا تفصیلی ذکر کیا۔

ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ صحافتی سرگرمیوں میں بھی خاصا فعال رہا۔ پیرس میں قیام کے ابتدائی 20 ماہ میں اس نے "ٹورنٹو اسٹار" کے لیے 88 اسٹوریز لکھیں۔ کئی اہم واقعات کی رپورٹنگ کی جس سے بہ طور صحافی اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس نے اسپین کا بھی دورہ کیا جہاں اس نے پہلی بار بل فائٹنگ کا مقابلہ دیکھا جس نے اسے مبہوت کردیا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک دن اس موضوع پر ضرور لکھے گا۔

اپنی بیوی ہیڈلی سے اس کے تعلقات مثالی تھے۔ اس عرصے میں ان کے درمیان صرف ایک بار جھگڑا ہوا جب دورانِ سفر ہیڈلی ایک ایسا سوٹ کیس گم کر بیٹھی جس میں ارنسٹ کے مسودے تھے۔

ماہ ستمبر میں ارنسٹ نے ایک بار پھر ٹورنٹو جانے کا سوچا کہ وہ دھیرے دھیرے پیرس سے اُوب رہا تھا۔

☆☆☆

ٹورنٹو منتقل ہونے کے بعد اکتوبر 1923ء قدرت نے ارنسٹ کا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ اُس کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام اس نے جیک رکھا۔

وہ اپنے باپ کی مانند بیٹے کی پیدائش پر بگل بجانے کا خواہش مند تھا لیکن یہ اس کا آبائی شہر اوک پارک تو نہیں تھا ٹورنٹو تھا سو اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔

ابھی وہ باپ بننے کی خوشی ہی نہیں سنبھال پا رہا تھا کہ اسے ایک اور خوش خبری ملی۔ اُس کی غیر موجودگی میں پیرس سے اس کی پہلی کتاب Three Stories and Ten Poems شائع ہوگئی تھی اور اسے بہت سراہا جارہا تھا۔ یہ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ جلد ہی پبلشرز کو اس کا دوسرا ایڈیشن لانا پڑا۔

جب پیرس میں دھوم مچی تو ٹورنٹو میں مقیم ارنسٹ کو خوشبوؤں کا شہر شدت سے یاد آنے لگا۔

اُس نے خود سے کہا۔ "میرے دوست اینڈرسن تم درست تھے، پیرس ہی رہنے کے لائق اکلوتا شہر ہے۔"

چونکہ اب وہ ایک مشہور شخص تھا اس لیے اس کے مزاج میں بھی تبدیلی آرہی تھی جس کے نتیجے میں اس کے اور اخبار کے ایڈیٹر کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ اس نے ناراض ہوکر استعفیٰ بھی دے دیا تھا، لیکن اسے قبول نہیں کیا گیا، کیونکہ اخبار کی انتظامیہ ایک اُبھرتے ہوئے ادیب کو اپنے اخبار سے وابستہ رکھنے میں خصوصی دلچسپی رکھتی تھی۔ نتیجتاً اختلافات کے باوجود وہ 1924ء تک "ٹورنٹو اسٹار" کے لیے لکھتا رہا۔ اس کی تحریر "ڈیٹ لائن ٹورنٹو" کے عنوان سے شائع ہوتی تھی۔

اگلے برس اس کا افسانوی مجموعہ In Our Time

منظرِ عام پر آیا۔ یہ امریکا میں شائع ہونے والی اُس کی پہلی کتاب تھی۔ وہ اِس ضمن میں تذبذب کا شکار تھا، جس کا اظہار گھریلو جھگڑوں اور دوستوں سے ..... رنجشوں کی صورت بھی ہوا۔ دراصل اِس کا خیال تھا کہ امریکی نقاد اس کے کام کو پسند نہیں کریں گے لیکن اس کے اندیشوں کے برعکس اس مجموعے میں شامل کہانیوں کو بہت سراہا گیا۔ خصوصاً اس کے اسلوب کی بہت تعریف ہوئی۔

اس مجموعے میں اس کی شہرہ آفاق کہانی Indian Camp بھی شامل تھی۔ ایک کہانی Big Two-Hearted River کو بھی بہت پسند کیا گیا۔

الغرض وہ تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک صحافی تھا، افسانہ نگار تھا اور خوش خرم زندگی گزار رہا تھا، لیکن حقیقتاً اس نے تاحال خود کو دریافت نہیں کیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا اصل میدان تو ناول نگاری ہے، تاہم قدرت نے یہ پیغام اس تک پہنچانے کا انتظام کر رکھا تھا۔

اپنے افسانوی مجموعے کی اشاعت سے چند ماہ قبل اس کی معروف ادیب ایف اسکاٹ فٹز جیرالڈ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور یہ اسکاٹ ہی تھا جس کے توسط قدرت نے اُسے ناول نگار بننے کا پیغام دیا۔

اُسی برس اسکاٹ کا ناول The Great Gatsby شائع ہوا تھا جسے پڑھنا ارنسٹ کے لیے ناقابلِ یقین تجربہ ثابت ہوا۔ ایک بار جب اُس نے کتاب اُٹھائی تو ختم کرنے کے بعد ہی رکھی۔

"اب میں بھی ناول لکھوں گا!" یہ اس کے الفاظ تھے، اس کا فیصلہ تھا، جس نے اُسے کے مستقبل کی راہ متعین کر دی۔

اس زمانے میں وہ The Sun Also Rises پر کام کر رہا تھا جو بنیادی طور پر اس کی یادداشتیں تھیں جنہیں ناول کے طرز پر بیان کرنے کا فیصلہ اس نے اسکاٹ کے مشورے پر عمل کیا جس کے ساتھ اس کی اکثر نشستیں ہوتیں جن میں وہ پینے پلانے کے دوران طویل مباحثے کرتے اور مسودوں کا تبادلہ کرتے۔

اس عرصے میں وہ خوب گھوما پھرا۔ اس نے دوستوں کے ساتھ کئی ممالک کا دورہ کیا۔

ان ہی سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے طفیل اس کی 1925ء میں پالین فیفر سے ملاقات ہوئی جو جلد اس کے حلقے میں شامل ہوگئی۔ پالین ایک فیشن رپورٹر تھی جس نے ابتدائی ملاقاتوں ہی میں اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

جن دنوں وہ اپنی اگلی کتاب کی اشاعت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا، اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ اس عورت سے محبت کرنے لگا ہے۔

بالآخر اکتوبر 1926ء میں اُس کا ناول The Sun Also Rises شائع ہوگیا جس کا موضوع اسپین اور پیرس میں مقیم امریکیوں کے گرد تھے۔ یہ وہ حقیقی کردار تھے جن سے گزشتہ چند برسوں میں اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی "گم شدہ نسل" جن کے خیالات نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ناقدین نے پہلی جنگ عظیم کے بعد تخلیق کیے جانے والے ادب میں اِس ناول کو کلیدی قرار دیا اور یوں ارنسٹ کا ایک کامیاب ناول نگار بننے کا سپنا سچ ہوگیا۔

☆☆☆

جب وہ اس ناول کی شہرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا، پالین اس کی محبوبہ اس کے پہلو میں تھی۔ وہ دھیرے دھیرے، چھپتے چھپاتے محبت کے مراحل طے کر رہے تھے لیکن وہ کہتے ہیں ناں، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے!

بالآخر اس کی بیوی ہیڈلی کو اس کے کارناموں کا پتا چل ہی گیا۔

اُسے شک تو تھا جس کا وہ کئی بار دبے دبے لفظوں اظہار بھی کر چکی تھی، ایک آدھ بار دونوں کے درمیان شدید جھگڑا بھی ہوا۔

یوں دونوں کے رشتے میں سرد مہری در آئی جس نے حساس طبیعت ارنسٹ کو گہرے غم سے دوچار کر دیا لیکن وہ اس معاملے میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں مجبور تھا۔

ہیڈلی ایک شریف عورت تھی، اس لیے اس نے کوئی انتہائی قدم اُٹھانے کے بجائے ارنسٹ سے درخواست کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔

"بہتر ہے کہ ہم اچھی یادوں کے ساتھ الگ ہو جائیں۔" اس نے کہا۔

جب ارنسٹ نے ہیڈلی کے یہ الفاظ سنے وہ سکتے میں آ گیا۔ بے شک وہ بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا اور اب اُس کی توجہ کا مرکز پالین بن گئی تھی لیکن وہ تاحال ہیڈلی سے محبت کرتا تھا، وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد ارنسٹ نے اپنی بیوی سے درخواست کی کہ وہ ناول کی تشہیر کے مراحل طے ہونے تک انتظار کر لے۔ ہیڈلی نے یہ درخواست قبول کر لی۔ بالآ

1927ء میں اُن میں طلاق ہوگئی۔

اس واقعے نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا کیونکہ ہیڈلی اور اس نے خاصا اچھا وقت ساتھ گزرا تھا۔ اداسی اور تنہائی سے بچنے کے لیے اس نے فوراً ہی اپنی محبوبہ پالین سے شادی کر لی۔

اس کی دوسری بیوی پالین ایک امیر کیتھولک خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے عقائد راسخ تھے۔ اُس نے کچھ اپنی محبت اور کچھ اپنے دلائل سے ارنسٹ کو بھی اپنے نظریات میں رنگ دیا تھا۔ شادی سے قبل وہ پوری طرح کیتھولک ازم قبول کر چکا تھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی، وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش تھا اور اپنے نئے افسانوی مجموعے کی اشاعت کی تیاری میں جتا ہوا تھا۔ بالآخر اکتوبر 1927ء میں یہ مجموعہ Men Without Women شائع ہوگیا۔ توقع کے عین مطابق اسے بہت پسند کیا گیا۔ خصوصاً مجموعے میں شامل کہانی The killers کو تو بہت سراہا گیا۔

"مبارک ہو جان، تم تیزی سے کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہو۔" ایک روز پالین نے اُس سے کہا۔

ارنسٹ مسکرا دیا۔ "یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ممکن ہوا ہے، تم میری لیے خوش بختی لے کر آئی ہو۔" اُس نے کہا۔

ٹھیک اُس لمحے اس کی روح میں پیوست خودکشی کی خواہش طنزیہ مسکرائی کیونکہ وہ مستقبل سے واقف تھی، جانتی تھی کہ جلد ہی اس کی محبوبہ پالین جسے وہ خوش بختی کی علامت سمجھ رہا ہے، اُس کے لیے دکھ کا باعث بننے والی ہے۔

☆☆☆

پالین حاملہ تھی اور خواہش مند تھی کہ اب وہ دونوں امریکا میں اس کے آبائی شہر میں رہیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ میرا بچہ امریکا میں پیدا ہو۔" اس نے کہا۔

اپنی بیوی کی خوشی کے لیے ارنسٹ بادل ناخواستہ 1928 میں پیرس سے فلوریڈا منتقل ہوگیا لیکن وہ اپنے ساتھ ایک زخم بھی لایا، گہرا زخم!

دراصل پیرس میں اپنے مکان کے باتھ روم میں اُسے گہری چوٹ آئی تھی جس نے اس کے ماتھے پر انمٹ نشان چھوڑا۔ اس زخم نے اس کا رویہ بھی تبدیل کر دیا... اور وہ ساری زندگی مختلف افراد کی جانب سے اس زخم کی بابت پوچھے جانے والے سوالات بڑے ہی بھونڈے ڈھنگ سے نظرانداز کرتا رہا۔ طبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ خیال غالب ہے کہ اِس چوٹ نے اس کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کیے تھے جس کی وجہ سے اس کی سوچ میں بگاڑ آتا گیا۔

خیر، پیرس چھوڑنے پر وہ بہت مغموم تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کبھی کسی بڑے شہر میں نہیں رہے گا۔

☆☆☆

1928ء نے ارنسٹ کی زندگی پر عجیب نقش چھوڑے۔ اس برس کے وسط میں اُسے ایک بڑی خوش خبری ملی۔ 28 جون کے روز جب یہ جوڑا کنساس سٹی میں مقیم تھا، پالین نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام پیٹرک رکھا گیا۔

بچے کی پیدائش بہت ہی پیچیدہ صورتِ حال میں ہوئی تھی۔ ایک وقت تو ایسا آیا، جب ارنسٹ کو لگنے لگا کہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی دونوں کو کھو دے گا، تاہم جب یہ مرحلہ طے ہوگیا، اُس نے سکون کا سانس لیا۔

"ایک روز میں اِس پیچیدہ صورتِ حال کو، اس تلخ تجربے کو اپنی تحریروں کا حصہ بناؤں گا۔" اس نے خود سے کہا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

اپنے ناول A Farewell to Arms کے آخری صفحات میں اس نے ان کرب ناک لمحات کو تفصیل سے بیان کیا۔

بچے کی پیدائش کے بعد یہ جوڑا نیویارک چلا گیا۔ ارنسٹ بہت مسرور تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی روح میں پیوست بدبختی نے اپنی ابتدائی علامات کے اظہار کا فیصلہ کر لیا ہے۔

بہار کے موسم میں اُسے یہ اطلاع ملی کہ اس کے باپ نے خودکشی کر لی ہے۔

"اس نے خود کو گولی مار کر زندگی کے بندھن سے آزادی حاصل کر لی۔" موصول ہونے والے تار کی اس سطر نے اسے غم کے دریا میں دھکیل دیا۔

"خدایا!" اُس کے منہ سے نکلا۔

دراصل اُس وقت ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ارنسٹ کا باپ شدید مالی مشکلات کا شکار تھا۔

اُس نے چند روز قبل اپنے باپ کو امید بھرا ایک خط لکھا تھا جس میں اسے معاشی حوالے سے پریشان نہ ہونے کا پیغام دیتے ہوئے یہ یقین دلایا تھا کہ جلد ہی مسائل حل ہو جائیں گے۔ "زندگی جینے کے قابل ہے!"

یہ ارنسٹ کے تحریر کردہ خط کی آخری سطر تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ خط ملنے کے بعد اس کے باپ کا دکھ کچھ کم ہو جائے گا لیکن شومئی قسمت، وہ خط اس کے باپ کی خودکشی

www.paksociety.com

کے چند پلوں بعد ہی اوک پارک پہنچ سکا جس کا ارنسٹ کا ساری زندگی قلق رہا اور وہ محکمۂ ڈاک کو کوستا رہا۔

’’اگر یہ خط اُنہیں وقت پر مل جاتا تو وہ کبھی خودکشی نہیں کرتے!‘‘ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

باپ کی موت کی خبر ملنے کے بعد جو پہلا خیال اُس کے ذہن میں آیا وہ اپنی پہلی بیوی ہیڈلی کے باپ کی موت سے متعلق تھا، جس نے 1903ء میں خودکشی کرکے زندگی سے جان چھڑوائی تھی۔

اپنے آبائی شہر پہنچنے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ...... کر رو دیا۔ اس وقت وہ ماں سے نفرت کو بھی بھلا بیٹھا، تاہم ٹھیک تدفین کے لمحات پر وہ اپنے ذہن پر، اپنی سوچ پر قابو کھو بیٹھا۔

’’خودکشی کرنے والے جہنم میں جائیں گے۔‘‘ یہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ تھے جو بڑے ہی غیر متوقع تھے۔

گو کہ وہ بڑبڑایا تھا لیکن سب نے سن لیا کیونکہ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ یہ کیتھولک نظریات تھے جن کی وہ ترجمانی کر رہا تھا، لیکن انتہائی غلط مقام پر!

جب کسی نے اسے ٹوکا تو وہ باآواز بلند اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگا جس کی وجہ سے وہاں نزاعی صورتِ حال پیدا ہوگئی اور اس کے اہلِ خانہ کو اس کے رویے کی وجہ سے شدت کرب سہنا پڑا۔

بعد میں اسے احساس ہوا کہ وہ کسی نامعلوم قوت کے تحت اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

خیر، وہ اپنے اگلے ناول A Farewell to Arms پر کام کر رہا تھا، جو اسی برس ستمبر میں شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ناول کا اختتامیہ اس نے سترہ بار لکھا۔ اس ناول کو ناقدین اُس کی بہترین کاوش قرار دیتے ہیں۔

جب سال کا آخری سورج غروب ہوا، وہ عجیب مخمصے کا شکار تھا کہ آخر اس برس کو کس طرح یاد رکھے۔

اس برس اسے دو بڑی خوشیاں ملیں تھا، اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا اور اس کے ناول کو بین الاقوامی پذیرائی ملی، تاہم اسی برس اُس نے بڑے ہی عجیب انداز میں اپنے والد سے جدائی کا کرب سہا۔

☆☆☆

’’فلوریڈا بہتر جگہ ہے، ہمیں یہیں اپنا گھر تعمیر کرنا چاہیے۔‘‘ ایک روز ارنسٹ نے اپنی بیوی سے کہا۔

چند ہی روز میں یہ خیال جنون بن گیا۔ اُس نے دن رات محنت کی، خوب بھاگ دوڑ کی اور آخر فلوریڈا کے مضافاتی علاقے میں ایک عالی شان گھر تعمیر کرلیا۔ اُسے اپنی قیام گاہ سے بہت محبت تھی اور وہ یقین رکھتا تھا کہ یہاں اپنی زندگی کے خوش گوار لمحات گزارے گا لیکن خوشی اس کے نصیب میں نہیں تھی کہ اِس گھر سے آنے والے چند برسوں میں دُکھ بھری یادیں وابستہ ہونے والی تھیں۔

اسے اسپین سے عشق تھا، خصوصاً بل فائٹنگ کا تو وہ دیوانہ تھا۔ اور یہی اس کی اگلی کتاب Death in the Afternoon کا موضوع بھی تھا جس پر وہ ان دنوں کام کر رہا تھا۔ 1931ء میں اُس کے تیسرے بیٹے کی کنساس سٹی کے علاقے میں پیدائش ہوئی اور اگلے برس اُس کی یہ کتاب منظرِ عام پر آگئی۔

وہ نہ صرف اسپین کے تہذیبی اور ثقافتی رنگوں سے متاثر تھا بلکہ اسپین کے ادیبوں نے بھی اُس پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے جن میں پیو بروجا کا نام سرِفہرست ہے جس کے اسلوب کا رنگ ارنسٹ کی تحریروں پر بھی چڑھ گیا تھا۔

اُس عرصے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کئی بار مچھلی کے شکار کے لیے گیا۔

’’سمندر مجھے اپنی جانب کھینچتا ہے۔‘‘ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کبھی زیادہ عرصے خود کو سمندر سے دور نہیں رکھ پایا۔ بہ طور سیاح بھی خوب گھوما پھرا۔ یورپ اور کیوبا کا سفر کیا، پھر افریقا کی پُراسرار زمینوں کی جانب نکل گیا، جہاں ایک نئی دنیا اس کی منتظر تھی۔ ان تجربات کو اس نے اپنے کئی افسانوں کا موضوع بنایا۔

☆☆☆

’’ہاں میں ایک ادیب ہوں لیکن میں ایک صحافی بھی تو ہوں۔‘‘ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا جو جانتے تھے کہ ارنسٹ کے اندر کا صحافی اسے کبھی ٹک کر نہیں بیٹھنے دے گا اور اسے ہمیشہ متحرک رکھے گا۔

جب اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو وہ رپورٹنگ کی غرض سے وہاں جانے کے لیے بے تاب ہوگیا اور بالآخر نارتھ امریکن نیوز پیپر الائنس سے منسلک ہوکر 1937ء میں اسپین پہنچ گیا، جہاں اس نے جنگ و جدل کا، زیست و نیست کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔

وہ خدا پر پورا بھروسا رکھتا تھا لیکن جب اُس نے زندگی کو یوں سسک سسک کر دم توڑتے دیکھا تو وہ تشکیک کا شکار ہوگیا۔

’’قدرت کہاں ہے؟ اس نے ظالم کو کیوں چھوٹ دے رکھی ہے؟ اس قتل و غارت گری کا ذمے دار کون ہے؟‘‘ یہ وہ سوالات تھے، جنھوں نے اسپین میں رپورٹنگ کے زمانے میں اس کی روح کو بے چین رکھا۔ اسی دور میں اس کی مارکسی سوچ رکھنے والے افراد سے مراسم قائم ہوئے جو آنے والے وقت میں اس کے لیے خاصی پریشانی کا باعث بنے۔

وہ شادی کے بعد کیتھولک ہوگیا تھا لیکن تشکیک نے اسے چرچ کا باغی بنا دیا جس کی وجہ سے اُس کے اور پالین کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔

اس نے اپنی محبت، اپنی بیوی کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے سخت گیر موقف اپنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے ارنسٹ شدید کرب کا شکار رہا۔

اسی زمانے میں اس کی صحافی اور ادیب مارتھا گیلھوم سے ملاقات ہوئی جو اسپین میں اس کے ساتھ رپورٹنگ کر رہی تھی۔ اور مارتھا نے بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے اُسے متاثر کیا، جس کا ایک روز ارنسٹ نے اسکول کے زمانے کے دوست جون کے سامنے ان الفاظ میں اظہار کیا ’’مارتھا کا تعلق میری پہلی بیوی ہیڈلی کے آبائی وطن سے ہے، وہ کچھ کچھ اس جیسی ہے، جبکہ وہ پالین کے مانند ایک صحافی بھی ہے۔ سچ کہوں تو وہ مجھے بہت پسند ہے۔‘‘

دراصل اُسے مارتھا میں پالین اور ہیڈلی کا امتزاج نظر آتا تھا۔

’’یہ خطرناک راہ ہے، ذرا سنبھل کر!‘‘ جون نے احتیاط برتنے کا مشورہ دیا تھا۔ بچپن کی دوستی کے طفیل اب وہ ارنسٹ کے خیال کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا مگر ارنسٹ کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔

اس کے اور پالین کے درمیان اختلافات بڑھ رہے تھے جس کی وجہ اسپین میں جاری خانہ جنگی سے جنم لینے والی سیاسی صورتِ حال بھی تھی۔

ارنسٹ ری پبلکن حکومت کا حامی تھا لیکن کیتھولک ازم کی حامی ہونے کی وجہ سے پالین قدامت پسند جنرل فرانسکو فرانکو کی فاشسٹ حکومت کے ساتھ تھی۔ اس حوالے سے بھی دونوں میں خاصا جھگڑا ہوا۔

بالآخر 1939ء میں فرانکو اور قوم پرستوں نے ری پبلکن پارٹی کو شکست دے دی اور خانہ جنگی ختم ہوگئی۔ لیکن یہ فقط خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ پالین اور ارنسٹ کے تعلقات اور ارنسٹ کے کیتھولک ازم سے وابستگی کا بھی خاتمہ تھا۔

واضح رہے کہ ارنسٹ نے زندگی میں The Fifth Column کے نام سے ایک ہی ڈراما لکھا تھا۔ اُس نے ان دنوں جب اسپین میں دھماکوں کی گونج منجمد ہوگئی تھی، یہ متاثر کن اور فکر انگیز ڈراما مکمل کیا تھا۔

اس عرصے میں ارنسٹ کی مارتھا سے خاصی ملاقات رہی۔ وہ مختلف مقامات پر ساتھ ساتھ نظر آتے تھے، جس کی سن گن پالین کو بھی ملی جس کی وجہ سے وہ مضطرب ہوگئی۔

بالآخر معاملہ طلاق تک پہنچ گیا اور ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کی بیوی نے علیحدگی کا مطالبہ کردیا۔

وہ ارنسٹ کے لیے انتہائی دُکھ بھرا لمحہ تھا۔ کم سنی میں اگینسز کے ہاتھوں بے وفائی کا کرب سہنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کبھی خواتین کو موقع نہیں دے گا کہ وہ اُسے دکھ پہنچائیں۔ اس فیصلے نے اُسے انجانی راہوں پر دھکیل دیا تھا جس کے باعث اس کی خانگی زندگی کئی عذابوں سے دوچار رہی۔

’’تمہاری ازدواجی زندگی ایک ناکام زندگی ہے۔‘‘ یہ پالین کے الفاظ تھے جو اس نے اُس وقت ادا کیے جب ان کے درمیان طلاق طے ہوگئی تھی۔

ارنسٹ پالین سے علیحدگی پر پہلے ہی خاصا مغموم تھا اس جملے نے تو اسے جیسے توڑ ہی دیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، لیکن ان آنسوؤں نے پالین کا دل نرم نہیں کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ’’تم نے نہ صرف اپنی بلکہ ان کی زندگی بھی اجیرن کردی جو تم سے محبت کرتے ہیں، تم کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔‘‘

☆☆☆

پالین کو طلاق اُس کے لیے دُہرا دکھ لائی۔ ایک تو اپنے ساتھی سے جدائی کا کرب دوسرا فلوریڈا میں بڑے چاؤ سے تعمیر کردہ مکان سے علیحدگی!

دراصل اسے پالین کو طلاق دینے کے بعد اس گھر سے جسے اس نے بڑی محبت سے سجایا تھا قانوناً دست بردار ہونا پڑا۔

وہ یاسیت اور قنوطیت کا زمانہ تھا۔ دکھ میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ ان ہی دنوں اس کی کتاب The Denunciation شائع ہوئی، جس کا زیادہ چرچا نہیں ہوا۔

خیر، کرب کی شدت میں اُس وقت کمی واقع ہوئی، جب وہ مارتھا سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گیا اور دھیرے دھیرے زندگی کی جانب لوٹنے لگا۔

اس میں مارتھا کا کردار کلیدی رہا۔ جب شادی کے دو روز بعد ارنسٹ نے اُس کے سامنے اپنے غم کا اظہار کیا، اس

WWW.Paksociety.com

نے کہا" میں سمجھ سکتی ہوں اور یاد رکھو، میں تمہارے ساتھ ہوں، زندگی کے ہر موڑ پر۔ خود کو کام میں غرق کردو، یوں تم اس کرب سے نکل آؤ گے۔"

ارنسٹ نے ایسا ہی کیا۔ وہ قلم تھام کر میز پر بیٹھ گیا۔

1940ء میں اسپین کی خانہ جنگی کے موضوع پر تحریر کردہ اس کا ناول For Whom the bells tolls شائع ہوا۔ یہ ناول حقیقی واقعات کے تناظر میں لکھا گیا تھا جس کا مرکزی کردار ایک امریکی فوجی رابرٹ جورڈن تھا جو ری پبلک کی جانب سے ہسپانوی فوجیوں سے لڑ رہا تھا۔ چونکہ ارنسٹ ان گنے چنے امریکیوں میں سے تھا جو خانہ جنگی کے اختتام تک اسپین میں موجود رہے، اس لیے اُس نے اس ناول میں اپنے مشاہدات و تخیلات کا ایسا امتزاج پیش کیا جسے شاہکار گردانا گیا۔ اس کتاب کے لیے وہ پالٹر پرائز کے لیے نامزد بھی ہوا۔

"یہ ناول ہیمنگ وے کی بہترین کاوش ہے!" ایک اخبار میں تبصرہ شائع ہوا۔

"ہیمنگ وے نے جزئیات نگاری کا میدان مار لیا۔" ایک معروف نقاد نے خیال ظاہر کیا۔

اس قسم کے حوصلہ افزاء تجزیوں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا لیکن یہ عارضی معاملہ تھا کیونکہ جلد دنیا ایک عفریت کی لپیٹ میں آنے والی تھی، جلد دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کو تھی۔

☆☆☆

ستمبر 1939ء میں نازی فوج نے پولینڈ پر حملہ کردیا جس کے بعد دنیا دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ابھی پہلی جنگِ عظیم کے زخم نہیں بھرے تھے کہ حساس طبیعت ارنسٹ کے سامنے ایک بار پھر لاشیں بکھر گئیں۔

دسمبر 1941ء میں امریکا نے اِس جنگ میں شمولیت کا اعلان کردیا اور اس اطلاع نے ارنسٹ میں سوئے صحافی کو پھر جگا دیا۔

"مجھے یورپ جانا ہوگا۔" ایک روز اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ مارتھا جو خود بھی ایک بہادر صحافی تھی، ارنسٹ کی طبیعت سے واقف تھی۔ گوکہ اسے خطرات کا اندازہ تھا لیکن اس نے اِس فیصلے کی مخالفت نہیں کی۔

ان برسوں میں وہ ایک میگزین کے لیے یورپ میں جنگ کی رپورٹنگ کرتا رہا۔ اس بار بھی اُس نے گولیوں کی بارش اور دھماکوں کی گونج میں زندگی کو سسکتے ہوئے، تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اس تجربے نے ایک طرح سے اُسے زندگی سے متنفر کردیا۔ ان برسوں میں وہ لکھنے لکھانے سے بھی دور رہا۔

لیکن دوری کا یہ معاملہ فقط ادب اور زندگی ہی سے نہیں تھا، وہ دھیرے دھیرے اپنی بیوی مارتھا سے بھی دور ہورہا تھا۔ ان کے درمیان سردمہری پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی۔

مارتھا کا خیال تھا کہ ارنسٹ کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے اور یہ شک کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ دراصل جنگ کے زمانے میں ارنسٹ کی میری نامی ایک صحافی سے ملاقات ہوئی تھی۔ جلد ہی اُن میں دوستی ہوگئی، جس میں اُنسیت کا رنگ دَر آنے میں زیادہ وقت بھی نہیں لگا۔

جب مارتھا کو یہ اطلاع ملی کہ اس کے شوہر اور میری کے درمیان جسمانی تعلقات قائم ہوگئے ہیں، وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یہ سب تو اُسی کا کیا دھرا ہے۔

"نہ میں ارنسٹ کی زندگی میں آتی، نہ پالین کی شادی شدہ زندگی برباد ہوتی۔ اب میں اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی ہوں، اِس شخص کے ساتھ رہنا آسان نہیں۔"

وہ سچ تھی، واقعی ارنسٹ کے ساتھ رہنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ اب بہت زیادہ ذہنی خلجان میں رہنے لگا تھا۔ زیادہ تر اب خاموش اور مضطرب رہتا تھا۔ وہ اکثر ماتھے پر آئے اُس زخم کو کریدنے لگتا جو اُسے پیرس میں ملا تھا۔

بالآخر مارتھا اور ارنسٹ میں طلاق ہوگئی۔ وہ ایک بار پھر عشق میں ناکام رہا۔ ایک بار پھر اُسے کرب کا عذاب سہنا پڑا۔ اور ایک بار پھر کرب سے نجات کے لیے اُس نے وہی طریقہ اپنایا، جو ماضی میں اپنایا تھا۔ اس نے 1946ء میں میری سے شادی کرلی۔ چوتھی شادی!

لیکن زندگی ڈگر پر آنے سے انکاری ہوگئی تھی۔ ان برسوں میں اُسے صحت اور معاشی مسائل نے شدید پریشان رکھا۔

اور پھر... وہ ایک بھیانک کار حادثے میں اپنا گھٹنا تڑوا بیٹھا۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ اس حادثے میں مارتھا بھی شدید زخمی ہوئی۔

وہ کئی دنوں تک ٹانگ پر پلستر چڑھائے بستر پر دراز رہا اور وہ دن اکتاہٹ سے بھرپور تھے۔

ان اداس دنوں میں اُسے اپنے کانوں میں عجیب و غریب سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں جنہیں وہ سمجھنے سے قاصر رہا۔

☆☆☆

وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تھا، قلم بھی دوبارہ سنبھال لیا تھا، میری بھی صحت یاب ہوگئی تھی لیکن نحوست نے تاحال اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

1947ء میں اُس کا بیٹا پیٹرک ایک کار حادثے میں شدید زخمی ہوگیا... اُس کے سر پر چوٹ آئی، گہری چوٹ!

مافوق الفطرت واقعات کے یقین رکھنے والے چند حلقوں کا دعویٰ ہے کہ پیٹرک کے سر پر ٹھیک اسی مقام پر چوٹ آئی تھی جہاں چند برس قبل ارنسٹ کے زخم آیا تھا۔

اُن دنوں یاسیت عروج پر تھی۔ وہ گھر میں بیٹھا ماضی یاد کرتا رہتا، اسے اب اپنے وہ دوست بھی یاد آتے جو ایک ایک کرکے جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے تھے۔

اپنے دوستوں کی جدائی کے غم میں اس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کردی۔ وہ جام تھامے غروب ہوتے سورج کو تکتا رہتا جو اسے یہ پیغام دیتا کہ جس طرح ایک ایک کرکے اس کے دوست دنیا سے چلے گئے، وہ بھی چلا جائے گا۔

مشکلات کسی طور کم ہونے کو تیار نہیں تھیں، دراصل یہی وہ وقت تھا، جب بدبختی کے عفریت نے جو پیدائش سے اس کے ساتھ تھا، عروج پر آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس کے سر میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ جب درد کی شدت بڑھ جاتی، وہ ماتھے پر آئے زخم کو کریدنے لگتا۔ وہ بلڈ پریشر کے مرض میں بھی مبتلا ہوگیا تھا۔ ساتھ ہی اسے ذیابیطس کی بیماری بھی لاحق ہوگئی جس نے اُسے توڑ دیا۔

"چوتھی شادی میرے لیے بدبختی کا پیغام لائی۔" وہ اکثر سوچا کرتا تھا۔

ادبی حوالے سے وہ شدید اُلجھنوں کا شکار تھا!

1946ء میں اس نے The Garden of Eden نامی کتاب پر کام شروع کیا تھا جو ایک طویل منصوبہ تھا۔ اُس نے اُس کے آٹھ سو صفحات بھی لکھ ڈالے تھے۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد وہ ایک Trilogy (ثلیات) پر بھی کام کررہا تھا جنہیں وہ The Sea Book نامی ایک ضخیم ناول کے طور پر شائع کروانا چاہتا تھا، تاہم بدقسمتی سے یہ دونوں ہی ناول مکمل نہیں ہوسکے۔

"اب میں جم کر نہیں لکھ سکتا۔" ایک روز اُس نے رندھی ہوئی آواز میں خود کو مخاطب کیا۔

1948ء میں مایوسی کا کچھ زور ٹوٹا، جب اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ یورپ کا دورہ کیا اور وینس میں قیام کیا۔ وہاں عشق لڑانے کی نقصان دہ عادت نے پھر اُس پر حملہ کردیا اور وہ ایک 19 سالہ لڑکی آندریانا کی محبت میں مبتلا ہوگیا۔

یہ رشتہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ نوخیز حسینہ اپنے باپ کی عمر کے شخص سے عشق لڑانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور وہ ارنسٹ کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی بے اعتنائی نے اُسے بہت دکھ دیا لیکن ایک معنی میں یہ بے وفائی سودمند ثابت ہوئی کہ اُس نے ارنسٹ کو لکھنے کی تحریک سے بھر دیا۔

اُس ناکام محبت کو اُس نے اپنے ناول Across tho River and Into the Trees کا موضوع بنایا جو اس نے کیوبا میں قیام کے زمانے میں مکمل کیا تھا۔

یہ ناول بہت پسند کیا گیا جس کے بعد اس نے اپنے نئے ناول The Old Man and the Sea پر کام شروع کیا۔

ناول مکمل کرکے جب اس نے مسودہ پبلشر کے حوالے کیا تو کہا "یہ میری اب تک کی بہترین کاوش ہے!"

وہ درست تھا، سو فیصد درست! اس ناول نے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے اور اسے ایک بین الاقوامی ادیب تسلیم کرلیا گیا۔ 1952ء میں اِسی ناول کے لیے اسے پالٹر پرائز بھی ملا۔

☆☆☆

اب وہ افریقا میں تھا، ایک پُراسرار خطے میں جو اپنے زرخیز اور گھنے جنگلات اور عجیب و غریب ثقافتوں کی وجہ سے دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ارنسٹ کا خیال تھا کہ وہ جنگِ عظیم دوم کے بعد جس اکتاہٹ اور بیزاری کی لپیٹ میں آیا تھا، اب اس سے نکل چکا ہے، نحوست پیچھا چھوڑ چکی ہے لیکن وہ غلط تھا۔ بدقسمتی تو اس کی جان کے درپے تھی۔

1954ء میں بدبختی نے دوبارہ اُس وقت ارنسٹ پر حملہ کیا جب وہ ہوا میں معلق تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ارنسٹ نے جب اپنی بیوی کو کرسمس کا تحفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سوچا کہ کچھ ایسا کیا جائے جس سے اُن کی درمیان سو جو سردمہری دم توڑ دے۔ سو اس نے ایک جہاز بک کروایا جس میں وہ دونوں سوار ہوگئے۔ اُن کی منزل بیلجئین کونگو کا خطہ تھا اور دورانِ پرواز اُنہوں نے مارچیسن آبشار کی تصاویر اتارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا لیکن یہ سفر کسی طور خوشگوار نہیں رہا۔

نامعلوم وجوہات کی وجہ سے ایک ویران، جھاڑیوں سے بھرے علاقے میں جہاز کو کریش لینڈنگ کرنی پڑی۔ اس

www.paksociety.com

حادثے میں میاں بیوی بُری طرح زخمی ہو گئے اور کرسمس کا تحفہ ایک المیہ بن گیا۔

اگلے روز جب وہ بہتر طبی سہولیات حاصل کرنے کے غرض سے یوگنڈا کے شہر اینٹیبی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوئے تو بڑے ہی پُراسرار انداز میں جہاز میں دھماکا ہو گیا!

دوسری جانب اینٹیبی میں جو افراد ارنسٹ کے منتظر تھے، ان میں یہ خبر پھیل گئی کہ اس حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر سے پوری دنیا تشویش کا شکار ہو گئی۔ کئی جگہ سوگ منایا گیا۔

جب وہ چند روز بعد زخموں سے چور، جھلسا ہوا وہاں پہنچا تو اسے بڑی مشکل سے صحافیوں کو راضی... کرنا پڑا کہ وہ دنیا کو یہ اطلاع دیں کہ وہ زندہ ہے۔

''میں ابھی زندہ ہوں، مجھے مارنے کی اتنی جلدی کیا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے صحافیوں سے کہا تھا، حالانکہ اس وقت وہ شدید کرب میں تھا۔

☆☆☆

ہاں وہ زندہ تھا اور لکھنے کی کوششوں میں لگا تھا، لیکن حقیقتاً وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا، نحوست اس پر پوری قوت سے حملہ کر چکی تھا، وہ زخموں سے چور تھا اور غم بھلانے کے لیے کثرت سے شراب نوشی کر رہا تھا جس کی وجہ سے ایک جانب جہاں اس کا جسم گھلتا جا رہا تھا، وہیں اس کا ذہن بھی بُری طرح متاثر ہوا تھا۔

حالات اتنے بگڑ گئے کہ جب 1954ء میں اسے ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا، وہ یہ اعلیٰ ترین ایوارڈ وصول کرنے نہیں جا سکا۔

اُس نے ایک بیان جاری کیا، جس میں کہا کہ اس وقت دنیائے ادب میں کئی ایسی شخصیات ہیں جو اس انعام کی اس سے زیادہ حق دار ہیں، اس نے اسپین سے تعلق رکھنے والے پیو بروجا کا خصوصی طور پر ذکر کیا جو اس وقت بسترِ مرگ پر تھا۔

''البتہ میں اعزاز کے ساتھ ملنے والی رقم میں خاصی دلچسپی رکھتا ہوں کیونکہ میرے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے صحافیوں کو بتایا تھا۔

بعد میں کئی دوستوں نے یہ سوال کیا کہ وہ نوبل انعام وصول کرنے کے معاملے میں کیوں پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' اس نے آسمان کو گھورتے ہوئے جواب دیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور جام اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''دو برس قبل جو فضائی حادثات پیش آئے تھے، ان کی وجہ سے دنیا بھر میں میرے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ انعام اسی ہمدردی کی وجہ سے دیا گیا ہے۔''

ایک خیال یہ بھی ہے کہ فضائی حادثوں نے اُس کے ذہن میں یہ خوف بٹھا دیا تھا کہ اگر وہ پھر ہوائی جہاز میں سوار ہوا تو اجل اس پر قابو پا لے گی۔

☆☆☆

اگلے برس شراب نوشی کی وجہ سے اس کے گردے جواب دینے لگے۔ معالجین نے اسے متنبہ کیا کہ اگر وہ شراب پیتا رہا تو وقت سے پہلے ہی قبر میں اُتر جائے گا لیکن اس نے ان کی رائے کو اہمیت نہیں دی۔

بالآخر ہمت مجتمع کر کے ایک بار پھر اُس نے 1956ء میں یورپ کے لیے رختِ سفر باندھا۔

جب خیر خواہوں نے سمجھانے کی کوشش کی، اس نے جواب دیا ''میں ویسے ہی موت کے قریب ہوں، اس خوف سے میں اپنی خواہش ترک نہیں کر سکتا۔''

اس نے اسپین کا دورہ کیا جس کا مقصد پیو بروجا سے ملاقات تھی۔ ان کی ملاقات کے چند ہی روز بعد بروجا زندگی کی بازی ہار گیا۔ جب ارنسٹ کو یہ اطلاع ملی، وہ گہرے کرب میں چلا گیا۔

''بروجا، اچھے دوست تم چلے گئے، ان دوستوں کے مانند جو مجھے چھوڑ چکے ہیں۔''

اس سفر میں بھی وہ خاصا بیمار رہا۔ 1957ء میں وہ کیوبا پہنچا، جہاں اب وہ طویل قیام کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ چونکہ اسپین کی خانہ جنگی کے زمانے میں اس کے تعلقات مارکسی سوچ رکھنے والے افراد سے استوار ہو گئے تھے، اس لیے وہ ایف بی آئی کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ امریکی حکومت کا خیال تھا کہ وہ کیوبا میں موجود کمیونسٹوں سے رابطے میں ہے۔

1959ء میں فیڈل کاسترو نے کیوبا میں انقلاب برپا کر دیا اور بتیستا کی حکومت ختم ہو گئی۔

''فوراً امریکا لوٹ آؤ!'' اسے تار کے ذریعے دوستوں کا پیغام ملا جسے اُس نے درخورِ اعتنا نہ جانا اور وہیں ٹھہرنے کا حیران کن اعلان کر دیا۔ اس فیصلے نے ایف بی آئی کو چونکا دیا اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ انقلابیوں سے اُس کے روابط ایک حقیقت ہے۔

گو کہ وہ امریکی تھا، تاہم انقلابی نے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ دراصل وہ کسی زمانے میں فیڈل کاسترو کے حق میں بیانات دے چکا تھا جس کی وجہ سے اسے انقلاب کا حامی تصور کیا جاتا تھا۔

1960ء میں اُس نے کیوبا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا جس کا سبب یہ اطلاع تھی کہ فیڈل امریکا اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد کی ملکیت کو قومیانے کی پالیسی کا اعلان کرنے والا ہے۔

یہ ایک طرز کی ہجرت تھی جس میں اس کے کئی مسودے ضائع ہو گئے جس کا اُسے آنے والے برسوں میں شدید قلق رہا۔

☆☆☆

اب اس نے ریاست ایڈھو کے علاقے کیچ کم کو اپنا مسکن بنایا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس کے سفر کا، بھرپور زندگی کا بڑے ہی بھونڈے ڈھنگ سے اختتام ہونا تھا۔

اس نے بل فائٹنگ کے متعلق ایک ناول لکھا تھا جسے وہ اپنا ماسٹر پیس خیال کرتا تھا۔

''یہ میرا سب سے کامیاب ناول ثابت ہوگا۔'' وہ اکثر اپنی بیوی سے کہا کرتا تھا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی پبلشر اسے چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دراصل کیوبا میں قیام کے فیصلے نے اس کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔

ناول کی اشاعت کے لیے اسے اپنی بیوی کے دوست ول لانگ کی منت سماجت کرنا پڑی جو لائف میگزین کا بیورو چیف تھا۔

وہ عجیب صورتِ حال تھا کہ نوبل انعام یافتہ، دنیا بھر میں معروف ادیب ارنسٹ ہیمنگ وے اپنی تحریر کی اشاعت کے لیے ایک میگزین کے بیورو چیف کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ خیر، اس کہانی کا پہلا حصہ میگزین میں شائع ہو گیا لیکن جس طرز پر اسے چھاپا گیا تھا، اس سے ارنسٹ خوش نہیں تھا۔ اس نے ول لانگ سے خاصا جھگڑا بھی کیا۔ جب میری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، وہ اس سے بھی اُلجھ پڑا۔

''اس کی حمایت مت کرو، مجھے پتا ہے تمہارے اس سے کس قسم کے تعلقات ہیں۔'' اس نے کف اُڑاتے ہوئے کہا۔

میری حیران رہ گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ارنسٹ کی ذہنی حالت اتنی بگڑ گئی ہے، دراصل وہ زود رنج ہو گیا تھا۔

بلڈ پریشر اور جگر کی بیماریاں اپنے عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ ایسے میں کسی نے الیکٹرو کنول سو تھراپی (ECT) کروانے کا مشورہ دے دیا، جسے اس نے قبول کیا اور پھر زندگی کے آخر دن تک وہ اُس شخص کو کوستا رہا۔

وہ مالیخولیا کا شکار ہو گیا تھا، یادداشت بھی ساتھ چھوڑ رہی تھی، وزن گھٹ رہا تھا اور وہ تھراپی ہی کو اس کا سبب قرار دیتا تھا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا۔ ہر شخص سے بلاسبب لڑ پڑنے کی عادت راسخ ہو گئی۔ اس کے دوست، خیر خواہ اس سے دور ہوتے گئے۔

اس کے اور میری کے اختلافات بھی عروج پر پہنچ گئے تھے، پھر اسے مالی پریشانیوں نے بھی گھیر رکھا تھا۔ وہ وقت پر ٹیکس ادا نہیں کر پا رہا تھا اور مادی سہولیات کے لیے دوسروں کا محتاج ہو گیا تھا۔

ایسے میں، جب وہ جام ہاتھ میں لیے اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا ہوتا، کوئی اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا، ایک پیغام دیتا، ایسا پیغام جسے اب وہ واضح طور پر سمجھ سکتا تھا!!

☆☆☆

یہ 1961ء کا ذکر ہے!

ایک صبح جب ناشتے کی تیاری کے ارادے سے میری کچن میں داخل ہوئی، وہاں ایک ایسا منظر اس کا منتظر تھا جس نے اس کے ہوش اُڑا دیے۔

اس نے دیکھا، اس کا خستہ حال شوہر شارٹ گن ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔

اُس کا چہرہ بے تاثر تھا اور میری کے لیے یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ آیا وہ خود کو ہلاک کرنا چاہتا ہے یا اپنی بیوی کو جسے وہ علی الاعلان اپنی مصیبتوں کا سبب قرار دینے لگا تھا۔

وہ چند ساعت کھڑی اسے تکتی رہی۔ پھر آگے بڑھی، بڑی محبت سے اُسے سمجھانا شروع کیا، تسلی دی۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ ارنسٹ نے شارٹ گن ایک جانب رکھ دی لیکن اس کا چہرہ بے تاثر ہی رہا۔ وہ واقعی زندگی سے اُوب چکا تھا۔

اسے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا جہاں اس کی شاک ٹریٹمنٹ کی گئی۔ 30 جون کو اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ طبی ماہرین نے دورانِ علاج اس پر گہری نظر رکھی تھی۔ ان کا اندازہ تھا کہ اب وہ دوبارہ اس قسم کی حرکت نہیں کرے گا، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ موت تاحال اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔

اُس وقت وہ 61 برس کا تھا اور اپنی سالگرہ سے چند ہفتوں کی دوری پر تھا۔ احباب نے اس کے لیے شان دار تقریب کا اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ اسے یاسیت سے باہر لانے میں مدد کر سکیں لیکن ان کا یہ منصوبہ کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

www.paksociety.com

آخرکار 2 جولائی کی صبح طلوع ہوئی۔ یہ وہی صبح تھی جس میں عالمی ادب کی سب سے بڑی ٹریجڈی نے جنم لیا اور کہانیاں سُنانے والا اپنے پیچھے ایک حزنیہ داستان چھوڑ گیا۔

☆☆☆

ارنسٹ ہیمنگ وے، انگریزی زبان کا مایۂ ناز ادیب مر چکا تھا اور اس کے چاہنے والوں میں، علمی ماہرین میں یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ آخر اُس نے خودکشی کیوں کی؛

ایک خیال تو یہ تھا کہ گرتی صحت اور معاشی پریشانیوں نے اسے توڑ دیا تھا جن سے جان چھڑانے کے لیے اس نے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔

تاہم پُراسرار قوتوں پر یقین رکھنے والے حلقوں میں جو نظریہ مقبول ہوا، وہ نحوست کے تعاقب کا نظریہ تھا۔

آسیب اور بددعاؤں پر یقین رکھنے والوں نے ارنسٹ ہیمنگ وے کے سلسلے میں یہ خیال پیش کیا کہ نہ صرف اُس کا باپ، بلکہ اُس کے اجداد میں بھی کئی لوگ آسیب اور بددعاؤں کے زیرِ اثر رہے تھے اور اُنہوں نے زندگی کے مختلف حصوں میں خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ سب سے بڑی مثال ارنسٹ کا باپ تھا جس نے ایک شارٹ گن کے مدد سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا جس کی ہو بہو ارنسٹ نے تقلید کی۔

مافوق الفطرت قوتوں پر یقین رکھنے والے اس ضمن میں ارنسٹ کی اولاد کی مثال بھی پیش کرتے ہیں جن کی زندگی میں اُوب جانے، اُکتا جانے کی علامات ظاہر ہوئیں لیکن اُنہوں نے کسی نہ کسی طرح اس پر قابو پالیا۔ واضح رہے کہ ارنسٹ کی پوتی مارگیوس ہیمنگ وے نے جمی جو ایک اداکارہ اور ماڈل تھی، ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا "میرے کانوں میں عجیب و غریب سرگوشیاں ہوتی ہیں اور چند قوتیں مجھے موت قبول کرنے کے پیغامات دیتی ہیں۔"

اسی مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس نے یوگا شروع کر دیا تھا۔

مارگیوس ہیمنگ وے کی کہانی پُراسرار قوتوں پر یقین رکھنے والوں کے نظریات کو خاصا سہارا دیتی ہے۔ یاد رہے کہ ارنسٹ نے 2 جولائی کو خودکشی کی تھی اور 1996ء میں یکم جولائی کو یعنی اپنے دادا کی برسی والے دن سے ایک روز قبل مارگیوس پراسرار حالات میں مردہ پائی گئی۔ بعد میں پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ اُس کے جسم میں نشہ آور ادویہ بڑی مقدار میں موجود تھیں۔

ہیمنگ وے خاندان نے بھرپور کوشش کی کہ اس موت کو حادثاتی قرار دے دیا جائے، لیکن عام لوگوں میں یہ خیال راسخ تھا کہ اس نے خودکشی ہی کی ہے۔

ایک جانب جہاں ارنسٹ کی موت کو آسیب اور بددعا سے جوڑا جاتا ہے، وہیں سنجیدہ علمی ماہرین کا خیال مختلف تھا۔ ان کے مطابق آخری دنوں میں ارنسٹ میں وہی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں جو خودکشی سے قبل اس کے باپ میں ظاہر ہوئی تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا باپ کلیرنس ہیمنگ وے hemochromatosis نامی مرض میں مبتلا تھا اور یہ بیماری ارنسٹ کو وراثت میں ملی تھی۔ یہ بیماری ایک طرح کا "ڈس آرڈر" ہے جس کی وجہ سے جسم میں آئرن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

کئی برس بعد 1991ء میں سامنے آنے والی تحقیق سے یہ واضح ہو گیا کہ ارنسٹ واقعی اس مرض کا شکار تھا۔

یاد رہے کہ اس کی بہن ارسلا اور اس کے بھائی لیسیسٹر نے بھی خودکشی کی تھی جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی مرض وراثت میں اُنہیں بھی ملا۔

ارنسٹ ہیمنگ وے کی موت کی بابت بحث جاری ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ دنیا کا بدبخت ترین خوش قسمت تھا۔

ایک جانب جہاں اس نے عزت، شہرت اور دولت حاصل کی، وہیں اپنی صحت کو تباہ کیا، معاشی پریشانیوں میں گھرا رہا۔ چار شادیاں کیں، چاروں ناکام رہیں، عشق کیا، ہجر کا کرب سہا۔ اور بالآخر خود کو موت کے حوالے کر دیا۔

گو کہ اس کی موت متنازع ہے، تاہم پوری دنیا اس بات پر متفق ہے کہ وہ بیسویں صدی کا عظیم ترین فکشن نگار تھا جس کے اسلوب نے ایک عہد کو متاثر کیا۔ اس نے صحافت کے میدان میں بھی نئی تاریخ رقم کی۔ نوبل انعام حاصل کرنے والے اس ادیب کی زندگی میں اُس کے سات شاہکار ناول اور افسانوں کے چند مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ موت کے بعد شائع ہونے والے ناول کی تعداد تین جب کہ افسانوی مجموعوں کی تعداد چار ہے۔ "نان فکشن" کتابوں کی تعداد پانچ ہے جنہیں ہیمنگ وے کے اچھوتے اسلوب کی وجہ سے ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔ یوں تو اس کے کئی ناول مقبول ہوئے، لیکن The Old Man and the Sea کو انگریزی ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے، جس کی وجہ سے اُسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

☆☆☆

(ماخذات: وکی پیڈیا، بی بی سی، نیشنل جیوگرافک۔)

زردآندھی

مریم کے خان

انسان اگر تہذیب سے عاری بنے تو حیوان کہلاتا ہے، حیوانیت اس پر سوار ہو جاتی ہے۔ وہ ظلم وجبر کی آخری حدود پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ چرواہے تھے، بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ گلہ بانی کرتے کرتے ان کے سر میں جہاں بانی کا سودا سمایا اور وہ جیتے جاگتے قہر بن کر دیگر اقوام پر ٹوٹ پڑے۔ گرم لاوے کی طرح دنیا کو جلاتے، تباہی پھیلاتے آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کی خوں آشامی کے قصّے آج بھی لرزا دینے کو کافی ہیں۔

ایک جرم کی تاریخی سرگزشت [illegible] کے درمیان

ان کے لیے آسمان ہی چھت تھی۔ ان کے کمزور خیموں کی چھتیں موسم کی سختی کو نہیں سہار سکتیں تھیں۔ اس کے باوجود وہ زندہ تھے اور طاقت ور تھے۔ اسے وہ آسمان کی مہربانی سمجھتے تھے اس لیے وہ آسمان کو خدا کے روپ میں دیکھتے تھے اور اپنے اوپر چھائی اس چھت کو نیلا جاودانی آسمان کہتے تھے۔ صحرائے گوبی کے آس پاس بسنے والے چرواہے قبائل کا مذہب غیر واضح تھا۔ وہ آسمان کو اپنا خدا تو مانتے تھے لیکن ان میں مذہبی رسومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ان کی طرح ان کا مذہب بھی غیر متمدن اور سادہ تھا۔ وہ وسیع و عریض چراگاہوں میں اپنے جانوروں کے ساتھ رہتے تھے اور خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ان میں پیدا ہوتے اور ان میں ہی مر جاتے تھے۔ وہ

www.Paksociety.com

کھال، پوستین اور اون سے بنے لباس پہنتے تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ گھوڑے کی پشت پر گزرتا تھا۔ وہ بہت سادہ خوراک کھاتے تھے۔ گوشت اور دودھ ان کی مرغوب غذا تھی۔ گھوڑی کے دودھ کو سڑا کر وہ اس سے ایک خاص مشروب تیار کرتے تھے۔ البتہ شراب نوشی میں وہ کسی طرح باقی متمدن دنیا سے کم نہیں تھے۔

یہ چرواہے قبائل کہاں سے آ کر منگولیا میں آباد ہوئے اور ان کا تعلق کس نسل سے ہے اس کے بارے میں آج کے ماہرین بھی کم جانتے ہیں۔ ان کا تعلق ہن نسل سے نہیں ہے جو پورے چین، منچوریا اور مشرق بعید میں آباد ہیں۔ چین سے لے کر جنوب میں انڈونیشیا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندے تک ہن نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چین کے بالکل ساتھ جڑے منگولیا میں بسنے والے ان پستہ قد اور زرد رنگ کے لوگوں کا تعلق کسی اور نسل سے بتایا جاتا ہے۔

ماہرین ان کا تعلق ایشیا یورو نسلوں سے جوڑتے ہیں۔ یوں تو یورپ کے باسی بھی اصل میں وسط ایشیا سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن گزشتہ کئی ہزار سال سے وہ الگ نسلی خصوصیات کے مالک بن گئے ہیں۔ جیسے سنہری بال، نیلی آنکھیں اور طویل قامت خوب صورت جسم وغیرہ۔ یہ خصوصیات ایشیائی نسلوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ڈی این اے سے واضح ہے کہ یورپ کے باشندے بھی اصل میں آریا النسل ہیں اور یہ وسط ایشیا سے ہجرت کر کے یورپ میں آباد ہوئے۔ مشرقی یورپ اور خاص طور سے روس کے علاقوں میں آباد نسلیں ایشیا یورو مشترک نسل کہلاتے ہیں۔ اس گروہ سے بہت ساری ذیلی نسلیں بھی نکلیں۔ جن میں ترک اور منگول نمایاں ہیں۔

اگر ایشیا کے نقشے کا جائزہ لیا جائے تو اس کا وسط حصہ وہی ہے جسے آج ہم وسط ایشیا کہتے ہیں یعنی سوویت یونین سے آزاد ہونے والی مسلم ریاستیں ایشیا کا وسط ہیں۔ اس لیے کہ یہاں سے ایشیا میں ہر طرف جانے والی قدیم ترین شاہراہیں موجود ہیں جن میں سب سے مشہور شاہراہ ریشم ہے۔ سلک روڈ آج سے ہزار سال پہلے دنیا کی معروف ترین تجارتی گزرگاہ تھی۔ یہ ایک طرف ایشیا کو یورپ سے ملاتی تھی تو دوسری طرف عرب ممالک اور ہندوستان کو چین اور منگولیا سے جوڑتی تھی۔ اس شاہراہ کی اہمیت بعد میں کم ہوئی اور جب منگول وسط ایشیا پر حملہ آور ہوئے اور اس پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا تو پھر یہ بے کار ہو گئی تھی۔

جنوبی ایشیا کے اوپر ہمالیہ کے عظیم پہاڑی سلسلے کے بعد دو بڑے صحرا ہیں۔ ان میں ایک چین یا وسط ایشیا کا صحرا تکلی ماکان ہے۔ چین کے صوبے سنکیانگ (سابق ترکستان) سے شروع ہونے والا یہ صحرا ہزار میل سے زیادہ وسیع ہے اور اس کی چوڑائی چار سو میل سے کم نہیں ہے۔ اس عظیم صحرا کا رقبہ پاکستان سے زیادہ ہے۔ دوسرا بڑا صحرا جو چین کے شمال مغرب میں منگولیا میں واقع ہے صحرائے گوبی کہلاتا ہے۔ یہ دنیا کا واحد صحرا ہے جو بعض مقامات سے سترہ ہزار فٹ تک بلند ہو جاتا ہے اور یہاں سردیوں میں درجہ حرارت گر کر منفی تیس ڈگری سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ یہی صحرا وسط ایشیا کے منفرد حیوان، دو کوہانوں والے اونٹ کا گھر ہے کیونکہ عام اونٹ کے مقابلے میں دو کوہانوں والے اونٹ کہیں زیادہ سردی برداشت کر سکتے ہیں۔

ان دو صحراؤں کے درمیان کی سرزمین چین اور پھر منگولیا تک رسائی کا واحد ذریعہ تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں صحرا عبور کرنا تقریباً ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ سخت موسموں سے بنی یہ سرزمین بھی سفر کے لیے ناموزوں تھی لیکن پھر بھی قافلے اس سے گزر کر چین کی سرزمین تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ منگولیا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس زمانے میں یہ سارا علاقہ وحشت اور درندگی کا گھر تھا۔ باہر سے آنے والوں کی جان و مال کی یہاں کوئی ضمانت نہیں ہوتی تھی۔ اخلاق و مروت کا یہ عالم تھا کہ اکثر میزبان اپنے مہمان کو قتل کر کے اس کے مال و اسباب اور بیوی تک پر قابض ہو جاتا تھا اور اسے بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وسط ایشیا ہمیشہ سے چرواہے خانہ بدوشوں کا گھر رہا ہے کیونکہ بارشوں کی کمی اور غیر یقینی موسم کی وجہ سے یہاں کاشت کاری فروغ نہیں پا سکی۔ البتہ بہت بڑی چراگاہوں کی وجہ سے یہاں مویشی پالنے کے مواقع موجود تھے۔ اس لیے یہاں کے لوگ مویشی پالنے لگے۔ پھر جیسے جیسے آبادی بڑھتی رہی اور نئے لوگوں کو مزید چراگاہوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ شمال اور مشرق کی طرف پھیلنے لگے۔ ان میں سے کچھ قبائل منگولیا کی زمین پر آباد ہوئے اور آج منگول کہلاتے ہیں۔ یہی قبائل ہمارے اس مضمون کا موضوع ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق آج سے دس ہزار سال پہلے منگولیا میں انسان آباد تھے۔ یہ ابتدائی خانہ بدوش تھے جو اپنے مویشی لے کر زرخیز چراگاہوں کی تلاش میں پھرتے تھے۔ جب انہوں نے منگولیا کی سرد اور سبز گھاس سے ڈھکی سرزمین کو پایا تو وہ یقیناً خوش ہوئے ہوں گے۔ جب وہ

یہاں مستقل آباد ہوئے تب بھی انہوں نے اپنے خانہ بدوش طرز زندگی کو نہیں چھوڑا تھا۔ وہ خیموں میں رہتے تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں زندگی آسان نہیں تھی کیونکہ سال میں پانچ مہینے کے لیے زمین برف سے ڈھک جاتی تھی اور جانوروں کے کھانے کے لیے سبزے کا ایک تنکا بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ ان میں تجارت کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اس وجہ سے یہ قبائل بہت بڑی تعداد میں اپنے جانور کاٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جانوروں کا گوشت سکھا کر محفوظ کر لیتے تھے۔ ان کی چربی سے اپنے چراغ روشن کرتے تھے اور ان کی کھال مختلف کاموں میں استعمال کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ یہاں خوش تھے۔

سخت اور سرد موسموں کے پروردہ یہ چرواہے قبائل سردی سے نہیں گھبراتے تھے بلکہ یہ سردی میں خوش رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ شمال کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے سائبیریا آباد کیا پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر آبنائے بیرنگ عبور کرتے ہوئے شمالی امریکا میں داخل ہوئے اور وہاں سے پھیلتے ہوئے جنوبی امریکا کے آخری سرے تک جا پہنچے تھے اور اس کام میں ان کو صرف تین ہزار سال کا عرصہ لگا تھا۔ آج جنوبی امریکا کی قدیم ترین انسانی آبادی کا سراغ سات ہزار سال پہلے کا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر بلند حوصلہ اور پُرعزم انسان تھے۔ آبنائے بیرنگ کو پیدل عبور کرنا آج کے دور میں بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت ان لوگوں نے اسے پیدل اور پورے خاندانوں کے ساتھ عبور کیا تھا۔ ان میں عورتیں اور بچے سب تھے۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ سفر سردیوں میں کیا تھا کیونکہ سرما کے چھ مہینوں کے دوران اس بائیس میل چوڑے سمندر پر برف جم جاتی ہے اور اس پر سفر کیا جا سکتا ہے۔ سرما میں یہاں درجۂ حرارت گر کر منفی ساٹھ ڈگری سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے۔ صرف سوچا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس قیامت کی سردی کا مقابلہ کس طرح کیا ہوگا؟ بظاہر تو یہ چیز انسانی طاقت سے باہر نظر آتی ہے اور پھر وہ شمالی امریکا میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی حالات اچھے نہیں ہوں گے اور ہزاروں میل تک برف جمی ہوگی۔ اس کے باوجود یہ زندہ رہے اور پھلتے پھولتے رہے۔ اس سفر کی سختی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی جانور نہیں آ سکا تھا یہی وجہ ہے آج ہمیں امریکا میں کوئی ایشیائی جانور نہیں ملتا ہے۔ یہ چرواہے امریکا آنے کے بعد

حدیث پاک

"جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی دیکھیں اور اسے روکنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیف دیں گے۔ پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔"

(ترمذی۔ 2178، ابوداؤد..... 4338)

مرسلہ: نصرت علی خان، چنیوٹ

اپنی خوراک کے لیے شکار پر مجبور ہو گئے تھے اور پھر ہزاروں سال تک یہ شکار کرتے رہے کیونکہ امریکا میں ایسے جانور نہیں پائے جاتے تھے جنہیں پالتو بنا کر پالا جا سکے۔ آج ماہرین منگول نسلوں اور امریکی ریڈ انڈین قبائل کو ایک ہی نسلی گروہ کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گروہ کس قدر سخت جان تھا۔ دنیا میں بنیادی طور پر تین نسلی گروہ ہیں۔ ایک آریائی جن میں ایشیا اور یورپ کی نسلیں آتی ہیں۔ دوسرے ہن نسل کے لوگ جو چین سے آسٹریلیا تک آباد ہیں۔ واضح رہے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے سفید فام باشندے یہاں چند سو سال پہلے یورپ سے آئے تھے۔ یہاں کے اصل باشندے جنہیں ایبوجینز بھی کہتے ہیں اصل میں ہن نسل سے ہی ہیں۔ تیسرا گروہ سامی النسل افراد پر مشتمل ہے ان میں عرب اور افریقی نسلیں آتی ہیں۔ ان کا منبع عرب ملک ہیں لیکن افریقا میں یہ کئی ہزار نسلی گروہوں کی صورت میں موجود ہیں۔ منگول آریا گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان کی جسمانی خصوصیات ہن نسل کے باشندوں سے ملتی ہیں۔ یعنی قد اور چہرے کے نقوش وغیرہ۔

چرواہے قبائل جنگجو ہوتے تھے لیکن یہ لڑائی جھگڑے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا کوئی مستقل مستقر نہیں تھا جس کی حفاظت کی ان کو فکر ہوتی۔ اس لیے اگر کہیں لڑائی کا سامنا ہوتا تو یہ کنی کترا جاتے تھے۔ ہاں اگر ان پر حملہ کیا جاتا تو یہ

پوری بے جگری سے مقابلہ کرتے تھے۔ مگر جب یہی خانہ بدوش چرواہے کہیں مستقل آباد ہوئے تو ان کی جنگجوئی ابھر کر سامنے آئی۔ انہوں نے اپنی مستقل حد بندیاں بنائیں اور ان کی حفاظت کے لیے آپس میں لڑنے لگے۔ پھر ان کی آبادیاں پھیلیں اور ان کو اپنے جانوروں کے لیے مزید زمینوں کی ضرورت پڑی تو یہ اپنی حدوں سے نکلے۔ آپس میں لڑائیاں ہوئیں۔ جو کمزور تھے وہ مغلوب ہو گئے اور جو طاقت ور تھے وہ غالب آئے۔ انہوں نے دوسروں سے صرف زمینیں نہیں چھینیں بلکہ انہیں غلام بنالیا۔ ان کے مردوں کو مار دیا اور ان کی عورتوں کو اپنی نسل بڑھانے کا ذریعہ بنا لیا۔ یوں ایک مسلسل عمل سے گزر کر کئی سو خانہ بدوش قبائل سمٹ کر چند درجن بڑے قبائل میں بدل گئے۔

بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دنیا کے نقشے پر صرف دو بڑی طاقتیں تھیں۔ ایک مسلمان اور دوسرے عیسائی۔ پانچ صدیوں کی مسلسل محاذ آرائی کے بعد بالآخر عیسائیوں نے ہار مان کر ایشیا سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے انہیں فلسطین سے بے دخل کر دیا تھا اور سوائے موجودہ ترکی کے کچھ حصے کے اس کے پاس ایشیا میں مزید کوئی علاقہ باقی نہیں رہا تھا۔ ایشیا کے وہ علاقے جو ایک زمانے میں ایران کے خلاف یورپ کے مضبوط گڑھ سمجھے جاتے تھے جیسے آرمینیا اور آذربائیجان وغیرہ اب ان پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ مسلمانوں میں جب عربوں کا خون ٹھنڈا ہوا تو اللہ نے ترکوں کی صورت میں مسلمانوں کو ایک اور محافظ عطا کیا۔ پورا وسطِ ایشیا طاقت ور مسلم سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا۔ سلجوق ترکوں کے بعد خوارزمی آ گئے تھے اور انہوں نے وسطِ ایشیا کو ایک بہت بڑی حکومت میں بدل دیا تھا۔

مگر دنیا والے بے خبر تھے کہ مہذب دنیا سے ہزاروں میل دور گوبی کے صحراؤں میں ایک طوفان جنم لینے والا ہے اور وہ طوفان جلد ایشیا اور یورپ کا رُخ کرے گا۔ منگولیا کی وسیع سرزمین پر بسنے والے درجنوں طاقت ور جنگجو قبائل آپس میں صدیوں سے محاذ آرا رہنے کے بعد لڑائی کے تمام حربے سیکھ چکے تھے۔ دوسری طرف ان میں مشترک قومیت کی روح بیدار ہو رہی تھی۔ مختلف قبیلوں میں بٹے ہونے کے باوجود انہیں احساس تھا کہ وہ ایک ہی نسل کے لوگ ہیں اور آپس میں مار کاٹ بالآخر انہیں کمزور کر دے گی اور جنوب کے ہن نسل کے لوگ جو صدیوں سے ان کے خلاف تھے ان پر غالب آ سکتے تھے۔ کہتے ہیں واقعہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس کا آغاز بہت چھوٹا سا ہوتا ہے۔ منگول قبیلے طاقت ور اور اس قابل ہو چکے تھے کہ کسی بھی سلطنت کو روند کر رکھ دیں لیکن ابھی اس کا چھوٹا سا آغاز نہیں ہوا تھا۔

یہ چھوٹا سا آغاز ایک بچے کی پیدائش تھی۔ اس کی ماں نے اس کا نام تموچن رکھا تھا لیکن بڑا ہو کر یہ چنگیز خان کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا قبیلہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور آس پاس کے طاقت ور قبائل اسے دبا کر رکھتے تھے۔ کسی جنگی مہم میں اس کے قبیلے سے سپاہی لیے جاتے تھے اور ان کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ انکار کر سکیں اس طرح غیروں کی لڑائی میں ان کا خون بہتا تھا اور ان کو کوئی صلہ بھی نہیں ملتا تھا۔ چنگیز خان یہ سب دیکھتے ہوئے جوان ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے قبیلے اور قوم کی حالت بدل کر رہے گا۔ جوانی میں اس کا پسندیدہ مشغلہ شکار تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ہفتوں شکار کی مہم پر رہتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا کہ شکار کے تعاقب میں اسے کئی کئی دن گھوڑے کی پشت سے اُترنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے آرام کر لیا کرتا تھا۔

کہتے ہیں چنگیز خان نے اپنی ان شکاری مہمات کے دوران ہی دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ شکار کو صرف شکار کے طور پر نہیں کھیلتا تھا بلکہ اسے آنے والے دنوں کی ریہرسل سمجھتا تھا۔ اس نے بہت ساری جنگی چالیں شکار کے دوران سیکھی تھیں۔ یہی وجہ تھی جب وہ فاتح اعظم بنا تو اس نے اپنی فوج کے لیے شکار کھیلنا لازمی قرار دے دیا۔ کم عمری میں اس نے جنگجو ساتھیوں کا ایک ٹولہ بنا لیا تھا جو آس پاس لوٹ مار کرتے تھے اور موقع ملنے پر دوسروں کے مویشی اور عورتیں چھین لاتے تھے۔ جلد قبیلے والوں نے اسے دلیر جنگجو محسوس کرتے ہوئے سرداری کا تاج اس کے سر پر سجا دیا۔ چنگیز خان نے اپنے قبیلے کے نوجوانوں کی تربیت کی اور انہیں بہترین جنگجو بنا دیا۔ اسے معلوم تھا آنے والے دنوں میں یہ نوجوان اس کے دست و بازو ہوں گے۔

مختلف حالات سے گزرتا ہوا چنگیز خان بالآخر صحرائے گوبی میں آباد منگول قبائل کو اپنے پرچم تلے لانے میں کامیاب ہوا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا کہ خود ان قبائل میں قومیت کا احساس بیدار ہو رہا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ پُرامن ہونے کے خواہاں تھے بلکہ وہ اپنی خونخواری دوسری قوموں پر آزمانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک جھنڈے تلے جمع ہوں اور ان کا کوئی ایک ہی سردار ہو۔ منگول بہت سادہ تھے اور ان میں مذہبی اور معاشرتی قوانین نہ ہونے کے برابر تھے۔

چالاک چنگیز خان نے اسی چیز کا فائدہ اُٹھایا اور ایک آئین بنا کر اس نے تمام منگولوں کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا۔ اس کے مرتب کیے قوانین کا مجموعہ یاسا کہلاتا ہے اور اس وقت ہر منگول کے لیے لازم تھا کہ وہ یاسا کے قوانین کی پاسداری کرے۔ اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ایک ہی سزا تھی — دردناک موت۔ چنگیز خان نے ان کو قومی نعرہ دیا۔ اوپر ایک آسمان اور زمین پر ایک خان۔ اس نے تمام منگول قبیلوں کو مساوی قرار دیا اور انصاف کے معاملے میں کوئی کسی سے بڑا نہیں تھا۔ اگر چنگیز خان کا نزدیکی رشتے دار بھی کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا تو اسے بھی وہی سزا دی جاتی جو کسی عام منگول کو دی جاتی تھی۔ اس مساوات نے منگولوں میں یک جہتی کی روح پھونک دی اور پھر دنیا نے دیکھا انہوں نے کس طرح ایشیا اور یورپ کی عظیم الشان سلطنتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔

چنگیز خان نے صحرائے گوبی کے قبائل کو جمع کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ اس نے بہت بڑی فوج بنائی اور اسے کڑی تربیت دلوائی۔ وہ اپنے لوگوں سے کہتا تھا کہ بہت جلد دنیا ان کے زیر ہو گی۔ منگول ویسے ہی سخت جان ہوتے تھے۔ چنگیز خان نے ان کی وحشت کو فوجی ڈسپلن میں بدل کر انہیں دنیا کی خوفناک ترین فوج بنا دیا۔ منگول سپاہی انتھک لڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بڑی مہمات سے پہلے چنگیز خان نے اس فوج کو چھوٹی چھوٹی جنگوں میں استعمال کیا اور اپنے آس پاس تمام حریفوں کا خاتمہ کر کے ان کو مکمل طور پر اپنا وفادار بنا لیا۔ اسے جس قبیلے یا گروہ پر شبہ ہوتا کہ وہ اس کا وفادار نہیں ہے۔ وہ بے دریغ اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔ لیکن اس چڑھائی میں وہ عام لوگوں کو نقصان پہنچانے سے گریز کرتا تھا، صرف سرداروں اور قبیلے کے بڑوں کو قتل کر دیتا تھا۔ اس حکمت عملی سے اس نے پورے علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

بارھویں صدی کے آخری چوتھائی میں وسطِ ایشیا کے لوگ بے خبر تھے کہ شمال مشرق سے ایک بڑی فوج ان کے علاقے کا رُخ کرنے والی ہے۔ چنگیز خان کی یہ حکمت عملی حیران کن تھی کہ اس نے نزدیکی کمزور چینی سلطنت کو چھوڑ کر دور دراز وسطِ ایشیا کی طاقت ور مسلم سلطنتوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب کہ یہاں تک رسائی کے لیے اسے دنیا کے دو بڑے صحرا بھی عبور کرنے پڑتے۔ ان میں خاص طور سے تکلی مکان کا صحرا بہت خوفناک اور پُراسرار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے کنارے بسنے والے لوگ بھی اس میں سفر کرتے ہوئے ہارتے تھے۔ یہاں میلوں تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا اور اسے دنیا کا خشک ترین صحرا سمجھا جاتا ہے جہاں کسی وقت بھی ہوا میں ... نمی کا تناسب بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے تہ در تہ ریت کے ٹیلوں کو عبور کرنا ہمالیہ سر کرنے سے کم نہیں ہے کیونکہ ان ٹیلوں کی اونچائی ہزار فٹ ہوتی ہے۔ شاید چنگیز خان کے اس فیصلے کے پیچھے اس کا ساری دنیا پر حکومت کرنے کا عزم تھا۔ اس کا نعرہ تھا اوپر ایک آسمان اور نیچے ایک خان کی حکومت۔ چین اس وقت چھوٹی بڑی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ اسے چین سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اسے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں مختلف حکومت ہونے کے باوجود ان کا ایک خلیفہ ہے جو بغداد میں بیٹھ کر حکم دیتا ہے تو سب اس کا حکم مانتے ہیں۔ ہر مسلم سلطان کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ اس سے حکمرانی کی سند لے۔ چنگیز خان کو خلیفہ کے اختیارات اپنی خاقانیت کے خلاف محسوس ہوئے تھے اور اس نے اسی وقت خلیفہ کو اپنا ہدف بنا لیا۔ باقی ساری تگ و دو خلیفہ تک رسائی حاصل کرنے کی تھی۔

وسطِ ایشیا میں طاقتور سلطنت خوارزم تھی اور اس کا بادشاہ خلیفہ کا وفادار تھا۔ وہ کسی صورت چنگیز خان کو بغداد تک رسائی حاصل کرنے نہ دیتا۔ چنگیز خان کے علم میں یہ سارے حالات تھے۔ اس کے جاسوس نہ صرف آس پاس کے ملکوں میں سرگرم عمل تھے بلکہ وہ مسلم دنیا کے مرکز یعنی بغداد تک پہنچ چکے تھے۔ یہ جاسوس معلومات جمع کر رہے تھے اور اطلاعات قراقرم بھیج رہے تھے جسے چنگیز خان نے اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا۔ منگولیا کے پہاڑوں میں بسا یہ شہر آنے والے دنوں میں اہم ترین دارالحکومت ثابت ہونے والا تھا۔ چنگیز خان ملنے والی معلومات کے مطابق اپنی فوجی اور جنگی حکمت عملی تیار کر رہا تھا۔ بالکل اَن پڑھ اور کسی بھی علم سے ناآشنا چنگیز خان نے اپنے دور میں ایسا جاسوس نظام ترتیب دیا جو آج بھی جاسوسی کے ماہرین کو حیران کرتا ہے۔ اس نے جاسوس اپنے دشمنوں میں سے تلاش کیے اور ان سے کام لیا۔ چنگیز خان کی ایک خصوصیت اپنے دشمنوں میں غدار تلاش کرنا تھی۔ وہ غدار تلاش کر کے ان سے دشمن کی ساری کمزوریاں جان لیتا تھا اور پھر ان غداروں کی مدد سے دشمن کو اندر سے کمزور کر کے حملہ کرتا تھا۔ کامیابی اور فتح کے لیے چنگیز خان کی لغت میں ہر حربہ جائز تھا۔ جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کا صحیح معنوں میں استعمال اسی نے کیا تھا۔ جب وہ فتح حاصل کرتا تو اس کی فوج بلا امتیاز سب کو قتل کر دیتی تھی اور سب سے پہلے ان غداروں کا سر قلم کیا جاتا جو اس کا ساتھ دیتے تھے۔ ان کے بارے میں چنگیز خان کا قول مشہور ہے کہ جو اپنوں سے غداری کرے وہ دوسروں کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے؟

www.Paksociety.com

ہندوستان میں انگریزی فلموں کی نمائش 4 فروری 1896ء سے شروع ہوئی۔ یہاں درآمد کی جانے والی تین ابتدائی انگریزی فلمیں یہ تھیں۔

1)London Girl Dancers.
2)The Arrival of the Train.
3)Parade of the Gaurd.

محولہ بالا تینوں فلموں کے ذریعے پہلی بار ہندوستانی اسکرین پر کھل کھیلنے کا سامان فراہم ہوا۔ خود ایک ہندوستانی فلمساز موہن بھوانی (پیدائش: 1903ء) نے مانچسٹر کالج آف فلم ٹیکنالوجی انگلینڈ سے پروڈکشن، ڈائریکشن اور اسکرین تکنیک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد U.F.A اسٹوڈیوز جرمنی اور اکلیئر (Eclair) اسٹوڈیوز فرانس کے تجربے کے ساتھ 1925ء میں ہندوستان آ کر امپیریل فلم کمپنی بمبئی کے لیے "The Village Girl" The Magic Flute" "Wild Cat of Bombay" تین فلمیں بنائیں۔ اس کی فلم "Vasantasena" کو اس زمانے میں Metro Goldwyn Mayer برطانیہ جیسے نمایاں ادارے نے ساری دنیا میں ریلیز کرنے کے انتظامات کیے اور فلم کی ریلیز کا ہندوستان میں خاص اہتمام کیا گیا۔ واضح رہے کہ موہن بھوانی ہی کی ایک فلم "The Mill" حکومتِ برطانیہ کے ایما پر "ہندوستان میں مزدوروں کی صورتِ حال" کے موضوع پر بنائی گئی تھی۔ یوں موہن بھوانی ہندوستان کا پہلا فلمساز تھا جس نے عوام اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان ایک رابطے کا کام کیا۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مضمون سے اقتباس

مرسلہ: نزہت اشتیاق لاشاری، ڈی آئی خان

منگولوں نے خلیفۂ بغداد کے وزیرِ اعظم کو غداری پر آمادہ کر لیا اور اس نے بغداد جیسا عظیم الشان شہر منگول فوج کے لیے کھول دیا۔ جس نے اندر داخل ہونے کے بعد کئی دن تک بے پناہ قتلِ عام کیا۔ اگرچہ چنگیز خان یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا اس کے مرنے کے پورے اکتیس برس بعد اس کے پوتے ہلاکو خان نے یہ کام مکمل کیا تھا۔ اس بے پناہ قتلِ عام میں اس نے منگولوں کے ساتھ اپنی فوج میں شامل عیسائیوں سے بھی کام لیا تھا۔ اپنی زندگی میں چنگیز خان نے وسطِ ایشیا کی سلطنت خوارزم کو تباہ کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کے بڑے بڑے علمی مراکز برباد کر دیے اور جب منگول افواج کسی شہر سے رخصت ہوتیں تو ان کے پیچھے سوائے لاشوں کے ڈھیر اور جلے ہوئے کھنڈر کے کچھ باقی نہیں رہتا تھا۔ شاہ خوارزم کے بیٹے شہزادہ جلال الدین نے نہایت بہادری سے منگول فوجوں کا مقابلہ کیا مگر اس سیلِ بے پناہ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چنگیز خان اس کا تعاقب کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے تک آیا اور جلال الدین نے اس سے بچنے کے لیے اپنا گھوڑا دریا میں اُتار دیا اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔

چنگیز خان نے اپنے دورِ فتوحات میں ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا اُن میں سے بیشتر مسلمان تھے۔ اگرچہ اس نے کچھ عیسائی اور بدھ مت کے ماننے والے علاقوں پر بھی چڑھائی کی لیکن اس کا زیادہ نشانہ مسلمان ہی بنے تھے۔ خوارزم کی سلطنت کو برباد کرنے کے بعد وہ افغانستان میں داخل ہوا جو اس زمانے میں ایک سرسبز و شاداب ملک تھا۔ یہاں ہزاروں سال کی محنت سے پانی جمع کرنے کا نظام بنایا گیا تھا جو کاریز کہلاتا ہے۔ آج بھی بلوچستان میں کہیں کہیں یہ نظام موجود ہے۔ چنگیز خان نے آبپاشی کا یہ نظام اس طرح برباد کرایا کہ آج آٹھ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسے بحال نہیں کیا جا سکا اور افغانستان ایک خشک صحرا کی صورت اختیار کر گیا۔ افغانستان سے وہ ہندوستان میں داخل ہوا۔ لیکن اس نے دریائے سندھ پار کر کے دہلی پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ منگول فوج کے بعض دستے ملتان تک پہنچ گئے تھے۔ مگر انہوں نے ہندوستان پر فوج کشی کی کوشش نہیں کی۔

اس کی وجوہات میں منگول افواج کی بہت عرصے تک وطن سے دوری اور چنگیز خان کی پیرانہ سالی تھی۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اب اس میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی تھی۔ پھر اسے اپنے وطن کی یاد بھی ستا رہی تھی۔ سب سے اہم بات قدرت نے اس سے جو کام لینا تھا وہ لے لیا تھا۔ اب اس کے بیٹے میدانِ عمل میں تھے۔ اس لیے چنگیز خان واپس قراقرم چلا گیا اور وہاں سے منگول فوجوں کی رہنمائی کرنے لگا۔ قراقرم کے بارے میں وضاحت کر دی جائے کہ یہ وہ قراقرم پہاڑی سلسلہ نہیں ہے جو پاکستان کے شمال میں ہمالیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اور دنیا کی دوسری بڑی چوٹی کے ٹو اسی قراقرم کے سلسلے میں ہے۔ جب کہ چنگیز خان کا قراقرم صحرائے گوبی کے پار منگولیا کے پہاڑوں میں واقع ایک شہر ہے۔ اب اس شہر کے صرف کچھ آثار ملتے ہیں۔ مگر چنگیز خان

اور اس کے بعد آنے والے خانوں کے دور میں اس شہر نے بے پناہ ترقی کی یہاں عمارتیں بنیں اور ساری دنیا سے لوگ یہاں چلے آئے۔

چنگیز خان کے دور میں اس کی فوجوں نے جو علاقہ فتح کیا اور اس پر قابض ہو گئے اس کا رقبہ ساٹھ لاکھ مربع میل سے زیادہ تھا۔ اتنے بڑے علاقے کا انتظام کرنا آسان کام نہیں تھا اس لیے چنگیز خان نے اپنی زندگی میں یہ علاقے مختلف بیٹوں اور ان کے بیٹوں میں بانٹ دیے اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے طور پر مزید جنگی مہمات کا اہتمام کرتے رہیں اس کے لیے انہیں براہِ راست قراقرم سے ہدایت لینے کی ضرورت نہیں۔ وسطِ ایشیا کا علاقہ برقائی خان کے حصے میں آیا جو چنگیز خان کا ایک پوتا تھا جب کہ مشرقِ وسطیٰ اور ایران و خراسان کا علاقہ ہلاکو خان کے حصے میں آیا وہ بھی چنگیز خان کا ایک پوتا تھا۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان ہلاکو خان کے ہاتھوں اُٹھانا پڑا۔ بغداد اور دمشق جیسے بڑے شہروں کی تباہی اسی کے لشکر نے کی۔

چنگیز خان کا سب سے بڑا بیٹا اوغدائی اس کے ساتھ ہی قراقرم میں تھا اور جب چنگیز خان دنیا سے رخصت ہونے لگا تو اس نے اوغدائی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ 1227ء میں چنگیز خان دنیا سے رخصت ہوا۔ اس وقت منگول دنیا پر چھائے ہوئے تھے اور قراقرم میں چنگیز خان کے سپہ سالاروں کو خوف ہوا کہ کہیں اس کی موت کی خبر عام ہو گئی تو بے شمار محاذوں پر لڑنے والی منگول فوج کے حوصلے پست نہ ہو جائیں۔ ویسے بھی اس وقت تک چنگیز خان ایک ماورائی ہستی بن چکا تھا۔ اس لیے اس کی موت کی خبر کو ہر قیمت پر چھپانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسے قراقرم شہر کے پاس اس کے پسندیدہ صنوبر کے جنگل میں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس کی قبر بھی چھپا کر بنائی گئی۔ جب اسے دفنانے کے لیے لے جا رہے تھے تو راستے میں اس کا جنازہ دیکھنے والے ہر شخص کو قتل کر دیا گیا۔ یوں وہ مر کر دفن ہوتے ہوتے بھی انسانی جانوں کا خراج لیتا رہا تھا۔

اوغدائی دوسرا منگول خان بنا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے خاقان کا لقب اختیار کیا۔ خاقان کے معنی شہنشاہوں کا شاہ ہے۔ اس کے خیال میں دنیا میں جتنے بھی بادشاہ تھے وہ سب اس کے ماتحت تھے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی دنیا کے مختلف حصوں میں لشکر کشی کا حکم دیا۔ وسطِ ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ تک منگولوں کے قدم چنگیز خان کی زندگی میں پہنچ گئے تھے اور اس سے آگے صرف عراق اور

نارورن لائٹ کے علاوہ اسکینڈے نیویا میں مجھے تین نئے تجربے کرنے ہیں۔ سامی، سوآنہ اور سمورگاس۔ ایک جاننے کی چیز ہے، دوسری محسوس کرنے کی اور تیسرے کھانے کی۔ یہاں میری دلچسپی سامی لوگوں میں ہے۔

اسکینڈے نیویا کے یہ قدیم باسی اب ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کے ناتے کسی کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہیں اس لیے ان کی تہذیب، زبان اور روایات کو زندہ رکھنے کا ٹھیکا حکومت نے لے رکھا ہے۔ امریکا کے ریڈ انڈین ہوں، کینیڈا کے فرسٹ پیپلز یا آسٹریلیا کے ایب اوریجن، زمین کے اصل باسیوں کو ہر جگہ سفید فام آبادکاروں کے ظلم سہنے پڑے۔ شروع کے آبادکاروں نے ان کی زمین اور ذرائع پر قبضہ کرنے کے لیے انہیں قتل کیا، گورے مبلغوں نے ان کا مذہب بدلنے کے لیے ان کی اولاد چھین کر چرچ کے اسکولوں میں بند کر دی اور سماجی علم رکھنے والوں نے ان کی تہذیب کو شکست خوردہ اور مردہ قرار دے کر انہیں جدیدیت کے سبق پڑھائے۔

پھر جب ریاستیں قائم ہو گئیں اور بچے کھچے اصل باسیوں کو شہروں سے دور کھلی جیلوں میں قید کر دیا گیا تو عمرانیات کے ماہروں نے ان کی ہزاروں برس کی جہاں نوردی سے کشید کی گئی دانش مندی کو ماننا شروع کیا۔ قدرتی عناصر کے ساتھ ان کے صحت مند تعلق کو جدید ماحولیاتی پالیسی کی اساس بنایا اور ان کی متروک روایات کو اپنا تاریخی ورثہ مان کر اس کی کھوج شروع کی۔

اقتباس: "چلو" از مسعود عالم

مرسلہ: فتح خان درانی، ڈی جی خان

مصر کی سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں جو منگولوں کی برق رفتار پیش قدمی کے سامنے بس چند دن کی مار لگ رہی تھیں۔ مگر معاملہ بدل رہا تھا۔ چنگیز خان کی تیسری نسل میدانِ جنگ میں تھی جس نے بہت عیش و عشرت میں پرورش پائی تھی اگرچہ ان میں جہاں بانی کی صلاحیت تھی لیکن ان میں چنگیز خان جیسا حوصلہ اور چالاکی نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ متمدن ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں عالی شان محلات اور شہر بنا کر عیاشی کو معمول بنا لیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تبدیلی ایک عام منگول کی زندگی میں آ رہی تھی۔

منگول اپنی سفاکی اور خونخواری کے باوجود مذہبی لحاظ سے ایک سادہ قوم تھے۔ درحقیقت عام آدمی کی زندگی میں مذہب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ منگول آئین یاسا بھی مذہب کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں لگاتا تھا۔ جب منگولوں نے مسلم علاقوں کو فتح کرلیا تو عام منگول کا مسلمانوں سے میل جول ہوا اور ان میں بہت سارے مسلمان ہوگئے۔ یہ مسلمان ہونے والے منگول دوسروں کو بھی اسلام کی طرف راغب کرنے لگے اور ایک صدی کے اندر منگول اپنی شناخت کھوکر مسلم قومیت کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ یہ عمل چنگیز خان کی زندگی میں شروع ہوگیا تھا لیکن ہلاکو خان کے بغداد پر حملے کے بعد اس میں بے پناہ تیزی آئی اور جس وقت عین جالوت کے میدان میں رکن الدین بیبرس نے منگولوں کو ان ہی کی چال کے ذریعے عبرت ناک شکست دی تو اس دن سے منگول اقتدار یوں غائب ہونے لگا جیسے تیز دھوپ میں برف پگھل جاتی ہے۔ پھر وسط ایشیا میں چنگیز خان کا پوتا برقائی خان مسلمان ہوگیا اور یہ اس وقت منگول اقتدار کے لیے سب سے بڑا دھچکا ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ منگول ہلاکو خان کی زیرِ قیادت اسلامی حکومت کو بالکل ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے..... مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ جس وقت ہلاکو خان بغداد کو تباہ کرکے آگے بڑھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ قراقرم میں چوتھے خاقان منگول کی موت کی خبر آئی اور ہلاکو خان واپس چلا گیا جس کے بعد اسے دوبارہ یہاں آنا نصیب نہیں ہوا۔ صرف ہلاکو خان ہی نہیں بلکہ اس علاقے میں قراقرم کی طرف سے منگول دستوں کی آمد بھی رک گئی کیونکہ راستے میں برقائی خان بیٹھا ہوا تھا اور اس نے منگولوں کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چنگیز خان کے بعد منگول کمزور پڑ گئے تھے۔ بلکہ منگولوں کی فوجی تنظیم میں وسعت آئی تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ تعداد میں تھے اور اس دور کے بہترین ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ اگرچہ مسلم دنیا میں ان کی پیش قدمی رک گئی تھی لیکن باقی دنیا کے لیے وہ بدستور قہر بنے ہوئے تھے۔ اوغدائی نے خاقان بنتے ہی وسط ایشیا کی طرف دوبارہ فوجیں روانہ کیں لیکن اس بار ان کا رُخ مسلم علاقوں کے بجائے کاکیشیا اور ترکی کی طرف تھا۔ اس وقت یہ علاقے غیر مسلم تھے اس لیے برقائی خان نے اپنے علاقے سے منگول فوجوں کے گزرنے پر اعتراض نہیں کیا۔ برقائی خان قراقرم سے اپنا رشتہ توڑ کر خود مختار حکمران بن گیا تھا اور اس نے کبھی کسی قورلتائی (خاقان چننے کے لیے ہونے والی تقریب) میں شرکت نہیں کی۔ وہ اتنا طاقت ور تھا کہ کسی منگول خاقان نے بھی اسے چھیڑنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ان کے لیے اتنا کافی تھا کہ برقائی خان ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کررہا تھا۔ منگول لشکروں نے کاکیشیا، ترکی، آرمینیا اور آذربائیجان کے علاقوں کو برباد کرکے رکھ دیا۔ اگر اچانک اوغدائی کا انتقال نہ ہوتا تو یہ لشکر بحیرۂ اسود کے کنارے تک چلا جاتا اور شاید موجودہ یوکرائن تک چلا جاتا۔

منگولوں میں جانشینی کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے ان کی فتوحات پر بہت اثر پڑا تھا۔ کم سے کم تین مواقع ایسے آئے جب منگول کسی خطے کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کرنے والے تھے اور اچانک خاقان کی موت کی خبر آنے پر لشکر کے سرکردہ لوگ واپس قراقرم چلے گئے اور اس سے پیش قدمی رک گئی۔ چین میں اوغدائی نے بذاتِ خود اپنے گھڑسوار دستوں کے ساتھ حملہ کیا اور چین میں کافی اندر تک تباہی مچادی تھی۔ اس وقت شمالی چین پر چن خاندان کی حکومت تھی۔ چین کے دارالحکومت کائی فنگ پر منگولوں کا قبضہ ہوگیا۔ اوغدائی چینیوں کی تہذیب سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اس کا بھتیجا اور تولائی کا بیٹا قبلائی خان چینیوں سے متاثر ہوا تھا اور درحقیقت یہ قبلائی خان تھا جس نے چین کو منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔ وہ چینی دانشور لیو جت سائی سے بہت متاثر تھا اور اسی کے مشورے پر اوغدائی اور قبلائی خان نے کائی فنگ اور چین کو دوسرے شہروں کو تباہ کرنے کے بجائے اپنی مملکت میں شامل کرلیا تھا۔ بعد میں یہ سارا علاقہ قبلائی خان کو مل گیا اور اس نے بہت طویل عرصے یہاں حکومت کی۔ مشہور سیاح مارکوپولو اسی کے عہد میں چین آیا تھا اور اس نے قبلائی خان کے حکومت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے پتا چلتا ہے چین نے اس کے دور میں بے پناہ ترقی کی تھی۔

اوغدائی کا حملہ اتنا کامیاب رہا کہ موجودہ چین کا ایک چوتھائی علاقہ اس وقت منگول سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔ قبلائی خان کے بعد یہ دوبارہ چینی شاہوں نے واپس حاصل کرلیا۔ قبلائی خان نے موجودہ بیجنگ کی جگہ اپنا عظیم الشان دارالحکومت تعمیر کرایا تھا۔ اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شہر کے اندر کئی مربع میل رقبے پر قبلائی خان کا ذاتی محل اور دوسری عمارات تعمیر کی گئی تھیں۔ اس میں ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی بھی تھی جسے قراقرم کے پہاڑوں کے انداز میں بنایا گیا تھا اور اس پر وہی درخت اور پودے لگائے گئے تھے جو قراقرم میں پائے جاتے ہیں۔ جب قبلائی خان کو اپنے وطن کی یاد ستاتی تو وہ

اس پہاڑی پر چلا آتا تھا۔ دوسرے منگول حکمرانوں کی طرح اسے بھی کبھی اپنے وطن جانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

چینی دانشوروں اور عالموں کی مدد سے قبلائی خان نے ٹیکس جمع کرنے کا اتنا موثر نظام بنایا تھا کہ اس کی مملکت میں کوئی بھی صاحبِ حیثیت فرد بغیر ٹیکس ادا کیے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا عملہ نہایت مستعد تھا۔ سال بھر میں جمع ہونے والا ٹیکس قبلائی خان اور دوسرے منگول سرداروں کی عیاشی پوری کرنے کے ساتھ قراقرم بھی بھیجا جاتا تھا۔ بعد میں جب خاقان کی مرکزی اہمیت ختم ہوگئی اور دنیا بھر میں پھیلی منگول حکومتیں خود مختار ہوگئیں تو قبلائی خان نے بھی یہ رقم بھیجنا بند کردی تھی۔ اگرچہ منگولوں نے چین میں بھی اپنی قومی خصوصیات برقرار رکھی تھیں لیکن چینی تہذیب اور ثقافت نے ان پر گہرا اثر ڈالا تھا اور رفتہ رفتہ وہ اس میں ضم ہونے لگے تھے۔ مگر قوم پرست چینی انہیں اپنے اندر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ انتظار کررہے تھے کہ کب منگول حکمران عیاشیوں میں پڑکر کمزور ہوتے ہیں اور چینی ان کی انتظامی مشینری اور فوج پر حاوی آتے ہیں اس وقت وہ ایک ایک منگول کو مار کر چین سے نکالیں گے اور بعد میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔

منگول شہزادوں میں قبلائی خان سب سے عقل مند اور اختراع پسند تھا۔ اس کا ثبوت اس نے چین پر حکومت کے دوران دیا تھا۔ اس نے حکومت میں بہت ساری تبدیلیاں کیں اور ایسی عظیم الشان تعمیرات کرائیں جو بیک وقت چینی اور منگول طرزِ تعمیر کا نمونہ تھیں۔ اس نے پورے ملک میں انصاف اور امن قائم کرکے معاشرتی ترقی کا راستہ کھول دیا اور یہ حقیقت ہے چین نے اس کے دور میں جو ترقی کی وہ اس کے بعد نہ کرسکا۔ مگر قبلائی خان نصف صدی تک چین پر حکومت کرنے کے باوجود غیر ملکی رہا تھا اور اس کے چینی سرداروں نے بھی اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد وہ منگولوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے انتقام لینے کے لیے منگولیا پر حملہ کردیا۔

تقریباً ایک صدی بعد 1388ء میں چینی فوج نے قراقرم شہر پر قبضہ کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پورے شہر کو زمین کے برابر کردیا۔ یہ چینیوں کا انتقام تھا۔ وحشی منگولوں نے ان کے شہروں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن مہذب چینیوں نے منگول شہروں کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ وہ اس کے بعد دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوئے۔ منگولوں کا اتنے بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا کہ بہت سارے منگول قبیلے صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئے اور ان کا ایک فرد بھی باقی نہیں رہا تھا۔ غلامی کا اتنا بھیانک انتقام شاید ہی کسی قوم نے لیا ہو جیسا کہ چینیوں نے منگولوں سے لیا تھا۔ اس کے بعد قراقرم کے عظیم الشان حکومت ماضی کی بھولی بسری یاد رہ گئی۔

اس کے مقابلے میں منگولوں کا مسلمانوں سے سلوک نہایت بھیانک رہا تھا اور انہوں نے بنا کسی دشمنی یا تاریخی چشمک کے نصف مسلم دنیا کو تباہ کرڈالا۔ علمی مراکز اس طرح برباد کیے کہ وہ پھر دوبارہ آباد نہ ہوسکے۔ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی مرکز بغداد کو اس طرح تباہ کیا کہ آج تک کسی بڑے شہر کی تباہی کی ایسی مثال نہیں ملتی ..... صرف چنگیز خان کے حملوں میں کم و بیش ایک کروڑ مسلمان مارے گئے۔ ایک منگول سپاہی کے لیے سو مسلمانوں کا قاتل ہونا عام سی بات سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ فتح کے بعد ہونے والے قتلِ عام میں ایک سپاہی کے حصے میں اس سے زیادہ ہی مسلمان آتے تھے۔ مارتے مارتے ان کے ہاتھ شل ہوجاتے تھے اور تلواریں کند پڑ جاتی تھیں۔ منگولوں کے ہاتھوں مسلمانوں سے زیادہ کسی قوم نے نقصان نہیں اُٹھایا۔ لیکن جب یہی منگول مسلمان ہوئے اور اسلام کا ایک حصہ بن گئے تو دشمنی چشم زدن میں ختم ہوگئی۔ اسلام کی یہی خوبی دنیا کی دوسری قوموں کو ہمیشہ متوجہ کرتی ہے۔ عربوں کے بعد ایرانی، پھر

واہ شاہ جی واہ

شہنشاہِ خطابت حضرت مولانا سید عطاءاللہ شاہ صاحب بخاری کے بارے میں مشہور ہے، ۱۹۴۰ء کے بعد کھڑے ہوتے تو صبح کردیتے۔ پل بھر میں لوگوں کو زاروقطار رُلا دیتے۔ چند لمحات بعد سب کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کردیتے۔ ایک بار بادشاہی مسجد لاہور میں دورانِ خطاب فرمایا، مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب تاحدِ نگاہ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ یہ سب میری تقریر سننے آئے ہیں۔ جب میں ان سے ووٹ مانگتا ہوں تو ووٹ مجھے نہیں دیتے۔ مسلم لیگ کو دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ ہم مولویوں کو مسجد میں مفت روٹی حلوہ کھانے والا سمجھتے ہیں، باطل کے خلاف میں نے ڈٹ کر تقریر کی۔ لوگوں نے نعرے لگائے "واہ شاہ جی واہ! مجھے حکومت نے گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا۔ لوگ چلائے آہ، آہ اور ہم ہوگئے تباہ۔

مرسلہ: احمد خان توحیدی، چکری راولپنڈی

www.Paksociety.com

ہندوستانی، پھر ترک اور پھر منگول اسلام کا دست و بازو بنے۔ اگرچہ شروع میں یہ سب شدید دشمن بھی رہے۔

مگر تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف میں ایسا لگ رہا تھا کہ دنیا میں منگولوں سے بڑی طاقت کوئی نہیں ہے اور وہی اس دنیا کے فیصلے کرنے والے ہیں۔ وہ ایک کروڑ مربع میل سے زیادہ رقبے پر قابض ہو چکے تھے اور اس میں بسنے والی کئی سو اقوام سے خراج اور ٹیکس وصول کر رہے تھے۔ چاروں طرف سے مال و دولت اور فوجوں کا ایک سیلاب تھا جو قراقرم کی طرف آ رہا تھا۔ کیونکہ ہر قوم کو اپنے بہترین جوان منگولوں کی فوج میں دینے پڑتے تھے۔ اوغدائی اس فوج کی مدد سے دنیا کے باقی حصوں کو فتح کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ موت نے اچانک اسے آن دبوچا۔ اس کی موت کثرتِ شراب نوشی اور عورتوں کی صحبت سے ہوئی تھی۔ اوغدائی کے حرم میں دنیا کی دو ہزار اقوام اور قبیلوں کی عورتیں اور دوشیزائیں تھیں۔ اسے صرف پندرہ برس حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس میں چنگیز خان جیسی صلاحیتیں بھی نہیں تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اوغدائی نے اپنے باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ زمینوں کو روند ڈالا تھا۔ چنگیز خان دشمن کو غلام بنانے کے لیے زندہ رکھنے کا قائل نہیں تھا لیکن اوغدائی نے بہت ساری مفتوح اقوام کو صرف باج گزار بنانے پر اکتفا کیا اور صرف ان کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیا جو اس کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھے۔

وسطِ ایشیا منگولوں کے ہاتھ سے نکل رہا تھا اور یہاں موجود منگولوں نے اسلام بھی قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اوغدائی نے موجودہ قازقستان اور وسطِ ایشیا کی دوسری ریاستوں پر دوبارہ قبضہ کر کے اپنا مغرب اور جنوب کی طرف پیش قدمی کا راستہ محفوظ کر لیا تھا۔ چین کے بعد وہ مغرب کی طرف متوجہ ہوا۔ 1235ء میں قراقرم میں ایک قورلتائی منعقد ہوئی لیکن اس کا مقصد خاقان کا انتخاب نہیں تھا بلکہ منگول فوجوں کی پیش قدمی کے لیے ایک نیا علاقہ چننا تھا اور اس بار یورپ کا انتخاب ہوا۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو خان نے اس مہم کی مخالفت کی تھی اور مسلم دنیا میں ادھوری رہ جانے والی فتح کو مکمل کرنے پر زور دیا تھا۔ ہلاکو دوقوز نامی عیسائی عورت سے شادی کر چکا تھا اور اس کا عیسائیت کی طرف رجحان بھی تھا لیکن اسے عیسائیت کا امن پسندی کا فلسفہ ہضم نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال بیوی کے زیر اثر وہ مسلم مخالف ہو گیا تھا اس لیے اس نے بغداد کی طرف پیش قدمی پر اصرار کیا۔ مگر اوغدائی اپنے بھائی تولائی سے نفرت کرتا تھا۔ اسے اپنی تخت نشینی میں سب سے زیادہ مزاحمت اسی کی طرف سے کرنا پڑی تھی۔ پھر اس کے بیٹے قبلائی، منگو اور ہلاکو خان نہایت قابل تھے اور اپنی زندگی میں وہ چنگیز خان کے بہت پاس آ گئے تھے اوغدائی کو خطرہ تھا کہ اس کے بعد خاقانیت تولائی کے گھر نہ چلی جائے۔ جب کہ وہ اپنی اولاد کو اگلا خاقان بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ہلاکو خان کی تجویز مسترد کر کے منگول افواج کے لیے اگلا ہدف یورپ کو چنا۔ شاید وہ جان بوجھ کر عیسائی علاقوں کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا تھا تاکہ ہلاکو خان کو تکلیف دے سکے۔

جوجی چنگیز خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا لیکن وہ چنگیز خان کے نطفے سے نہیں تھا۔ بلکہ ایک موقع پر جب چنگیز خان کمزور تھا اس کے دشمن اس کے قبیلے پر حملہ آور ہوئے اور وہ اس کی بیوی کو بھی اغوا کر کے لے گئے تھے۔ جب وہ واپس آئی تو جوجی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود چنگیز خان نے جوجی کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا اور اسے وہی عزت اور حیثیت دی جو بڑے بیٹے کی ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کی چہیتی بیوی کی اولاد تھا۔ مگر اس نے اسے اپنا جانشین نہیں بنایا کیونکہ وہ سمجھتا تھا جوجی میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو اس کی قائم کی ہوئی سلطنت کو سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ بعد میں اوغدائی نے اپنا انتخاب درست ثابت کر دکھایا تھا۔ لیکن جوجی کو بڑے بیٹے کی حیثیت سے ایشیائے کوچک کے پاس کا علاقہ دے دیا گیا تھا۔ یہ موجودہ قازقستان کا مغربی حصہ ہے اور اس حصے پر جوجی اور اس کی اولاد کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ جوجی کے بعد باتو اس خطے کا حکمران بنا۔

باتو خان اس علاقے میں منگول فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ ایشیائے کوچک کے آس پاس اور ترکی تک کے علاقے منگول لشکر نے فتح کر لیے تھے اور یہاں موجود ترکوں کو اپنا باج گزار بنا لیا تھا۔ لیکن ابھی انہوں نے یورپ کی حدود میں قدم نہیں رکھا تھا۔ منگولوں کو یہاں سب سے بڑا خطرہ ان جنگجو خانہ بدوش قبائل سے تھا جو پورے مشرقی یورپ میں پھیلے ہوئے تھے اور اپنے آس پاس کی حکومتوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ یہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں کسی طرح منگولوں سے کم یا پیچھے نہیں تھے۔ بظاہر ان خانہ بدوشوں لٹیروں سے باتو خان کی فوج کی حفاظت اور نامعلوم علاقوں پر منگول حملے کے لیے ساٹھ ہزار بہترین گھڑ سوار منگولوں پر مشتمل زبردست فوج روانہ کی گئی۔ لیکن اس لشکر کے ساتھ منجنیق بردار دستے بھی تھے۔ یہ منجنیقیں شہروں اور قلعوں پر پتھر اور آتشیں گولے برسانے کے لیے تھیں۔ اس وقت تک منگول یورپ کی سرزمین سے ناآشنا تھے۔ حالانکہ نصف صدی پہلے ہی یورپی عیسائی قراقرم پہنچ چکے تھے اور انہوں نے سادہ منگولوں کو عیسائی بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے اور انہوں نے مسلم ممالک کو منگولوں کا نشانہ بنوا دیا۔ لیکن جب منگول خود مسلم علاقوں میں آئے اور انہوں نے اسلام کو قریب سے دیکھا تو انہوں نے اس دین کو فطرت کے نزدیک پایا اور نہایت تیزی سے مسلمان ہوتے چلے گئے۔ صرف ایک صدی میں وسطِ ایشیا کے مسلم خطوں میں شامانی مذہب رکھنے والے منگول غائب ہو چکے تھے اور صرف مسلم منگول رہ گئے تھے۔

قراقرم آنے والے عیسائیوں نے یورپ کا تذکرہ سرے سے گول کر دیا یا اگر منگولوں کو بتایا تو یہی بتایا کہ یورپ ایک بہت دور دراز اور اُجاڑ سرزمین ہے۔ وہاں منگولوں کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ بالآخر منگولوں نے یورپ کا رُخ کیا۔ قراقرم سے بھیجی جانے والی فوج برقائی خان اور باتو خان کے علاقوں سے گزرتی ہوئی موجودہ روس میں داخل ہوئی۔ اس وقت روس چھوٹی چھوٹی مقامی طرز کی حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ کوئی بڑی حکومت نہیں تھی جس کی فوج منگولوں کا راستہ روک سکتی اس لیے وہ بلا روک ٹوک دریائے وولگا کے کنارے آباد شہر کازان تک جا پہنچی۔ شہر والوں کے لیے منگولوں کی آمد قطعی غیر متوقع تھی اس لیے وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ کازان ریاست بلغار... دارالحکومت تھا اور دریائے وولگا سے ہونے والی لکڑی، کھالوں اور خوشبوجات کی تجارت نے اسے خوشحال ریاست بنا دیا تھا۔ ایک زمانے میں روس اور سائبیریا میں دنیا کے گھنے اور بہترین لکڑی والے جنگل پائے جاتے تھے۔ اس لکڑی کی بہت مانگ تھی۔ روسی ماہر اس سے بہت اچھا فرنیچر اور دوسرا سامان تیار کرتے تھے۔ ریاست کی فوج منگولوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور چند دن بعد کازان کی جگہ جلے ہوئے ملبے کا ڈھیر باقی رہ گیا تھا۔ منگولوں نے حسبِ معمول شہر کو لوٹ کر اور شہریوں کو قتل کر کے اسے آگ لگا دی تھی۔ اس حملے کی خبر نے سارے مغرب میں سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ کیونکہ منگولوں کا نام اب اجنبی نہیں رہا تھا ان کی وحشت اور درندگی کی خبریں مغرب تک پہنچ چکی تھیں اور مسلم دنیا کی تباہی پر بغلیں بجانے والوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ آفت ان کا رُخ بھی کر سکتی ہے۔

کازان کی تباہی تو آغاز تھا۔ اس کے بعد منگول فوج چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں کو تباہ کرتی یورپ میں آگے

افکارِ اقبالؒ

☆......مسلمانوں کے لیے جائے پناہ صرف قرآن پاک ہے۔

☆......قرآن کریم کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا کرو بلکہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

☆......علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے، عبادت کی ایک شکل ہے۔

☆......ایک سوچنے والے زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا۔

☆......مصیبت ایک عطیۂ خداوندی ہے تاکہ انسان پوری زندگی کا مشاہدہ کر لیں۔

☆......تاریخ ایک طرح کا ضخیم گراموفون ہے جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔

☆......انسان کی روح کی اصل کیفیت غم ہے۔ خوشی ایک عارضی شے ہے۔

☆......زندگی کا راز یہی ہے کہ جہاں رہو، جس حالت میں رہو خوش رہو اور مطمئن رہو۔

☆......فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے، نورِ ایمان بھی کسبِ حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

☆......کام میری نظر میں ایسے ہی مقدس ہے جیسے عبادت۔

مرسلہ: ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی

ادبی لطائف

ایک صاحب ذوق نے اکبر کو لکھا۔

"میں صاحب ذوق ہوں، آپ کی الہامی شاعری کا پرستار اور والہ و شیدا، اتنی استطاعت نہیں کہ آپ کے دیوان یا کلیات خرید کر پڑھ سکوں، اس لیے ازراہِ علم دوستی اپنے دیوان کی ایک جلد بلا قیمت مرحمت فرما کر ممنون فرمایئے۔"

خط دیکھ کر اکبر الٰہ آبادی کہنے لگے۔

"اور سنیے...... آج مفت دیوان طلب فرما رہے ہیں، کل فرمائش کریں گے کہ صاحب ذوق ہوں، مفت میں "جانکی بائی" کا گانا سنوا دیجیے۔"

مرسلہ: ممنون حسین، ڈیرہ غازی خان

بڑھنے لگی۔ اس وقت کا ایک مورخ منگولوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ ”کافر حملہ آوروں نے کسی کو نہیں چھوڑا، انہوں نے عورتوں اور بچوں تک کو قتل کر دیا اور شہروں اور آبادیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔“

منگولوں کے حملے کے دوران ہی سرد موسم کا آغاز ہونے والا تھا۔ اگرچہ وہ سرد موسم کے عادی تھے لیکن روس کی سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس سے بچنے کے لیے منگولوں نے کازان سے لوٹی جانے والی کھالوں سے لباس سلوائے اور انہیں پہن کر روس میں پیش قدمی کرنے لگے۔ ان کے جاسوس اردگرد کے علاقوں پر نظر رکھے ہوئے تھے اور انہوں نے بتایا کہ تقریباً چار سو میل کی دوری پر ایک اور روسی شہر ریازان موجود ہے جس میں بڑی مقدار میں دولت موجود ہے۔ تباہی و بربادی کے بعد منگولوں کا دوسرا مقصد دولت ہوا کرتی تھی۔ اس لیے وہ تیزی سے ریازان کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے راہ میں آنے والی کسی آبادی یا شہر کو بخش دیا۔ وہ سب کو مٹاتے ہوئے جا رہے تھے۔ منگول حملے کے بعد اس علاقے کو دوبارہ سے آباد ہونے میں ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگا تھا۔

ریازان جنوب مشرقی روس کی ایک ریاست کا دارالحکومت تھا یہاں ایک عورت کی حکومت تھی۔ ظاہر ہے وہ منگولوں کی آمد کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے مشیروں سے مشاورت کی اور طے پایا کہ وہ خود منگولوں کے پاس جا کر انہیں حملے سے روکنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ منگول لشکر کے سامنے آئی اور اس نے دریافت کیا کہ حملہ نہ کرنے کے عوض وہ کیا لیں گے؟ منگول سالار نے جو شرط بتائی وہ نہایت کڑی تھی اس نے شہر کی دس فیصد چیزوں کا مطالبہ کر دیا۔ مال و دولت کے ساتھ انسانوں میں بھی دس فیصد لوگ مانگے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ ملکہ نے یہ شرط سنتے ہی مسترد کر دی۔ اس باحوصلہ عورت نے منگول سالار سے کہا۔

”ایسا صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم میں سے کوئی زندہ نہ رہے۔“

منگول سالار نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تب ایسا ہی ہوگا۔“

جب منگول یہاں وارد ہوئے تو سرما عروج پر تھا اور چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی۔ ریازان کی قلعے کی فصیل بلند اور نہایت مضبوط تھی۔ اس میں تیر اندازوں کے لیے محفوظ مورچے تھے جہاں سے وہ چاروں طرف شہر پر حملہ کرنے والی فوج پر تیر برسا سکتے تھے۔ منگولوں کے تیر انداز ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ایسے میں منگول لشکر نے ایک عجیب حکمت عملی تیار کی۔ انہوں نے آس پاس کے جنگلوں سے ہزارہا درخت کاٹ کر فصیل کے گرد ان سے دیوار بنانی شروع کر دی۔ یہ دیوار انہیں قلعے سے آنے والے تیروں سے محفوظ رکھتی۔ درختوں کی اس دیوار کی آڑ میں وہ اپنی منجنیقیں شہر کے بالکل پاس لے آئے اور انہوں نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ پتھروں اور آتشیں گولوں کی متواتر بمباری نے بالآخر شہر کی فصیل گرا دی اور منگول فوج ریازان میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور عورتوں سے زیادتی کا ایک طوفان اٹھا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک شہر کا ایک ایک متنفس موت کے گھاٹ نہیں اتر گیا۔ آخر میں منگولوں نے شہر کو آگ لگا دی اور اس کی فصیل کو مکمل طور پر ڈھا دیا۔

یہاں سے منگول ماسکو کی طرف آئے۔ اس وقت ماسکو ایک معمولی سا قصبہ تھا جس میں تمام ہی مکانات لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور روسی ریاستوں میں اس شہر کو کوئی مقام حاصل نہیں تھا۔ اس وقت روس کا دارالحکومت موجودہ سینٹ پیٹرز برگ کے مقام پر تھا لیکن یہ بھی معمولی سا شہر تھا۔ منگولوں نے ماسکو جلا کر خاک کر دیا۔ پھر اسی خاک سے وہ ماسکو بنا جو ایک زمانے میں دنیا کے طاقت ور ترین دارالحکومتوں میں شامل ہو گیا تھا۔ گزشتہ سات سو سال سے یہ ایک متواتر پھیلتی سلطنت کا مرکز رہا۔ ماسکو سے منگولوں کو بس کچھ اناج ملا تھا یا اپنے گھوڑوں کے لیے چارہ مل گیا تھا۔ کچھ لوگ ملے جنہیں قتل کر کے ان کی خون کی پیاس مزید بھڑک اٹھی تھی۔ اس لیے منگولوں نے آرام کیے بغیر جنوب مشرق میں واقع ولادی میر شہر کا رخ کیا۔ مشرقی یورپ میں اس کا شمار سب سے ترقی یافتہ شہر میں ہوتا تھا۔ خاص طور سے فولاد سازی اور فولاد سے بننے والی اشیا کے لیے ولادی میر مشہور تھا۔ یہاں ہر قسم کے ہتھیار اور تیروں سے کھلنے والے تالے تیار کیے جاتے تھے۔ یہ کھالوں، مشک اور ریشم کی تجارت کا بھی اہم مرکز تھا اور جہاں یہ سب ہو وہاں دولت بھی ہوتی ہے۔ منگول اسی دولت کی خوشبو پر کھنچے چلے آئے تھے۔

بڑا مرکز ہونے کے باوجود ولادی میر کے گرد معمولی سی فصیل تھی جسے عبور کرنا منگولوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن یہاں بھی منگولوں کو ماہر تیر اندازوں کا سامنا تھا۔ ان کے جاسوسوں نے پہلے ہی خبردار کر دیا کہ اگر ان کا کوئی تدارک نہ کیا گیا تو نصف منگول فوج شہر میں داخل ہونے سے پہلے ماری جائے گی۔ یہاں کا سربراہ شہزادہ یوری بڑا وہ ماہر تیر انداز تھا اور سو قدم کی دوری سے آنکھ کا نشانہ لیتا تھا۔ اس کا دستہ شہر کا دفاع کرنے کے لیے مستعد ہو گیا۔ مگر اس بار بھی منگولوں نے حیران کن چال چلی۔ وہ ولادی میر کی طرف آتے ہوئے راستے کی چھوٹی موٹی آبادیوں سے لوگوں کو اپنا قیدی بناتے ہوئے ساتھ لے آئے۔ ان میں اکثریت عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی تھی۔ سردی کا موسم تھا اور وہ ان مجبور قیدیوں کو برف پر چلاتے ہوئے لائے۔

جب وہ شہر کے سامنے نمودار ہوئے تو شہزادہ یوری کے تیر اندازوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ اپنے ہی لوگوں پر کیسے تیر چلاتے جنہیں منگولوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے ڈھال کی طرح سامنے رکھا ہوا تھا۔ لیکن شہر کا دفاع تو کرنا تھا اس لیے مجبوراً شہزادہ یوری کے دستوں نے تیر چلائے اور ان کے تیروں سے زیادہ تر ڈھال بنائے ان کے ہم وطن ہی مارے گئے۔ بالآخر منگول ان کی آڑ میں شہر میں گھس گئے اور عام آبادی کا قتل عام کرنے لگے۔ شہزادہ یوری اپنی فوج سمیت محل کے قلعے میں بند ہو گیا۔ یہ قلعہ بھی خاصا بڑا تھا اور منگولوں کو اس میں داخل ہونے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ شہزادہ بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے اہل خانہ ایک چرچ میں محصور ہو گئے تھے اور وہ ایک خفیہ کمرے میں چھپ گئے۔ ان کے سپاہی آخر وقت تک منگولوں کو روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر کب تک....؟ آخر منگول چرچ پر بھی قابض ہو گئے اور انہوں نے خفیہ کمرے کا سراغ بھی لگا لیا مگر انہوں نے بدقسمت شاہی خاندان کو باہر نکال کر تہ تیغ کرنے کے بجائے ایک بہیمانہ قدم اٹھایا اور اس خفیہ کمرے کے آس پاس آگ لگ دی۔ کمرے میں دھواں بھر گیا اور وہاں موجود تمام افراد دم گھٹ کر مر گئے۔ جب منگولوں کو کسی طرف سے مزاحمت کا خطرہ باقی نہیں رہا تو انہوں نے لوٹ مار اور زیادتیوں کا بازار گرم کیا۔ شہر کو آگ لگا دی بس اس چرچ کو چھوڑ دیا جس میں شاہی خاندان نے پناہ لی تھی۔ یہ چرچ آج بھی اسی طرح قائم ہے اور سنگ مرمر کی تختی پر اس کی یادگار نصب ہے۔

منگول لشکر ایک سال سے مسلسل سفر اور جنگوں میں مشغول تھا اس لیے سالاروں نے آرام اور قراقرم سے مزید کمک کی آمد تک مزید جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سارے سپاہی زخمی تھے اور ان کے گھوڑے بھی تھک گئے تھے۔ اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان مرمت طلب تھا۔ بہت ساری منجنیقیں بے کار ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھوڑے وسیع و عریض چراگاہوں میں چھوڑ دیے اور خود ولادی میر کے پاس کھلے میدان میں خیمے لگا کر آرام کرنے لگے۔ ایک سال کے آرام نے لشکر کو دوبارہ تازہ دم کر دیا۔ ان کے گھوڑے اور اسلحہ بھی تیار تھا۔ قراقرم سے نئے دستے آ گئے تھے اور بعض پرانے دستوں کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ اپنی حکمت عملی کے تحت منگولوں نے مفتوح لوگوں سے فوجی بھرتی کیے اور آنے والی جنگوں میں وہ انہیں آگے رکھ کر استعمال کرتے۔

نئی مہم کا آغاز یوکرائن کے شہر کیف سے کیا۔ اسے تباہ کر کے منگول لشکر چرنی گوف کی طرف بڑھا اور اسے بھی بہ آسانی فتح کر لیا۔ اس فتح کے ساتھ موجودہ روس کا بیشتر حصہ منگولوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ اس فتح کے بعد مشرقی یورپ منگولوں کے براہِ راست نشانے پر آ گیا تھا۔ وہ بہ آسانی یوکرائن میں داخل ہو گئے۔ یوکرائن اس وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ درحقیقت پورے مشرقی یورپ اور باقی یورپ کا بھی یہی حال تھا۔ سوائے فرانس، اٹلی، اسپین اور انگلینڈ کے کہیں کوئی بڑی حکومت نہیں تھی۔ آسٹریا جو بعد میں بڑی طاقت بنا اس وقت ایک معمولی سی ریاست تھا۔ یہ وہی آسٹریا ہے جس نے بعد میں عثمانی سلطنت سے ٹکر لی اور بالآخر ویانا کی شکست عثمانیوں کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور وہ بتدریج یورپ سے بے دخل ہوتے چلے گئے۔ ہنگری اس وقت مشرقی یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا۔ پولینڈ کے چار حصے تھے اور سب الگ الگ تھے۔

قراقرم سے اوغدائی نے باتو خان کو یورپ میں پیش قدمی کرنے والے لشکر کا سپہ سالار بنا دیا۔ باتو خان ایک چالاک شخص تھا اس نے بھانپ لیا کہ یورپ کے ممالک آپس میں خانہ جنگی کا شکار رہتے تھے اور ان سے کسی متحدہ لشکر کی امید کم تھی اس لیے اس نے منگول لشکر کے خطرے کو کم کر کے دکھانے کے لیے اسے چھ سو مربع میل میں پھیلا دیا۔ بیس میل چوڑے اور تیس میل لمبے محاذ پر سفر کرتی منگول فوج راستے میں آنے والی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کو بھی تباہ کرتی جا رہی تھی تاکہ اسے عقب سے حملے کا خطرہ نہ رہے۔ یوکرائن پر منگول حملے کی خبر نے مشرقی ریاستوں ہنگری اور پولینڈ کے حکمرانوں کو فکر مند کر دیا تھا۔ ان میں ہنگری کا بادشاہ ایک لاکھ کا لشکر رکھتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس کی تمام جنگی طاقت اس کے سرداروں میں منقسم تھی اور یہ سردار ہمہ وقت آپس میں لڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں منگولوں کے خلاف جمع کرنا ہی کسی سردرد سے کم نہیں تھا۔ یہی حال پولینڈ کا بھی

www.paksociety.com

تھا۔ یوکرائن سے ہوتی منگول فوج پولینڈ میں داخل ہوئی اور اس کے سب سے اہم شہر کاراکاوو کا رُخ کیا۔ کاراکاوو میں پولینڈ کی فوج کا بہترین حصہ تعینات تھا۔ لیکن یہ منگولوں کے طرزِ جنگ سے قطعی بے خبر تھے۔ منگول لشکر شہر کے سامنے نمودار ہوا اور جیسے ہی ان تھوڑے سے سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے پولینڈ کے سپاہی باہر نکلے منگول پسپا ہو گئے۔ پولش سمجھے کہ منگول ڈر کر واپس جا رہے ہیں پوری فوج اس دستے کے تعاقب میں چل پڑی اور وہ اسے وہاں لے آیا جہاں اصل منگول فوج گھات لگائے بیٹھی تھی اور اس نے گھیر کر پولش سپاہ کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ پیچھے شہر کی حفاظت کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا اس لیے منگولوں کے دستے میدانِ جنگ سے گھوم کر بہ آسانی شہر پر قابض ہو گئے اور پھر یہاں بھی وحشت اور درندگی کا وہی کھیل کھیلا گیا جو اس سے پہلے یورپ اور ایشیا کے بے شمار شہروں میں کھیلا جا چکا تھا۔ سقوطِ کاراکاوو کی خبر نے پولینڈ میں ماتم برپا کر دیا تھا اور باقی ماندہ شہروں کو اپنی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

بدقسمتی سے پولینڈ چار حصوں میں تقسیم تھا اور چار شہزادے یہاں حکومت کرتے تھے۔ منگولوں نے ان کے انتشار سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور باری باری تمام شہزادوں کو زیر کر لیا۔ اگلی باری ڈیوک ہنری کی تھی۔ جو لیگ نیکا کا حاکم تھا اور اس کے پاس تیس ہزار تربیت یافتہ فوج تھی۔ اس کی فوج میں ایک خاص دستہ تھا جو ٹیوٹانک نائٹس کہلاتا تھا اور ان کا تعلق بالٹک کے خطے سے تھا۔ یہاں کے عیسائی مذہب سے جنون کی حد تک وابستگی رکھتے ہیں اور یہ نائٹس صلیب کے نام پر جان لینے اور دینے کے لیے مشہور تھے۔ منگولوں کی آمد کے بعد مصر پر یورپ کی جانب سے حملہ کیا گیا تھا تو یہ نائٹس بھی اس صلیبی فوج کا حصہ تھے۔ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق یہ جنگجو اپنے خوفناک حملے کے لیے بھی مشہور تھے۔ مگر منگولوں کے پاس ان کا بھی علاج تھا۔ انہوں نے لیگ نیکا میں بھی اپنی روایتی چال سے کام لیا اور ڈیوک ہنری کی فوج کو کھینچ کر میدانِ جنگ میں اس جگہ لے آئے جہاں منگول دستے چھپے تھے انہوں نے جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ فولاد پوش نائٹس اپنے لباس کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے۔ دھویں اور آگ نے بہت ساروں کی جان لے لی اور بچ جانے والوں کو منگول سپاہ نے اپنے طویل نیزوں سے چھید کر رکھ دیا۔ ان دو طاقتور ریاستوں سے نمٹ کر منگول بہ آسانی باقی پولینڈ پر قابض ہو گئے۔

پولینڈ سے نمٹ کر منگول ہنگری کی فتح کا عزم لیے آگے بڑھنے لگے۔ ہنگری کا بادشاہ بیلا اپنے دارالحکومت بوڈاپسٹ میں متفکر موجود تھا کیونکہ اس کے سرداروں کے جھگڑے کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے اور وہ ایک بہت بڑی فوج رکھنے کے باوجود منگولوں کے سامنے بے بس تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح منگول یہاں سے واپس چلے جائیں۔ یہ اور بات ہے اسے منگولوں کی واپسی کے بجائے پولینڈ کی مختلف ریاستوں کی تباہی کی خبریں مل رہی تھیں اور یہ خبریں وہ مہاجرین لا رہے تھے جو منگولوں سے بچنے کے لیے کسی سیلاب کی طرح ہنگری کا رُخ کر رہے تھے۔ اس وقت ہنگری مشرقی یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ آج کا سابق یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیہ بھی ہنگری کا ایک حصہ تھا۔ مگر سیاسی استحکام نہ ہونے سے ریاست کمزور تھی۔

بوڈاپسٹ جو آج بھی ہنگری کا دارالحکومت ہے کبھی زمانے میں دو شہروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ دونوں شہر دریائے ڈینوب کے دونوں کناروں پر آباد تھے۔ ان میں سے ایک بوڈا اور دوسرا پسٹ کہلاتا تھا۔ پھر ان کا مجموعہ بوڈاپسٹ کہلانے لگا۔ آج انہیں ایک ہی شہر سمجھا جاتا ہے۔ دریا کے دونوں طرف اونچے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں کے درمیان شہر موجود تھا۔ جب شاہ بیلا کے سرداروں کو خبر ملی کہ منگول پولش مہاجرین کے پیچھے ہنگری میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کا مقصد بوڈاپسٹ پر قبضہ کرنا ہے تو وہ مجبور ہوئے کہ شاہ بیلا کے احکامات کو مانیں اور ان میں سے بہت سارے اپنی فوج لے کر بوڈاپسٹ پہنچ گئے۔

شاہ بیلا خوش تھا کہ شاید اب وہ اس آفت سے اہم ملک کا دفاع کرنے میں کامیاب رہے گا۔ مگر اس دوران ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے بیشتر سردار پولش مہاجرین کو پناہ دینے کے خلاف تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں ملک بدر کر دیا جائے تب ہی وہ منگولوں کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان مہاجرین کی آڑ میں بہت سارے منگول جاسوس بھی ہنگری میں داخل ہو گئے ہیں۔ سرداروں کا خدشہ بالکل درست تھا۔ سچ مچ ان پولش مہاجرین کے ساتھ منگول جاسوس بھی ہنگری میں داخل ہوئے تھے اور بوڈاپسٹ تک چلے آئے تھے۔ انہوں نے یہاں فوج اور دفاعی انتظامات کی تفصیلی رپورٹ کے ساتھ شاندار شہر اور خوب صورت عورتوں کا ذکر اس انداز سے کیا کہ منگول لشکر جلد بوڈاپسٹ پہنچنے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔

شاہ بیلا نے اپنے سرداروں کو سمجھانے کی کوشش

فی الحال مہاجرین کو نہیں نکالا جا سکتا ہے اور وہ کہاں جاتے کیونکہ ان کے پیچھے تو منگول چلے آ رہے تھے۔ سرداروں نے تجویز دی کہ مہاجرین کے مردوں کو فوج میں بھرتی کر کے ان کی عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنا لیا جائے تاکہ اگر کوئی فرار کی کوشش کرے تو اس کی سزا اس کے اہلِ خانہ کو دی جائے۔ مگر شاہ بیلا نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ ایک تو وہ اپنے ہم نسل لوگوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مشرقی یورپ کی تمام اقوام سلاو نسل سے ہیں۔ ان میں روسی بھی شامل ہیں۔ دوسرے اتنا وقت نہیں تھا کہ نئی فوج کو بھرتی کر کے اسے لڑنے کی تربیت دی جاتی۔ شاہ بیلا کے انکار پر اس کے سردار ناراض ہوئے اور ان میں سے کچھ تو اپنی فوجیں لے کر واپس بھی چلے گئے۔

منگول خطرہ سر پر آ گیا تھا اور گرما کے آخر میں ان کے ہراول دستے بوڈاپسٹ کے آس پاس دیکھے جانے لگے تھے۔ یہاں بھی منگولوں نے اپنی مخصوص چال سے کام لیا۔ یہ دستے جھلک دکھلا رہے تھے۔ جیسے ہی شاہ بیلا اپنی تمام تر فوج لے کر نکلا منگول تیزی سے پسپا ہونے لگے۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ چند دن میں شاہ بیلا کی فوج کو ڈیڑھ سو میل پیچھے لے گئے۔ دراصل باتو خان کو جاسوسوں نے آگاہ کر دیا تھا کہ بوڈاپسٹ کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ اس پر حملہ کرنا نہایت دشوار تھا دوسرے اس کے گرد نہایت مضبوط فصیل تھی۔ اسے توڑنا مشکل تھا۔ اس میں منگولوں کا وقت اور جانیں بہت زیادہ لگتیں۔ آسان کام یہ تھا کہ کسی طرح ہنگری کی فوج کو کھلے میدان میں لایا جائے اور پھر اس کا صفایا کر دیا جائے۔

شاہ بیلا کے کچھ مشیروں نے اسے تعاقب سے روکا اور مشورہ دیا کہ منگولوں کو آنے دیا جائے۔ وہ شہر پر آسانی سے قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر سرما آنے والا تھا اور ایسے میں وہ شہر کا غیر معینہ مدت تک محاصرہ نہیں کر سکتے تھے۔ امید تھی کہ وہ واپس چلے جائیں گے۔ لیکن شاہ بیلا نے یہ تجویز رد کر دی۔ اسے خوف تھا کہ منگول شہر تک آ گئے تو اسے فتح کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اب تک منگولوں کا ریکارڈ یہی تھا وہ جس شہر تک پہنچ جاتے بالآخر اسے برباد کر کے دم لیتے۔ اسی خوف سے شاہ بیلا نے اپنے دارالسلطنت سے باہر منگولوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری طرف منگولوں کی جنگی چال بھی شاہ بیلا اور اس کے سرداروں کے علم میں آ گئی تھی۔ اس لیے وہ تعاقب کرتے ہوئے بہت محتاط تھے اور پورا اطمینان کرنے کے بعد آگے بڑھتے تھے کہ کہیں منگول سپاہ گھات لگائے تو نہیں بیٹھی..... جب وہ خاصے دور نکل آئے تو انہیں اعتماد ہو گیا کہ اب منگول سچ مچ پسپا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف منگول انہیں پہاڑوں سے کھینچ کر میدان کی طرف لا رہے تھے جہاں وہ ان کے خلاف کھل کر کارروائی کر سکتے تھے۔ جب وہ مطلوبہ مقام پر پہنچے تو کھلی جگہ دیکھ کر شاہ بیلا نے لشکر کے گرد سامان کے چھکڑوں کا حصار بنانے کا حکم دیا تاکہ منگول شب خون نہ مار سکیں۔

اس دوران میں منگول سپاہ ہنگرین فوج کی واپسی کا راستہ بند کر رہی تھی اور اس نے چاروں طرف سے اسے یوں گھیر لیا کہ اب فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ جب شاہ بیلا کو علم ہوا کہ وہ گھر چکے ہیں تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ چھکڑوں کے حصار سے نکل کر منگولوں کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی اور انہیں پہلی بار پتا چلا کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ قبائلی لڑائیاں جنگ نہیں ہوتی ہیں۔ منگولوں نے نہایت لاپروائی سے انہیں واپس چھکڑوں کے حصار میں دھکیل دیا اور پھر ان چھکڑوں کو آگ لگا دی۔ ہنگری کے سپاہی اس آگ میں جل رہے تھے اور دھویں سے ان کا دم گھٹ رہا تھا لیکن حصار کے باہر یقینی موت ان کی منتظر تھی۔ منگولوں نے محاصرہ توڑنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ بالآخر شاہ بیلا کا پورا لشکر تباہ ہو گیا اور شاید چند سو سے زیادہ افراد جان بچا کر نکل سکے تھے۔ اس شکست نے پورے مشرقی یورپ کو منگولوں کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی منگول فوج آسٹریا میں داخل ہوئی اور اس کے دارالسلطنت ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ بس ایسا لگتا تھا کہ مشرقی یورپ تو اب منگول سلطنت کا حصہ بن گیا ہے۔

مگر اچانک ہی قراقرم سے اوغدائی کی موت کی اطلاع آ گئی۔ یہ اطلاع آتے ہی باتو خان کو فوراً جانشینی کی فکر لاحق ہوئی اور اس نے منگول فوج کو لے کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اسے اتنی عجلت تھی کہ اس نے ایک رات میں ویانا کا محاصرہ ختم کر دیا اور اگلی صبح جب روشنی ہوئی تو اہلِ شہر نے منگول سپاہ کو واپس جاتے دیکھا۔ یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کیونکہ منگول جب کسی شہر کا محاصرہ کرتے تھے تو اسے تباہ کیے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس وقت ویانا والے سمجھے کہ منگول ان کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں اور وہ اچانک کسی دن شہر پر آ پڑیں گے۔ صرف ویانا والے ہی نہیں بلکہ یورپ میں جہاں جہاں منگول موجود تھے، مقامی لوگوں نے منگولوں کو غائب پایا تو بہت عرصے تک اس شک میں رہے تھے کہ منگول گئے نہیں بلکہ کہیں آس پاس موجود ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی منگول اس طرح غائب ہو گئے تھے جیسے فصل برباد کرنے کے بعد ٹڈیاں غائب ہو جاتی ہیں اور پورے مشرقی یورپ میں

ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا تھا۔ جب انہیں یقین آ گیا کہ منگول نامی یہ آفت ٹل گئی ہے تو شدید بربادی کا سامنا کرنے کے باوجود اہلِ یورپ نے خوشیاں منائی تھی۔

عجیب بات ہے کہ جب یورپ کے کسی غیر یورپی حملہ آور کے آگے سرنگوں ہونے کا وقت آتا ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا سبب بن جاتا ہے جب حملہ آور فیصلہ کن پوزیشن میں ہونے کے باوجود واپسی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ کئی صدیوں بعد جب عثمانی فوج یورپ میں پیش قدمی کر رہی تھی اور یورپ والے اس کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔ سلطان ۔۔۔۔۔۔ نے ویانا کا محاصرہ کر لیا تھا اور بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ اب مشرقی یورپ کو سرنگوں ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا کہ کسی

مصلحت کے تحت سلطان کو ویانا کا محاصرہ اُٹھا کر واپس جانا پڑا تھا۔ منگول حملے پر بھی تاریخ نے خود کو دُہرایا تھا۔

باتو خان خود خاقان بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ اگرچہ اوغدائی نے اپنے بیٹے قویوق کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن ابھی قراقرم میں ہونے والی قورلتائی میں اس کی توثیق ہونا باقی تھی۔ اس لیے باتو خان کو امید تھی کہ وہ بھی خاقان بن سکتا ہے۔ لیکن وہ مشرقی روس میں واقع اپنے علاقے تک آیا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ خاقان کا انتخاب ہو چکا ہے۔ یہ سنتے ہی اسے اپنے زیرِ قبضہ علاقے کی فکر لگ گئی اور اس نے برقائی خان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قراقرم سے آزاد اور خودمختار حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے لیے دارالسلطنت کی جگہ منتخب کی اور مشرقی یورپ سے لوٹی جانے والی دولت سے شہر تعمیر کرانے لگا۔ اس نے اس شہر کا نام سارائی رکھا اور آج آثاریات کے ماہرین نے اس شہر کے کھنڈرات دریافت کر لیے ہیں۔ یہاں بیش قیمت روغنی ٹائلیں اور سیوریج کے نظام کے ساتھ گھروں تک پینے کے پانی کی فراہمی کا نظام بھی کام کرتا تھا اور اس مقصد کے لیے مٹی سے بنے پائپ بچھائے گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باتو خان نے باقاعدہ ماہرین کی زیرِ نگرانی اور منصوبے کے تحت اس شہر کو آباد کیا تھا۔ یقیناً اپنے وقت میں یہ ایک عظیم الشان شہر ہوگا۔

باتو خان نے مشرقی یورپ کو ضرور برباد کیا تھا لیکن اس نے روس میں اپنے علاقے کی ریاستوں کو نہیں چھیڑا تھا ان پر بدستور روسی حاکم تھے اور وہ باتو خان کو خراج دیتے تھے۔ نقد رقوم کے علاوہ وہ باتو خان کی فوج کو سپاہی، گھوڑے اور رسد کا سامان دینے کے پابند تھے۔ اس طرح باتو حرے سے کچھ

کیے بغیر اپنے محل میں عیش وعشرت سے رہنے لگا۔ البتہ اس کا کوئی باج گزار خراج دینے سے انکار کرتا تو منگو فوجیں اس پر چڑھ دوڑتی تھیں اور اسے تباہ کر کے دوسر کے لیے نمونہ عبرت بنا دیتیں۔ باتو خان کے پاس دو لاکھ زیادہ منگول سپاہی تھے۔ لیکن ان سپاہیوں کے لیے قرا سے عورتیں نہیں آئی تھیں مجبوراً باتو کو ان سپاہیوں کو اجاز دینی پڑی کہ وہ مقامی عورتوں سے شادی کر لیں۔ اس نتیجے میں صرف ایک نسل بعد ہی منگول اپنی خالص شناخت چکے تھے۔

صرف مشرقی روس ہی نہیں بلکہ منگول جہاں جہاں انہیں مقامی عورتوں سے شادیاں کرنا پڑیں اس کے نتیجے مخلوط نسل پیدا ہوئی اور مزید چند نسلوں کے بعد منگول مقا نسلوں میں یوں گھل مل گئیں کہ ان کی منگول خصوصیات مٹ رہ گئیں۔ حد یہ کہ مغل خاندان جو خود کو خالص منگول خون ہیں ان میں بھی منگولوں والی نسلی خصوصیت نہیں ملتی ہے سب طویل قامت، کھڑی پیشانی اور ناک والے اور بڑ آنکھوں والے تھے۔ یوں اصل منگول نسل آج ہمیں صرا منگولیا میں ملتی ہے۔ چنگیز خان کے دور میں یہاں آباد بڑے قبائل میں سے کچھ بھی آج باقی نہیں ہیں لیکن باقی قبا موجود ہیں اور اپنا نسلی ورثہ بہت فخر سے اپنائے ہوئے ہیں۔ ایک دنیا کے لیے دہشت چنگیز خان آج منگولیا میں باپ حیثیت رکھتا ہے اور پورے ملک میں جابجا اس کے نصب ہیں جن کے قدموں میں مقامی باشندے یہ عقیدت پھول رکھتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے منگولیا میں ہو والے عام انتخابات میں ایک حکومت مخالف اتحاد چنگیز خان کے لیے کہا کہ وہ آج بھی زندہ ہے اور ان کا ہے۔ اس پر اتحاد کو حیرت انگیز کامیابی ملی۔

باتو خان کو اس کے بعض مشیروں نے گمراہ کیا تھا جو اس کے ساتھ یہاں نہایت عیش کی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ باتو اگر قراقرم چلا گیا اور وہاں اسے خاقان دیا گیا تو ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی اس لیے اسے بہکاتے رہے۔ حتیٰ کہ اسے یہ تک کہہ دیا کہ اگر قراقرم گیا تو اسے چنگیز خان کی نسل سے نہ ہونے کا طعنہ جائے گا اور اسے ذلیل کیا جائے گا۔ درحقیقت ایسے خدشات باتو خان کے دل میں بھی تھے۔ وہ جانتا تھا کہ چنگیز خان کے باقی بیٹے اور پوتے اس سے شدید نفرت کرتے اور پیٹھ پیچھے اس کا ذکر ہمیشہ بُرے الفاظ میں کرتے تھے۔ ان کے دل سے یہ بات نکلی نہیں تھی کہ اپنا بیٹا نہ ہونے

خان جوجی سے نہایت محبت کرتا تھا اور اس نے سلطنت کا ایک بڑا حصہ اپنی زندگی میں دے دیا اسے اپنے خاندان کا فرد تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے اور ان قورلتائی میں شریک ہونے جاتا تو عین ممکن ہے ساتھ بُرا سلوک تو کیا جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی ہین کر کسی اور منگول شہزادے کے سپرد کر دی جاتی۔

یوق ابھی کمسن تھا۔ لیکن اس کی ماں نہایت ہوشیار تھی۔ اسے اوغدائی کی بیویوں اور داشتاؤں میں سب مقام حاصل تھا۔ اس نے تین سال تک بیٹے کی جگہ کی اور جب قویوق اس قابل ہوا تو حکومت اس کے دی۔ مگر قویوق بھی اپنے باپ اوغدائی کی طرح نالائق تھا اور اس نے کم عمری میں بے تحاشہ شراب نوشی شروع کر دی تھی۔ جب تک وہ خاقان نہیں بنا تھا تب تک کسی ماں کے قابو میں تھا لیکن خاقان بنتے ہی اسے آزادی اور اس نے اس طرح شراب پی کہ صرف دو سال میں رخصت ہو گیا جب کہ وہ ابھی جوان ہی تھا۔ ایک شبہ ہے کہ اسے شراب کے ساتھ سست روی سے اثر کرنے والا دیا گیا جس نے بالآخر اس کی جان لے لی۔

اس شبے کی وجہ تولائی کا بیٹا منگو خان تھا۔ اس کی ماں شاطر عورت تھی اور اس نے قویوق کی جگہ منگو کو خاقان بنانے کی ہر ممکن کوشش کر لی تھی۔ مگر اس وقت قویوق کی پوزیشن بہت مضبوط تھی البتہ جب وہ انتقال کر گیا تو منگو خود بہ کا مضبوط امیدوار بن گیا۔ حالانکہ قویوق کی ماں اپنے خاقان بنانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کا رجحان باتو کی طرف بھی تھا۔ اصل میں تین سال تک حکومت کر کے حکومت کا چسکا پڑ گیا تھا اور وہ کسی کی آڑ میں قراقرم کے پر اپنا قبضہ مضبوط رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے جب قویوق کا تو اس نے اپنے بھتیجے شریمن کو آگے کیا۔ شریمن ایک جنگجو تھا لیکن وہ منگول سرداروں میں منگو خان جیسی دبدبہ نہیں رکھتا تھا۔

دراصل چالاک منگو خان نے لباس اور حلیے میں چنگیز کی قطع وضع اپنائی تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ قراقرم اپنے دادا کے دورِ حکمرانی کو واپس لائے گا۔ اس وقت چنگیز خان منگولیا میں ایک دیوتا کی حیثیت اختیار کر گیا تھا منگول اس سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ منگو خان کا حربہ کامیاب رہا۔ جس وقت دوسرے منگول شہزادے غیر ملکی اور طرز کے زرق برق لباس پہننے لگے تھے۔ منگول کھال اور پوستین کا بنا ہوا سادہ لباس پہنتا تھا اور اس کے

پیروں میں ہمیشہ سخت چمڑے کے جنگی جوتے ہوتے تھے۔ قراقرم میں سرداروں نے اسے اگلا خاقان منتخب کر لیا اور اوغدائی کی بیوہ ناکام رہی۔ اس پر شریمن نے چراغ پا ہو کر منگو خان کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی مسلح بغاوت ناکام رہی۔ اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا لیکن شریمن کو فوری کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بجائے منگو خان نے چین میں اپنے بھائی قبلائی خان کے پاس بھیج دیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ البتہ اوغدائی کی بیوہ سے منگو خان نے بھیانک انتقام لیا اور منگولوں کے پسندیدہ انداز میں اسے قتل کیا۔ منگول اپنے دشمن کو قالین میں سی کر اسے گھوڑوں سے روند کر ہلاک کرتے ہیں یا قالین کو پانی میں ڈبو دیتے ہیں اور یہ سلوک وہ اپنے ذی حیثیت دشمن کے ساتھ کرتے ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ ہے اگر کسی ذی حیثیت آدمی کا خون زمین پر گرے تو یہ بہت بُرا شگون ہوتا ہے۔ توہم پرست منگول بات بات پر شگون لینے کے عادی تھے۔ خود چنگیز خان اس وقت تک دشمن پر حملہ نہیں کرتا تھا جب تک اسے آسمان پر کوئی عقاب یا چیل نظر نہ آ جائے۔ اس کے نزدیک یہ کامیابی کا شگون ہوتا تھا۔ منگو خان وحشی اور سفاک آدمی تھا اس نے بے دردی سے اپنی چچی کو قالین میں سلوا کر پانی میں ڈبو دیا۔ اس کے بعد بیرونی مہمات سے پہلے اس نے سلطنت میں اپنے مخالفوں کا خاتمہ ضروری سمجھا۔

منگو اور قبلائی آپس میں سگے بھائی تھے اور قبلائی خان نے اس وقت تک مکمل خودمختاری حاصل نہیں کی تھی۔ منگو نے خاقان بنتے ہی چین میں نئی مہم کا آغاز کیا اور اس بار وہ جنوبی چین کی سب سے بڑی سلطنت سانگ پر حملہ آور ہوا۔ اس زمانے میں بغداد کے بعد دنیا کا سب سے بڑا شہر ہانگ زو اسی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ یہ اپنے چھاپے خانوں، ریشم سازی کے مراکز، چینی مٹی کے برتنوں اور قیمتی پتھروں کے لیے مشہور تھا۔ منگولوں نے فتح کے بعد اس شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ جن خاندان کی سانگ خاندان سے دشمنی تھی انہوں نے قبلائی خان کی فوج میں شامل ہو کر ان کا بھرپور ساتھ دیا اور سانگ سلطنت کو برباد کر کے رکھ دیا۔ یہ چین کے لیے مشکل دور تھا۔

دوسری طرف ہلاکو خان کب سے اپنے منصوبے پر عمل کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ منگو کے خاقان بنتے ہی اس کی امید بر آئی۔ اس نے منگو کو راضی کر لیا کہ مسلم مرکز بغداد پر قبضہ کیا جائے اور دنیا میں صرف ایک خان کی حکومت قائم کی جائے۔ منگو بھی چنگیز خان کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتا تھا اس لیے

بغداد پر قبضے کے لیے ایک عظیم الشان لشکر تشکیل دیا۔ کہتے ہیں منگولوں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی ایسا لشکر نہیں بنایا تھا۔ اس میں ڈیڑھ لاکھ سپاہی اور گھڑ سوار اور ایک ہزار منجنیقیں تھیں۔ منگولوں کے ساتھ آرمینیا، جارجیا اور مشرقی یورپ سے آئے عیسائی دستے بھی اس لشکر میں شامل تھے اور مسلمانوں کے قتلِ عام میں وہ پیش پیش تھے۔

ایران اور عراق کے علاقوں کو روندتے ہوئے منگول بالآخر بغداد تک پہنچ گئے۔ سقوطِ بغداد مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دل گداز باب ہے جو اپنوں کی غداری اور غیروں کی سفاکی سے رقم کیا گیا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی خلیفہ بغداد کی فوج کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ منگول اتنی زبردست قوت سے حملہ آور ہونے کے باوجود کھلے میدان میں اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کے بجائے چالوں اور غداروں کی مدد سے بغداد پر قابض ہوئے۔ مسلم فوج کو خلیفہ کے غدار وزیر اعظم نے منتشر کر دیا اور ان کو غلط سمتوں میں بھیج دیا گیا۔ عین جنگ کے دوران انہیں تنخواہ لینے کے لیے قصرِ وزارت بلا لیا۔ بارہ ہزار کی ایک سپاہ کو دریا کے ساتھ تعینات کیا جہاں منگولوں نے بند توڑ کر اس دستے کو غرقاب کر دیا۔ جب منگولوں کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ بغداد میں داخل ہوئے۔ کئی دن تک قتلِ عام ہوتا رہا، عفت مآب خواتین کی سرِعام بے حرمتی کی جاتی رہی۔ کتب خانوں اور مدرسوں کو آگ لگا دی گئی۔ دجلہ پہلے تین دن سرخ بہتا رہا کیونکہ اس میں مسلمانوں کا خون شامل ہو گیا تھا اور اس کے آنے والے کئی مہینے تک اس کا پانی ان کتابوں کی سیاہی سے سیاہ رہا جو اس میں پھینکی گئی تھیں۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کو منگولوں نے قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہلاک کر دیا۔ بغداد اُجڑ گیا اور پھر کبھی اس طرح آباد نہیں ہو سکا۔

حسبِ معمول منگولوں کی جانب سے غداروں کو کچھ نہیں ملا اور ان میں سے بہت سارے تہ تیغ کر دیے گئے۔ ان کے بجائے ہلاکو خان نے شمس الدین نامی ایک مسلمان کو یہاں اپنی حکومت کا وزیر مقرر کر دیا۔ یہ نیک شخص ہلاکو خان کے ساتھ رہا اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا البتہ بعد میں اس نے مسلم حکومت کی بحالی اور خاص طور سے منگولوں کو مسلمان کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اس کا ثمر یہ ملا کہ چند عشروں بعد مسلمان دوبارہ اس علاقے کے حکمران بن گئے تھے۔ ایک طرف تو ہلاکو خان بغداد اور اس کے آس پاس کے علاقوں کا انتظام کر رہا تھا۔ یہ علاقے ایک طرف سے اس سلطنت کا حصہ تھے کیونکہ اس کا بھائی منگو قراقرم میں بیٹھا اور یہاں اسے حکمرانی کرنے کا موقع ملتا۔ دوسری طرف عیسائی اس کی بیوی کی مدد سے اسے گھیرے ہوئے تھے ا بیت المقدس کو منگولوں کی مدد سے واپس حاصل کرنا چا تھے۔ وہ ہلاکو خان کو اُکسا رہے تھے کہ وہ جلد از جلد المقدس اور مصر کی طرف اپنی مہم کا آغاز کرے تاکہ اسلا حکومت کا مکمل خاتمہ کیا جا سکے۔ اس وقت صرف مصر میں خود مختار اسلامی حکومت باقی رہ گئی تھی۔ بہرحال قدرت اب منگولوں کی رسی کھینچنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عین جالوت میدان میں ان کے ساتھ جو ہوا وہ مکافاتِ عمل کا آغاز تھا۔

ہلاکو خان کے ارادے ابھی اس کے سینے میں تھے۔ قراقرم سے منگو خان کی موت کی خبر آ گئی۔ نئے خاقان دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ہلاکو خان اپنا لشکر لے کر قراقرم کی طرف چل پڑا اور اسے دوبارہ واپس آنا نصیب ہوا۔ پھر مصری حکومت نے منگولوں کو شکست دے کر علاقوں سے پسپا کرنا شروع کر دیا۔ ایران، عراق اور ایشیا کچھ عرصے قراقرم کا تابع رہا لیکن جلد مسلمانوں دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ منگو خان کے بعد کئی خاقان بعد دیگرے قراقرم کے تخت پر بیٹھے لیکن اب منگول زوال کی طرف گامزن تھی۔ پہلے وسطِ ایشیا کے مقبوضات پھر یورپی مقبوضات بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ جہاں آباد تھے وہ تہذیب اور مذہب کے لحاظ سے اسی کے رنگ میں رنگ گئے۔ مقامی عورتوں سے شادی۔ ان کی نئی نسل بالکل مختلف آئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بالکل غائب ہو گئے۔

1200ء میں صحرائے گوبی سے جو طوفان اُٹھا اس نے ایشیا اور یورپ کے ایک بڑے خطے کو تہ و بالا تھا۔ 1350ء تک یہ طوفان اپنی حدود سے گزر کر ختم تھا اور اب قراقرم کی حکومت صرف منگولیا تک محدود چین سے منگول کلی طور پر بے دخل کیے جا چکے تھے اور اس علاوہ وہ دنیا میں کہیں حکمران تھے تو ان کا قراقرم تعلق نہیں تھا۔ قراقرم کی شان و شوکت ماضی کا حصہ تھی۔ یہ پھر سے ایک معمولی سا شہر بن گیا تھا۔ پھر تیمور شہر بن کر ٹوٹے اور اس کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ اب صرف زرد ریت اُڑتی ہے۔ صرف یہی ریت اس کی یادگار ہے جو آٹھ صدی قبل یہاں سے اُٹھی تھی۔

بھگوان شکاری

مسعود کھدر پوش
ترجمہ ابراہیم جمالی

دوسرا اور آخری حصہ

شکار کرنا دورِ گزشتہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ راجے مہاراجے، نوابین اور اعلیٰ عہدے دار شکار کھیلنا شان کی بات سمجھتے تھے کیونکہ اس کھیل میں سنسنی بھی ہے، شملہ اونچا رکھنے کا بہانہ بھی اور شان کا مظاہرہ بھی، انگریزوں کے دورِ اقتدار میں اعلیٰ منصب پہ فائز سرکاری عہدے داروں میں مسعود کھدر پوش کا اپنا ایک الگ مقام تھا۔ انہوں نے شکار بیتی بیان کرتے ہوئے ہر قسم کی معلومات قارئین تک پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے قلم کی جادوگری آپ بھی ملاحظہ کریں۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک بہت ہی منفرد انداز کی شکار کتھا

اس کے اتنے خوف زدہ ہونے کا سبب مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ وہ بھیل نوجوان بچپن میں کبھی چیتے کے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ تب سے اس کے دل میں چیتے کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ اب چیتے کو اپنے سامنے دیکھا تو اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ مجھے اتنی اہم بات نہیں بتائی گئی تھی۔ اگر مجھے پہلے سے اس حقیقت کا علم ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ ہرگز نہ لاتا۔

چیتا بانکی چال چلتا ہوا جھیل کی طرف جا رہا تھا۔ جھیل

میں ایک روز دربار کر رہا تھا کہ امیر اعظم خاں کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا۔ یہ کابل میں تھی اور میرے ساتھ منسوب تھی۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا کبھی شوق نہ تھا۔ خط پا کر مجھے ندامت ہوئی۔ میں نے اپنے آپ کو سخت ملامت کی کہ جاہل ہوں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت رویا اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت عاجزی اور انکساری سے دعا مانگی اور ارواح اولیا اللہ سے سفارش کی درخواست کی۔ صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ بزرگ میرے سرہانے کھڑے ہو کر فرماتے ہیں "عبدالرحمٰن اٹھ اور لکھ" میں چونک پڑا اور کسی کو نہ پا کر پھر سو گیا۔ وہی بزرگ پھر تشریف لائے اور فرمایا "اگر اس مرتبہ تو سویا تو اس عصا سے تیرا سینہ چھلنی کر دوں گا۔" یہ سن کر میں خوف کے مارے اٹھ بیٹھا اور پھر نہ سویا۔ خادم کو بلا کر کاغذ قلم منگوایا اور مکتب میں جو حروف لکھا کرتا تھا انہیں سوچنے لگا۔ خدا کی قدرت کہ تمام حروف کی شکل میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ میرے حافظے نے مدد کی اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا، یاد آنے لگا، ایک ایک لفظ کر کے کاغذ پر لکھا۔ اس طرح طلوع آفتاب تک میں نے ساٹھ سطریں لکھیں۔ بعض حروف اچھی طرح نہ ملا سکا اور بعض درست بھی نہ تھے لیکن جب میں نے ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب پڑھ سکتا ہوں اور غلطیاں بھی معلوم کر لیں جو کہ بہت تھیں۔

امیر عبدالرحمٰن خاں کی سرگزشت سے انتخاب

مرسلہ: نجمہ اچکزئی، کراچی

کے قریب موجود اتّا دکا جانور اسے دیکھ کر تیزی سے غائب ہونے لگے۔ اب چیتے کی راہ میں کوئی نہ تھا لیکن وہ کسی کو دیکھے بغیر انتہائی شان سے قدم اٹھاتا آگے بڑھتا رہا۔ اچانک اس نے رک کر بائیں طرف دیکھا اور پھر جھیل کی جانب جانے کی بجائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس درخت کے نیچے آ گیا جہاں پچھلی رات سے کٹے کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی۔

وہ کٹے کے بے جان وجود کے قریب گیا اور اس کی چیری ہوئی گردن پر زبان پھیرنے لگا۔ چاندنی میں یہ خوفناک منظر ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جب چیتے نے اپنا ایک پنجہ کٹے کی مروڑی ہوئی گردن پر رکھ کر وہاں کے گوشت پر منہ رکھا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے بھیل کو ٹہوکا مارا کہ وہ ٹارچ روشن کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ دوسرا قبائلی اب اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے ایک طرف پڑا کانپ رہا تھا۔

اس دن میرے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ اس ہتھیار کے ساتھ وہ میرا پہلا شکار تھا۔ میں نے اندازاً چیتے کے سر کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ بھیل قبائلی نے طاقتور ٹارچ کی روشنی چیتے پر ڈالی اور میں نے نشانہ لے کر کے گولی چلا دی۔

فائر کے دھماکے اور چیتے کی دہشت ناک دہاڑ کے ساتھ ہی مچان پر جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ خوف زدہ بھیل بُری طرح تڑپا تھا اور دوسرے بھیل نے ایک ہاتھ سے اسے قابو میں رکھنے کی جدوجہد کی، اس دوران میں اس کے ہاتھ سے ٹارچ گر گئی پھر تو دونوں بھیلوں میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ یہ آناً فاناً ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میری توجہ ہٹی تھی اور جب میں نے ٹارچ اٹھا کر سامنے روشنی ڈالی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں کٹے کی ادھڑی ہوئی لاش تو موجود تھی لیکن چیتا کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ اس کی دور ہوتی بھچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ چیتا میری گولی سے زخمی ضرور ہوا ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ جی میں آیا کہ کمبخت بھیل کو اٹھا کر نیچے پھینک دوں جس کی مداخلت نے عین وقت پر میرا نشانہ خطا کر دیا تھا۔

وہ پوری رات ہم نے مچان پر گزاری اور صبح ہوتے ہی کیمپ پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چند لڑکے آئے ان کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو باتیں سنائیں وہ انتہائی دردناک اور دہشت ناک تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلی رات کے آخری پہر چیتا بستی میں داخل ہو گیا تھا اس نے کئی بھینسوں، گائے اور بکریوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ باقی سارے ڈھور ڈنگر اس کے خوف سے لکڑی کے کٹہرے توڑ کر جنگل کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ اب پوری بستی جانوروں سے خالی پڑی ہے۔ دو چار بھیل جوانوں نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تیروں اور نیزوں سے حملہ کر کے اسے بھگانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ بے چارے چلتی پھرتی اس موت کی خونخواری کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک اسی وقت مر گیا تھا اور باقی دو شدید زخمی ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ چیتا انسانوں سے انتقام پر آمادہ ہے۔

یہ دہشت ناک خبریں بجلی بن کر تمام شکاریوں پر گریں، سب کے چہرے مرجھا گئے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو، میں اس خطرناک درندے کو شکار کرنے کے لیے فوراً جنگل میں جاؤں گا۔ اس لیے میں نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں اعلان کیا۔

"بھیل جوانو! میں چیتے کو مارنے کے لیے جنگل میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی بہادر جوان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میرے ساتھ چلنا چاہے تو یہاں آ جائے۔"

پاگل پن کی حد تک پہنچی ہوئی میری اس دلیری کو دیکھ کر سہمے ہوئے قبائلیوں کو بھی قدرے حوصلہ ملا۔ دس، بارہ نوجوان ہمت کر کے میرے قریب آ گئے۔ میں نے ان میں سے صرف تین بندوں کو چنا اور گھنے جنگل کی طرف چل دیا۔ دن کے وقت اپنے پیروں پر چل کر خطرناک جنگل میں کسی زخمی چیتے کا شکار کرنا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہے لیکن میں گویا خود فراموشی کی حالت میں معصوم بھیلوں اور جانوروں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کے لیے یہ درندہ بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ اس لیے میں جلد سے جلد اس چیتے کا خاتمہ چاہتا تھا۔

میں نے ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کی تیاری کی ہوئی تھی۔ جب ہم جھیل کے کنارے اس مقام پر پہنچے جہاں چیتا زخمی ہوا تھا تو میں نے رائفل پوری طرح لوڈ کر لی۔ اب صرف درندے کو دیکھتے ہی ٹرائیگر دبانے کی دیر تھی۔ میرے ساتھ آنے والے قبائلیوں کا بُرا حال تھا۔ وہ میرے سامنے یہ خوف ظاہر نہیں کر رہے تھے لیکن میرے قریب رہنے کی کوشش کرتے رہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم نے چیتے کے لہو سے بنی پتلی سی لکیر ڈھونڈ لی۔ پھر ہم اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ کہیں خون کی یہ لکیر غائب ہو جاتی تو ہمیں چیتے کا کھرا تلاش کرنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک جگہ خاصی مقدار میں خون نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مقام پر زخمی چیتے نے کچھ دیر آرام کیا ہوگا۔ پھر اس نے وہاں سے بھیل بستی کی جانب رُخ کر لیا تھا۔

بستی سے واپسی پر چیتے کا نقش قدم تلاش کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہم نے پوری بستی کا ایک چکر لگایا۔ خوش قسمتی سے ایک جگہ مٹی میں کچھ ایسے مدھم دھبے دکھائی دیے جنہیں خون کے قطرے کہا جا سکتا تھا۔ شاید آٹھ گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد چیتے کا خون بہنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ ہم اندازے سے چلتے ہوئے جنگل میں بہت اندر

کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے، میں صبح کی ٹھنڈک میں تیز تیز چلتا ہانپتا ہوا جا رہا ہوں اور میرے کانوں میں طیارے کی آواز آتی ہے، اوپر دیکھتا ہوں اور پھر وہاں کھڑے ہو کر سنسان سڑک کے عین درمیان میں، پارلیمنٹ ہاؤس کے عین سامنے اوپر دیکھتا ہوں اور اوپر گلگت جانے والا طیارہ ہے تو میں مٹھیاں بھینچ کر بازو لہراتا ہوں اور دل کی بھڑاس نکالنے لگتا ہوں۔ "اوئے، گلگت جا رہے ہو، اوئے شرم نہیں آتی۔"

میری آواز بلند ہوتی جاتی ہے۔ "اوئے، عیش کر رہے ہو، ابھی گلگت ائرپورٹ پر اُتر کر اس ہوا میں سانس لو گے، اوئے...... فیری میڈو جاؤ گے کمبختو! مجھے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو، شرم نہیں آتی۔"

ایک روز میں اسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بلند آواز سے گلگت جانے والے طیارے سے "محوکلام" تھا اور جب میں ذرا زیادہ جوش میں آیا تو احساس ہوا کہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کوئی صاحب بے حد حیرت سے منہ کھولے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہیں کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ صاحب ایک سینئر بیوروکریٹ تھے جو تقریباً روزانہ سیر کرتے ہوئے مل جاتے اور ان سے سلام دعا ہوتی...... جس روز انہوں نے مجھے جہاز سے باتیں کرتے سنا، اس کے بعد وہ مجھ سے ذرا محفوظ فاصلے پر ہو کر گزرنے لگے۔ اگر میں سلام کرتا تو جلدی سے وعلیکم السلام کہہ کر تقریباً بھاگ نکلتے۔

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب "کے ٹو کی کہانی" سے

انتخاب: فہیم تبسم، شورکوٹ

تک جا پہنچے۔

گھنے جنگل سے گزر کر ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دور دور تک انسانی قد سے بھی بلند، سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ اردگرد جا بجا خاردار جھاڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی دکھائی دی اور ہم اس پر چلنے لگے۔ میں اس علاقے میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ یہ پگڈنڈی ایک جھیل کی طرف جا رہی تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اس خشک سالی کا شکار ہو کر سوکھ چکی ہوگی۔ اس جھیل سے آگے چٹانوں اور پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ میرے خیال کے مطابق اگر چیتے نے اُدھر کا رُخ کیا ہے تو

اسے انہی چٹانوں یا کسی پہاڑی غار میں موجود ہونا چاہیے۔

میں اسی سوچ میں غلطاں آگے بڑھتا رہا اور یہی بات میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ میں اردگرد سے بالکل بے خبر سا ہو گیا تھا کہ اچانک مجھے پودوں کے ہلنے اور ٹہنیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔

میرے سنبھلنے سے پہلے ہی کوئی وزنی چیز مجھ پر آن گری۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب محسوس ہوا کہ میرا بایاں ہاتھ کسی دندانے دار آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔

چیتے نے ایسی برق رفتاری سے مجھ پر حملہ کیا تھا کہ مجھے لوڈیڈ رائفل استعمال کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ چیتا، کتے کی طرح میرا ہاتھ اپنے طاقتور جبڑوں میں دبا کر اس طرح اپنے سر کو جھٹک رہا تھا جیسے وہ اسے میرے بازو سے الگ کرنا چاہتا ہو۔ اس کشمکش کے دوران میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تینوں قبائلی مجھے مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر جنگل میں غائب ہو چکے تھے۔

خونخوار درندہ اس طرح اپنے پنجے چلا رہا تھا جس سے میرا پیٹ اور کندھے لہولہان ہو گئے تھے، میں اپنے ہی لہو میں نہا گیا تھا۔ یہ سارا خون خرابا ایک دو سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔

میں اپنی جوانی میں پہلوانی بھی کرتا رہا، پھر گورنمنٹ کالج لاہور اور آکسفورڈ یونیورسٹی لندن جا کر باکسنگ کے مقابلے بھی لڑے۔ آکسفورڈ کی جانب سے مجھے باکسنگ بلیو بھی ملا تھا...... اب گویا اپنی طاقت آزمانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس وقت نہ تو میرے پاس رائفل تھی اور نہ میں اپنا شکاری چاقو نکال سکتا تھا اس لیے میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک فیصلہ کیا اور اپنا دایاں مکا بنا کے اسے جتنا پیچھے لے جا سکتا تھا، لے گیا اور پھر اپنی بائیں ٹانگ پر جسم کو تول کے اپنا پورا وزن رائٹ ہک پر ڈال کر پوری قوت سے چیتے کے منہ پر دے مارا۔

خوف اور جوش میں مارا ہوا وہ مکا اس قدر کارگر ثابت ہوا کہ چیتے کا منہ کھل گیا اور وہ پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ پھر مجھے اس کی ایسی آواز سنائی دی جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ شدید جھٹکا لگنے کے باعث میں بھی لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا تھا۔ جتنی دیر میں چیتا پینترا بدل کر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا، اس دوران میں رائفل اُٹھا کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لطف کی بات یہ کہ رائفل کی بیرل پر میرا ہاتھ پڑا اور میں نے جلدی سے اُٹھا لیا تھا۔ اسے سیدھا کرنے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ رائفل لوڈ تھی اور ہلکے سے دباؤ سے اس کی گولی مجھے لگ سکتی تھی، لیکن میں ہر قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔

اس بار جب چیتے نے اُچھل کر مجھ پر حملہ کیا تو میں نے دائرے میں گھما کے پوری طاقت سے رائفل کا بٹ اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ یہ وار بھی خاصا کارگر ثابت ہوا لیکن وحشی درندہ تیزی سے سنبھل گیا اور آگے بڑھ بڑھ کر اپنے پنجوں سے مجھے زخمی کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اب صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس میں پہلے جیسی پھرتی نہیں رہی۔ اس کے جبڑے پر لگے میرے داہنے مکے اور کھوپڑی پر پڑنے والے رائفل کے بٹ نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس لیے وہ جھک جھک کر مجھ پر حملہ کر رہا تھا۔ اس کی یہ ڈھیل میرے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ایک لمحے کی مہلت ملتے ہی میں نے رائفل کو سیدھی طرف سے پکڑ لیا۔ اب جیسے ہی چیتا میرے قریب آیا، میں نے نشانہ لیے بغیر ہی فائر کر دیا۔ وہ فلک شگاف دہاڑ کے ساتھ چکرا کر زمین پر ڈھے گیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور اب وہ خرخر جیسی آوازیں نکال رہا تھا۔

میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوسری گولی بیرل میں چڑھائی اور اس مرتبہ نشانہ لے کر گولی چلائی۔ دوسری گولی لگتے ہی چیتے کا کام تمام ہو گیا۔ جب میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں بُری طرح مجروح تھا اور جسم سے خون بہہ بہہ کر میرے بوٹوں میں جمع ہو رہا تھا۔ میں نے چلنے کی کوشش کی تو اپنے ہی لہو کی کیچڑ محسوس کر کے بڑی کراہت ہوئی۔ میں نے پیروں سے نگاہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھا گئی۔ میں غش کھا کر اسی جگہ گر گیا۔

جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ چیتے کے حملے سے ڈر کر بھاگ جانے والے تینوں بھیل میرے قریب بیٹھے تھے اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ان میں ایک کو میں فرسٹ ایڈ کا سامان اُٹھانے کے لیے اپنے ساتھ جنگل میں لایا تھا۔ اس نے میری ہدایات پر الٹی سیدھی پٹیاں کیں اور زخموں کو لال دوا سے صاف کیا۔ میں نے ایک کو کسی سواری کا بندوبست کرنے کے لیے بستی کی جانب دوڑایا۔ باقی دونوں نوجوان سہارا دے کر مجھے چلاتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ قبائلی ایک بھینس دوڑاتا میرے پاس آیا۔ اس کے پیچھے بے شمار قبائلی بھی تھے جو

روایتی انداز میں ناچتے گاتے چلے آ رہے تھے۔ سب کو اس خطرناک درندے کے ہلاک ہونے کی خبر مل چکی تھی۔

اس دن میں نے شدید زخمی حالت میں آٹھ تو میل کا سفر بھینس پر سوار ہو کے طے کیا۔ چونکہ قبائلیوں کے پاس کوئی گھوڑا وغیرہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے چارے بھینس ہی لے آئے تھے۔ بھینس لے آنے والے نے مجھے بتایا تھا کہ رات کو چیتے کے حملے کے ڈر سے بھاگ جانے والے جانور بستی میں واپس آنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ بھینس بھی ان میں سے ایک تھی۔

میں اس علاقے کی اکلوتی ڈسپنسری پہنچا جہاں موجود ادھیڑ عمر انگریز ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے میری مرہم پٹی کی اور میں چار پانچ دن کے بعد کسی سہارے کے بغیر چلنے کے قابل ہو گیا کیونکہ صرف گوشت میں دانت گڑے تھے، ہڈی بالکل محفوظ تھی۔ جس دن میں اپنے بنگلے میں واپس آیا، اس دن اتنی بارش ہوئی کہ ہر جانب جل تھل ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت کو ان معصوم قبائلیوں پر ترس آ گیا ہے۔

چیتے کے ساتھ دو بدو لڑائی کے واقعے نے پورے جنگل میں بے انتہا شہرت پائی تھی۔ ایک دن جب ایک بھیل شکاری نے مجھے اس چیتے کی کھال اور سر دکھایا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ چیتے کے بائیں جبڑے سے ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔ دیکھ کر مجھے اپنا وہ انتہائی جوش میں مارا ہوا مکا یاد آ گیا جس کے لگنے سے درندے کے منہ میں پھنسا ہوا میرا ہاتھ آزاد ہو گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا مکا اتنا زوردار ثابت ہوا تھا کہ چیتے جیسے طاقتور جانور کا دانت جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ میں نے اس چیتے کی کھال کو کیمیکلز لگوا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

میرے ہاتھوں چیتے کی ہلاکت اور اس سے میری لڑائی والے واقعے کے بعد بھیلوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ چیتے کو "موت کا دیوتا" سمجھنے کا ان کا تصور پاش پاش ہو گیا تھا لیکن خرابی یہ پیدا ہو گئی کہ انہوں نے مجھے کوئی آکاش سے اتری ہوئی ہستی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن ایک اجنبی بھیل نوجوان میرے پاس آیا۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے اپنے قبائلی انداز میں میری تعریف میں کچھ کلمات پڑھے جنہیں ہم تعریفی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔

بعد میں وہ بول قبائلیوں میں اتنے مقبول ہوئے کہ وہ مشہور ترین لوک گیت بن گیا۔ بھیلوں کے یہ لوک گیت ان کی وھارک دعائیں تھیں، اور بھی کئی مذہبی گیتوں اور اپنی طرف سے گھڑے ہوئے قصوں میں میرا ذکر شامل کر کے بھیلوں نے واقعی مجھے اپنا بھگوان ہی بنا دیا تھا۔ چیتے کے شکار کے بعد تمام بھیلوں نے مجھے "مسعود بھگوان" کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پوجنے کی حد تک میرا احترام کرنے لگے تھے۔

کسی ہندی یا مراٹھی اخبار کو کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ بھیلوں کے لیے میری جدوجہد کی کوئی چھوٹی بات ہی چھاپ دے۔ لیکن انگریزی پریس نے میرے کاموں کو کافی کوریج دی۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز انگریزوں اور دیگر عام لوگوں نے میرے بارے میں آرٹیکل لکھے۔ انہی دنوں کچھ انگریز صحافیوں نے خاندیش کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے بھیلوں سے بات چیت کی اور ان کے لوک گیت سنے۔ تب انہیں بھیلوں کے لیے کیے گئے میرے کام کا زبردست احساس ہوا۔ انہوں نے واپس جا کر اس دورے کی دلچسپ رپورٹنگ کی اور "ایک آئی سی ایس افسر کا حیرت انگیز کارنامہ" کے عنوان سے آرٹیکل لکھا۔ یہ مضمون مشہور ہفت روزہ انگریزی رسالے "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کے 11 ستمبر 1945ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

اس تحریر کا ایک مختصر اقتباس:

"یہ اسی معاشی اور اقتصادی کارنامے کی تفصیل ہے جس نے کچلی ہوئی اور احساس کمتری کی ماری ہوئی بھیل قوم کو ایک پروقار اور خود اعتماد قوم میں تبدیل کر دیا ہے۔ بھیل آج اپنی ثقافت اور روایات پر ہرگز شرمندہ دکھائی نہیں دیتے۔ اب ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ جس ہستی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے، انہیں بھیل "مسعود بھگوان" اور "مسعود مہاراج" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آئی سی ایس افسر ہیں اور ان کا نام محمد مسعود ہے۔ آج ان کا نام تین لاکھ بھیلوں کے گھروں میں گونج رہا ہے اور وہ ان کے دلوں میں اس طرح بس گئے ہیں کہ کئی قبائلی گیتوں اور کہانیوں میں یہ نام عام پایا جاتا ہے۔"

میرے لیے وہ دن بڑے یادگار ہیں جو میں نے بھیلوں کے درمیان گزارے۔ میں نے بھیلوں کی بھلائی کے لیے جتنی محنت کی، انہوں نے اس سے بڑھ کر مجھے عزت دی۔ آج سے چند برس قبل میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد مجھے ڈھولیا خاندیش میں گزارے ہوئے دن یاد آ گئے۔ اس وقت میں نے ان سادہ لوح بھیلوں کو بہت مس کیا۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ میں لندن گیا ہوا تھا۔ وہاں ایشیائی لوگوں کے ایک فنکشن میں میری ملاقات بمبئی کے ایک پارسی

www.paksociety.com

بزنس مین سے ہوئی۔ تقریب کے اختتام پر رخصت ہونے کے وقت میری نگاہ اس پارسی سیٹھ کے شوفر پر پڑی اور میں چونک گیا۔ اس کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اس سے دریافت کرنے کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس ڈرائیور کا تعلق بھیل قوم سے تھا۔ میں نے صاحب کو بھول بھال کر ان کے ڈرائیور کے ساتھ کھل کے گپ شپ کی لیکن وہ بے چارہ جھجکتا رہا۔

رخصت ہونے کے وقت میں نے پارسی بزنس مین سے ان کا ایڈریس لے لیا۔ پھر اس کے تیسرے ہی دن میں ان کے گھر جا پہنچا۔ میرا اصل مقصد اس بھیل ڈرائیور کے ساتھ بات چیت کرنا تھا۔ میں سیدھا اس کے کوارٹر میں چلا گیا۔ وہ بھیل نوجوان مجھے بالکل نہیں جانتا تھا لیکن باتوں کے دوران مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کے پاس بھیل زبان میں لکھی ہوئی کچھ کتابیں موجود ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔

میں اس سے پوچھے بغیر ہی اُٹھ کر کمرے میں موجود الماری میں رکھی کتابوں کو دیکھنے لگا۔ جب میں نے قدیم بھیل قبائلی دھارمک اور لوک گیتوں کی ایک کتاب کھولی تو اپنے سامنے لکھی نظم کا سرنامہ دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔ نظم کا عنوان تھا:

''بھگوان شکاری!''

مجھے ماضی کے واقعات خواب کی طرح یاد آنے لگے۔ یہ وہی نظم تھی جو ایک بھیل قبائلی نے مجھے اس وقت سنائی تھی جب میں چیتے کو ہلاک کرتے ہوئے شدید زخمی ہوگیا تھا۔ وہ بھیل شوفر میرا جوش وجذبہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اصل بات بتانے کی بجائے کہا۔

''مجھے بھیل زبان کی حرف حرف پہچان ہے۔ تم اس نظم کا آسان زبان میں ترجمہ کردو۔''

اس نے جو ترجمہ کیا، اس کا اردو روپ اس طرح ہے۔

''ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا سرخ لہو
ہماری ہڈیوں پر منڈھا ہوا کالا ماس
یہ سب ''موت کے دیوتا'' کو مرغوب تھا
وہ آسمانی بجلی کی طرح ہمیں آ دبوچتا
پھر لہو میں لت پت جسم لرز کر سرد ہوجاتا
ہمارے ڈھور ڈنگر اس کا شکار بنتے
وہ تو ہمارے کھانے والا ماس بھی کھا جاتا
اب دھرتی پہ اُترا ہے اک ''بھگوان شکاری''
وہ تو ''موت کے دیوتا'' کو بھی مار دیتا ہے۔''

میں نے بھیل نوجوان سے پوچھا ''یہ بھگوان شکاری کون تھا؟''

وہ ایکدم سنجیدہ ہوگیا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا ''مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں ہے۔ میں نے یہ گیت اپنے باپ سے سنا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہمارے قبیلے میں ایک بھگوان، انسانی روپ میں آیا تھا۔ وہ بھیلوں کی رکھشا کے لیے ہمیشہ جنگلی درندوں کا شکار کرتا رہتا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے اس مقدس گیت میں اپنے بھگوان کی مدح سرائی کی ہے۔ آپ اسے مذاق نہ سمجھنا..... یہ ہمارا بڑا قیمتی ورثہ ہے۔''

اس نے میرے ہاتھ سے کتاب لی اور بڑے احترام کے ساتھ الماری کے سب سے بالائی خانے میں رکھ دی۔

میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنس پڑا اور اس سے رخصت ہونے سے پہلے صرف اتنا کہا۔

''واقعی تمہارے بھگوان کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔''

☆☆☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں زخمی چیتے کا شکار کرتے ہوئے خود بھی شدید زخمی ہوگیا تھا۔ مگر چند ہی دنوں کے بعد میرے زخم بھر گئے تھے۔ بائیں ہاتھ کے چیتے کے منہ میں کچلے جانے کے نشانات کے کھرنڈ بھی مدھم پڑ گئے تھے۔ اس خونی لڑائی میں میرا ہاتھ تو بچ گیا تھا لیکن اس کے زخموں کے نشان ہمیشہ کے لیے میری بہادری کے تمغے کی طرح موجود ہے۔

میں ان ایام میں اپنے آپ کو بھول کر بھیلوں میں بیداری پیدا کرنے میں مصروف عمل رہا۔ ان کی تعلیم وتربیت کا میرا مشن اپنے عروج پر تھا۔ دوسری جانب میرے خلاف ہونے والی برہمنوں اور مارواڑیوں کی سازشیں بھی انتہا کو پہنچی تھیں۔ آخرکار ان کی محنت رنگ لائی اور اب سرکار بھی مجھ پر شک کرنا شروع کردیا تھا۔ اس بات کا واضح ثبوت ملا جب رام رائے نامی ایک شخص کو میری نگرانی کے لیے ڈھولیا بھیج دیا گیا۔ رام رائے اپنے ساتھ ایک بل ٹیریئر لے کر اس جنگلی قصبے میں وارد ہوا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد ایک شوقیہ شکاری کی طرح چھوٹا موٹا شکار کرتا نظر آتا تھا مجھے کچھ ہمدردوں کی جانب سے اشارہ مل چکا تھا سرکاری کارندہ ہے اور اسے میری نگرانی پر مامور کر کے بھیجا گیا ہے لہٰذا مجھے اس سے ہوشیار رہنا چاہیے لیکن جان کر خوشی ہوئی تھی کیونکہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ گورنمنٹ مفاد پرستوں کی افواہوں پر توجہ دینے کے بجائے یہاں اصل صورتِ حال کو جان سکے۔

اس خیال کے تحت میں نے رام رائے کو کھل کر اپنے قریب آنے کا موقع دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کام دیکھنے کا موقع بھی فراہم کیا جو میں نے بھیلوں کی فلاح کے لیے کیے تھے۔ تاکہ وہ میرے پُرخلوص مشن کے بارے میں جان سکے اور ان مقاصد کے خلاف ہونے والی سازشوں کا ادراک کرسکے۔

رام رائے پنجاب کے اس علاقے سے تعلق رکھتا تھا جو اب ہریانہ صوبے میں شامل ہے۔ اس کی مادری زبان ہریانوی تھی۔ وہ بہت باتونی شخص تھا۔ ہر وقت اس کی زبان چلتی رہتی تھی۔ اس لیے مجھے پہلے ہی دن اس کی باتوں سے معلوم ہوگیا کہ وہ شکار کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔ وہ ڈرپوک اور کسی قدر احمق آدمی تھا۔ کسی کی جاسوسی کرنے کے لیے ایسے شخص کو مامور کرنا، مجھے تو بڑی عجیب بات معلوم ہوئی تھی لیکن اس کا کتا واقعی ظالم شے تھی۔

مجھے اس کی یہ بات بہت بُری لگتی تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑانا فرض سمجھتا تھا اور فضول باتیں کر کے سامنے والے کو زچ کردیتا تھا۔ ایک دن شکار کی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''منے بی بوت جناور مارے ایں۔ مارا پورا کنبہ سکاری اے۔''

میں پچھلے کئی دنوں سے اس کی ڈینگیں سن رہا تھا۔ اس لیے میں نے فوراً کہا ''اچھا بھئی، کل ہم گھنے جنگل میں چلیں گے اور تمہیں کھلی چھوٹ ہوگی شکار کرنے کی۔ اس طرح جنگل کی سیر بھی ہوجائے گی اور تمہاری بہادری کا بھی پتا چل جائے گا۔''

یہ سن کر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا لیکن جب میں نے اس کی باتیں یاد دلائیں تو اس کے راجپوتی خون میں جوش آگیا اور وہ گھنے جنگل میں چلنے اور شکار کھیلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

☆☆☆

اگلے دن دس بجے ہم گھنے جنگل کی طرف چل دیے۔ چونکہ میرے ذہن میں کوئی بڑا شکار کرنے کا پروگرام نہیں تھا اس لیے میں نے کسی بھیل شکاری یا اپنے ملازم کو ساتھ لے جانا ضروری نہ سمجھا۔ اس دن میرے پاس کسی برطانوی رائفل کی نقل تھی جو درے کی بنی ہوئی تھی۔ میں دیسی مال استعمال کرنے کی چاہ میں اپنے ملک کی تیار کی ہوئی گن کی کارکردگی دیکھنا چاہتا تھا۔

رام رائے کے پاس بارہ بور کی عام بندوق تھی۔ وہ اپنے بل ٹیریئر کتے کے ساتھ شکار کی مکمل تیاری کر کے نکلا تھا لیکن اس نے پورے دن سخت ضرورت کے وقت بھی اپنی بندوق کو استعمال کرنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ میرے اندازے سے زیادہ بزدل اور ناتجربہ کار ثابت ہوا۔ اتفاق کی بات یہ کہ کئی گھنٹے تک جنگل میں خجل خوار ہونے کے باوجود میں بھی کوئی جانور شکار نہیں کرسکا تھا۔ کئی بار میں نے ہرنوں کی ڈار پر گولی چلائی لیکن پتا نہیں کیوں کوئی جانور نہ گرا۔ میری اس ناکامی کا ایک سبب رام رائے کا کتا بھی تھا۔ ویسے تو وہ بڑی اچھی نسل کا جانور تھا لیکن شاید وہ بھی اپنے مالک کی طرح پہلی مرتبہ جنگلی جانوروں سے بھرے ہوئے گھنے جنگل میں داخل ہوا تھا۔ اس لیے جب وہ کسی جانور کو دیکھتا تو ایکدم اس کے پیچھے لپک کر دوڑ لگاتا اور اسے میرے نشانے سے دور پہنچا کر ہی واپس آتا۔ رام رائے کی ناتجربہ کاری کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے کتے کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی زنجیر یا رسی ساتھ نہیں لایا تھا۔ اگر ہم گھوڑوں پر سوار ہوتے تو شاید ہمیں کتے کی مدد سے شکار کرنے میں آسانی ہوتی لیکن اب تو اس کی وجہ سے سامنے نظر آنے والے جانور بھی ہمارے نشانے کی زد پر نہیں آرہے تھے۔

جب مجھ سے کوئی جانور شکار نہ ہوسکا تو رام رائے کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔

''ام تو دوئیں اک ای طراں کے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا ''نا تمے سکار کرن آتا، نا منے گولی چلانا آتی اے۔''

مجھے اس کی یہ باتیں زہر لگ رہی تھیں لیکن اتفاق یہ کہ لاکھ کوشش کے باوجود میں کوئی ایک جانور بھی نہ گرا پایا تھا۔ رام رائے بھی میری طرح چل چل کر بُری طرح تھک چکا تھا۔ اس لیے ایک جگہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹھہر گیا اور بولا۔

''اب تو پیچھے مڑ جانا چاہیے...... منے تو بھوکھ لگ رئی اے۔''

لیکن میں کچھ نہ کچھ شکار ضرور کرنا چاہتا تھا اس لیے میں اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتا رہا۔ اس وقت ہم چھوٹی بڑی پہاڑی چٹانوں اور ٹیلوں ٹبوں کے علاقے میں چل رہے تھے۔ دوپہر کا وقت ہوچکا تھا۔ ہم ایک چھوٹا سا گھنا درخت دیکھ کر اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ سخت دھوپ اور گرمی میں خجل خوار ہونے کے سبب ہمیں بہت بھوک اور پیاس لگی تھی۔ اس لیے ہم نے اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں نکالیں اور کھانے پینے بیٹھ گئے۔ رام رائے نے اپنے کتے کو بھی لنچ کرایا۔ دراصل کتا کھلے ڈھلے جنگل میں آکر بہت انجوائے کررہا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود وہ تھکا نہیں تھا۔

www.paksociety.com

’’اس زمانے میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں بالکل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔‘‘ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔‘‘ جب میں بولتی تو سب چڑاتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے بھی میری ناسمجھی سے فائدہ اُٹھایا۔ وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہوشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں پھٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خودسر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہوگئی۔ وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہوجاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا، ہاتھ پیر اینٹھتے، ان کی بیوی بچی ان کی چھاتی سینکا کرتیں اور وہ مجھے پڑھایا کرتے، انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑگیا۔ دو گھنٹے ہوگئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

’’ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ اتنا تو کھانستے ہیں۔‘‘ میں نے جل کر کہا۔

’’بے وقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھانس رہے ہیں؟‘‘ انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھانسیں گے۔

پتا نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دلچسپی ہوگئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلالیا، چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔ اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کردیا۔ حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سب میرے ہی اوپر بیت رہی ہے اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئن تصور کرکے نہایت چیٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

عصمت چغتائی کی خودنوشت سے اقتباس

مرسلہ: راحیلہ تنویر، حیات آباد

کھانے کے بعد غنودگی نے آلیا۔ تھکاوٹ تو پہلے ہی تھی، خمار گندم نے ہمیں بالکل ست کردیا۔ رام رائے کا حال بہت خراب تھا۔ وہ درخت کے سائے میں سبز گھاس پر لیٹ گیا اور میرے ٹوکنے کے باوجود آنکھوں پر بازو رکھ کر ایسے بے پروائی سے سوگیا جیسے وہ کسی خطرناک جنگل میں نہیں بلکہ اپنے بیڈروم میں ہو۔

میں نے اپنی رائفل درخت کے تنے کے ساتھ رکھ دی اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے درخت پر بالکل توجہ نہ دی جہاں شہد کی مکھیاں چکرا رہی تھیں۔ دراصل درخت کی ایک بلند شاخ پر بڑی مکھیوں کا چھتا موجود تھا جس پر میری نظر نہیں پڑسکی تھی۔

مجھے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھ آگئی۔ جاگتے رہنے کی کوشش میں سونے سے پہلے میں نے دیکھا تھا کہ کتا ہمارے اردگرد پودوں میں اِدھر اُدھر چکرا رہا تھا۔

کسی درندے کی سانسوں کی تیز آوازوں اور کتے کی دہشت ناک غراہٹ سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوفناک موٹا تازہ کالا ریچھ ہماری طرف بڑھنے کی کوشش کررہا ہے اور وفادار کتا اپنے سے بیس گنا بڑے اس درندے کا راستہ بڑی بہادری سے روکے ہوئے ہے۔ مجھے اس منظر نے اتنا مبہوت کردیا کہ میں اسی طرح بیٹھا دو جانوروں کی لڑائی دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ ریچھ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو کتے نے سخت آواز نکالتے ہوئے اس کی گردن میں دانت گاڑ دیے لیکن ریچھ کے لمبے بالوں کے علاوہ اس کے جبڑے میں کچھ نہ آیا۔

کتے کی زبردست غراہٹ سن کے بے ہوشی کی نیند سویا ہوا رام رائے بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور جنگی جنگ وجدل کا میدان گرم دیکھ کے اپنی بندوق کو بھی چھوڑ کر چیختا ہوا ایک طرف دوڑ گیا۔ ریچھ نے تیزی سے بھاگتے ہوئے رام رائے کی جانب رُخ کیا لیکن کتے نے پیچھے سے اس کے پیر میں اپنے دانت گاڑ کر اسے بریک لگانے پر مجبور کردیا۔

یکایک ریچھ غضبناک ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر اپنے خنجروں جیسے پنجوں سے کتے پر وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے چارہ ’’کوں کوں‘‘ کرتا ہوا دور جا گرا اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ کتے نے زخمی ہونے کے باوجود ریچھ کی جان نہ چھوڑی۔ وہ جب درخت کی جانب بڑھنے لگتا، کتا پیچھے سے اس پر حملہ کردیتا۔ پھر ریچھ اس کے پیچھے دوڑ پڑتا اور کتا پھرتی سے جھاڑیوں کے عقب میں چلا جاتا۔ یہ سارا خون خرابا چند سیکنڈ میں ہوگیا تھا۔ مجھے اب بھی وہ منظر میلوں ٹھیلوں میں ہونے والے ریچھ، کتے کی لڑائی جیسا ڈراما لگ رہا تھا لیکن ایکدم مجھے احساس ہوا کہ میری اپنی جان بھی سخت خطرے میں ہے۔ میں نے اُٹھ کر اپنی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت نہ جانے کس طرح ریچھ کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ پلٹ کر بجلی کی تیزی سے مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اگر میں جلدی سے چھلانگ مار کر ایک طرف نہ ہوجاتا یا کتا لپک کر اس کے وجود سے نہ لپٹ جاتا تو شاید وہ اپنے لمبے ناخنوں سے مجھے چیر پھاڑ کے رکھ دیتا۔

اس کے باوجود عین آخری لمحے میں ریچھ کا ہاتھ میری رائفل سے ٹکرایا اور وہ اُڑ کر دور جا گری۔ اس مرتبہ کتا، ریچھ کے وجود میں کہیں دانت گاڑنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس لیے اب ریچھ کی بلند غراہٹیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں

کتا اس کی پشت پر سوار تھا اور ریچھ کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اچانک ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا اور انتہائی عجیب انداز میں اُچھلتے ہوئے خود سے لپٹی ہوئی بلا سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے پنجے بھی چلا رہا تھا۔ اب ریچھ پوری طرح کتے کی جانب متوجہ تھا۔ اس لیے میں نے ہمت کرکے دوڑ لگائی اور اس کے قریب پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر قریب موجود ایک بڑے سے درخت کے خشک تنے کے پاس پہنچا اور جلدی جلدی اسے لوڈ کرنے لگا لیکن ریچھ کے حملے کے دوران دور جا گرنے کی وجہ سے اس دیسی ہتھیار کے میکنزم میں کوئی خرابی پیدا ہوچکی تھی۔ اس لیے کوشش کے باوجود اس کے چیمبر میں گولی نہ چڑھ سکی۔ یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی تھی۔ نہ اب رائفل کی موجودگی کے باوجود میں ریچھ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

دوسری جانب ریچھ نے کتے سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بڑا عجیب طریقہ اپنایا۔ وہ زمین پر لوٹیں لگانے لگا۔ کتا اس کے بھاری وجود کے نیچے آکر چیخنے لگا اور اس کے منہ سے ریچھ کی کھال چھوٹ گئی۔ اچانک ریچھ اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا اور اپنے نیچے سے نکلتے ہوئے کتے کے وجود کو تیز قاتل پنجوں کی گرفت میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے ناخنوں سے کتے کے انجر پنجر کھول دیے۔

کتے کی آنتیں ریچھ کے پنجوں میں دھاگوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ وہ پھرتیلا جانور سیکنڈوں میں اُدھڑ کر بوٹی بوٹی ہوگیا تھا۔ کتے کے خون میں لتھڑ کر ریچھ مزید دہشت ناک دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آخری بار رائفل کو لوڈ کرنے کی کوشش کی۔ جب اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو ریچھ کو اپنے قریب آنے کا موقع دینے سے پہلے میں نے ایک ہاتھ میں رائفل تھامی اور دوڑ لگادی۔ آخرکار میں گرتا پڑتا ایک چٹان کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ چٹان کہیں بالکل عمودی اور کہیں ڈھلوان تھی۔ میں اس کے پتھریلے ابھاروں کو پکڑ کر کوئی بیس فٹ اوپر تک چلا گیا۔ اس سے مزید اوپر جانے کی کوئی راہ نہ تھی۔

جب میں نے نیچے کی طرف دیکھا تو ریچھ اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا انتہائی غصے کی حالت میں میری طرف دیکھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہی تھی اور وہ وحشیانہ انداز میں چٹان پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

ریچھ مزاجاً بہت لڑاکا ہوتا ہے۔ وہ کبھی انسانی گوشت نہیں کھاتا۔ لیکن عام حالات میں بھی اسے محض شغل میں انسان کو مارنے میں لطف آتا ہے۔ اگر کوئی بندہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریچھ کے سامنے آجائے تو وہ پہلوانوں کی طرح جھکائیاں دیتا ہوا اس سے کھیلتا ہے اور پھر اپنے طاقتور بازوؤں میں بھینچ کر انسان کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔

انسان کا خالی ہاتھ ریچھ کا مقابلہ کرنا اس لیے بھی خطرناک ہوتا ہے کہ اس کے خنجروں جیسے ناخن بلا تاخیر بندے کا پیٹ چاک کردیتے ہیں۔ ریچھ موٹا تازہ ہونے کے باوجود تیز دوڑ سکتا ہے۔ وہ کھلے میدان میں تیز دوڑنے والے انسان کو بھی قابو میں کرلیتا ہے۔ جو ریچھ میرے پیچھے پڑگیا تھا، وہ کتے سے زخمی ہوکر پاگل پن کی حد تک غضبناک ہوگیا تھا۔ اگر چٹان قریب نہ ہوتی تو وہ اب تک میرا بھی کام تمام کرچکا ہوتا۔

میں جدوجہد کرکے مزید چند فٹ بلندی پر جاکر چٹان

کے قدرے مسطح حصے پر قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے نیچے نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ریچھ اُبھرے ہوئے پتھروں پر قدم جماتا ہوا کافی اوپر آ گیا تھا۔ وہ بار بار سر اُٹھا کر میری طرف اس طرح دیکھنے لگتا جیسے جلد سے جلد مجھے قابو کر لینا چاہتا ہو۔ میں اس کی جنونی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ موت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پھر کوشش کی لیکن چیمبر میں نہ جانے کیسی خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ گولی اس میں آگے جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اب مجھے قریب آتے ہوئے ریچھ کی غرّاہٹیں اور تیز تیز سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریچھ مجھ تک پہنچنے ہی والا تھا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور مجھے اس رائفل پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا جو عین وقت پر دھوکا دے گئی تھی۔ میں نے اسی غصے کی حالت میں اس پر ہاتھ مارا...... اور کڑک کی آواز کے ساتھ گولی چیمبر میں بیٹھ گئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اب ریچھ مجھ سے صرف پانچ چھ فٹ نیچے رہ گیا تھا۔ اگلے پانچ دس سیکنڈوں کے دوران وہ مجھ تک پہنچ جاتا۔

اس کا منہ اوپر کی جانب اُٹھا ہوا تھا۔ اس کے لمبے سفید دانت مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ رائفل لوڈ کر کے میں بھی انتہائی جوش میں آ گیا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور دانت پیستے ہوئے ریچھ کو للکارا۔

"آج تیری خیر نہیں کالیا......!"

اس مرتبہ ریچھ نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا تو میں نے فوراً ٹریگر دبا دیا۔ گولی لگتے ہی وہ خوفناک چیخ کے ساتھ مٹی کے پتلے کی طرح زمین پر جا گرا۔ اس کی جان نکل چکی تھی۔ اسے گولی اس قدر قریب سے لگی تھی کہ وہ اس کا جبڑا پھاڑتی ہوئی دماغ سے گزر گئی تھی اس لیے اب مزید اس پر گولی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں بے خوف ہو کر فوراً ٹیلے سے نیچے اُتر آیا اور ریچھ کا قریب سے جائزہ لیا۔ وہ خاصی عمر کا ریچھ تھا اور جنگلی خوراک کھا کر موٹا تازہ ہو رہا تھا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر شاید رام رائے کو بھی یقین آ گیا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس لیے جب چٹان سے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آئی تو میں نے اوپر کی جانب دیکھا، وہ بلندی پر کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے دومنٹ پہلے ہی ریچھ پر فائر کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں چھپا ہوا تھا۔ اب وہ پتھریلی دیوار کو تھامے سارس کی طرح گردن لمبی کر کے ریچھ کی لاش دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس جانب سے چٹان چھجے کی طرح آگے نکلی ہوئی تھی اور اسے ریچھ کی لاش نظر نہیں آ رہی تھی۔

مجھے اس کی بزدلی پر ہنسی آ گئی تھی۔

"اب تو نیچے آ جاؤ مہاراج!" میں نے کہا "مردار ریچھ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

اس نے بڑے غیر یقینی انداز میں قدم آگے بڑھایا اور جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ شاید اس کا پیر کسی پتھر پر غیر متوازن انداز میں پڑا تھا۔ پہلے چند پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آئے اور پھر وہ خود "ہو......" کی ڈراؤنی آواز نکالتا، رگڑ اور قلابازیاں کھاتا ہوا سیدھا ریچھ کی گود میں آ گرا۔ اس نے چیخ چیخ کے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہنس ہنس کے میرا بُرا حال ہو گیا۔ اسے بھی جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ ریچھ سے گلے مل کر بھی زندہ سلامت ہے۔ اس خیال نے اسے کافی حوصلہ اور اعتماد عطا کیا اور وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"سر! یہ تو بڑا منحوس جنگل اے۔ یاں سے نکل چلیں۔"

میں رام رائے کے ساتھ اس درخت کے پاس آیا جہاں ہم نے آرام کیا تھا۔ وہاں اس کی بارہ بور گن بھی پڑی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس درخت پر نظر ڈالی تو وہاں مجھے شہد کا چھتا نظر آیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے پہلے اوپر کیوں نہیں دیکھا تھا۔ اگر میں پہلے ہی شہد کے اس چھتے کو دیکھ لیتا تو کبھی اس پیڑ کے نیچے اس طرح بے خبر ہو کر نہ سوتا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ کئی جنگلی جانور شہد کو بہت پسند کرتے ہیں اور وہ مکھیوں کے اُڑنے کی پروا کیے بغیر پورا چھتا چٹ کر جاتے ہیں۔ خاص طور پر ریچھ تو میٹھے کا عاشق ہوتا ہے۔ وہ میلوں دور سے شہد کی بو سونگھتا ہوا اصل جگہ پر جا پہنچتا ہے۔ یہ ریچھ بھی، جو بار بار درخت کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا...... اس کا مطلب ہمیں نقصان پہنچانا نہیں بلکہ شہد حاصل کرنا تھا۔ مگر کتے کی چوکیداری کے سبب یہ خوفناک خونی فساد برپا ہو گیا تھا۔

واپسی کا سفر خاصا طویل تھا۔ اس لیے ہم گپیں ہانکتے ہوئے چلتے رہے۔ رام رائے خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔ وہ ایسی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اسے اپنے وفادار کتے کی دردناک موت کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ ریچھ کے حملے کے موقعے پر دکھانے والی اپنی بے مثال بزدلی کو اپنی باتوں سے بھلانا چاہتا تھا۔ اس نے نان اسٹاپ گپیں ہانکنا

شروع کر دیں۔ اس کا موضوع ریچھ اور ریچھنی تھا۔ پہلے تو اس نے ریچھ کی نفسیات پر روشنی ڈالی اور پھر اس کے اور ریچھنی کے "تعلقات" پر سیر حاصل گفتگو کی۔ وہ جھوٹے اور من گھڑت قصے سنا کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ریچھ اور ریچھنی ہمیشاں کٹھے رویں۔ جے کوئی ان میں سے کسے کو مار دے تو دوسرا اس کا بدلہ جرور لیوے۔" اس نے کہا "ریچھنی اپنے ریچھ کا بدلہ لین کے واسطے سکاری کے گھار تک پونچ جائے۔ جے سکاری اپنے گھار کا دروجہ بند کر دے تو وہ چھات (چھت) پھاڑ کے سکاری کو جان سے مار دوے۔"

میں نے چونکہ ریچھ کو مارا تھا۔ اس لیے میں رام رائے کی ان باتوں کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اس کی حرکتوں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہارے پاس کہنے کو کوئی دوسری بات نہیں ہے؟ تم بار بار ریچھنی کے انتقام کی بات کر کے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

اس نے میری اس بات کو اپنی کامیابی تصور کیا اور قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔ پھر وہ قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے لگا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔

اس وقت تک دن ڈھل چکا تھا اور جنگل میں دھندلا سا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے ترشی سے کہا کہ وہ ریچھنیوں کے بارے میں اپنی بک بک بند کرے اور مکمل تاریکی چھانے سے پہلے گھر پہنچنے کی ہمت کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی۔ میری اس بات سے رام رائے نے یہ اندازہ لگایا کہ میں اس کی باتوں سے ڈر گیا ہوں اور اب جلدی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔ اب وہ کم بخت خاموش ہونے کے بجائے مزید جوش کے ساتھ ریچھنیوں کے ظالمانہ انتقام کے قصے سناتا رہا۔

اس وقت ہم ایک ٹیڑھی میڑھی تنگ سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں بڑے گھنے درخت تھے اور ان کے نیچے بے شمار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ملگجا سا اندھیرا پھیل چکا تھا جس کے سبب دور کی چیزیں صاف طور پر نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے ایسے میں کچھ فاصلے پر کالے رنگ کی کوئی چیز سائے کی طرح پگڈنڈی سے گزرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا لیکن رام رائے گردن جھکائے اپنی دھن میں ریچھنیوں کے بدلہ لینے کی سنسنی خیز داستان سناتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

اچانک سیاہ رنگ کی ایک ریچھنی جنگل سے نکل کر واقعی پگڈنڈی پر ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ میرے وجود میں خوف کی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ رام رائے کی گپیں سچ ثابت ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں لیکن وہ اب بھی اس سے بے خبر اپنی رو میں زبان چلاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے سر اُٹھایا تو سامنے موجود عفریت کو دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی۔

"ب...... بچاؤ رے......" وہ ایکدم پلٹ کر میری طرف دوڑا اور مجھ سے بُری طرح لپٹ گیا۔ انتہائی خوف زدہ ہونے کے سبب اس کے منہ سے عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے اُچھلنے کودنے اور شور مچانے سے ریچھنی پوری طرح ہماری جانب متوجہ ہو گئی۔ پہلے تو وہ دور کھڑی اپنی تھوتھنی اُٹھائے "شروں شروں" کرتی ہوا سونگھتی رہی پھر اس نے دھیرے دھیرے ہماری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ رام رائے نے سختی سے مجھے بھینچی ڈالی ہوئی تھی اور وہ بار بار گردن موڑ کے ریچھنی کو دیکھ رہا تھا۔ جب ریچھنی نے ہماری طرف

دنیا کا پہلا ڈراما نگار

ایسکلیز یونان کے [illegible] میں 429 قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنا پہلا ڈراما مقابلے کی خاطر لکھا تھا۔ 484 قبل مسیح میں اسے اپنے ایک ڈرامے "ایرانیان" پر انعام ملا تھا۔ 468 قبل مسیح میں المیہ نگاروں کے مقابلوں میں اسے خود سے چھوٹے ہم عصر سوفوکلیز نے شکست دی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اسی پر دلبرداشتہ ہو کر اس نے یونان کو خیر باد کہہ دیا تھا اور سائی راکوز کے بادشاہ ہائی رون کے دربار میں چلا گیا تھا۔ اس کی موت 452 قبل مسیح میں گیلا نامی قصبے میں ہوئی۔ مشہور ہے کہ ایک چیل نے اس کے گنجے سر کو پتھر سمجھا اور اس پر ایک کچھوا گرا دیا تھا تاکہ کچھوے کی اوپری سطح ٹوٹ جائے اور یوں انسٹھ سال کی عمر میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

مرسلہ: شاہ وار کاکاخیل، پشاور

www.Paksociety.com

بڑھنا شروع کیا تو وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھا اور رونے جیسی آواز میں ریچھنی کی منتیں کرنے لگا۔

”اری منے تیرا ریچھ نہیں مارا...... منے تو کچ بی نہیں کرا......اے میرے بھگوان، منے بچالے......“

رام رائے کے چمٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے میں بھی ٹھیک طرح سے اپنی رائفل استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے میں نے زور کا دھکا دے کر اسے خود سے الگ کیا اور عجلت میں کاندھے سے لٹکی رائفل اُتار کے اسے لوڈ کرنے لگا۔ اس مرتبہ رائفل نے پوری طرح میرا ساتھ دیا۔ میں فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ریچھنی ہماری اُلٹی سیدھی حرکتیں دیکھ کر غصے میں آگئی تھی اور اپنے پچھلے پیروں پر کھڑی ہوگئی۔ اب اس نے غراتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کردیا تھا۔

ریچھنی کو اپنے انتہائی قریب دیکھ کر رام رائے خوف سے بالکل پاگل ہوگیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں وہاں سے بھاگ جانے کی بجائے اُچھل کر میری پشت پر سوار ہوگیا۔ میں اس کی ایسی بے ہودہ حرکت کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس لیے ناگہانی جھٹکے سے رائفل میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس بے وقوف نے یہ بھی نہ دیکھا کہ میں نے ریچھنی کو اپنے نشانے پر لے لیا ہے اور اب وہ میری گولی سے کسی طرح بھی نہیں بچ سکتی۔

ریچھنی ہمارے سر پر پہنچ چکی تھی اور حملہ کرنے سے پہلے اپنے سامنے دو جڑے ہوئے لوگوں کی کشمکش کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رام رائے اپنی احمقانہ حرکتوں کی وجہ سے اپنے ساتھ مجھے بھی موت کے منہ میں لے گیا تھا۔

میں نے ہمت کرکے پوری قوت سے رام رائے کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بدبخت کسی آکٹوپس کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ یکایک مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر زور کا جھٹکا دیا اور اس طرح میں اپنی گردن اس کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے اپنے جسم کو بَل دے کر اسے دور جھٹک دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ریچھنی کے قدموں میں جا گرا۔ جھٹکا لگنے سے میں بھی پہلو کے بَل زمین پر گر گیا۔

ریچھنی اپنے قدموں میں گرے شکار پر جھکی۔ رام رائے کی آنکھیں دہشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ تیز ہل رہے تھے لیکن کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا وجود حرکت کرنے سے عاجز تھا لیکن اس کی کپکپاہٹ نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔

اس وقت ریچھنی پوری طرح رام رائے کی طرف متوجہ تھی۔ اس لیے مجھے زمین پر لیٹے لیٹے اپنی رائفل قبضے میں لینے اور اسے ریچھنی کی طرف سیدھا کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اسی حالت میں اس عفریت کا نشانہ لیا اور بلاتاخیر فائر کردیا۔ گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی ریچھنی کے پیٹ سے لہو کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ میری گولی اس کے پیٹ میں روشندان بنا گئی تھی۔

وہ اسی جگہ گھٹنوں کے بَل انسانوں کی طرح ڈھے گئی اور منہ اُٹھا کے چنگھاڑنے لگی۔ میں نے پھر نشانہ لیا اور اس کے سینے پر گولی داغ دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پیچھے کی طرف گر گئی۔ جوش میں آکر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور تیسری گولی چلادی جس کے لگتے ہی وہ ٹھنڈی ہوگئی۔

رام رائے اب بھی سکتے کی حالت میں فرشِ خاک پر لیٹا خلا میں گھور رہا تھا۔ جب میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بڑی نرمی کے ساتھ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اب مجھے اس پر بہت ترس آنے لگا تھا۔

”اب کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ریچھنی مرگئی ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد اس کا لرزتا وجود قدرے اعتدال پر آیا اور میری تسلی و تشفی سے وہ کافی حد تک سنبھل گیا۔ لیکن اب بھی اس کی رنگت پیلی پڑ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ریچھنی کی طرف دیکھا۔ جب میری بات سچ ثابت ہوئی تو اسے کافی حوصلہ ملا۔

میں نے آگے بڑھ کر ریچھنی کا جائزہ لیا۔ وہ بھی جھجکتا ہوا میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ اب اسے مکمل طور پر یقین ہوچکا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ یہ اس کی عجیب فطرت تھی کہ وہ جس قدر جلدی خوف زدہ ہوجاتا تھا، اتنی ہی جلدی سنبھل بھی جاتا تھا۔

ریچھنی کے حملے کے دوران رام رائے کی اُچھل کود سے میرا شکاری بیگ اور اس کی بندوق گر گئی تھی۔ میں یہ سامان سمیٹنے کے لیے پلٹا اور بیگ وغیرہ اُٹھاتے ہوئے میری سماعت سے رام رائے کی حیرت زدہ آواز ٹکرائی۔

”ہائے بھگوان......! یہ کیسی ریچھنی اے......“

میں نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے غور سے ریچھنی کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ہنس دیا۔

”اب کیا ہوا رام رائے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ایسی بدماس ریچھنی منے نہیں دیکھی۔“ وہ اسی حیرت سے بولا ”اس نے تو ”میل آرگن“ لگائے ہوئے ایں۔“

میں اس کی بے وقوفانہ باتیں سن کر ہنستا ہوا اس کے قریب گیا اور یہ دیکھ کر میں بھی چکرا گیا کہ رام رائے کی بات درست تھی۔ ایک لمحے کے لیے میری بھی مت ماری گئی تھی۔ میں بھی اسے ”مردانہ“ صفات رکھنے والی ریچھنی سمجھ بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرے ذہن میں اصل بات آگئی اور میں اپنی بے اختیار ہنسی پر قابو نہ پاسکا۔ میں جوں جوں اس معاملے پر سوچتا رہا، میری ہنسی بلند ہوتی چلی گئی۔

رام رائے اب بھی کبھی اپنی طرف سے سمجھی جانے والی ریچھنی کو اور کبھی میری جانب حیرت سے دیکھنے لگتا۔

”ارے بھولے ناتھ......! یہ ریچھنی نہیں ریچھ ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”تم نے ریچھنی کے انتقام کے قصے سنا کر مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کا اثر مجھ سے زیادہ خود تم پر پڑا۔ تم صاف نظر آنے والے ریچھ کو اب بھی ریچھنی سمجھ رہے ہو۔“

میری بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ سر پکڑ کر بولا ”ان جنگل کے جناوروں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ ان کا تو کوئی دین دھرم ای نہیں اے۔“

دراصل رام رائے نے واپسی کے دوران ریچھنی کے انتقام کی ایسی خوفناک اور پراثر کہانیاں سنائی تھیں کہ میرے ذہن میں ریچھنی کا ایک تصور بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے میں سامنے آنے والے اچھے بھلے ریچھ کو بھی ریچھنی سمجھ بیٹھا تھا۔ رام رائے خود مجھ سے زیادہ اپنی داستان گوئی سے متاثر ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ اب بھی ذہنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ریچھ کی لاش ہے۔

کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس لیے ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ اب رام رائے کہانیاں سنانا بھول چکا تھا اور وہ مجھ سے بھی زیادہ تیز چل رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم خیریت سے بنگلے پر پہنچ گئے۔

☆☆☆

کئی نامعقول حادثوں کے باوجود رام رائے کے ساتھ میری پکی دوستی ہوگئی۔ وہ مزید دو ہفتے میرے ساتھ رہا لیکن اس کے بعد کبھی اس نے شکار کی بات نہ کی اور نہ ہی اپنی بہادری کے قصے سنائے۔ اس نے پوری توجہ اپنے سرکاری کام پر مرکوز کرلی تھی۔ میں جب بھی بھیلوں کے درمیان جاتا وہ میرے ساتھ ہوتا۔ وہ مجھے بھیلوں کے درمیان ان جیسا صرف لنگوٹ باندھے چلتے پھرتے دیکھ کر بہت حیران ہوتا۔ پہلے تو وہ بہت پریشان ہوکر مجھ سے پوچھتا تھا کہ میں ان وحشی لوگوں کے ساتھ ان ہی کی طرح ننگے پاؤں اور ننگے بدن کیوں خوار ہوتا ہوں۔ اس میں آخر میرا کیا فائدہ ہے؟ لیکن کچھ دن میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ میرا جنگلیوں جیسا بھیس بدلنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ بھیل بھی مجھے اپنی قوم کا ایک فرد سمجھیں اور اپنا ہر دکھ سکھ بیان کرسکیں۔ میں ان کے جیسا بن کر ہی ان کے دلوں میں جگہ بناسکتا ہوں۔

رام رائے کے لیے ایک آئی سی ایس افسر کا یہ روپ بڑا انوکھا تھا۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہوا۔

کچھ دن رہنے کے بعد رام رائے واپس بمبئی چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس نے اپنی رپورٹ میں صحیح باتیں لکھیں تو وہ میرے حق میں بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ اس طرح میری شہرت کو نقصان پہنچانے والوں کا منصوبہ فیل ہوجائے گا مگر دس دن کے بعد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ گورنمنٹ میرے خلاف کوئی سخت ایکشن لینے کا سوچ رہی ہے۔ مجھے یہ بھی رپورٹ ملی کہ مقامی مارواڑیوں اور برہمنوں نے بمبئی کے کمشنر سے شکایت کی ہے کہ مسعود، بھیل عورتوں کو خراب کررہا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بے شمار بھیلوں کو زبردستی مسلمان بنارہا ہے۔

اس قسم کی جھوٹی شکایتوں نے مجھے سرکار کی نظر میں مشتبہ بنادیا۔ کچھ ہندی اخبارات نے میرے خلاف پروپیگنڈا کرکے عوام میں بھی غلط فہمیاں پیدا کردی تھیں۔ ایک بار پھر میرے خلاف تحقیقات کا آغاز ہوگیا۔

دراصل کردار کا شیشہ اس قدر نازک ہوتا ہے کہ بعض اوقات جھوٹ کا پتھر بھی اسے چکنا چور کردیتا ہے۔ میری کردار کشی کے لیے ہندو لابی کے قائم کیے ہوئے منظم محاذ کا اصل مقصد میرے انسان دوستی کے پروگرام کو روکنا تھا۔ بھیل قوم کی بیداری اس مالدار طبقے کے مفاد کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے ہر حال میں مجھ سے پیچھا چھڑانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ لیکن میں کسی طور بھی مظلوم لوگوں سے اپنا رابطہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ بھیلوں پر ہونے والا بے پناہ ظلم میری برداشت سے باہر تھا لیکن مجھے اپنی بدنامی کا بھی دکھ تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ گورنمنٹ کھل کر میرے خلاف تفتیش کرے اور اسے اصل صورتِ حال کا علم ہو۔ چھوٹی موٹی جاسوسی سے سرکار اصل حقائق سے آگاہ نہیں ہوسکتی تھی اور نہ ہی عوام تک اصل حالات پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے میں نے سرکار کو اپنے خلاف اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات کرانے پر آمادہ کرنے کے لیے ایک تجویز سوچی۔ میں نے کمشنر کو ایک گمنام خط لکھا کہ فلاں

رات اس جنگل میں فلاں ڈپٹی کمشنر اور پولیس چیف آئے تھے۔ مسعود نے ان کے ساتھ مل کر دو بھیل لڑکیوں کے ساتھ اتنی زیادتی کی کہ ایک لڑکی وہیں مرگئی اور دوسری کی حالت بہت نازک ہے۔

کمشنر کو پہلے ہی میرے خلاف بہت بھڑکایا گیا تھا۔ اس لیے میرا خط پڑھتے ہی غصے میں آگیا اور میرے خلاف اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات کرنے کے لیے ایک انکوائری کمیٹی قائم کردی۔ کئی اعلیٰ افسر بھیلوں سے اصل حقیقت دریافت کرنے کے لیے آئے لیکن سخت محنت کرنے کے باوجود میرے خلاف ایک الزام بھی ثابت نہ ہوسکا۔ ہر بات تحریر کے سامنے آگئی تھی کہ میرا نہ تو کسی بھیل عورت کے ساتھ غلط تعلق ہے اور نہ ہی میں زبردستی کسی بھیل کا دھرم بدل رہا ہوں۔ بلکہ بھیل قبائلی سرداروں نے میرے حق میں لمبے چوڑے بیان دیے جنہیں سن کر سرکار کی آنکھیں کھل گئیں۔

جب میرے بیان دینے کا موقع آیا تو میں نے بڑے دھڑلے کے ساتھ مارواڑیوں اور برہموں کے بھیلوں پر کیے گئے مظالم کی تفصیل سامنے رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انگریز کمشنر کو اپنے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ کمشنر اصل صورتِ حال جان کر مجھ سے بہت خوش ہوا۔ اس نے نہ صرف مجھ پر لگائے گئے ہر الزام کو بے بنیاد قرار دیا بلکہ اپنی رپورٹ میں میری کارکردگی کی بہت تعریف کی اور ہندوؤں کی غلط پالیسی کی زبردست مذمت کی۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہندو سیٹھوں کے رویّے سے بددل ہوکر کمشنر نے مجھ سے کہا۔

”مسٹر مسعود! جو حقائق سامنے آئے ہیں، انہیں دیکھ کر مجھے خدشا ہے کہ یہ سازشی عناصر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان حالات میں یہ علاقہ آپ جیسے افسر کے لیے مناسب نہیں ہے۔“

اس کی بات سن کر میں سمجھ گیا کہ اب میرا ٹرانسفر ہوجائے گا۔ لیکن اللہ نے میری عزت بحال کردی تھی، یہ میرے لیے سب سے بڑا انعام تھا۔

کمشنر نے گورنر کو رپورٹ ارسال کردی۔ گورنر ذاتی طور پر میرے کردار سے واقف تھے اس لیے وہ بہت خوش ہوئے۔ دراصل گورنر سرجان کالول بڑے انسان دوست اور دردمند دل رکھنے والے افسر تھے۔ انہوں نے میرے حق میں اپنے حکم کے ساتھ ایک پریس نوٹ بھی جاری کیا جو بمبئی کے تمام اخبارات میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی یہ ہوا کہ عوام میں میری عزتِ نفس اور شہرت بحال ہوگئی اور سب کو اصل حقیقت معلوم ہوگئی۔

بھیلوں کے لیے کیے گئے میرے کام نے اس حد تک شہرت پائی کہ میرے ہم منصب افسر مجھے ”مسعود بھیل“ کہنے لگے تھے۔ اس طرح ایک اور نام مجھ سے منسوب ہوگیا۔

☆☆☆

دوسری عالمی جنگ کے ختم ہونے کا وقت قریب آگیا تھا۔ ملک کی سیاسی صورت حال تیزی سے تبدیل ہورہی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار نزع کے عالم میں تھا۔ شاید نئے انتظامی اور سیاسی مسائل کا ادراک کرتے ہوئے سرجان کالول نے سوچا کہ سردار پٹیل جیسے متعصب لیڈروں کی موجودگی میں صوبے کی کانگریسی حکومت مسعود جیسے عوام دوست مسلمان افسروں کو تنگ کرے گی۔ اس لیے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر میرا تبادلہ بمبئی سے صوبہ سندھ میں کردیا۔

سرجان کالول میری کارکردگی سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے سندھ کے گورنر فرانسس موڈی کو لکھے گئے اپنے خط میں میری انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کی، انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

”اس نڈر مسلمان افسر کا ہر طرح خیال رکھا جائے۔ ہندو پریس نے ان کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرکے انہیں متنازعہ شخصیت بنادیا ہے۔ جس کے سبب اعلیٰ عہدوں پر فائز غیر جانبدار انگریز افسر بھی ان پر شک کرنے لگتے ہیں۔“

آخر کار میرا ٹرانسفر ہوگیا۔ ڈھولیا خاندیش سے میری واپسی کا منظر بڑا دردناک تھا۔ اس دن جنگل کے ہزاروں ننگ دھڑنگ بھیل میرے بنگلے کے اردگرد جمع ہوگئے۔ ان میں سے کئی لوگ اپنے مذہبی طور طریقوں سے عجیب و غریب رسمیں ادا کررہے تھے۔ اس وحشی قوم نے واقعی مجھے اپنا دیوتا مان لیا تھا۔ میری اس طرح کی جدائی ان کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔

میں نے انہیں ایک جگہ جمع ہونے کی ہدایت کی اور پھر میں نے ان کے سامنے باقاعدہ تقریر کی اور نئے حالات کے مطابق کام کرنے کے آخری مشورے دیے۔ وہ اس طرح ہمہ تن گوش تھے جیسے میں انہیں کوئی الہامی کلام سنا رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک ایک کے پاس جاکر اسے تسلی دی اور آخری بار سب سے پیار سے ملا۔ وہ سب جذباتی ہورہے تھے۔ جب میری سواری روانہ ہوئی تو کئی قبائلیوں نے بلند آواز سے رونا شروع کردیا...... سچی بات یہ ہے کہ اس موقعے پر میں بھی جذباتی ہوگیا تھا۔

دوسری زندگی

ظفر سعید

وہ اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی۔ جب وہ مرا تو اس نے اس موت کو تسلیم نہ کیا اور اسے زندہ کرنے کے لیے مخفی علوم کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ وہ مردہ زندہ تو ہو گیا مگر پوری دنیا کے لیے خطرہ بن گیا

ایک ایسا واقعہ جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا مشکل ہے

سینٹ پال ہومی سائیڈ ڈیپارٹمنٹ کے پولیس افسران مارک بیکر اور رائل بیچ کو ایک موقع واردات پر پہنچنے کو کہا گیا۔ وہ فوری طور پر ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوگئے۔ مارک تقریباً پچاس برس کا تجربے کار آفیسر تھا اور اس کے کریڈٹ پر کئی کامیاب کیس تھے۔ اس کا ساتھی رائل جوان تھا لیکن اس کی عمر بھی بتیس برس سے کم نہیں تھی۔ رائل کم عمری میں بہ طور سپاہی آیا تھا لیکن پھر اپنی ذہانت کی وجہ سے ترقی کرتا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ کیپٹن شین جائلز نے مارک کو جائے واردات کے بارے میں بتایا تھا اس لیے رائل بے خبر تھا۔ اس نے راستے میں پوچھا۔ وہ ڈرائیو کررہا تھا۔

”جانا کہاں ہے؟“

”شہر سے باہر ایک چھوٹا قصبہ چارلسن ویلی ہے وہاں جانا ہے۔“

”میں نے دیکھا ہے۔“ رائل نے سر ہلایا۔ ”بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ وہاں زیادہ تر امرا کے گھر ہیں اور دور دور بنے ہوئے ہیں۔ ایک بڑی پیاری سی جھیل بھی ہے۔ لیکن ہوا کیا ہے؟“

”کیس ہومی سائیڈ کا ہو تو کیا ہوتا ہے۔“ مارک نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیپٹن کا کہنا ہے ایک جوڑا قتل ہوگیا ہے۔“

شیلی کارٹر ایک خود میں کھوئی رہنے والی اور خوف زدہ سی لڑکی تھی ہلکی سی آواز بھی اسے چونکانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھی لیکن وہ اپنی زندگی میں مگن رہنے والے لوگ تھے اور شیلی کو اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ اسکول سے واپسی پر وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس کے ماں باپ دونوں جاب کرتے تھے۔ شام کو کام سے آنے کے بعد وہ عام طور سے تفریح کرنے نکل جاتے تھے۔ شیلی کو ڈنر بھی اکیلے کرنا پڑتا تھا۔ انہیں شیلی کی پروا نہیں تھی۔ ایک دو بار وہ صرف ان کو تنگ کرنے کے لیے دیر تک گھر سے غائب رہی تب بھی انہوں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ تنگ آکر شیلی نے بھی ان کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔

اسکول سے واپسی پر اس کا گھر آنے کو دل نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ اکثر نزدیک جنگل میں چلی جاتی اور کئی گھنٹے وہیں گزارتی تھی۔ یہاں اسے سکون ملتا تھا ایسا سکون جو اسے گھر میں نہیں ملتا تھا۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب سوچیں آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اپنے ماں باپ کو قتل کردے جنہیں اس کی بالکل بھی پروا نہیں ہے اور وہ بس خود میں مگن رہتے ہیں پھر وہ اس سوچ پر کانپ جاتی تھی۔ دل ہی دل میں ایسا سوچنے پر خود کو لعنت ملامت کرتی تھی۔ کبھی اسے خیال آتا

کہ گھر سے بھاگ جائے کہیں دور چلی جائے جہاں اسے تلاش کرنا ناممکن ہو۔ مگر وہ جانتی تھی وہ ایسا بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ خود سے کیسے زندگی گزارتی۔ اس کا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا حالانکہ وہ سترہ اٹھارہ سال کی خوب صورت لڑکی تھی۔ مگر اس کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے لڑکے اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ جو چند ایک اس کے پاس آنے کی کوشش کرتے تھے شیلی خود ان کو منہ لگانا پسند نہ کرتی۔ در حقیقت اسے لڑکوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس نے کبھی ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی جیسا کہ اس کی کلاس اور اسکول فیلو لڑکیاں کرتی تھیں۔ وہ ایسا لباس اور انداز اختیار کرتی تھیں کہ لڑکے خود ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

اس دن اسکول کی چھٹی ہوئی تو اس کا گھر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا اس لیے اس نے جنگل جانے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ اپنی سائیکل پر اسکول سے نکلی ایک سیاہ وین اس کے پیچھے آنے لگی۔ شیلی کو اس کا بالکل پتا نہیں چلا لیکن جب وہ جنگل کے اندر جانے والی سڑک پر گھومی تو اسے عقب میں آتی وین دکھائی دی۔ اس وقت بھی اس نے اس پر بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ کچھ آگے آنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو سیاہ وین نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کچی سڑک کے راستے سے اُتر گئی تھی اور اب جنگل میں درختوں کے درمیان سفر کر رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر ایک کھلی جگہ آئی اچانک ایک طرف سے وین نمودار ہوئی اور اس نے شیلی کو ٹکر مار کر سائیکل سمیت دور اُچھال دیا تھا۔

☆☆☆

نصف گھنٹے بعد مارک اور رائل بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں کئی پولیس کاریں اور کوئی ایک درجن پولیس والے پہلے سے موجود تھے۔ اس دو منزلہ پُرانے طرز کے لیکن خوب صورت مکان کے سامنے والے حصے میں پیلی پٹی لگی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ وہاں کوئی واردات ہو چکی ہے اور پولیس نے اس جگہ کو غیر متعلقہ لوگوں کے لیے بند کر دیا ہے۔ موقع پر موجود علاقے کا ڈپٹی شیرف انہیں کار سے اُترتے دیکھ کر تیزی سے ان کے پاس آیا۔ مارک نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو وہ مؤدب ہو کر بولا۔ ”میں ڈپٹی شیرف مائیکل گورڈن ہوں۔“

”یہاں کیا ہوا ہے؟“ مارک نے مکان کی طرف دیکھا۔

”مکان گزشتہ کئی دن سے ویران تھا۔ آج دودھ پہنچانے والے نے پولیس کو اطلاع دی کہ کئی دن سے دودھ کی بوتلیں جمع ہو رہی ہیں۔ وہ شام کو آیا تھا۔ ہمارے دفتر سے ایک آفیسر یہاں دیکھنے کے لیے آیا۔ اسے مکان مقفل ملا۔ آس پاس کے لوگ اس خاندان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے.... یہاں ایک جوڑا مسٹر اور مسز بینسن رہتے تھے۔ آفیسر نے واپس آ کر اطلاع دی کہ مکان مقفل ہے اور اندر سے بو آ رہی ہے۔ اس لیے شیرف نے مکان دیکھنے کے لیے مجھے بھیجا۔ اندر مسٹر اور مسز بینسن کی کئی دن پُرانی لاشیں موجود ہیں۔“

”لاشیں۔“ رائل نے دُہرایا۔ ”موت کی وجہ؟“

”انہیں نہایت درندگی سے چیر پھاڑ دیا گیا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے گھر میں کوئی درندہ گھس آیا تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون ہے۔ لاشیں لاؤنج میں پڑی ہیں۔ باقی گھر میں کوئی نشان نہیں ہے۔“

”اندر گھسنے کا کوئی نشان؟“

”عقبی دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہے لیکن بس اتنا کہ اس سے اوسط جسامت کا کوئی بچہ اندر آ سکتا ہے۔ دروازے کا لاک ٹھیک پایا گیا ہے۔“

مارک سر ہلاتا اندر کی طرف بڑھا۔ رائل اس کے پیچھے تھا۔ انہوں نے پیلی پٹی عبور کی اور اندر آئے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی راہداری تھی اس کے دائیں طرف لاؤنج تھا جو اصل میں مکان کے عقبی حصے تک جاتا تھا یہ خاصا بڑا اور سجا سجایا لاؤنج تھا جس میں قدیم وکٹورین طرز کے فرنیچر کی بھرمار تھی۔ ایک طرف بڑا سا آبنوس کی لکڑی کا بنا ہوا پیانو بھی تھا۔ لیکن اس کی حالت اب نہایت خوفناک ہو رہی تھی۔ پیانو کے ساتھ ایک کرسی کے سامنے ایک بڑے سائز کا وائلن پڑا ہوا تھا اور اسے بجانے والا حصہ بھی ساتھ ہی تھا۔ کرسیاں اور دوسری چیزیں اُلٹی پڑی تھیں۔ فرش اور قالین پر جا بہ جا خون پھیلا ہوا تھا۔ مسٹر بینسن کی لاش سامنے دیوار کی بڑی سی کھڑکی کے ساتھ پڑی ہوئی تھی اور اسے گردن سے پکڑ کر اتنی قوت سے پیچھے کھینچا گیا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور سامنے اس کا سینہ اور پیٹ کھلا ہوا تھا۔ تقریباً ایسی ہی حالت مسز بینسن کی تھی اس کی لاش پیانو کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ لاشوں کی حالت اور بو سے لگ رہا تھا کہ انہیں مرے ہوئے کم سے کم چار دن گزر چکے تھے۔ موسم سرد تھا اس وجہ سے لاشیں بالکل خراب ہونے سے محفوظ رہی تھیں۔

مارک لاؤنج کے فرش اور دوسری چیزوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے کسی جانور کے نشان کی تلاش تھی لیکن باریک بینی سے معائنے کے باوجود وہاں ایسا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ اس دوران میں رائل عقبی دروازے کا معائنہ کر رہا تھا جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اس نے مارک کو آواز دے کر بلایا اور بولا۔ ”یہ دیکھو ٹوٹے ہوئے شیشوں پر خون کے نشانات ہیں جیسے اندر آنے والے نے خود کو مار کر شیشہ توڑا ہو۔“

”لیکن سوراخ بہت چھوٹا ہے ایک عام جسامت کا انسان اس سے نہیں گزر سکتا۔“ مارک نے ٹوٹے شیشے کا جائزہ لیا۔ ”ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ بھی مشکل سے گزرے گا۔“

”وہ بھی زخمی ہو کر۔“ رائل نے لقمہ دیا۔ ”جیسا کہ خون سے ظاہر ہے۔“

خون مکمل طور پر جم گیا تھا لیکن مارک کے خیال میں اس سے کم سے کم یہ پتا چلایا جا سکتا تھا کہ خون انسان کا ہے یا کسی جانور کا۔ اس نے رائل سے کہا۔ ”ڈاکٹر سے کہنا کہ تمام جگہوں پر پھیلے خون کے نمونے الگ الگ لے اور پھر ان کی آپس میں میچنگ بھی کرائے۔“

رائل کو ہدایت کر مارک سامنے کی طرف سے گھوم کر مکان کے عقبی حصے میں آیا، ابھی تک عقبی دروازے سے نشانات نہیں اُٹھائے گئے تھے اس لیے اس نے اسے نہیں چھیڑا۔ پیچھے مکان میں ایک چھوٹا سا لان تھا۔ سامنے کی نسبت یہ حصہ ذرا نیچا تھا۔ اور یہاں مکان کے نچلے حصے میں شیشے کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ نیچے یقیناً تہ خانہ تھا اور یہ اسی کی کھڑکیاں تھیں۔ مارک کی توجہ ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی طرف گئی اس میں بھی تقریباً ویسا ہی سوراخ تھا جیسا کہ لاؤنج کے عقبی دروازے کے شیشے میں موجود تھا۔ اس نے قریب جا کر سوراخ میں جھانکا تو اسے اندر مکمل تاریکی نظر آئی۔ لیکن ٹوٹے شیشوں کے کناروں پر خون کے داغ محسوس کیے جا سکتے تھے۔

☆☆☆

شیلی کو ہوش آیا تو اس کا سر بُری طرح دکھ رہا تھا۔ لیکن اب وہ جنگل میں نہیں تھی۔ بلکہ ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹی تھی اور اس کے جسم پر اسی کا لباس تھا۔ یہ بڑا اچھا سا کمرا تھا فرش اور دیواریں بہترین لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ریک میں بہت ساری کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل بھی رکھی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھی تو اس کی نظر بستر کے سامنے کرسی پر بیٹھی اس عورت پر گئی۔ اس نے نرس جیسا سفید لباس پہن رکھا تھا۔ شیلی کے اُٹھنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اُٹھ کر اس کے پاس آئی۔

”اب تم کیسی ہو؟“

”میں کہاں ہوں؟“ شیلی نے اپنے ماتھے کی چوٹ کو چھوا یہاں نشان پڑا تھا لیکن خون نہیں نکلا تھا۔ ”ایک آدمی نے مجھے اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی۔“

”اب تم بالکل ٹھیک اور محفوظ ہو۔“ عورت نے اسے تسلی دی، لیکن اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کی تھی لیکن اپنے سخت نقوش اور چھوٹے بالوں کی وجہ سے اپنی عمر سے زیادہ کی لگ رہی تھی۔ اس کا جسم دبلا لیکن مضبوط لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی مشقت والا کام کرنے کی عادی ہو، ممکن ہو وہ باقاعدگی سے جم جاتی ہو۔ اس کے جواب سے شیلی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بستر سے اُتر آئی۔

”میں کہاں ہوں؟“

”تم محفوظ ہو لڑکی۔“ عورت نے سخت لہجے میں کہا۔

شیلی اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کھڑکی کی طرف آئی اور اس نے پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو اسے مکان سے باہر نیچے وہی سیاہ وین دکھائی دی جس نے اسے ٹکر ماری تھی۔ اس کے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر عورت کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اچانک شیلی دروازے کی طرف بھاگی راستے میں عورت نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن شیلی نے اسے دھکا دیا اور وہ اُلٹ کر بستر سے ہوتی ہوئی نیچے جا گری۔ جب تک وہ اُٹھتی شیلی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ وہ دوسری منزل پر تھی اسے راہداری کے سرے پر سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی دکھائی دیں، وہ ان کی طرف لپکی جب تک وہ نیچے آتی اوپر سے عورت بھی نکل کر آ گئی۔ وہ بُری طرح چلا رہی تھی اور اسے بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ شیلی نیچے آتے ہی باہر جانے والے دروازے کی طرف لپکی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا ایک معمر اور شریف نظر آنے والے آدمی کو سامنے کھڑے پایا۔ شیلی نے ہانپتے ہوئے اس سے کہا۔

”پلیز میری مدد کرو۔“

اچانک مرد نے اسے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی تو عقب سے آتی عورت نے اسے جکڑ لیا۔ وہ بپھری ہوئی تھی۔ اس نے شیلی کو اندر کی طرف کھینچتے ہوئے مرد سے کہا۔ ”اب اسے وہیں پہنچا دینا چاہیے۔“

وہ دونوں اسے پکڑ کر مکان کے اندر والے حصے کی طرف لے جانے لگے۔ شیلی خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بُری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ مگر ان دونوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اسے کھینچ کر سیڑھیوں کے نیچے واقع ایک دروازے تک لے آئے۔ اس دروازے پر نہ صرف باہر سے کنڈی لگی تھی بلکہ اسے مزید مضبوطی سے بند کرنے کے

www.Paksociety.com

لیے اس پر لکڑی بھی لگائی ہوئی تھی۔

☆☆☆

مارک واپس اندر آیا تو ڈاکٹر آچکا تھا اور لاشوں کا معائنہ کر رہا تھا، مارک اس کے پاس چلا آیا۔ ”کیا خیال ہے کتنی پُرانی ہیں یہ لاشیں؟“

”کم سے کم پانچ دن پُرانی ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”لیکن صحیح اندازہ پوسٹ مارٹم سے ہوگا۔“

مارک اور رائل کچھ دیر وہیں رہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر اور فارنسک لیب کے عملے نے اپنا کام کر لیا اور لاشیں پلاسٹک بیگ میں ڈالی جانے لگیں۔ ڈاکٹر معائنہ مکمل کر چکا تھا اس نے مارک کو بتایا۔ ”حیرت انگیز بات ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی انسان نے ان کو صرف دانتوں اور انگلیوں کی مدد سے چیر پھاڑ دیا ہو۔“

مارک اور رائل چونک گئے۔ رائل نے پوچھا۔ ”تو یہ کسی جانور کا کام نہیں ہے؟“

”نہیں پہلے میں بھی یہ سمجھا تھا کہ کسی بڑے ریچھ نے حملہ کیا ہے لیکن ان کے جسموں پر انسانی دانتوں اور انگلیوں کے نشانات واضح ہیں۔ ان کے سینے اور پیٹ سے کچھ اعضا جیسے کلیجی اور دل بھی غائب ہیں۔ سامنے سے گوشت بھی نُچا ہوا ہے۔“

”میرے خدا! کیا ان پر کسی آدم خور نے حملہ کیا ہے؟“ رائل بولا۔ ”کیا ان کا گوشت کھا لیا گیا ہے؟“

”شاید۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کیا میں لاشیں اُٹھوا لوں؟“

مارک نے اجازت دیدی۔ کچھ دیر میں طبّی عملہ لاشوں سمیت رخصت ہو گیا۔ کیونکہ سوائے لاؤنج کے باقی گھر صاف ستھرا تھا اس لیے اس پر توجہ نہیں دی گئی تھی لیکن اب مارک کا خیال تھا کہ انہیں باقی گھر پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے تھی۔ اکثر پولیس والے چلے گئے تھے صرف دو یہاں رکے تھے جب تک ہومی سائیڈ کی طرف سے حکم نہیں آتا مکان پر پولیس کا پہرہ لازمی تھا۔ مکان کا نچلا حصہ ایک لاؤنج، ایک وسیع نشست گاہ اور ڈائننگ روم پر مشتمل تھا جس کے ساتھ ہی کچن بھی تھا۔ بیڈ روم اوپر تھے۔ وہ اوپری منزل پر آئے۔ یہاں دو بیڈ روم تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا سا ٹیرس بھی تھا۔ مارک اور رائل الگ الگ بیڈ روم میں داخل ہوئے اس طرح کام جلدی نمٹ جاتا۔

مارک مسٹر اور مسز بینسن کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بیڈ کی سائیڈ دراز کی تلاشی لی۔ اس میں وہی تھا جو عام طور سے سائیڈ دراز میں پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی توجہ ایک طرف رکھے ہینڈ بیگ کی طرف گئی اس نے ہینڈ بیگ کھولا۔ یہ مسز بینسن کا ثابت ہوا۔ اس میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور سوشل سیکورٹی کارڈ تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ نرس تھی لیکن پرس میں کسی اسپتال کا کارڈ نہیں تھا جہاں وہ کام کرتی۔ اس کا پورا نام آرینا بینسن تھا۔ اس کے علاوہ ہینڈ بیگ میں کچھ رقم اور ایک کریڈٹ کارڈ بھی تھا۔ اس نے پرس واپس رکھ دیا۔ الماریوں میں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف درازوں اور ریک پر مشتمل الماری تھی۔ اس میں اوپر کتابیں تھیں اور نیچے درازوں میں مختلف سامان بھرا ہوا تھا۔ مارک نے سب سے نیچے والی دراز کھولی تو اس میں اسے ایک درمیانی ڈائری نظر آئی تھی۔ مارک نے ڈائری نکالی اور اس کا پہلا صفحہ کھولتے ہی اسے پتا چل گیا کہ یہ آرینا بینسن کی ڈائری تھی۔

”اے مارک۔“ رائل نے کمرے میں جھانکا۔ ”ذرا اِدھر آنا۔“

رائل اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ”یہ کسی نوجوان کا ہے۔ یہ دیکھو الماری میں کپڑے اور دوسری چیزیں ہیں۔“

بیڈ روم کسی نوجوان کے لحاظ سے تھا۔ لیکن وہاں سوائے کپڑوں کے اور کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ نہ دیواروں پر تصویریں تھیں۔ نہ کوئی میوزک سسٹم تھا اور نہ دیگر ملٹی میڈیا الیکٹرانکس جن کے بغیر آج کل کے نوجوان کسی صورت گزارا نہیں کر سکتے ہیں۔ سوائے سونے اور پہننے کی چیزوں کے کمرا بالکل خالی تھا حد یہ وہاں کوئی پڑھنے والی چیز بھی نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ اگر یہ کمرا کسی نوجوان کا تھا تو وہ خود کہاں تھا؟ ڈپٹی شیرف مائیکل نے انہیں بتایا تھا کہ اس مکان میں صرف ایک جوڑا رہتا ہے اور وہ مسٹر اور مسز بینسن ہیں پھر یہ نوجوان کہاں سے آ گیا اور کہاں گیا؟

”میرا خیال ہے اس بارے میں مائیکل زیادہ بہتر بتا سکے گا۔“ مارک نے کہا اور وہ نیچے آئے۔ مائیکل باہر اپنی گاڑی میں موجود تھا اور سردی سے بچنے کے لیے اس نے شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ باہر آ گیا۔

”مائیک اس گھر میں کوئی نوجوان لڑکا بھی رہتا ہے؟“

”میری اطلاعات کے مطابق تو کوئی نہیں ہے۔“ مائیکل نے سوچ کر کہا۔ ”میں مسٹر گلیڈ بینسن سے ذاتی طور پر واقف ہوں وہ بہت اچھا پیانو بجاتا ہے۔“

”اس کا نام گلیڈ ہے۔“ مارک نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔“

مائیکل چونکا۔ ”ہاں... میں بتانا بھول گیا۔ آرینا اور گلیڈ کا ایک بیٹا بھی تھا لیکن پھر وہ غائب ہو گیا اور اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”کتنا عرصہ ہوا غائب ہوئے اور اس وقت اس کی عمر کیا تھی؟“

”یہ شاید سات سال پُرانی بات ہے اس وقت لڑکے کی عمر شاید بارہ سال تھی۔ نام رینڈ تھا۔ اس وقت میں نیا نیا شیرف آفس میں آیا تھا۔“

”پولیس نے کیس فائل کر دیا تھا؟“

مائیکل نے سر ہلایا۔ ”ایسا ہی ہوا تھا میں بھی تفتیش کرنے والوں میں شامل تھا۔“

”رینڈ کیسے غائب ہوا تھا؟“

”ایک اتوار کو وہ گھر سے نکلا اور واپس نہیں آیا۔ اس کے ماں باپ کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں اور کیوں غائب ہوا ہے؟“

”اوپر ایک کمرا ایک لڑکے کے لیے بالکل سیٹ ہے۔ اس میں مناسب فرنیچر اور کپڑے اور دوسری چیزیں موجود ہیں اور سب استعمال میں ہیں۔ لیکن لڑکا نہیں ہے۔“

مائیکل اس اطلاع پر حیران ہوا تھا۔ مارک نے اسے ہدایت کی کہ وہ اس بارے میں آس پاس معلوم کرے۔ مائیکل سے دور ہو کر رائل نے مارک سے کہا۔ ”اب کیا کرنا ہے؟“

”ابھی یہاں کام ہے۔“ مارک نے کہا اور اسے ڈائری دکھائی۔ ”اسے دیکھنا ہے مجھے امید ہے اس میں کام کی کوئی چیز ملے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں یہاں تہ خانہ دیکھنا ہے۔“

رائل چونکا۔ ”اس کی وجہ؟“

”جس طرح لاؤنج... میں دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہے اسی طرح پیچھے تہ خانے کی کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔“

رائل نے سر ہلایا۔ ”لیکن تہ خانے کا دروازہ کس طرف ہے؟“

”شاید اوپر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے۔“ مارک نے اندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ اندر آئے اور راہداری کے آخر میں سیڑھیوں کی طرف آئے۔ مارک کا اندازہ درست نکلا۔ دروازہ اسی طرف تھا۔ لیکن یہ بند تھا۔ کنڈی کے علاوہ لکڑی کی بلّی بھی لگی تھی جیسے اسے بہت مضبوطی سے بند کرنا مقصود ہو۔ رائل نے لکڑی ہٹائی اور پھر کنڈی ہٹاتے ہوئے دروازہ کھولا انہوں نے بیک وقت اندر جھانکا۔ تہ خانے میں جانے والی سیڑھی کی جگہ صرف خلا تھا۔

☆☆☆

عورت اسے جکڑے ہوئے تھی اور مرد اسے ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ شیلی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ صورت سے اتنا شریف نظر آنے والا مرد اس طرح درشتی سے پیش آ سکتا ہے۔ وہ اسے دروازے تک لائے۔ عورت نے چلّا کر مرد سے کہا۔ ”کھولو اسے اس چڑیل کو اندر پھینکتا ہے۔“

”چھوڑ دو مجھے۔“ شیلی نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

مرد نے اس کا بازو چھوڑ کر دروازے سے لگی بلّی ہٹائی اور پھر کنڈی ہٹا کر دروازہ کھول دیا فوراً ہی عورت نے شیلی کو دھکا دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ تقریباً دس فٹ نیچے فرش پر جا گری تھی۔ اوپر سے عورت نے نفرت سے کہا۔ ”کتیا...“ اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ شیلی اُٹھ کر لپکی لیکن اتنی دیر میں دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ویسے بھی وہاں سے سیڑھی ہٹائی جا چکی تھی اور وہ کسی صورت دروازے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ان دونوں کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ لیکن وہ دونوں وہاں سے جا چکے تھے۔ شیلی بول بول کر تھک گئی تو وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔ ان لوگوں نے اسے کیوں اغوا کیا ہے اور پھر اس طرح سے کس لیے قید کر کے رکھا ہوا ہے اور اب تہ خانے میں لا پھینکا ہے اس کی سیڑھیاں بھی نہیں ہیں وہ باہر کیسے جائے گی؟

شیلی بہت ڈری ہوئی تھی۔ یہاں تہ خانے میں روشنی نہیں تھی صرف عقبی کھڑکیوں سے کسی قدر روشنی نیچے آ رہی تھی۔ تہ خانے میں جا بہ جا کاٹھ کباڑ اور پُرانی چیزیں رکھی تھیں۔ ان پر پڑنے والی روشنی سے سایوں اور تاریکی کا ایسا امتزاج بن رہا تھا جو خوف زدہ کرنے والا تھا۔ اچانک اسے کوئی آواز سنائی دی۔ شیلی ساکت ہو گئی اس نے سانس بھی روک لی تھی اور ساری قوت سماعت پر لگا دی تھی آواز اسی تہ خانے سے آئی تھی اس کا مطلب تھا وہاں کوئی اور بھی موجود تھا۔ آواز دوبارہ آئی اور ایسا لگا جیسے کوئی غرّا رہا ہو لیکن آواز میں خرخراہٹ بھی شامل تھی۔ شیلی لرز اُٹھی وہاں یقیناً کوئی تھا۔

کچھ دیر وہ بیٹھی رہی پھر ہمت کر کے اُٹھی اس نے آس پاس دیکھا تو اسے ایک لوہے کی سلاخ دکھائی دی اس نے اپنے دفاع کے لیے وہ اُٹھالی۔ وہ دبے قدموں اس حصے کی طرف بڑھی جہاں سے آواز آتی محسوس ہوئی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے جارہی تھی آواز واضح ہوتی جارہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی درندہ سوتے میں خرخرا رہا ہو۔ کاٹھ کباڑ کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ تہ خانے کے آخری حصے میں پہنچی جہاں کھڑکیاں بھی تھیں اور وہاں روشنی بھی بہتر تھی۔ وہ منظر سامنے آتے ہی اس کے ہاتھ سے سلاخ چھوٹ گئی۔ سامنے ہی ایک نوجوان لڑکا چھت سے بندھی رسّی سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ جسم چست اور درمیانہ قد تھا۔ پھندا اس کے گلے میں کسا ہوا تھا اور اسے مزید کسنے سے بچانے کے لیے اس نے رسّی کو ہاتھ سے تھام رکھا تھا اس کے پیر خلا میں لہرا رہے تھے اور ایک چھوٹی سی تپائی پاس اُلٹی پڑی تھی۔ خرخراہٹ کی آواز اسی کے گلے سے آرہی تھی۔

"میرے خدا!" شیلی کے منہ سے نکلا اور وہ اس کی طرف لپکی۔ اس نے بے ساختہ لڑکے کی ٹانگیں پکڑ لیں اور چلائی۔ "اپنے گلے سے رسّی نکالنے کی کوشش کرو۔"

لڑکا پہلے ہی کوشش کر رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ رسّی ڈھیلی کرنے کے لیے اسے اوپر سے چھوڑتا تو سارا وزن آنے سے پھندا مزید سخت ہوجاتا اور اسے بچانے کے لیے وہ اوپر سے رسّی پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے وہ مرنے سے بچا ہوا تھا ورنہ اب تک وہ مرچکا ہوتا۔ شیلی کمزور سی لڑکی تھی وہ بھی اسے ایک حد سے زیادہ سہارا نہیں دے سکتی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں حل آگیا اور اس نے لڑکے کی ٹانگیں چھوڑ کر فرش پر اُلٹی تپائی سیدھی کی اور اسے لڑکے کے پیروں تلے لے آئی۔ اس کے پیر ٹکے تو رسّی پر دباؤ خود بہ خود ختم ہوگیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے بہ مشکل پھندا اپنے گلے سے نکالا اور زمین پر گر گیا۔ وہ دیوانہ وار سانس لے رہا تھا۔ اس کی گردن بُری طرح سوج گئی تھی۔ شیلی اس کے پاس بیٹھ کر اسے تسلی دینے لگی۔

"سب ٹھیک ہے... سب ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو اب تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

چند منٹ میں لڑکے کی حالت کسی قدر بہتر ہوگئی تھی لیکن اس دوران میں تہ خانے کی کھڑکیوں سے آتی روشنی مدہم پڑنے لگی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ شیلی نے اُٹھ کر دیکھا، ایک جگہ اسے ایک بلب کے ساتھ لٹکا تار دکھائی دیا اس نے تار کھینچا تو نہ صرف یہ بلب بلکہ تہ خانے میں دوسری جگہوں پر لگے تین بلب اور جل اُٹھے تھے۔ اب وہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ شیلی لڑکے کے پاس واپس آئی۔

"یہ تم کیا کر رہے تھے؟"

لڑکے نے بولنا چاہا لیکن اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ اس کی زبان ہونٹوں کے درمیان کانپ رہی تھی۔ گردن کی تکلیف سے اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔ اس نے بے بسی سے شیلی کی طرف دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم نے خودکشی کی کوشش کی تھی؟"

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ شیلی نے پھر پوچھا۔ "لیکن کیوں؟"

لڑکے نے سوچا اور پھر اس نے گرد آلود فرش پر لکھا۔ "میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

شیلی نے تعجب سے پڑھا اور پھر وہی سوال کیا۔ "لیکن کیوں؟"

لڑکا خاموش ہوگیا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وضاحت کس طرح کرے۔ شیلی نے کہا۔ "میرا نام شیلی ہے، تمہارا نام کیا ہے؟"

"رینڈ۔" لڑکے نے فرش پر لکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیا ان لوگوں نے تمہیں بھی قید کر رکھا ہے؟"

"وہ میرے ماں باپ ہیں۔" لڑکے نے لکھا تو شیلی اُچھل پڑی تھی۔

"تمہارے ماں باپ ہیں۔ پھر انہوں نے تمہیں کیوں قید کیا ہے؟"

لڑکا سوچ میں پڑ گیا تھا جیسے فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے کیسے سمجھائے۔ پھر اس نے فرش پر لکھا۔ "تمہاری جان خطرے میں ہے۔"

"وہ کیسے؟"

شیلی نے ابھی پوچھا ہی تھا کہ بادل گرجے اور رینڈ وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ اس نے اشارے سے شیلی سے کہا کہ وہ دور چلی جائے۔ "کیوں کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا مگر رینڈ اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کی نظریں اوپر کھڑکی کے شیشے پر مرکوز تھیں جس پر رہ رہ کر بجلی کی چمک نمایاں ہو رہی تھی۔ اچانک رینڈ نے لرزنا شروع کر دیا اس کا جسم سخت ہو کر جھٹکے لے رہا تھا اور اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں پتلیاں غائب ہونے سے ڈیلوں کی سفیدی نمایاں ہونے لگی تھی۔ شیلی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے لگا جیسے رینڈ کی شکل تبدیل ہو رہی ہو۔

☆☆☆

مارک نے رائل کی طرف دیکھا۔ "معاملہ مشکوک ہو رہا ہے۔ مائیکل کا کہنا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں رہتا...... ہاں اس جوڑے کا ایک لڑکا تھا جو پُراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ پھر اس کا سراغ نہیں ملا۔ حالات بتاتے ہیں یہاں ایک لڑکا رہتا ہے اور وہ نوجوان ہے۔ دونوں میاں بیوی کو کسی انسان نے ہاتھوں اور دانتوں سے چیر پھاڑ کر مار دیا۔ عقبی دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے بالکل اسی طرح تہ خانے کی کھڑکی کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ اب یہاں تہ خانے کی سیڑھیاں غائب ہیں۔"

رائل اپنے باس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن معمّا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا بہرحال اس نے سیڑھی کا مسئلہ اس طرح حل کر دیا کہ مکان کے عقبی لان میں ایک ہلکی الومینیم کی تہ ہو جانے والی سیڑھی رکھی تھی وہ اسے اُٹھا کر لے آیا اور کھول کر تہ خانے میں لگا دیا۔ اس دوران میں مارک آرینا کی ڈائری کی ورق گردانی کرتا رہا تھا نیچے جانے سے پہلے اس نے رائل سے کہا۔ "اس ڈائری میں کچھ دلچسپ چیزیں ہیں لیکن پہلے ذرا نیچے کا حصہ دیکھ آتے ہیں۔"

وہ سیڑھی سے نیچے آئے۔ دروازے کے ساتھ یقیناً کسی وقت لکڑی کی سیڑھی بنی ہوئی تھی لیکن اب دیوار کے ساتھ صرف اس کے نشان باقی رہ گئے تھے۔ سیڑھی کو جان کر توڑا گیا تھا کم سے کم اس کے بقیہ رہ جانے والے تختوں کی ٹکڑوں سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ نیچے آتے ہی انہوں نے بدبو محسوس کر لی تھی۔ لیکن یہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ وہ یہاں کسی لاش کی توقع کرتے۔ روشنی کے لیے انہوں نے ٹارچ نکال لی تھی پھر رائل نے بلب جلا لیے۔ اب تہ خانے کی چیزیں صاف نظر آنے لگیں۔ وہ سامان کے درمیان گھوم رہے تھے۔ رائل ایک طرف چلا گیا۔ مارک عقبی حصے میں آیا جہاں کھڑکیاں تھیں اور ٹوٹ جانے والی کھڑکی زمین سے کوئی دس فٹ کی بلندی پر تھی۔ مارک نے آس پاس دیکھا تو اسے ایک کونے میں فرش پر سیاہی مائل خون جما ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جھک کر انگلی سے اسے چھوا۔ خون پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا اور بدبو اسی سے اُٹھ رہی تھی۔

فرش پر صرف خون ہی نہیں تھا بلکہ اس خون میں کچھ چیزیں بھی جمی پڑی تھیں۔ مارک نے دیکھ کر پاس ہی پڑا ایک سخت تار اُٹھایا اور اس سے وہ چیزیں کرید کر دیکھیں۔ یہ گوشت کے ٹکڑے تھے۔ مارک نے ایک ٹکڑے کو تار میں اُٹھا کر دیکھا تو اسے لگا جیسے یہ انسانی آنتوں کا حصہ ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کسی انسان کا خون ہے۔ مارک نے محسوس کیا کہ اس مکان میں اور بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ معاملہ صرف اوپر پائی جانے والی دو لاشوں کا نہیں تھا۔ رائل بھی وہاں آگیا۔ اس نے خون سے نکلنے والے آنت کے ٹکڑے کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے یہ انسانی آنت کا ٹکڑا ہی ہے۔ لیکن یہ یہاں آیا کیسے؟"

"خون دیکھو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں کسی انسان کو قتل کیا گیا ہو۔" مارک نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اس کا حتمی پتا معائنے کے بعد ہی چلے گا۔ فارنسک لیب والوں کو طلب کرو اور ان سے کہو کہ یہاں سے خون اور دوسری چیزوں کا نمونہ لیں۔"

رائل سر ہلاتا اوپر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مارک نے تہ خانے کا مزید معائنہ جاری رکھا۔ ایک طرف کئی ریک رکھے تھے وہ ان کے بیچ خلا میں آیا تو اسے فرش پر ایک دائرہ نظر آیا جس کے اندر ستارہ بنا ہوا تھا۔ یہ جادوگری کا مخصوص نشان تھا۔ ستارے کے کونوں پر چھوٹی چھوٹی بجھی ہوئی موم بتیاں تھیں۔ اس سے ذرا ہی دور ایک موٹی اور پُرانی سی مجلد کتاب زمین پر رکھی تھی۔ دائرے میں بھی تھوڑا سا خون گرا ہوا تھا۔ یہ بھی مکمل طور پر خشک ہوگیا تھا۔ مارک نے کتاب دیکھی۔ اسے کھولتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ بہت پُرانی اور پُراسرار علوم پر مبنی کتاب تھی۔ لیکن اس سے پہلے وہ آرینا کی ڈائری دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے اس میں کیا لکھا تھا۔

☆☆☆

شیلی خوف زدہ نظروں سے رینڈ کو دیکھ رہی تھی۔ باہر بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور ہر گرج کے ساتھ رینڈ کا جسم جھٹکے کھاتا تھا۔ لیکن پھر بجلی کی گرج چمک رک گئی اور رینڈ کا جھٹکے کھاتا جسم بھی ساکت ہوگیا۔ شیلی نے ڈرتے ڈرتے اسے چھوا۔ اس کا جسم گرم تھا اور سانس بھی چل رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر تہ خانے میں پانی تلاش کرنے لگی۔ پھر اسے پانی مل گیا یہ پینے کا تو نہیں تھا۔ کیونکہ پانی کی ٹنکی بھٹی کے ساتھ ہی تھی۔ مکان کو گرم رکھنے والی بھٹی میں جلتی آگ ٹنکی میں پانی بھی گرم رکھتی تھی۔ اس میں نل بھی لگا تھا۔ بڑی مشکل سے

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

ایک خستہ حال کٹورہ ملا اور شیلی اسی میں پانی بھر کر رینڈ کے پاس لائی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شیلی نے سہارا دے کر اسے اوپر اٹھایا۔ ”لو پانی پی لو۔“

رینڈ نے پانی پیا جو کسی قدر گرم تھا اس سے اس کے دکھتے گلے کو بھی سکون ملا تھا اور اس نے پہلی بار کچھ کہا۔ ”میں بدلا نہیں۔“

شیلی حیران ہوئی۔ ”کیا مطلب؟“

”ابھی جب بجلی چمک رہی تھی تو میں ایسا ہی رہا تھا؟“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ابھی اس کی آواز بلند نہیں تھی۔

”ہاں تم ایسے ہی رہے تھے۔“ شیلی بولی۔ ”تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟... تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہاں کیوں بند کر رکھا ہے؟“

”کیونکہ میں سال میں ایک بار چاند کی آخری تاریخ کو عفریت بن جاتا ہوں اور کسی انسان کا خون و گوشت ہی مجھے دوسری زندگی دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو میں نیا چاند طلوع ہونے پر زندہ نہیں رہوں گا۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”میں کیا کروں میں بدل نہیں سکتا۔“

”تت... تم سچ کہہ رہے ہو؟“ شیلی کانپ اٹھی تھی۔

اس نے مغموم انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ میری زندگی کا سب سے تلخ سچ ہے۔ اسی وجہ سے میں نے خودکشی کی کوشش کی۔“

شیلی ڈر رہی تھی لیکن ساتھ ہی اسے رینڈ سے ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ شیلی نے فوراً اس کی بات پر یقین کر لیا تھا۔ اس کے سامنے ہی وہ پھانسی کے پھندے میں لٹکا ہوا تھا اور شیلی کچھ دیر اور اسے نہ دیکھتی تو وہ مر جاتا۔ اگر وہ سچ نہیں کہہ رہا تھا تو اس نے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟ شیلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”تم ایسے کیوں ہو گئے ہو؟“

رینڈ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆

مارک ڈائری کے ورق الٹ رہا تھا کہ ایک صفحے پر رک گیا۔ تاریخ دو اگست 1995 کی تھی آرینا نے لکھا تھا۔ ”آج ہماری زندگی کا سب سے اندوہناک دن ہے۔ ہمارا پیارا بیٹا رینڈ جھیل میں ڈوب کر مر گیا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کس کی غفلت تھی۔ رینڈ کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ گلیڈ پانی سے ڈرتا ہے وہ تو جھیل کے کنارے پر بھی قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ہماری توجہ کچھ دیر کے لیے ہٹی اور رینڈ کشتی لے کر جھیل میں چلا گیا۔ پھر کشتی الٹی اور اس کے چلانے کی آواز آئی تو میں اسے بچانے کے لیے بھاگی لیکن جب تک میں رینڈ تک پہنچتی وہ ڈوب چکا تھا ہماری دنیا تاریک ہو گئی...“ اس سے آگے ورق یوں بھیگا تھا جیسے اس پر آنسو گرے ہوں۔

مارک نے اگلا صفحہ پلٹا جو چار اگست کا تھا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا ہے ہم رینڈ کی موت کی اطلاع کسی کو نہیں دیں گے۔ اسے تہ خانے میں رکھ دیں گے جہاں ہم روز اسے دیکھ سکیں گے۔ پولیس میں رینڈ کی گم شدگی کی رپورٹ لکھوا دی ہے۔ ہمارا بچہ... ہماری تو دنیا اجڑ گئی ہے۔“

اس سے آگے کی تاریخ چار جنوری 1996 کی تھی۔ ”گلیڈ کی خاندانی لائبریری دیکھتے ہوئے مجھے ایک بہت قدیم نسخہ دکھائی دیا ہے اس نے پُراسرار رسوم اور جادو کی حیرت انگیز باتیں لکھی ہیں۔ گلیڈ کا کہنا ہے یہ سب بکواس ہے، کتاب میں لکھی کسی بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن اس میں ایک جگہ بڑی عجیب سی بات لکھی ہے۔ آپ اپنے مرنے والے کسی پیارے کو زندہ کر سکتے ہیں۔“

سات فروری۔ ”گلیڈ کسی حد تک متفق ہو گیا ہے کہ ہمیں عمل کر کے دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے ہمارا رینڈ ہمیں واپس مل جائے۔ یہ عمل صرف کوئی مرد کر سکتا ہے یعنی گلیڈ ہی کر سکتا ہے۔ میں اسے عمل کرنے کے لیے تیار کر رہی ہوں۔“

بارہ فروری۔ ”آج میرے لیے بہت اہم دن ہے آج رات سورج غروب ہونے کے بعد جب مکمل تاریکی چھا جائے گی تو گلیڈ عمل کرے گا، مجھے یقین ہے میرا رینڈ زندہ ہو کر ایک بار پھر ہمارے درمیان ہوگا۔“

تیرہ فروری۔ ”میرے خدا میں کیا کروں مجھے لگ رہا ہے میں خوشی سے مر ہی نہ جاؤں۔ گلیڈ کا کیا ہوا عمل کامیاب رہا۔ رینڈ جو بالکل خشک ہو گیا تھا دوبارہ سے زندہ اور گوشت پوست کا رینڈ بن گیا وہ ہمارا بچہ ہے اب ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔“

اس کے بعد کئی صفحے معمول کے مطابق تھے ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پھر دو فروری 1997 کی تاریخ تھی یعنی ایک سال بعد کی۔ ”میرے خدا یہ ہم نے کیا کیا۔ کل جیسے ہی سورج غروب ہوا۔ رینڈ کی حالت خراب ہونے لگی۔ بجلی کی گرج چمک کے ساتھ وہ تڑپتا تھا اور پھر اس کی شکل و صورت ہی بدل گئی۔ میں اور گلیڈ خوف سے اپنے کمرے میں بند ہو گئے اور وہ باہر نکل گیا۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے رینڈ کو اس حال میں اپنے کمرے میں سوتے پایا کہ اس کا لباس منہ اور ہاتھ خون آلود ہو رہے تھے۔ جاگنے پر اس نے بتایا کہ اس نے خواب میں ایک بچے کو جنگل میں لے جا کر قتل کر دیا اور اس کا گوشت کھایا۔ لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی اس نے یہ کام خواب میں نہیں سچ مچ کیا تھا۔ میں اور گلیڈ جنگل میں گئے جہاں اس بچے کی لاش مل گئی۔ ہم اسے جانتے تھے یہ کچھ دور ہی رہنے والے ایک کسان کا بیٹا تھا اس سے پہلے کہ کوئی لاش کو دیکھتا ہم نے اسے جنگل میں ایک جگہ دفن کر کے وہاں سے سارے نشانات مٹا دیے۔“

اس کے بعد ڈائری میں مزید کسی صفحے کا اضافہ بہت دیر بعد ہوا تھا۔ یہ اسی سال کی دسمبر کی چوبیس تاریخ تھی۔ ”ہم کیا کریں، یہ ہماری غلطی تھی بلکہ میری غلطی تھی جو ہم نے رینڈ کی صورت میں ایک عفریت کو زندہ کر دیا۔ اسے سال میں زندہ رہنے کے لیے کسی ایک انسان کی ضرورت پڑتی ہے جسے وہ مار کر کھا سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو اس کی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔ اس بار ہمیں اس کے لیے انسان مہیا کرنا پڑا تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا جسے گلیڈ دھوکے سے گھر لے آیا اور ہم نے اسے تہ خانے میں رینڈ کے ساتھ بند کر دیا۔“

آخری تحریر سال بھر پہلے کی تھی۔ ”ہم اس کے لیے انسان مہیا کرتے اور ان کی بچی کھچی لاشیں دفناتے ہوئے تھک گئے ہیں۔ مگر کیا کریں رینڈ ہماری اولاد ہے، نہ اسے مار سکتے ہیں اور نہ اسے اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ہم کیا کریں...؟“

مارک کو لگا جیسے وہ کوئی ہارر اسٹوری پڑھ رہا ہو۔ اس ڈائری میں جو لکھا تھا اس پر یقین کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس سے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا۔ باقی باتوں سے قطع نظر اگر بینسن فیملی کا کوئی لڑکا تھا اور پھر یہ مان لیا جائے کہ بینسن جوڑے نے اپنے لڑکے کو کسی طرح زندہ کر لیا تھا تو وہ کہاں تھا؟ رائل واپس آ گیا تھا اور یہ تہ خانے کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے مزید کئی جگہوں پر خون اور گوشت کے ٹکڑوں کے پرانے نشانات تلاش کیے تھے۔ وہ مارک کے پاس آیا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے اس جگہ کوئی درندہ رہتا تھا جو قتل عام کرتا تھا۔“

مارک نے ڈائری اس کی طرف بڑھائی۔ ”اسے دیکھو شاید اس سے تمہیں اندازہ ہو کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔“

رائل نے ڈائری دیکھی اور جن جن صفحوں پر مارک نے نشان لگائے تھے ان کو پڑھتا رہا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ آخری صفحہ پڑھ کر اس نے مارک کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا بکواس ہے کیا تم نے اس پر یقین کر لیا ہے؟“

مارک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہاں کم سے کم ایک نوجوان آدمی بھی تھا اور اس تہ خانے میں جا بہ جا پائے جانے والے خون کے دھبوں کا ذمے دار وہی ہے۔ اگر وہ لڑکا مل جائے تو شاید ان میاں بیوی کے قتل کا معما بھی حل ہو جائے۔“

”تمہارا مطلب ہے قاتل وہی لڑکا ہے؟“

مارک نے سر ہلایا۔ ”لاشوں کی حالت بتا رہی ہے کہ انہیں کسی انسان نے ہاتھوں اور دانتوں سے ادھیڑ کر ہلاک کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی لڑکا ہو جو کسی وجہ سے آدم خور ہو گیا ہو۔ بالآخر اس نے اپنے ماں باپ کو بھی ہلاک کر دیا۔“

”اگر یہ بات جو ڈائری میں لکھی ہے اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا ہے تو پھر لڑکے کے آدم خور بننے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

مارک نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے لڑکا کسی نفسیاتی وجہ سے آدم خوری پر اتر آیا ہو اور اس کی ماں نے اس کی پردہ پوشی کے لیے یہ کہانی گھڑی ہو۔ ممکن ہے اس نے کم عمری میں ہی کوئی جرم کر دیا ہو اور اس وجہ سے اس کی گم شدگی کی کہانی بھی بنائی گئی ہو۔ لوگ اپنے جرائم چھپانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ ایسا کرو مائیکل سے معلوم کرو گزشتہ کچھ عرصے میں یہاں کتنی ایسی گم شدگیاں ہوئی ہیں جن میں غائب ہونے والوں کا اب تک کوئی سراغ نہ ملا ہو۔“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“ رائل نے کہا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد مارک اس پرانی کتاب کی طرف متوجہ ہوا جو بہ ظاہر اس سارے فساد کی جڑ لگتی تھی۔

☆☆☆

شیلی حیرت اور خوف سے رینڈ کی کہانی سن رہی تھی۔ وہ جھیل میں ڈوب گیا اور مر گیا پھر بہت عرصے بعد اس کے ماں باپ اسے ایک جادوئی عمل سے زندہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن اب اسے زندہ رہنے کے لیے سال میں ایک بار کسی انسان کے خون و گوشت کی ضرورت پڑتی تھی۔ اگر یہ چیز اسے نہیں ملتی تھی تو وہ مرنے لگتا تھا۔ اس کا جسم سوکھنے لگتا۔ جب وہ خاموش ہوا تو شیلی نے

www.Paksociety.com

کہا۔ ”تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ ہوسکتا ہے تم مرے نہیں ہو بلکہ کسی وجہ سے بے ہوش ہو گئے ہو اور پھر تمہیں کوئی بیماری لگ گئی ہو جس کی وجہ سے تم... ایسا کرتے ہو۔“

رینڈ رونے لگا تھا پھر اس نے چلا کر کہا۔ ”نہیں... نہیں یہ بیماری نہیں ہے۔ ورنہ جب میں عفریت بنتا ہوں تو بادل کیوں گرجتے ہیں اور بجلی کیوں چمکتی ہے، میری شکل کیسے بدل جاتی ہے۔ اس وقت میں انسان نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہوں۔“

”ممکن ہے اس بیماری کا تعلق بادلوں کی گرج چمک سے ہو۔“ شیلی نے اصرار کیا۔ ”رینڈ تمہیں علاج کی ضرورت ہے لیکن ان لوگوں نے تمہارا علاج کرانے کے بجائے تمہیں آدم خور بنا دیا ہے۔“

رینڈ نے آنسو صاف کیے۔ ”مجھے ان دونوں سے نفرت ہے۔“

”اس لیے کہ انہوں نے تمہارا علاج نہیں کرایا۔“

”نہیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے مجھے زندہ کیا اور پھر مرنے نہیں دیا۔ میری خاطر یہ دوسروں کی جان لے رہے ہیں۔ کاش میں ان کو مار سکتا میں تنگ آگیا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں جب میں عفریت بنتا ہوں تو مجھے خود پر قابو نہیں رہتا ہے اس وقت میرے سامنے جو انسان آئے میں اس پر جھپٹ پڑتا ہوں۔ چاہے وہ میرے ماں باپ کیوں نہ ہوں۔“

”اوہ تو وہ تمہیں اسی وجہ سے ان دنوں یہاں بند کر دیتے ہیں۔“ شیلی نے سر ہلایا۔ ”پھر تمہارے لیے کسی کو پکڑ لاتے ہیں۔ جیسے مجھے لائے ہیں۔“

رینڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن جب میں عفریت بنوں گا تو تمہیں مار ڈالوں گا اس وقت مجھے بالکل ہوش نہیں ہوتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

شیلی سہم گئی۔ کچھ دیر پہلے وہ رینڈ کی حالت دیکھ چکی تھی۔ اگرچہ اس کی صورت نہیں بدلی تھی لیکن اس کی آنکھیں بالکل سفید ہو گئی تھیں... اچانک بجلی چمکی اور بادل گرجے۔ رینڈ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اس نے شیلی کو پیچھے دھکیلا۔ ”جاؤ چلی جاؤ اس سے پہلے کہ میں عفریت بن جاؤں۔“

”میں... کہاں جاؤں؟“

”کہیں بھی چلی جاؤ اس تہ خانے میں چھپنے کی کئی جگہیں ہیں۔ مجھ سے دور رہو... جاؤ۔“ آخری لفظ ادا کرتے ہوئے رینڈ کی آواز پھٹ گئی تھی اور اس کا جسم لرزنے لگا۔ شیلی پیچھے ہٹی۔ رینڈ زمین پر گر گیا تھا اور وہ پہلے کی طرح جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دوبارہ اوپر چڑھ گئیں۔ بادلوں کی گرج چمک بڑھ رہی تھی اور اسی لحاظ سے رینڈ کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی کھال سکڑنے لگی اور اس پر جھریاں نمودار ہونے لگیں۔ اس کا سر سامنے سے بڑھ رہا تھا اور بچ بچ اس کی صورت خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ شیلی ڈر کر پیچھے ہٹی۔ ابھی تک رینڈ زمین پر پڑا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بے اختیار انداز میں حرکت کر رہے تھے۔

شیلی اس جگہ سے بھاگی وہ تہ خانے کے دروازے کے نیچے آئی اور چیخ چیخ کر رینڈ کے ماں باپ کو آوازیں دینے لگی۔ ”خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو... یہ مجھے مار ڈالے گا۔“

”چپ کرو۔“ باہر سے عورت کی کرخت آواز آئی۔ ”تمہارا انجام قریب ہے اس لیے شور مت کرو۔“

”پلیز...“ شیلی نے کہنا چاہا اسی لمحے تہ خانے میں ایک تیز حیوانی چیخ گونجی اور وہ ڈر کر دروازے کے پاس سے ہٹ آئی۔ وہ ریک اور سامان کے درمیان میں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگی جہاں چھپ سکے۔ اسے ایک ریک کے آخری حصے میں کارڈ بورڈ سے بنا ہوا بڑا سا ڈبا دکھائی دیا جس کی ایک سائیڈ کھلی ہوئی تھی۔ وہ جھک کر رینگتی ہوئی اس میں داخل ہو گئی اور سمٹ کر کونے میں بیٹھ گئی۔ ڈبے میں جابجا سوراخ تھے جن سے باہر کا تھوڑا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ وہی تیز چیخ پھر سنائی دی اور ایسا لگا جیسے کوئی زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہو۔ شیلی نے اپنی سسکیاں روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ مگر اپنے بدن کی لرزش کس طرح روکتی۔ گھسٹتی ہوئی آواز قریب آ رہی تھی اس نے مڑ کر ایک سوراخ سے باہر جھانکا تو اسے دوسرے کنارے پر ایک عجیب الخلقت چیز دکھائی دی۔ اس کا سر بہت بڑا تھا اور جسم چھوٹا سا۔ وہ زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ بڑے سے سر پر بالکل سفید آنکھیں بہت بھیانک لگ رہی تھیں۔ اگر اس کے جسم پر رینڈ والا لباس نہ ہوتا تو شاید وہ اسے اب بھی رینڈ تسلیم نہ کرتی۔

وہ سر گھما گھما کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے تلاش کر رہا ہو اور اس کے منہ سے کراہتی ہوئی آواز نکل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اس راہداری کے سامنے رکا رہا پھر آگے نکل گیا۔ شیلی نے سکون کا سانس لیا وہ سیدھی ہوئی تو کوئی چیز اس کے پیچھے گری اور آواز آئی۔ اس کا دم خشک ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ رینڈ اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے بھی آواز سن لی تھی۔ شیلی نے جلدی سے ڈبے کے فرش کو ٹٹولا آخر اس کے ہاتھ ایک نٹ آگیا۔ رینڈ بالکل پاس آگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈبے کے اتنا پاس آتا کہ اسے ڈبے کا خلا نظر آجاتا شیلی نے نٹ خلا سے سامان کے دوسری طرف اچھال دیا وہ کہیں دور جا گرا اور اس کی آواز پر رینڈ چونک کر تیزی سے اس طرف چلا گیا۔

شیلی ڈبے کی دیوار سے ٹک کر رونے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کے منہ سے آواز نہ نکلنے پائے۔ ورنہ رینڈ اسے تلاش کر لے گا اور مار ڈالے گا۔ اس کی عفریت نما صورت دیکھ کر شیلی کو پورا یقین آگیا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ آگئی تو وہ اسے بخشے گا نہیں۔ بادلوں کی گرج چمک رک گئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد بادل پھر گرجنے لگے تھے۔ بجلی رہ رہ کر کڑک رہی تھی اور چمک سے تہ خانہ روشن ہو جاتا تھا۔ پھر بادلوں کی گرج چمک رک گئی۔ اب تہ خانے میں خاموشی تھی گھسٹنے اور کراہنے کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ پھر اسے رینڈ کی آواز سنائی دی۔ وہ کمزور لہجے میں شیلی کو پکار رہا تھا۔

”شیلی... کہاں ہو میرے پاس آؤ... اب میں ٹھیک ہوں۔“

اس کی آواز پر شیلی ڈرتے ڈرتے اس جگہ سے نکلی اور تہ خانے کے اس حصے میں آئی جہاں رینڈ ایک ریک سے ٹیک لگائے پڑا تھا۔ شیلی اسے دیکھ کر چونک گئی، وہ دوبارہ رینڈ بن گیا تھا لیکن اس کی جلد پر جھریاں نمودار ہو رہی تھیں اور چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔ اس نے شیلی کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر نحیف لہجے میں بولا۔ ”بس ایک بار اور تم خود کو بچا لو اس کے بعد میں زندہ نہیں رہوں گا۔“

”نہیں۔“ شیلی رو دی تھی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تم مر جاؤ۔“

رینڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے آج رات ہم میں سے ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو تم نہیں بچو گی اور یہ بات بھی یقینی نہیں ہے کہ میں دوسری بار مر جاؤں ممکن ہے میں زندہ رہوں اور بار بار عفریت بن کر تمہیں تلاش کرتا رہوں۔“ رینڈ کہتے کہتے رکا اس کا سانس پھول رہا تھا اس نے پھر کہا۔ ”تم سے پہلے بھی جو یہاں آئے انہوں نے اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کی لیکن ان میں سے کوئی مجھ سے بچ نہیں سکا۔ شیلی یہ تہ خانہ بہت چھوٹی جگہ ہے اور یہاں تم مجھ سے ہر بار نہیں بچ سکو گی۔“

”تب میں کیا کروں؟“

رینڈ کسی سوچ میں تھا اس نے کہا۔ ”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا، سچ تو یہ ہے کہ اس نئی زندگی میں اگر مجھے کسی انسان سے انسیت محسوس ہوئی ہے تو وہ تم ہو، میں کسی صورت تم کو نہیں مارنا چاہتا۔ لیکن دوسری طرف میں عفریت بن کر یہ بات بالکل بھول جاؤں گا۔“

شیلی لرزنے لگی کیونکہ باہر ایک بار پھر بادلوں کی ہلکی گرج چمک شروع ہو گئی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ رینڈ جلد ہی دوبارہ عفریت بن جائے گا۔ رینڈ ہمت کر کے اُٹھ بیٹھا۔ اس نے شیلی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”سنو ہم دونوں کے زندہ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور ہمیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔“

”کیسا طریقہ؟“

”آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ رینڈ بولا اور اسے لے کر راہداری کے آخری حصے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

مارک کتاب دیکھ رہا تھا، اس نے عمل والا حصہ تلاش کر لیا تھا اور اب اسے پڑھ رہا تھا۔ عمل پوری وضاحت سے درج تھا اور کوئی بھی انسان جو مردہ ہوا سے کر سکتا تھا اور اپنے اس مر جانے والے پیارے کو زندہ کر سکتا تھا جس سے وہ محبت کرتا ہو۔ لیکن اس عمل میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ مرنے والا جب زندہ ہو گا تو وہ سال میں ایک بار عفریت بن کر انسانی جان کی قربانی طلب کرے گا۔ غالباً یہ بات پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ عمل بھی آسان تھا۔ چاک یا چونے سے ایک دائرہ بنا کر اس کے اندر ستارہ نما شکل بنائی گئی تھی اور ستارے کی ہر نوک پر ایک موم بتی جلائی تھی۔ مارک نے بے ساختہ فرش پر بنے دائرے کی طرف دیکھا۔ اس میں ستارے کی نوکوں پر موم بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ اس چیز کو بالکل ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا یہاں کچھ نہ کچھ شیطانی کام ہوا ہے۔ آخر فرش پر یہ دائرہ بنانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ ڈائری کی لکھی بات درست ہے تو یہاں مارے جانے والے انسانوں کی چیزیں ہوں گی جیسے لباس یا ان کے پاس موجود دوسرا سامان۔ وہ اٹھ کر تہ خانے میں گھومنے لگا۔ بالآخر اس نے ایک بڑا چوبی بکس تلاش کر لیا اور جب اسے کھولا اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس

www.Paksociety.com

میں مردانہ اور زنانہ ملبوسات بھرے ہوئے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ یہ سب خون آلود تھے اور پھٹے ہوئے تھے۔ بیگز تھے اور دو اسکول بیگز بھی تھے۔ جب کہ لیڈیز پرس بھی تھے۔ اس نے پرس اُٹھا کر دیکھے، ان میں پرس والیوں کے کارڈز بھی تھے۔ وہ مزید چیزیں تلاش کرنے لگا۔ اسکول بیگز سے بچوں کے بیجز نکلے جن پر ان کی تصویریں بھی تھیں۔ مارک کا دل رک سا گیا تھا یہ پیارے بچے یقیناً اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ان کے بچے کھچے اجسام ان ظالموں نے جنگل میں کہیں دفنا دیے ہوں گے۔

اس نے بکس سے ساری چیزیں نکالیں اس کا اندازہ تھا کہ یہاں کم سے کم آٹھ افراد کی چیزیں تھیں۔ گویا آٹھ انسان غائب تھے۔ اس دوران میں رائل لوٹ آیا۔ وہ بھی یہ چیزیں دیکھ کر چونک گیا۔ مارک نے اسے ان چیزوں اور ان کے متعلق اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔ "میں نے مائیکل سے معلومات حاصل کی ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں یہاں نصف درجن کے قریب ایسی گم شدگیاں ہوئی ہیں جن میں غائب ہونے والوں کا کوئی سراغ نہیں لگا۔"

"میرا خیال ہے اب ان کا سراغ لگ گیا ہے۔" مارک نے ملنے والے کارڈز اسے تھما دیے۔ "بس ان کی لاشیں تلاش کرنا باقی ہے جو آس پاس کہیں جنگل میں دفن ہوں گی۔"

رائل نے کارڈز دیکھے اور بس اتنا کہا۔ "میرے خدا..."

"یہاں بہت برا ہوا ہے۔" مارک نے اسی راہداری کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "مزید لوگوں کو طلب کرو۔ لاشیں تلاش کرنے کا کام آج سے ہی شروع کرنا ہے۔"

رائل اوپر چلا گیا۔ مارک راہداری میں آیا اور اس نے ایک بار پھر کتاب اُٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جادوئی عمل والا دائرہ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی بنا ہے۔ آخر اسے بنانے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا، کیا اس عمل کی مدد سے پھر کسی کو زندہ کیا گیا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے قطعی بھول گیا تھا کہ وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔

☆☆☆

دونوں میاں بیوی تہ خانے کے دروازے کے پاس ہی موجود تھے اور انہیں کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی رات آدھی ہوئی تھی اور صبح ہونے میں بہت وقت تھا۔ دو دفعہ بادل گرجے اور بجلی چمکی تھی لیکن تہ خانے سے چیخوں کی آواز نہیں آئی۔ عورت نے شوہر کی طرف دیکھا۔ "ابھی تک وہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔"

مرد تشویش زدہ ہو گیا۔ "کہیں اس نے خود کو نقصان نہ پہنچا لیا ہو ان دنوں وہ بہت مایوس ہو رہا ہے۔"

"اسے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔" عورت نے پورے اعتماد سے کہا۔ "وہ مر نہیں سکتا۔"

مرد نے بے یقینی سے عورت کی طرف دیکھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے آخر وہ انسان ہے اور ہر انسان کو موت آتی ہے۔"

"وہ انسان نہیں ہے۔" عورت افسردہ ہو گئی۔ "اب وہ ایک عفریت ہے، وہ دوسروں کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے لیکن خود اسے موت نہیں آئے گی۔"

"ہم نے بہت برا کیا ہے۔" مرد تھکے انداز میں بولا۔

"ہاں لیکن ہم نے جو کیا اپنے بیٹے کے لیے کیا ہے۔" عورت نے اطمینان سے کہا۔ "کم سے کم مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ ہمارے لیے اس دنیا میں رینڈ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔"

مرد نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس معاملے میں بیوی سے زیادہ متفق نہیں ہے۔ اسی لمحے بادل پھر سے گرجنے لگے اور وہ دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد تہ خانے کے اندر سے ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی اور اس کے کچھ دیر بعد لڑکی کی بے تحاشا چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ان چیخوں میں درد اور اذیت رچی ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی حیوانی غراہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ عورت نے کہا۔ "بالآخر وہ کامیاب رہا۔"

مرد نے اس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ "اس تہ خانے میں کوئی اس سے زیادہ دیر نہیں بچ سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اگر ہم اسے انسان مہیا کرنے میں ناکام رہے تو اس دن یہ تہ خانے سے باہر آجائے گا اور ہمیں مار ڈالے گا۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔" عورت نے پختہ لہجے میں کہا۔ "ہم اس کے لیے ہمیشہ یہ کام کرتے رہیں گے۔ بولو کریں گے نا؟"

مرد نے اس بار بھی نظریں ملائے بغیر سر ہلایا اور سرد آہ بھری۔ "ہاں یہ ہماری مجبوری ہے اور ہمیشہ رہے گی۔"

"مجھے اپنی جان کی فکر نہیں ہے۔ لیکن ہم نہ رہے تو رینڈ خود کو راز نہیں رکھ سکے گا اور وہ پکڑا جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو ہم اس کی پوری دیکھ بھال اور حفاظت کریں گے۔" اس بار مرد نے بہتر انداز میں کہا۔ پھر وہ خاموش ہو کر اندر سے آنے والی غراہٹیں اور چپڑ چپڑ کی آوازیں سنتے رہے۔ خاصی دیر بعد غرانے اور چبانے کی آوازیں رک گئیں۔ اس دوران میں باہر بادل گرجنا بھی بند ہو گئے تھے۔ عورت نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے اب ہمیں تہ خانے میں جانا چاہیے۔"

مگر مرد راضی نہیں تھا۔ "بہتر ہے کچھ دیر اور انتظار کر لو۔"

عورت مان گئی۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد مرد باہر سے ہلکی الومینیم کی سیڑھی اُٹھا لایا۔ انہوں نے تہ خانے کا دروازہ کھول کر سیڑھی نیچے لگائی۔ پہلے مرد اُترا۔ وہ محتاط اور ڈرا ہوا تھا اس کے پیچھے عورت بھی اُتر آئی۔ وہ دونوں آگے گئے اور بالآخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں رینڈ اپنی اصل حالت میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لڑکی کی بچی کھائی خون آلود لاش پڑی تھی خود رینڈ بھی خون میں نہایا ہوا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے سر اُٹھایا اور رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آج میں نے ایک انسان اور مار دیا۔"

میاں بیوی نے جلدی سے آ کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ اسے اوپر لے آئے۔ عورت اسے باتھ روم میں لے گئی اور اس کے کپڑے اُتار کر اسے ٹب میں بٹھا دیا اور اسے گرم پانی سے نہلایا۔ لڑکا اس دوران میں بالکل خاموش تھا۔ نہانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے۔ اس کی ماں نے اسے سونے کے لیے کمرے میں بھیج دیا اور خود شوہر کے پاس لاؤنج میں آ گئی جہاں وہ پیانو پر بیٹھا بے دلی سے کیز چھیڑ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نہیں تھے۔ اس کے برعکس عورت خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے شوہر سے کہا۔ "کیا خیال ہے کوئی دھن بجائیں؟"

شوہر نے سر ہلایا لیکن اس کے انداز میں بے دلی تھی۔ عورت نے پروا کیے بغیر اپنا وائلن اُٹھا لیا۔ پھر اس نے جیسے ہی وائلن کے تاروں پر ضرب لگائی بادل گرج اُٹھے تھے۔ مرد چونک گیا اس نے پیانو پر ہاتھ روک لیا۔ "یہ کیا؟" اس نے تشویش سے کہا۔ "بادل پھر کیوں گرج رہے ہیں؟"

"موسم کا اثر ہو گا۔" عورت نے جواب دیا۔

مرد کھڑا ہو گیا۔ "نہیں یہ موسم کا اثر نہیں ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ بادل خاص انداز میں گرج رہے ہیں ویسے ہی جیسے..."

"نہیں۔" عورت نے اس کی بات کاٹی۔

"پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" رینڈ کی آواز آئی، وہ لاؤنج کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صاف ستھرے لباس میں خوب صورت اور تر و تازہ لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پاس آ کر باہر جھانکا اور بولا۔ "یہ بادل خاص انداز میں گرج رہے ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے مڑ کر معنی خیز انداز میں ماں باپ کو دیکھا۔ "کیا آپ دونوں محسوس نہیں کر رہے؟"

"رینڈ تم نے کیا کیا ہے؟" عورت تیز لہجے میں بولی۔

رینڈ مسکرانے لگا۔ "ماما میں نے وہی کیا جو آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ آپ نے جو کیا اس کا نتیجہ بھگتنے کا وقت سامنے آ گیا ہے۔"

عورت چیخ اُٹھی۔ "اس نے لڑکی کو..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ ایک تیز غیر انسانی چیخ گونجی تھی اور پھر ایسی آواز آئی جیسے کہیں شیشہ ٹوٹا ہو۔ اس کے فوراً بعد لاؤنج کے عقب کی طرف کھلنے والے دروازے میں اوپر لگا شیشہ ٹوٹا اور ایک گیند نما چیز اُچھل کر قالین پر آ گری۔ مرد ہڑبڑا گیا اور عورت کھڑکی کی طرف لپکی لیکن اسے مہلت نہیں ملی تھی گیند نما چیز اُچھل کر اس کے پیچھے آئی اور

حرم پاک میں 4000 لاؤڈ اسپیکر 3640 پنکھے اور 2100 بلب ہیں۔ 450 برقی گھنٹیاں ہیں جو مختلف زبانوں میں ٹائم بتاتی ہیں۔ 9 بڑے مینار ہیں جن کی لمبائی 90 میٹر ہے اور ان میں سے ہر ایک پر 14 سرچ لائٹس لگائی گئی ہیں۔ ہر سرچ لائٹ میں 20 بلب ہیں۔ غلاف کعبہ ہر سال ذی الحجہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اس کی قیمت 2 کروڑ ریال ہے۔ اس کا وزن 670 کلوگرام ہے اور یہ خالص ریشم کے کپڑے سے بنتا ہے۔ اس کی تیاری میں 150 کلوگرام خالص سونا اور چاندی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا سائز 658 مربع میٹر ہے اور یہ 47 حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصہ 14 میٹر لمبا ہے۔ اسے تبدیل کرنے میں 4 گھنٹے لگتے ہیں۔

مرسلہ: سحرش ملک، دمام

اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ مکان اس کی چیخوں سے گونج اُٹھا تھا۔ مرد نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن رینڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قالین پر پھینک دیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”نہیں پاپا اب بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“

عورت چیختے چیختے ساکت ہوگئی تھی۔ پھر گیند نما چیز اُچھل کر مرد کی طرف آئی اور اس بار مکان اس کی چیخوں سے گونج اُٹھا۔ رینڈ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

نزدیکی جنگل کے ایک چھوٹے سے حصے سے آٹھ لاشیں برآمد کی جاچکی تھیں۔ یہ لاشیں اب صرف ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔ لیکن اس سے ثابت ہوگیا تھا کہ مکان کے تہ خانے میں مارے جانے والے یہی لوگ تھے اور ان میں تین بچے بھی تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ ان میں کوئی تازہ لاش نہیں تھی۔ مارک اطلاع ملنے پر آیا تو لاشیں نکالی جاچکی تھیں اور اب انہیں ایمبولینسوں میں اسپتال بھیجا جارہا تھا۔ رائل کو فلو ہوگیا تھا اس لیے وہ چھٹی پر تھا۔ مارک نے آتے ہی کسی تازہ لاش کے بارے میں پوچھا لیکن اسے بتایا گیا کہ ملنے والی ساری لاشیں پُرانی تھیں۔ جب کہ مزید لاشوں کی تلاش کے لیے آس پاس کھدائی جارہی تھی۔ اس سلسلے میں کتوں سے بھی مدد لی گئی تھی۔ مگر کئی گھنٹے کی تلاش کے بعد مزید کوئی لاش نہیں ملی تھی۔ اس دوران میں مائیکل اس کے پاس آیا۔

”سر ایک گم شدگی کی رپورٹ اور آئی ہے۔ ہائی اسکول کی طالبہ شیلی کارٹر کل سے غائب ہے۔“

”اوہ!“ مارک چونکا۔ ”وہ کب سے غائب ہے؟“

”کل اسکول سے نکلنے کے بعد وہ گھر نہیں پہنچی۔ کل شام اس کی ماں نے پولیس کو اطلاع دی اور پولیس کو رات کو ہی اس کی سائیکل جنگل میں ایک جگہ پڑی ملی ہے۔ اس کی حالت سے لگ رہا ہے جیسے اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ وہاں کچی زمین پر کسی بڑی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات ہیں۔“ مائیکل نے مکمل رپورٹ پیش کی۔

مارک کا ذہن قدرتی طور پر جیکسن فیملی کے مکان میں موجود سیاہ وین کی طرف گیا۔ ”ان نشانات کو اس وین کے ٹائروں سے ملا کر دیکھو۔“

مائیکل چلا گیا اور ایک گھنٹے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ جنگل میں پائے جانے والے ٹائروں کے نشانات اسی وین کے تھے۔ سامنے اس کے بمپر پر نشان بھی تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ شیلی کا اغوا اصل میں گیڈ نے کیا تھا اور وہ اسے اپنے مکان پر لے کر آیا تھا لیکن اس کے بعد وہ کہاں گئی اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تہ خانے میں پایا جانے والا خشک خون اس گروپ کا تھا جو شیلی کا تھا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ یہ شیلی کا ہی خون ہے۔ اس کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کرانا ضروری تھا۔ مگر اس میں وقت لگتا۔

مارک ایک بار پھر مکان میں آیا۔ تہ خانے میں سیاہی بدستور موجود تھی اس لیے اسے نیچے آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جادوئی عمل والی کتاب اسی جگہ رکھی تھی۔ مارک نے اسے شہادتوں کا حصہ نہیں بنایا تھا۔ اسے معلوم تھا ایسا کرنے کی صورت میں صرف اس کا مذاق اڑتا۔ پھر کوئی عدالت اور جیوری بھی اسے بہ طور شہادت تسلیم نہیں کرتی اس لیے اس نے اپنی رپورٹ کو حقائق تک محدود رکھا تھا۔ آرینا کے ہاتھ کی لکھی ڈائری بھی تھی۔ مگر مسئلہ وہی تھا اس میں بیان کردہ باتوں کو کون تسلیم کرتا۔ اس سے قطع نظر معما تقریباً مارک کی سمجھ میں آچکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رینڈ نے شیلی کو مار دیا تھا لیکن ساتھ ہی اس پر وہی عمل بھی کیا تھا اس کی کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ مارک اس بارے میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے شیلی کی تصویر نہیں دیکھی تھی لیکن امکان یہی تھا کہ وہ خوش شکل ہوگی اور رینڈ کو اچھی لگی ہوگی اس لیے اس نے اسے بچانے کی کوشش کی اور عمل کے ذریعے زندہ ہوکر شیلی نے عفریت بن کر رینڈ کے ماں باپ کو مار ڈالا۔ یقینی طور پر رینڈ بھی اس واردات میں ملوث تھا۔ مارک نے کتاب کو دیکھا اور پھر اس طرف آیا جہاں مکان کو گرم کرنے والی بھٹی لگی تھی۔ یہ گیس سے جلتی تھی۔ مارک نے بٹن دبا کر بھٹی کو آن کیا اور فوراً اس میں شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ اس نے بھٹی کا دروازہ کھولا اور کتاب کو شعلوں میں پھینک دیا۔ کتاب کے ورق پھڑپھڑائے اور یک دم ہی وہ جلنے لگی۔ اس کے صدیوں پُرانے خشک اوراق کو راکھ ہونے میں چند منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں لگا تھا۔ مارک کی توقع کے خلاف نہ تو کہیں بادل گرجے اور نہ ہی بھٹی سے روحوں کے چیخنے چلانے جیسی آوازیں آئیں۔ بس ایک بدبو سی آئی اور کتاب راکھ ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے آرینا کی ڈائری بھی بھٹی میں ڈال دی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئے گی۔ رینڈ اور شیلی یہاں سے جاچکے تھے۔ پولیس ان کو تلاش کرتی اور قسمت ہوتی تو وہ ہاتھ آجاتے لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہوتا کہ جیکسن جوڑے کو ان ہی نے قتل کیا ہے۔

ٹوپی زمانہ

محمد ایاز راہی

زمانۂ قدیم سے سر کی زینت کے لیے ٹوپی کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ عہد فرعون ہو یا بابل ونینوا کی سلطنت۔ فارس ہو، افریقا کے جنگلات یا پھر سائبیریا کے برفیلے میدان، ہر علاقہ وہر عہد میں شرفا کی پہچان ٹوپی رہی ہے۔

مختلف قسام کی ٹوپیوں کا مختصر سا جائزہ

ٹوپ' ہندی زبان کا مذکر لفظ ہے۔ صیغۂ اسم میں آتا ہے۔ سر پر اوڑھتے یا پہنتے ہیں جس سے کان بھی ڈھک' چھپ جائیں اسی لیے اسے کن ٹوپ بھی کہتے ہیں۔ یہ روئی دار اونی یا سادہ بھی ہوسکتا ہے۔ جاڑے کا پہناوا ہے خصوصاً سرد پہاڑی علاقوں میں اس کا استعمال عام ہوتا ہے جب برفیلی رت ہو اور یخ بستہ کٹیلی ہواؤں کا زور ہو۔ ایسے میں

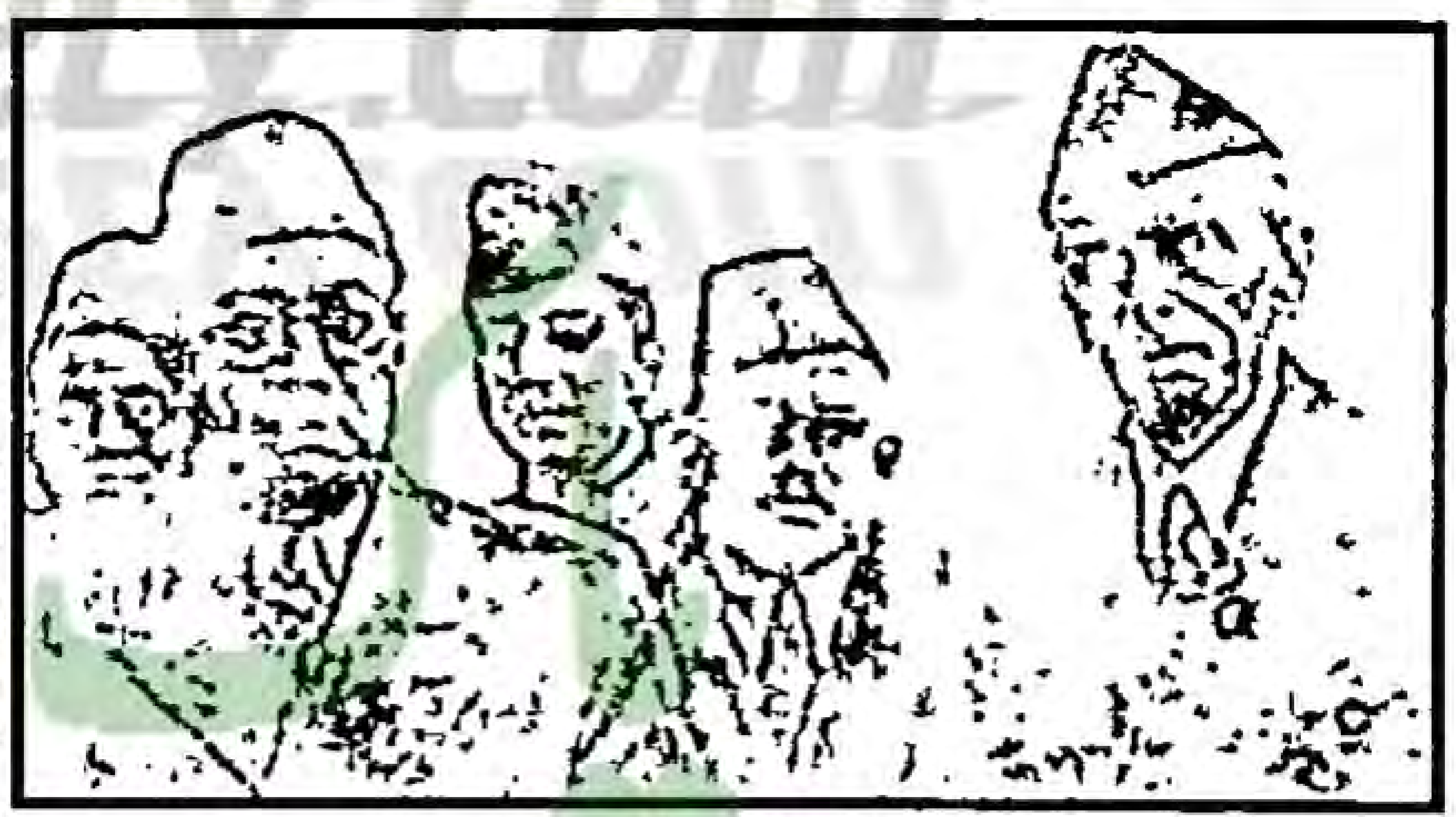

قائدین کی ٹوپی

امیر اور غریب اپنی اپنی استطاعت کے مطابق مہنگا یا سستا ٹوپ پہنتے ہیں اور خود کو تیز وتند مستانی ہوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی کن ٹوپ یا ٹوپ کی تصغیر ٹوپی ہے۔ ٹوپی انسانی لباس کا ایک اہم جزو ہے جو ضرورت کے علاوہ خوبصورتی اور رواج کے طور پر بھی برتی جاتی ہے۔ لباس کی مد میں اس پہناوے کو اگر گل سرسبد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ تہذیب۔ عزت ووقار اور شائستگی کی بھی علامت بلکہ نشان ہے۔ شاہی ٹوپی یا تاج' ٹوپی ہی کی ترقی یافتہ خاص شکل ہے جو بادشاہ یا شہنشاہ کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ کہتے ہیں نمرود پہلا بادشاہ یا شخص تھا جس نے ٹوپی یا تاج کا استعمال کیا۔ ہندی میں ٹوپی کو مکٹ (تاج) بھی کہا جاتا ہے۔ مکٹ اس ٹوپی کو بھی کہتے ہیں جو ہندو دلہا کے سر پر رکھتے ہیں۔ مور مکٹ یعنی مور کا سا تاج۔ تاج پر طاؤس۔ مور مکٹ والا۔ یا مکٹ دھاری سے مراد شری کرشن کنہیا ہیں چونکہ کرشن اکثر اس سنگھار (ٹوپی) سے رہتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا یہ لقب ہوا۔

دامنِ شاہد کنعاں ہے ہر اک دامنِ زیں
سر پہ کلغی کہ کنہیا کا ہے یہ مور مکٹ
(امیر)

فارسی میں ٹوپی کو افسر' کلاہ کلہ کہا جاتا ہے۔ فارسی محاورہ ہے کہ کلاہ احمد بر سر محمود ی نہد۔ یعنی احمد کی ٹوپی محمود کے سر یہ معنی ناانصافی کرنا۔

مشاعرے سے حسیں کیوں نہ چھین لے جاتے
رباعیاں مری چوگوشیاں کلاہیں تھیں
(امیر)

فرہنگ آصفیہ کے مطابق کلاہ یعنی لمبی ٹوپی جیسے کابلیوں کے پاس ہوتی ہے پہن کر لنگی (تہ بند) وغیرہ بھی باندھ لیتے ہیں۔ اوپر کا کام دار حصہ کھلا رکھتے' نمایاں رکھتے ہیں۔ اسی طرح فارسی میں کلاہ، ترل تاتاری ٹوپی کو کہا جاتا ہے ا امیر لوگ پہنتے ہیں نیز کلاہ فقیروں کی ٹوپی جو نمدے بنائی جاتی ہے۔
انگشتانہ (فارسی مذکر) چھلا لوہے کی خاردار شام نما انگلی ٹوپی جسے کپڑا سیتے وقت سوئی چبھنے سے بچانے کے لیے انگلی میں پہن لیتے ہیں ایک آہنی حلقہ کا نام ہے جسے تیر انداز تیر چلاتے وقت انگلی میں پہن لیتے ہیں اور اسی کو شست سوفار یا چھلی بھی کہا جاتا ہے۔ وہ تھیلی جو شکاری جانور کے سر پر چڑھا دیتے ہیں' ٹوپی کہلاتی ہے۔

وہ بدگماں ہوں کہ خط دے کر بند کیں آنکھیں
چڑھائی باز کی ٹوپی سر کبوتر پر
(وزیر)

عربی میں ٹوپی کو قلنسوہ' قلنسیۃ۔ جمع قلانس قلانیس اور قلوسۃ۔ جمع قلالیس' قلوسات ہے۔ چھوٹی ٹوپی کو قلیسہ کہا جاتا ہے۔ تقلنس' ٹوپی پہنانا۔ نوعمر و نوخیز اردو زبان مختلف قدیم زبانوں (ہندی' ترکی' عربی' فارسی' سنسکرت وغیرہ) کا دل کش مرقع ہے۔ چنانچہ اپنے محاورات اور اشعار میں ٹوپی کو اس خوبصورتی سے برتا اور نوازا کہ لباس میں ٹوپی کی اہمیت دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی۔ ذیل میں مختصراً کچھ کہاوتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ''ٹوپی اُچھالنا۔ خوشی میں کودنا۔ وجد اور خوشی کرنا ہرے ہرے پکارنا) یہ محاورہ اصل میں انگریزی زبان سے لیا گیا ہے مگر خواجہ حیدر علی آتش اور شعرائے لکھنو نے اردو میں

ہندو ٹوپی ن توپی

بھی اس کا استعمال کیا ہے اور فارسی میں بھی۔ کلاہ بر آسمان داشتن۔ کلاہ بہ ہوا انداختن۔ پایا جاتا ہے' سند دو اشعار۔

اترے ہو تم جو غسل کو عالم ہے وجد کا
دریا اُچھالتا ہے کلاہِ حباب کو
(خواجہ حیدر علی آتش)

آیا ہے جب سے ساقی اللہ رے جوشِ شادی
شیشے بھی انجمن میں ٹوپی اچھالتے ہیں
(نامعلوم)

ٹوپی اُتارنا۔ اُچھلنا۔ ٹوپی سر سے جدا کرنا ہونا (کسی کی بے عزتی یا توہین کرنا' ہونا) دوسرے کی ٹوپی اُچھالنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔
ٹوپی بدلنا۔ (کسی کو بھائی بنانا' اتحاد پیدا کرنا بھائی چارہ نا) دو دوستوں کا آپس میں ٹوپی کا تبادلہ کرنا۔

آئے جو کیف مے میں وہ گل گشتِ باغ کو
غنچے سے ٹوپی لالے سے پگڑی بدل چلے
(خواجہ حیدر علی آتش)

ٹوپی بدل بھائی (ایسا دوست جس سے بہت گہرا تعلق۔ وہ دوست جسے ٹوپی بدل کر دینی یا دنیاوی بھائی بنایا ہو۔

لی گھرایا زانہ)
ٹوپی پر ہاتھ ڈالنا (کسی کی بے عزتی یا توہین کرنا)
پگڑی اُتارنا (آبرو لینا' لوٹنا ٹھگنا کسی کی چیز کم قیمت پر لے نا۔ کسی کو دغا دینا)
ٹوپی چڑھانا۔ شکاری پرندوں کے سروں پر ٹوپی چڑھانا تاکہ ان کی آنکھیں بند رہیں اور وہ غیر ضروری شے یا شکار کے لیے اُڑنے نہ پائیں' وغیرہ۔
ٹوپی والا (معشوق۔ ٹوپی پہننے والا لڑکا' نوخیز' اَمرد)

دہلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا
(میر تقی میر)

اواج قزلباش درانی وابدالی آدمی جو اوّل اوّل سرخ ٹوپیاں پہنے نادر شاہ درانی (1739ء) اور احمد شاہ ابدالی (1759ء) کے ہمراہ ہندوستان میں آئے۔

کم نہیں کچھ ٹوپی والوں سے وہ طفلِ کج کلاہ
دیکھنے تنہا ذرا ہم اس کو کیوں کر جائیں گے
اس کے کوچے میں گزارا کب ہوا بے فوج اشک
ساتھ اپنے لے کے درانی کا لشکر جائیں گے
(شاہ نصیر)

فرنگی۔ انگریز اور یورپین لوگوں کو بھی ٹوپی والا کہا گیا۔
قزل باش۔ قزل ترکی زبان میں سرخ رنگ کو کہتے ہیں۔
قزلباش۔ سرخ سر والا۔ شاہ اسماعیل صفوی بادشاہ ایران کی فوج کا نام جو بارہ گوشوں کی سرخ ٹوپی پہنتی تھی' ان لوگوں کی اولاد بھی قزلباش کہلانے لگی۔ ٹوپی سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔ یعنی بے مشورہ کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ مشورے کے لیے اگر کوئی آدمی نہ ملے تو ٹوپی ہی سہی کہ مشورہ لازم ہے۔

کہتے ہیں اپنی ٹوپی سے بھی مشورت کرو
کہ قصدِ ترکِ شر ہے کبھو شرم مت کرو
(میر تقی میر)

ٹوپی کی بہت سی اقسام ہیں۔ دو پلی یا دو پلڑی ٹوپی۔ چوگوشیہ ٹوپی' گول ٹوپی' اونچی دیوار کی ٹوپی' اونی ٹوپی' قراقلی ٹوپی' چترالی ٹوپی جس میں پرندے کا پَر بھی لگا ہوتا ہے۔ ترکی ٹوپی' تکے دار ٹوپی۔ سندھی' بلوچی ٹوپی جو صدیوں سے اسی

لب پر نام کسی کا بھی ہو، دل میں تیرا نقشہ ہے
اے تصویر بنانے والی، جب سے تجھ کو دیکھا ہے
بے تیرے کیا وحشت ہم کو، تجھ بن کیسا صبر و سکوں
تو ہی اپنا شہر ہے جانی، تو ہی اپنا صحرا ہے
نیلے پربت، اودی دھرتی، چاروں کوٹ میں تو ہی تو
تجھ سے اپنے جی کی خلوت، تجھ سے من کا میلا ہے
آج تو ہم بکنے کو آئے، آج ہمارے دام لگا
یوسف تو بازارِ وفا میں، ایک ٹکے کو بکتا ہے
لے جانی اب اپنے من کے پیراہن کی گرہیں کھول
لے جانی اب آدھی شب ہے، چار طرف سناٹا ہے
طوفانوں کی بات نہیں ہے، طوفاں آتے جاتے ہیں
تو اک نرم ہوا کا جھونکا، دل کے باغ میں ٹھہرا ہے
یا تو آج ہمیں اپنا لے، یا تو آج ہمارا بن
دیکھ کہ وقت گزرتا جائے، کون ابد تک جیتا ہے
فردا محض فسوں کا پردا، ہم تو آج کے بندے ہیں
ہجر و وصل، وفا اور دھوکا سب کچھ آج پہ رکھتا ہے

ابن انشا

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا
اس دل کے دریدہ دامن کو، دیکھو تو سہی سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے، اس جھولی کا پھیلانا کیا
شب بیتی، چاند بھی ڈوب چلا، زنجیر پڑی دروازے میں
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو، سجنی سے کروگے بہانہ کیا
پھر ہجر کی لمبی رات میاں، سنجوگ کی تو یہ ایک گھڑی
جو دل میں ہے لب پر آنے دو، شرمانا کیا، گھبرانا کیا
اس روز جو اُن کو دیکھا ہے، اب خواب کا عالم لگتا ہے
اس روز جو اُن سے بات ہوئی، وہ بات بھی تھی افسانہ کیا
اس حسن کے سچے موتی کو، ہم دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں
جسے دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں، وہ دولت کیا، وہ خزانہ کیا
اس کو بھی جلا دکھتے ہوئے من، اک شعلہ لال بھبوکا بن
یوں آنسو بن بہہ جانا کیا، یوں ماٹی میں مل جانا کیا
جب شہر کے لوگ نہ رستہ دیں، کیوں بن میں نہ جا بسرام کرے
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا

ابن انشا

شکل میں ہیں۔ جناح ٹوپی، بھٹو ٹوپی، ماؤ ٹوپی یعنی جدید چین کے بانی ماؤزے تنگ کی ٹوپی۔ اسی طرح سرکاری ٹوپیاں مدرسہ، پولیس، تینوں بری، بحری اور فضائی افواج کی ٹوپیاں، سالگرہ کے موقعے پر بچوں، مسخروں اور بڑے ہوٹلز بیروں کی ٹوپیاں، کپڑے کے مختلف رنگ کے ٹکڑوں سے فقیروں کی ٹوپیاں۔ کالج یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر تختی نما (لوح قلم) ٹوپی۔ جنگ میں لوہے کی ٹوپی (خود) کا استعمال۔ بخاری شریف صفحہ نمبر 614 پر درج ہے کہ فتح مکہ کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرِ اقدس پر لوہے کی ٹوپی (خوذ مغفر) شرف سعادت سے ہم کنار تھی۔ جنگ کے علاوہ کان کنوں کی آہنی ٹوپی جس میں ٹارچ بھی نصب ہوتی ہے۔ بھاری مشینری کے کارکن بھی لوہے کی ٹوپی پہنے رکھتے ہیں۔ ہیلمٹ کا شمار بھی آہنی ٹوپی میں ہوتا ہے۔ انگریزی ٹوپیاں (HAT) تقریباً ساٹھ اقسام کی ہیں۔ ٹوپیوں کے ضمن میں حقے چلم اور پیچوان کی ٹوپی نیز قدیم توڑے دار بندوق۔ توپ کی ٹوپی، دوربین کی ٹوپی۔ اسی طرح ٹوپی دار سینخیں۔ کیلیں اور پن وغیرہ۔ اور ہاں، یاد آیا۔ خوب یاد آیا کہ وہ ٹوپی جو پگڑی کے نیچے پہنتے یا رکھتے ہیں طاقیہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح کروشیے سے بنی دھاگے کی جالی دار ٹوپی مختلف رنگوں میں عام استعمال ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے مذہبی پیشوا ''ربی'' کی مختصر گول ٹوپی بھی معروف شے ہے۔ کسی انتہائی بدصورت لڑکے کی شادی ہوئی تو بیوی کے پاس جاتے ہی اس نے سر اور چہرے پر مکمل کنٹوپ نما ٹوپی اوڑھ لی کہ صرف اس کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ بیوی نے پوچھا ''یہ کیا؟'' تو لڑکے نے جواب دیا ''چونکہ میں بے حد حسین اور خوبصورت ہوں اس لیے نظر بد سے بچنے کے لیے ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ یوں یہ ٹوپی ڈراما رچا کر اس نے ہمارے سیاست دانوں کو بھی راہ سجھائی کہ اپنے چہروں پر مختلف نقاب چڑھاتے رہو اور معصوم لوگوں کے ساتھ ٹوپی ڈراما کرتے رہو۔ ایک اور ٹوپی جو ہمارے سیاست دانوں کو از حد مرغوب ہے وہ سلیمانی ٹوپی ہے۔ انتخابات میں جیت جانے کے بعد یہی سلیمانی ٹوپی ان کا پہناوا بن جاتی ہے سو کسی کو بھی نظر نہیں آتے تا آنکہ اگلے انتخابات پر یہ سلیمانی ٹوپی وہ عارضی طور پر اُتار دیتے ہیں اور اس کی جگہ پھر کوئی نقاب (کنٹوپ نما ٹوپی) اوڑھ کر ٹوپی ڈراما رچا کر عوام کی ہمدردیاں سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی، باچا خان مرحوم کی سیاسی جماعت والی لال ٹوپی (سرخ پوش)۔

ہمت مرداں

صبا شفیق

وہ عمر میں چھوٹا ضرور تھا مگر حوصلے میں کسی پہاڑ سے کم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حادثے نے اس کے ایک بازو کو نگل لیا اور وہ گولف کھیلنے سے معذور ہوگیا تو اس نے حوصلے کی ڈور تھامی، معذوری کو مجبوری بننے سے روکا اور وہ کارنامہ دکھایا جس نے پوری دنیا میں اس کا نام روشن کردیا۔

[illegible] ناممکن کو ممکن کر دکھایا

میسی میز پر کھانے کے برتن رکھ رہی تھی جب اس کے بیٹے لیری نے اسے پکارا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک تھی اور آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔ پھر وہ ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا ''ماں، میری پیاری ماں! آج مجھے امریکا کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہیوسٹن یونیورسٹی سے گالف کا بہترین کھلاڑی ہونے کی بنیاد پر وظیفے کی پیشکش ہوئی ہے۔ اب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں گا اور ساتھ ہی کھیل میں اپنا مقام بناؤں گا۔ میں دنیا کو گالف کا چیمپیئن بن کے دکھاؤں گا۔''

اٹھارہ سالہ لیری دس سال کی عمر سے گالف کھیل رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا شوق جنون میں بدل گیا تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس کی ماں ایک مقامی آرٹ اسکول میں دستکاریاں سکھاتی تھی اور آرائش کی چیزیں گھر پر تیار کرکے انہیں بیچ کر گھر کا

www.paksociety.com

خرچہ چلاتی تھی اس لیے ننھے لیری کو اپنا گالف کا شوق پورا کرنے کے لیے اسکول کے بعد ایک گالف کورس میں ملازمت کرنا پڑی جہاں وہ شام کے وقت کھیل کر اپنا شوق بھی پورا کر لیتا۔ اس کی لگن اور محنت رنگ لائی اور وہ اپنے اسکول کی طرف سے گالف کا بہترین کھلاڑی منتخب ہوا۔ پھر اس نے کئی مقابلے جیتے اور اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ پانچ فٹ آٹھ انچ قد کا بہترین ایتھلیٹ بن چکا تھا اور اس کا شمار ملک کے سولہ بہترین گالف کے کھلاڑیوں میں ہونے لگا تھا اور اسے کئی یونیورسٹیوں سے وظیفوں کی پیشکش ہونے لگی تھی مگر آج ہوسٹن یونیورسٹی جیسی بڑی یونیورسٹی کی جانب سے وظیفے کی پیشکش نے اسے ایک انجانی خوشی بخشی تھی۔ اس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کی محدود آمدنی اور اس کی چھوٹی موٹی نوکریوں سے اس کا بہترین یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکتا تھا مگر آج اس کے خوابوں کو تعبیر ملنے جارہی تھی۔

ایک شام جب وہ گالف کھیل کر واپس آنے لگا تو اس کے ایک دوست نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اس نے نئی اسپورٹس کار خریدی تھی۔ لیری اور اس کا دوست نئی کار میں گھومنے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد لیری نے اپنے دوست سے کہا کہ وہ کار چلانا چاہتا ہے۔ لیری کے دوست کو قریبی دفتر میں کچھ کام تھا، وہ وہاں اُتر گیا اور لیری سے کہا کہ وہ کار لے جائے۔ گھومے پھرے اور تقریباً گھنٹے بعد اسے اس دفتر سے لے جائے، تب تک وہ اپنا کام نمٹالے گا۔ لیری کار لے کر ہائی وے پر آگیا۔ اس کو نئی کار میں بہت مزہ آرہا تھا۔ وہ گاڑی اُڑانے لگا، وہ بھول گیا تھا کہ ڈرائیونگ میں ایک چھوٹی سی غلطی بڑے حادثے کا سبب بن جاتی ہے۔ تیز رفتاری سے پرہیز لازمی ہے، یہی تیز رفتاری حادثے کا سبب بن گئی۔ گاڑی اُلٹ گئی۔ کار کی چھت اوپر سے کھلی تھی اس لیے لیری دور جاگرا۔ سڑک کنارے اُبھرے ہوئے آرائشی پتھر لگے تھے۔ وہ اُچھل کر انہی پر گرا تھا۔ پتھروں کی وجہ سے اسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کی آنکھ کے حلقے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور بائیں آنکھ باہر لٹک رہی تھی۔ اس کا جبڑا اور کندھا بھی ٹوٹ گیا تھا اور بائیں پاؤں کے ٹخنے کی ہڈی کئی جگہ سے چٹخ گئی تھی۔ اتنی زیادہ چوٹوں کے ساتھ جب لیری کو اسپتال پہنچایا گیا تو ڈاکٹرز اس کی حالت دیکھ کر سکتے میں آگئے۔ انہوں نے کار کے حادثے میں اس قدر شدید چوٹوں کے ساتھ بہت کم لوگوں کو زندہ بچتے دیکھا تھا۔ لیری کے بائیں ہاتھ میں پتھروں کی انی چبھ گئی تھی جس نے ہڈی کو جا بجا نقصان پہنچایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کو وزنی چیز سے کچلا گیا ہو۔ ہڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گوشت میں پیوست تھیں۔ سرجن نے جب آپریشن شروع کیا تو وہ جان گیا تھا کہ اگر لیری بچ بھی گیا تو اس کا بایاں ہاتھ کام نہیں کرے گا۔

سرجن نے اس کی ماں کو بتایا تو میسی نے صرف اتنا کہا "بس، میرے بیٹے کو کسی طرح بھی بچالیں۔"

سرجن نے کئی گھنٹے کے آپریشن کے بعد لیری کی جان بچالی مگر لیری کو تین دن تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں کو ڈر تھا کہ کہیں لیری کوما میں نہ چلا جائے مگر پھر ایک دن اچانک لیری کو ہوش آگیا۔ اس کا باپ بھی حادثے کے بعد سے اسپتال میں ہی تھا۔ وہ لیری سے دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگا۔ مگر لیری چونکہ ادویات کے زیر اثر تھا اس لیے اسے فوری طور پر معلوم نہیں ہوا کہ اس کا بایاں ہاتھ کٹ چکا ہے مگر جیسے ہی لیری مکمل طور پر ہوش میں آیا اور اسے ادراک ہوا کہ اس کا بایاں بازو کٹ چکا ہے تو وہ چیخنے چلانے لگا۔ پھر اپنے باپ سے گلے لگ کر خوب رویا۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی بات تھی۔

"اب میں گالف کیسے کھیلوں گا؟"

گالف اس کا عشق تھا۔ وہ بُری طرح بکھر رہا تھا۔ اسے نہیں سمجھ آرہا تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے کیسے کھیلے گا؟ عالمی چیمپین کیسے بنے گا؟ اعلیٰ تعلیم کیسے حاصل کرے گا؟ ایک پچھتاوا اسے گھیرے رکھتا کہ اس سب کا ذمّے دار وہ خود تھا۔ نہ وہ اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا، نہ حادثہ ہوتا اور نہ ہی اسے اپنے ہاتھ سے محروم اور اپنے خوابوں سے دستبردار ہونا پڑتا۔ لیری شدید ذہنی دباؤ کی کیفیت میں تھا۔ اسے خود پر بہت غصہ آتا۔ وہ ہروقت اداس اور غمگین رہنے لگا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنے خوابوں سے دست دار ہوکر وہ کیسے جیئے گا؟ پھر ایک دن لیری کی ماں نے اسے اس کا بچپن کا دوست ریان یاد کروایا جسے غدودوں کا کینسر تھا۔ ریان اور لیری آمنے سامنے والے گھروں میں رہتے تھے، وہ ریان کا بہترین دوست بھی تھا۔ لیری کو یاد آیا کہ اس نے ریان کو کبھی شکایت کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ شدید تکلیف میں بھی مسکراتا رہتا تھا۔ کیموتھراپی کے دوران اس کے سر کے سارے بال جھڑ گئے تھے، تب بھی کبھی لیری نے اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور پھر ایک سال میں ہی ریان کا مرض اسے موت کی جانب لے گیا مگر وہ بہت بہادر بچہ تھا اس لیے کبھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ لیری نے خود سے کہا "آج کے بعد میں خود پر کبھی افسوس نہیں کروں گا، خود کو قابلِ رحم نہیں سمجھوں گا۔ ریان نے اتنی بڑی بیماری کے خلاف لڑائی میں ہار نہیں مانی تھی، میں بھی کبھی ہار نہیں مانوں گا۔" اس

نے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کا عزم کرلیا تھا۔

چند دن بعد لیری نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ گالف کھیلنا چاہتا ہے۔ انہوں نے لیری کو تمام سامان لادیا، ابھی اس کے زخم پوری طرح بھرے نہیں تھے اس لیے وہ اسپتال میں ہی تھا سامان دیکھ کر وہ خوشی سے نہال ہوا تھا اور پھر ایک شام لیری اپنی اسٹک اور گیند کے ساتھ اسپتال کے لان میں موجود تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت جمع کرکے اپنے دائیں ہاتھ سے گالف اسٹک تھام کر جب گیند کو ضرب لگائی تو گیند صرف پچاس گز دور تک گئی۔ لیری کا وزن کافی کم ہوگیا تھا اور وہ بہت کمزور بھی ہوگیا تھا مگر اس نے کھیلنا دوبارہ شروع کردیا تھا اور پھر جب اسے اسپتال سے چھٹی ملی تو اس نے باقاعدگی سے مشق شروع کردی۔ کرسمس قریب تھا، اس کی ماں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ وہ کرسمس پر کیا تحفہ لینا پسند کرے گا۔ لیری نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک مصنوعی ہاتھ......"

میسی جانتی تھی، اس کا بیٹا مذاق نہیں کرتا اور وہ واقعی چاہتا ہے کہ اسے مصنوعی ہاتھ لگوادیا جائے۔ میسی نے اس سلسلے میں مختلف مصنوعی اعضا بنانے والے اداروں سے بات چیت شروع کردی مگر لیری کو ایسا ہاتھ درکار تھا جو طاقتور بھی ہو اور لچکدار بھی تاکہ وہ اسے بال پر ضرب مارتے وقت اپنی مرضی کے مطابق گھما سکے۔ بدقسمتی سے اس وقت ایسا کوئی مصنوعی ہاتھ دستیاب نہیں تھا اور میسی اپنے بیٹے کو یہ تحفہ ضرور دینا چاہتی تھی۔ سو اس نے مصنوعی اعضا کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرکے خود ہی ہاتھ کا خاکہ تیار کرنا شروع کردیا۔ خاکہ تیار کرنے کے بعد وہ اسے ایک مصنوعی اعضا بنانے والے ادارے کے پاس لے گئی۔ مگر ایک لچکدار کلائی اور مضبوط گرفت والا مصنوعی ہاتھ بنانا اتنا آسان نہیں تھا۔ میسی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور پھر ایک مصنوعی اعضا بنانے والے ادارے نے میسی کو اس کے خاکے کے مطابق ہاتھ فراہم کرنے کی ذمّے داری قبول کر ہی لی۔ اب اس کام کے لیے میسی کو کافی رقم درکار تھی۔ اس موقعے پر لیری کے دوست کام آئے اور انہوں نے لیری کے لیے فنڈ قائم کیے۔ اور مختلف مقابلوں کا اہتمام کیا اور اس سے اکٹھی ہونے والی تمام رقم میسی کو دے دی اور پھر کرسمس سے چند دن پہلے لیری کے لیے مصنوعی ہاتھ بن کر تیار ہوگیا۔ کرسمس والے دن جب میسی نے لیری کو تحفہ دیا تو وہ اسے کھولتے ہی خوشی سے چلّایا "میرا ہاتھ...... میرے خواب جو کبھی بکھر گئے تھے، اب سب پورے ہوں گے۔"

پھر وہ اپنی ماں کے گلے لگ کر رونے لگا۔ لیری کو نئے ہاتھ کو صحیح طرح سے استعمال کرنے اور اس سے اپنی گرفت مضبوط کرنے میں تقریباً دو ماہ لگ گئے۔ اب اسے اپنا مصنوعی ہاتھ واقعی اپنا ہاتھ لگنے لگا تھا۔

ایک شام جب لیری نے اپنی گالف اسٹک دونوں ہاتھوں میں تھام کر گیند پر ضرب لگائی تو وہ دو سو گز دور جاگری۔ لیری کی آنکھوں میں ناقابلِ یقین خوشی تھی۔ وہ اسی طرح کھیل رہا تھا جس طرح سال بھر پہلے کھیلتا تھا۔ لیری نے کالج جانا بھی دوبارہ شروع کردیا اور پھر کچھ ہی عرصہ میں وہ ایک بار پھر اپنے کالج کا بہترین کھلاڑی بن گیا اور ہوسٹن یونیورسٹی کی وظیفہ کی پیشکش ایک بار پھر اس کے دروازے پر دستک دینے لگی۔

آج لیری ہوسٹن یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کررہا ہے اور گالف کے عالمی مقابلے میں شرکت کی تیاریاں بھی۔ اس نے ایک ایسا ادارہ بھی بنایا ہے جو معذور بچوں کو مصنوعی اعضا فراہم کرتا ہے۔ لیری کہتا ہے "اپنی معذوری کو اپنی مجبوری مت بنائیں، خود کو کبھی حقیر نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ کی یہ معذوری آپ کو طاقت عطا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات اس لیے بنایا ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرے۔ کبھی شکست نہ مانے۔ بیماری اور معذوری ناکامی کی وجہ نہیں بلکہ ناکام وہ ہوتا ہے جو کوشش نہیں کرتا، خواب نہیں دیکھتا...... اور جو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے کوشش اور جدوجہد کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ خدا بھی ان کی ہی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں اس لیے کبھی ہمت نہ ہاریں، کامیابی خود ہی آپ کے قدم چومے گی۔"

▲▲▲

جو شخص ہر روز صبح شام، 10 مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود اور سلام بھیجے گا اس کے لیے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا "میں اس کا ہاتھ پکڑ کر مثلِ برق پل صراط سے گزاروں گا۔"

حضرت میکائیل علیہ السلام نے فرمایا "میں اسے حوضِ کوثر کا پانی پلاؤں گا۔"

حضرت اسرافیل علیہ السلام نے فرمایا "میں اس کے لیے اس وقت تک سجدے میں پڑا رہوں گا جب تک اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہ کردے۔"

حضرت عزرائیل علیہ السلام نے فرمایا "میں اس کی روح اس طرح قبض کروں گا جس طرح پیغمبروں کی کرتا ہوں۔"

مرسلہ: ندا فاطمہ، لاہور

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 60

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سویرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے لیے ماں جی کے سامنے دست سوال دراز کرتا وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ تعلیم مکمل کرکے میں نے کاروبار شروع کیا۔ سغیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا اپنے اوباش دوستوں سمیت ہم سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سغیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میری بھانجی ثمی اپنے ددھیال جارہی تھی کہ اس کی کار پر فائرنگ ہوئی۔ فائرنگ سے اس کا منگیتر بُری طرح زخمی ہوگیا۔ پھر ایک روز ہم سب عتیق کو اسپتال سے لانے پہنچے تاکہ اس کا علاج حکیم قاؤس سے کرا سکیں۔ حکیم قاؤس اس کا علاج کرنے لگا۔ زرین نے فرمائش کردی کہ میں یہاں بندرہ کر خود کو قیدی محسوس کررہی ہوں۔ میں اسے لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری وغیرہ کی طرف جاتا تھا۔ ہماری گاڑی بھی خراب ہوگئی۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ ہم اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانسر تھا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پُراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ براؤن نامی وہ کتا مونا کا تھا۔ سغیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے پھر اسلحہ وغیرہ پہنچانے کا انتظام کیا اور مونا وسادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائینز بریف کیس حاصل کرلوں۔ وہ مجھے لے کر اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم دیوار پھاند کر اندر پہنچے تھے کہ شہلا نے پستول نکال کر کہا کہ تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔ میں نے اسے قابو کیا اور راضی کرلیا کہ وہ بینک کا لاکر کھلوانے میں ہماری مدد کرے گی مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے اس کے پیروں میں نقلی بم باندھ کر کہا کہ یہ ریموٹ سے پھٹ سکتا ہے اگر تم نے غلط حرکت کی۔ تبھی اس نے عجیب حرکت کی اور اپنا پیر میرے پیروں میں پھنسا کر بولی

"میرے ساتھ تم بھی مروگے۔" بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا کہ یہ صرف احتیاطاً کیا ہے کیونکہ گزشتہ بار اس نے دھوکا کیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بینک جانے کے لیے راضی ہوگئی۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے دیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلایا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کرکے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کرلایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرکے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔

(اب آگے پڑھیں)

مجھے سمجھنے میں سیکنڈ لگا تھا کہ یہ سگنل دینے اور شاید ہماری گفتگو نشر کرنے والا آلہ تھا لیکن اس کی جسامت بہت ہی چھوٹی تھی۔ مشکل سے ایک انچ لمبی اور تہائی انچ چوڑی اس چپ کی موٹائی تین ملی میٹرز سے زیادہ نہیں تھی اور وزن شاید چند گرام تھا اس لیے جیکٹ کے فولڈ کالر میں اس کی موجودگی کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اگر یہ مائیکروفون کا کام بھی کرتی تھی تو میں نے اتنا چھوٹا مائیکروفون آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کا تفصیلی معائنہ کرتا یا اسے اُتارنے کی کوشش کرتا۔ دَرّے کے دوسری طرف سے آنے والی جیپ تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا تھا۔ میں نے جیکٹ پہنتے ہوئے جیپ کا رُخ کیا۔ مہرو میرے پیچھے لپکی۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہمیں یہاں سے روانہ ہونا ہے جلدی سے آؤ۔" میں نے عقب میں اشارہ کیا اور جیپ میں آگیا۔ فوراً ہی مہرو بھی اندر گھس آئی۔

"جلدی کس بات کی ہے؟" اس نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "کیا کوئی ہمارے پیچھے ہے؟"

"فکر مت کرو اگر کوئی پیچھے ہے تو میں اس سے نمٹ سکتا ہوں۔"

مہرو میں زنانہ تجسّس بہت زیادہ تھا۔ "یہ جو گاڑی آرہی ہے اس میں کوئی ہمارے پیچھے ہے؟"

"شاید۔" میں نے ٹالا کیونکہ اسے چپ کے بارے میں کیا سمجھاتا۔ اس نے پھر سوال کیا۔

"یہ تمہارے کوٹ سے کیا لگا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم شاید اسٹیکر ہے۔" میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اب ذرا خاموش ہو کر بیٹھو اور مجھے توجہ سے ڈرائیونگ کرنے دو یہاں ذرا سی غفلت کا مطلب ہے ہم کسی کھائی میں پڑے ہوں گے۔"

مہرو خاموش ہوگئی لیکن اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری وضاحتوں سے مطمئن نہیں تھی۔ میں نے سوات روانگی سے پہلے نقشہ دیکھا تھا ہمیں تقریباً ستر اسی میل کا فاصلہ طے کرنا تھا تب ہم اس مقام تک پہنچتے جہاں سے ہمیں وادی کی طرف پیدل سفر شروع کرنا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی ہم اس جگہ سے کوئی بیس میل دور تھے اور اگر سڑک آگے بھی صاف ملتی تو ایک سوا گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ جاتے۔ مجھے سو فیصد تو نہیں لیکن نوّے فیصد یقین تھا کہ اس بڑی جیپ میں فتح خان یا اس کے آدمی ہمارے پیچھے تھے۔ وہ اپنے باپ پر اعتبار کرنے والا نہیں تھا مجھ پر کیسے اعتبار کرتا حالانکہ سویرا کو قبضے میں لے کر اس نے مجھے بے دست و پا کردیا تھا اس کے باوجود اسے شک تھا کہ شاید میں کوئی چال چل جاؤں۔

اس لیے اس نے مجھے بالکل ہی آزاد نہیں چھوڑا تھا۔ نہ صرف اس کے آدمی میرا اور مہرو کا پیچھا کررہے تھے بلکہ اس نے میری جیکٹ میں ایک ایسی چپ بھی لگا دی تھی جو ہمارے مقام کی نشان دہی تو کرتی تھی شاید ہماری آوازیں بھی کہیں پہنچاتی تھی۔ فتح خان نے چالاکی دکھائی کہ چپ گاڑی میں لگانے کے بجائے میری جیکٹ کے کالر میں لگا دی۔ گاڑی خراب ہوسکتی تھی اور میں اسے خود سے چھوڑ بھی سکتا تھا لیکن اس موسم میں جیکٹ کہاں چھوڑتا؟

اس کی چال اب کسی قدر میری سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی قید میں رکھے گا تو میں اس طرح کام نہیں کروں گا جیسے آزاد رہنے کی صورت میں کرسکوں گا۔ اگر میں اس کی قید میں رہتے ہوئے ہیرے تلاش کرنے میں ناکام رہا تو اس وقت ناکامی میں وہ بھی شریک ہوگا لیکن اگر وہ مجھے آزاد کردے گا تو ہیرے تلاش کرنا مکمل طور پر میری ذمّے داری بن جائے گی اور میری ناکامی کی صورت میں وہ سویرا کو اپنی دھمکی کے مطابق مرشد کے حوالے کرنے میں آزاد ہوگا۔ اس لیے اس نے مجھے بہ ظاہر آزاد چھوڑا تاکہ میں اپنی پوری توجہ ہیرے تلاش کرنے پر لگا سکوں اور وہ

دور سے میری نگرانی کرتا رہے۔ جیکٹ کے کالر میں لگی چپ کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سے فتح خان یا اس کے آدمی صرف ہماری لوکیشن سے واقف ہوتے تھے یا اس کی مدد سے ہماری گفتگو بھی سنتے تھے۔ اگر یہ آواز بھی نشر کررہی تھی تو نہایت تشویش کی بات تھی۔ میں اس سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کرسکتا تھا اور اس کی موجودگی میں کھل کر بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن دوسری طرف میں اس چپ سے فائدہ بھی اُٹھا سکتا تھا۔ مجھے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ساتھ مہرو تھی جس کا میرے کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا اس کا ساتھ میرے لیے بوجھ تھا لیکن میں اسے لیے پھرنے پر مجبور تھا اس ویرانے میں اسے کہاں چھوڑتا۔ ایک آبادی میں فوراً کچھ لفنگے اس کے چکر میں آگئے تھے یہاں تو وہ کسی انسان نما بھیڑیے کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میں غور کررہا تھا کہ اس چپ سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ واقعی یہ چپ آواز بھی نشر کرتی تھی۔ دَرّے سے گزر کر ابھی تک وہ جیپ اس طرف نہیں آئی تھی حالانکہ ہم خاصے آگے آچکے تھے اور جیپ جس رفتار سے آرہی تھی اسے لازمی دَرّے کے پار آجانا چاہیے تھا۔ اس کا مطلب تھا اس میں فتح خان یا اس کے آدمی تھے اور وہ صرف اس لیے تیزی سے آئے تھے کہ میں رک گیا تھا جب میں نے دوبارہ سفر شروع کردیا تو انہوں نے بھی مناسب فاصلے سے تعاقب شروع کردیا۔ پیچھے تقریباً دو کلومیٹرز تک سڑک صاف تھی۔ میں نے ایک جگہ جیپ روک دی۔

"کیا ہوا جیپ کیوں روکی ہے؟" مہرو چونک کر بولی۔

"ایک منٹ میں ابھی آیا تم نیچے مت اُترنا۔" میں نے کہا اور جیپ سے باہر آکر ڈھلان سے نیچے جانے لگا اصل میں فطرت مجھے پکار رہی تھی۔ ایک منٹ میں فارغ ہوکر میں اوپر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

"تم کیوں باہر گئے تھے؟" مہرو نے پھر سوال کیا۔

"ایک اہم چیز چھپائی تھی۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ فتح خان کے ہاتھ لگ گئی تو میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

حسب توقع اس نے فوراً سوال کیا۔ "تم نے کہاں چھپائی ہے؟"

"نیچے سرخ پتوں والی ایک جھاڑی کے نیچے۔" میں نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور رفتار سست رکھی تھی۔ میری نظر عقبی آئینے پر تھی۔ تقریباً ایک کلومیٹر آگے نکل جانے کے بعد مجھے وہی بڑی جیپ اسی جگہ رکتی دکھائی دی جہاں میں نے جیپ روکی تھی۔ اتنی دور سے وہ بس گہرے سبز رنگ کا دھبا دکھائی دے رہی تھی اور اپنے رنگ کی وجہ سے پہچانی گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم ہورہا تھا کہ اس سے کوئی اترا ہے یا نہیں۔ میں نے جیپ کی رفتار بہت سست کردی لیکن روکی نہیں ورنہ وہ ہوشیار ہوجاتے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ وہاں کتنی دیر رکتے ہیں۔ مہرو نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ اگر میرے پاس دوربین ہوتی تو میں واضح دیکھ سکتا تھا کہ وہ گاڑی روک کر کیا کررہے تھے۔ بہرحال ان کی اس حرکت سے میرا شبہ پختہ ہوگیا کہ چپ آواز بھی نشر کررہی تھی۔ میری جیپ سڑک کے ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں سے وہ جگہ نظر نہیں آئی اس لیے میں نے جیپ روک لی اور سنانے کے انداز میں مہرو سے کہا۔

"میرا خیال ہے پیٹرول کم ہوگیا ہے ایک کین ٹینکی میں ڈال دیتا ہوں آگے مشکل نہ ہو۔"

حالانکہ ٹینکی ابھی نصف سے زیادہ ہی تھی۔ میں نے نیچے آکر ایک کین اُٹھایا اور ٹینک کا ڈھکن ہٹا کر کین سے اس میں پیٹرول ڈالنے لگا۔ میں نے جان بوجھ کر پیٹرول ڈالنے کی رفتار سست رکھی تھی۔ میری نظر وادی میں نیچے سڑک پر موجود گاڑی پر تھی۔ سست رفتاری کے باوجود ٹینک فل ہوگیا تھا اور نیچے والی گاڑی حرکت میں نہیں آئی تھی اس کا مطلب تھا وہ سرخ پتوں والی جھاڑی کو تلاش کررہے تھے جبکہ وہاں سرخ پتوں والی کوئی جھاڑی نہیں تھی۔ اس موسم میں کسی جھاڑی پر پتوں کا امکان بھی نہیں تھا۔ میں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتا تھا ورنہ ان لوگوں کو شبہ ہوجاتا کہ میں ان کی موجودگی اور تعاقب کرنے کا طریقہ سمجھ گیا ہوں۔ اس لیے مجبوراً میں آگے روانہ ہوگیا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہونے والا تھا اور میرے اندازے کے مطابق ابھی دس کلومیٹرز کا سفر باقی تھا۔ اندھیرے سے پہلے یہ سفر طے کرلیتا تھا ورنہ نقشے کے مطابق اس جگہ کی نشانیاں دیکھنا مشکل ہوجاتا۔ سفر کا آغاز تو اگلی صبح ہی کرنا تھا لیکن اس سے پہلے اس جگہ پہنچ جانا ضروری تھا۔

ایک بار بہت پہلے جب میں فتح خان کے ہتھے چڑھا تھا اور اس نے مجھے وہاں قید کیا تھا جہاں اس نے برٹ شا کو بھی قید کر رکھا تھا اور ایک گونگا بہرا غلام اس کی نگرانی پر معمور تھا۔ مجھے یاد ہے وہ جگہ اس وادی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر فتح خان نے برٹ شا کو اسی جگہ قید رکھا ہوا تھا تو ممکن ہے وہ جگہ وادی کے راستے میں آتی ہو۔ مگر سوال یہ تھا اگر وہ جگہ وادی کی طرف جانے والے راستے میں آتی تھی اور برٹ شا وہاں موجود ہوتا تب بھی میں اس سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا تھا اگر

PAKSOCIETY.COM

بات میری ذات کی ہوتی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں وہ جواری تھا جو اپنی ذات پر ہر داؤ کھیل جاتا لیکن بات سویرا کی تھی۔ میں اس کے لیے ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ابھی پانچ کلو میٹرز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ تاریکی چھانے لگی اور چند منٹ کے اندر ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس پہلے ہی آن کی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد مہرو نے کہا۔

''مجھے بھوک لگی ہے؟''

''بس کچھ دیر رک جاؤ۔ ہم اپنی پہلی منزل تک پہنچ جائیں اس کے بعد پیٹ پوجا کا بندوبست بھی کرتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ویسے تم چاہو تو پیچھے رکھے سامان میں سے کوئی چیز نکال لو۔ بس گرم کیے بغیر کھانی پڑے گی۔''

''نہیں میں بعد میں کھالوں گی۔'' اس نے انکار کر دیا۔

نقشے کے مطابق مجھے سڑک کے دائیں طرف ایک ایسی وادی میں مڑنا تھا جس کا آغاز وی کی صورت بناتی دو چھوٹی پہاڑیوں سے ہو رہا تھا اور جہاں وی کی دونوں لکیریں مل رہی تھیں۔ وہاں ایک چھوٹا سا نالا تھا جس پر چھوٹا سا پُل بنا ہوا تھا۔ ہمیں اسی مقام سے وادی کی طرف گھوم جانا تھا اور یہی لمبی وادی آگے جا کر اس وادی سے ملتی تھی جہاں برٹ شا نے کہیں ہیرے چھپائے تھے اور وہ ہیرے مجھ جیسے غیر متعلق آدمی کے لیے بھی مصیبت بن گئے تھے۔

جیپ کا آلٹی میٹر بتا رہا تھا کہ اس وقت ہم سات ہزار چار سو فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں ہر طرف برف کی سفیدی تھی۔ باہر کا درجہ حرارت کئی ڈگری منفی میں جا چکا تھا اور ابھی اس کے مزید گرنے کا امکان تھا۔ رات ہوتے ہی اوپر سے اوس نما دھند گرنے لگی اور کچھ دیر بعد دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جیپ کو مستقل پہلے گیئر میں رکھتے ہوئے چیونٹی کی رفتار سے سفر جاری رکھا۔ یہاں سڑک بھی تنگ تھی اور بعض مقامات پر تو بس گزرنے کی جگہ تھی۔ دو گھنٹے سے اس سڑک پر کوئی اور گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ گویا یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

سڑک اب نیچے کی طرف جا رہی تھی کیونکہ بلندی کم ہوتی جا رہی تھی۔ سات ہزار فٹ نیچے آنے پر ہمیں دائیں طرف وی کی صورت والی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ کہلانے کو چھوٹی تھیں ورنہ ان کی بلندی بھی ہزار فٹ سے زیادہ ہی تھی۔ ذرا دیر بعد ہم اس چھوٹے سے پُل تک پہنچ گئے جہاں سے اُتر کر ہمیں وادی میں داخل ہونا تھا۔ میں نے جیپ سڑک کے کنارے روک دی اور ٹارچ لے کر نیچے اُتر آیا۔ میں نے پُل کے دونوں طرف سے نیچے جانے والے راستے کا جائزہ لیا اور اگلے حصے کو بہتر پایا۔ میں جیپ یہاں سڑک پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

فی الحال تو ہمیں نیچے اُتر کر شب بسری کی تیاری کرنی تھی اگلی صبح دیکھتے کہ جیپ پر کہاں تک جا سکتے تھے اس سے آگے پیدل سفر کرتے۔ تاریکی اور دھند کی وجہ سے جیپ کسی قدر مشکل سے نیچے آئی اور اسے خشک نالے کے ساتھ روک کر ہم نیچے اُتر آئے۔ مہرو نے ذرا سی دیر میں کچھ خشک لکڑیاں جمع کیں اور الاؤ سلگا لیا۔ اگرچہ سامان میں اسپرٹ سے جلنے والا لیمپ اور اسپرٹ بھی تھا لیکن اسے بچا کر رکھنا ضروری تھا کہ آگے کہیں کام آتا۔ یہاں لکڑیاں مل رہی تھیں اور الاؤ سے خود کو بھی گرم کر سکتے تھے۔ کھانے کو ہمارے پاس بہت کچھ تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مہرو نے چیزیں نکالیں اور گرم کرنے لگی۔ میں نے کافی کا سامان نکال لیا اور کافی بنانے لگا کیونکہ کھلی فضا میں شدت سے گرم مشروب کی خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے کھانے سے پہلے کافی پی۔

الاؤ ایک بڑے پتھر کے پیچھے اس طرح روشن کیا تھا کہ سڑک سے اس کی روشنی نظر نہ آئے۔ ویسے بھی یہاں جھاڑیاں تھیں۔ فتح خان اور اس کے آدمی جانتے تھے کہ ہم کہاں ہیں۔ کھانے کے بعد میں نے دوبارہ کافی گرم کی اور اس بار مہرو نے بھی پی اور منہ بنا کر چپتی رہی۔ اس کی جیکٹ بھی تقریباً میری جیسی تھی اسے دیکھتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہتے ہوئے اس کے عقب میں آ کر اس کی جیکٹ کا کالر اوپر کیا اور حسبِ توقع مجھے اس پر بھی ویسی ہی چپ نظر آئی۔ میں نے کالر واپس موڑ دیا۔ مہرو سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچ کر اشارے سے اسے جیکٹ اُتارنے کو کہا اور اپنی جیکٹ بھی اتار دی۔ سردی کی شدت نے چند لمحے کے لیے اسے لرزا دیا تھا۔ وہ سمجھی نہیں تھی میں کیوں جیکٹ اُتارنے کو کہہ رہا ہوں۔ بہرحال اس نے بھی ہچکچاتے ہوئے جیکٹ اُتار دی تھی۔ میرے اشارے پر جیکٹیں وہیں الاؤ کے پاس چھوڑ دیں اور جیپ کے اندر آ گئے۔ میں اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھ رہا تھا اس لیے اندر آتے ہی دھیمی آواز میں کہا۔

''غلط مت سمجھنا، میں تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ ہمارے جیکٹوں کے کالر میں جو چیز لگی ہے اس سے ہماری

www.Paksociety.com

باتیں کہیں اور سنی جاتی ہیں۔"

اسے تعجب تو ہوا لیکن وہ بہرحال اس دور کی عورت تھی اس قسم کی چیزیں اب خانہ بدوشوں کے لیے بھی اجنبی نہیں رہی ہیں۔ اس نے کہا۔ "لیکن یہ تو بہت چھوٹی ہیں۔"

"ہاں اتنی چھوٹی چیز میں نے بھی نہیں دیکھی ہے لیکن تم نے دیکھا جب میں نے راستے میں فتح خان سے کوئی چیز چھپانے کی بات تم سے کی تو پیچھے آنے والی گاڑی اسی مقام پر رکی تھی اور وہ وہاں وہ چیز تلاش کرتے رہے تھے۔" میں ہنسا۔ "لیکن کوئی چیز ہوتی تو ملتی، بہرحال اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس چیز کی مدد سے وہ ہماری جگہ سے بھی واقف ہوتے ہیں اور ہماری باتیں بھی سنتے ہیں۔"

مہرو ذہین عورت تھی وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر پریشان ہو گئی "تب کیا کریں اس موسم میں کوٹ کے بغیر تو رہ نہیں سکتے۔"

"ظاہر ہے لیکن میں نے تمہیں اسی وجہ سے بتایا ہے کہ منہ سے بلاضرورت کوئی بات نہ نکالنا اور میں اگر کوئی کام کر رہا ہوں تو مجھے مخاطب بھی مت کرنا ورنہ فتح خان اور اس کے آدمی جان جائیں گے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں اور دشمن کا بے خبر رہنا ضروری ہے۔"

"یہ اس طرح تمہارے پیچھے کیوں ہیں؟" اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"فتح خان مجھ سے ایک کام لینا چاہتا ہے۔" میں نے گول مول انداز میں کہا۔ "یہاں بھی خاصی سردی ہے اب ہمیں اپنی جیکٹیں پہن لینی چاہئیں۔"

مہرو سمجھ گئی کہ میں اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہ رہا ہوں۔ ہم باہر آئے۔ جیکٹیں پہن کر کچھ دیر الاؤ کے پاس بیٹھے رہے۔ جب الاؤ بجھنے لگا تو اس پر مٹی ڈال کر ہم جیپ میں آ گئے۔ سارا سامان پہلے ہی جیپ میں رکھ دیا تھا کیونکہ باہر چھوڑنے کی صورت میں کوئی جنگلی جانور اس پر دست درازی کر سکتا تھا۔ ابھی تک مجھے یہاں کوئی جانور دکھائی نہیں دیا تھا سوائے چند آوارہ کتوں کے جو اس موسم میں پناہ کے لیے دربدر پھر رہے تھے۔ جنگلی جانور عام طور سے سرما میں نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہاں پر ریچھ، پہاڑی شیر، چیتے اور بھیڑیے بھی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مسلسل شکار سے ان کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے لیکن پھر بھی ہوتے ہیں۔ چند دن پہلے میں نے ٹی وی پر خبر سنی تھی کہ اسلام آباد میں دامن کوہ پر لوگوں نے چیتا دیکھا ہے۔ یہ اوپر کی سردی سے بچنے کے لیے یہاں نیچے آ گیا تھا۔

سردی کی شدت بڑھ گئی تھی لیکن گرم کمبلوں میں لپٹ کر کسی طرح نیند آ ہی گئی تھی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب میں نے برابر میں دیکھا تو مہرو غائب تھی۔ وہ کس وقت جیپ سے باہر گئی مجھے بالکل پتا نہیں چلا تھا میں نے اس کا کمبل چیک کیا وہ ٹھنڈا ہو رہا تھا یعنی مہرو کم سے کم پندرہ بیس منٹ سے غائب تھی۔ میں بھی جیپ سے اتر آیا۔ دھند مزید گہری ہو گئی تھی۔ میں نے ایک ٹارچ نکالی اور آس پاس کا معائنہ کیا پھر دبی زبان میں اسے آواز دی اگر وہ پچاس فٹ کے دائرے میں کہیں ہوتی تو میری آواز سن لیتی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ نالے میں وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی پھر میں الاؤ والی جگہ آیا۔ مہرو وہاں بھی نہیں تھی۔ پل اور سڑک والا حصہ تاریکی میں تھا لیکن میں نے اس طرف بھی دیکھ لینا مناسب سمجھا۔ یہ تو طے تھا کہ مہرو خود گئی ہے لیکن کہاں اور کیوں گئی تھی یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ جیسے ہی میں پل تک پہنچا ٹارچ کی روشنی میں وہ دوسری طرف سے آتی دکھائی دی۔ میں اس کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں کہا۔

"تم بتائے بغیر کہاں چلی گئی تھیں؟"

وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ "مجھے حاجت ہو رہی تھی۔"

"تو اس کے لیے پل کے دوسری طرف جانے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"اس طرف پانی نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "پانی دوسری طرف ملا ہے لیکن بہت سرد تھا میرے ہاتھ سن ہو گئے ہیں یہ دیکھو۔"

اس نے مجھے اپنے ہاتھ تھمائے جو واقعی نم اور یخ ہو رہے تھے۔ ہم واپس جیپ میں آ گئے۔ میرا شک کم ہوا تھا لیکن ختم نہیں ہوا۔ پانی وہ جیپ سے بھی لے سکتی تھی اس کے لیے اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم جیپ میں واپس آئے اور گرمائش کے لیے میں نے کچھ دیر کے لیے انجن چلا کر ہیٹر آن کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ ہیٹر کے ایگزاسٹ کے سامنے رکھے گرم کرتی رہی۔ جب ہاتھ گرم ہو گئے تو وہ دوبارہ کمبل میں لپٹ کر سو گئی۔ ابھی صبح کے چار بجے تھے اور سورج نکلنے میں یقیناً بہت وقت تھا۔ میں بھی کمبل اوڑھ کر اونگھنے لگا۔ کچھ دیر اس کے سانسوں میں ہلکی سی خرخراہٹ آ گئی جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ نیند میں جا چکی ہے۔ آدمی نقلی خراٹے تو لے سکتا ہے لیکن اس قسم کی خرخراتی آواز جان بوجھ کر نہیں نکال سکتا جس میں ایک فطری ردھم ہوتا ہے جو صرف گہری نیند کی صورت میں آتا ہے۔

میں نے مزید کچھ دیر انتظار کیا اور پھر بہت آہستگی سے اپنی جیکٹ اتارنے لگا۔ جیپ اور بالکل برابر میں سوئی مہرو کو ہلائے بغیر یہ کام کسی قدر مشکل ثابت ہوا تھا۔ اس کام میں کچھ مشکل تو ہوئی لیکن میں نے جیکٹ اتار دی اور پھر کمبل کو ایک طرف کرتے ہوئے دروازہ کھول کر خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ نئی جیپ کے دروازے بے آواز تھے۔ میں نے باہر آ کر اسے آہستگی سے بند کیا۔ صرف شرٹ میں سردی سے جو حشر ہوا وہ تو ظاہر ہے مگر اس کے بغیر چارا بھی نہیں تھا۔ میں دونوں ہاتھ بغل میں دبائے ٹٹولتے قدموں سے پل کی طرف بڑھا۔ میں ٹارچ استعمال نہیں کر سکتا تھا اس کی روشنی کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔

پل پر آ کر میں نے آس پاس کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ کچھ نظر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اگر آسمان صاف ہوتا تو پھر بھی دکھائی دیتا لیکن یہاں دھند اتنی تھی کہ روشنی کرنے پر پانچ گز سے آگے کچھ نظر نہ آتا۔ سناٹا گہرا تھا۔ میں سردی برداشت کرتے ہوئے خاموش کھڑا رہا۔ شاید دس منٹ گزر گئے اور اب میرے جسم نے بے اختیار کانپنا شروع کر دیا تھا۔ سردی میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے واپس چلے جانا چاہیے اور میں دبے قدموں واپس جیپ میں آ گیا۔ جیکٹ پہن کر اور کمبل اوڑھ کر میری جان میں جان آئی تھی۔

"اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔" مہرو نے مجھے ہلایا تو میں بیدار ہو گیا۔ باہر روشنی ہو رہی تھی اور دھند بھی کم ہو گئی تھی۔ میں نے محدود سی انگڑائی لینے کی کوشش کی تھی جو اس کا سوال سن کر ادھوری رہ گئی۔ "رات کو تم کہاں گئے تھے؟"

میں کچھ دیر ساکت رہا پھر بے پروائی سے کہا۔ "اسی کام سے گیا تھا جس کام سے تم گئی تھیں۔"

"دور گئے تھے؟" اس کی انکوائری جاری تھی۔

"نہیں یہیں تھا جیپ سے چند گز دور۔" میں نے جواب دیتے ہوئے اسے گھورا تو شاید اس کی سمجھ میں آ گیا کہ میں اس موضوع پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ چپ ہو گئی۔ ہم باہر آئے رات والی جگہ آگ جلائی اور مہرو ناشتا تیار کرنے لگی۔ جب تک اس نے ناشتا تیار کیا میں نے نالے میں کچھ دور جا کر دیکھا میرا خیال تھا کہ اس میں جیپ سفر کر سکتی تھی اس لیے جہاں تک ممکن ہوتا ہم جیپ کے ذریعے جاتے اور اس کے بعد کا سفر پیدل طے کرتے کیونکہ نقشے کے مطابق ہمیں کوئی بیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ امکان یہی تھا کہ آج شام تک ہم اس وادی میں ہوں گے۔ میں واپس آیا تو مہرو ناشتا بنا چکی تھی۔ خشک دودھ میں پانی ملا کر اس میں دلیہ بنا لیا تھا اور ساتھ میں چائے تھی۔ ناشتا کرتے کرتے سورج کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ ابھی نیچے سایا تھا لیکن چوٹیاں دھوپ میں آ چکی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ نالے کی زمین نم ہونے کی وجہ سے یہاں سردی کی شدت زیادہ تھی۔ یہ سردی جسم کو لگتی تھی اور اگر جسم کو زیادہ دیر حرکت نہ دی جائے تو جسم دکھنے لگتا ہے۔ مہرو نے برتن سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں کس طرح سفر کرنا ہے؟"

"جہاں تک ہو سکے گا جیپ سے جائیں گے اور جہاں سے آگے جیپ نہیں جا سکے گی وہاں سے پیدل سفر کریں گے۔"

اس نے نالے کی طرف دیکھا۔ "اس میں تو گاڑی مشکل سے چلے گی۔ خراب بھی ہو سکتی ہے۔"

"مشکل سے سہی لیکن چلے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ ویسے وہ ٹھیک کہہ رہی تھی جیپ اس راستے پر خراب بھی ہو سکتی تھی کم سے کم ٹائر پنکچر ہونے کا امکان بہت زیادہ تھا لیکن یہ کون سی میری تھی جو مجھے اس کی پروا ہوتی۔ اس مہم کی طرح یہ جیپ بھی فتح خان نے زبردستی میرے سر مار دی تھی۔ سامان رکھ کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ نالے کے پتھروں پر جیپ بری طرح اچھل رہی تھی اور بار بار قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ اس اچھل کود کا اثر ہم پر بھی ہو رہا تھا مگر پیدل چلنے کے مقابلے میں یہ مشقت کم تھی۔ مہرو کئی بار لڑھکی تو میں نے اسے بھی سیٹ بیلٹ باندھ دی۔ مگر اس سے لگنے والے جھٹکوں پر کوئی فرق نہیں آیا، جو ہڈیاں ہلائے دے رہے تھے۔ وہ اس طرح سفر کی عادی نہیں تھی اس لیے کچھ دیر بعد ہی بلبلا اٹھی۔ "میں ایسے سفر نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں نیچے اتار دیتا ہوں تم پیدل چل سکتی ہو بس تھوڑا سا تیز چلنا ہوگا۔" میں نے سر ہلایا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن میری پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے اس کا پیدل چلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ موسم کی وجہ سے نالا بالکل خشک پڑا تھا اور کہیں کہیں گڑھوں میں پانی جمع تھا۔ یہاں برف بہت کم تھی، شاید بالکل نشیبی جگہ کی وجہ سے برف کم پڑی تھی۔ پتھروں کی وجہ سے مجھے پوری توجہ سے ڈرائیو کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ ذرا سی غفلت سے جیپ کسی گڑھے میں اتر سکتی تھی یا کسی پتھر پر چڑھ کر الٹ سکتی تھی۔ یہاں فور وہیل ڈرائیو گیئر لگانا پڑا تھا۔ رفتار شاید دس میل فی گھنٹہ بھی نہیں تھی۔ پھر نالا سیدھا نہیں تھا بلکہ گھوم پھر کر جا رہا تھا اس لیے فاصلہ مزید بڑھ گیا تھا۔ نالے سے نکل کر سفر کرنے کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ دائیں بائیں ڈھلان تھی لیکن اس

www.Paksociety.com

پر پیدل سفر بھی مشکل سے ہی کیا جا سکتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بالآخر وہ مقام آ گیا جہاں سے آگے ہمیں پیدل ہی جانا تھا۔ یہاں نالا ایک کئی چٹان نے روک رکھا تھا۔ پانی اس کے اوپر سے آتا تھا اس لیے پانی کو تو کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی لیکن جیپ کے لیے اس کٹی چٹان پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا اس لیے ہمیں یہاں سے اوپر پیدل ہی جانا تھا۔ میں نے جیپ کو ممکن حد تک ایک طرف نالے کی دیوار پر چڑھا کر روک دیا۔ ہینڈ بریک کی وجہ سے یہ اپنی جگہ رکی ہوئی تھی۔ پھر میں نے سامان نکالا۔ جو بیگز سے باہر تھا اسے بیگز میں ڈالا۔ جیپ کو لاک کیا اور اس کی چابیاں پاس ہی ایک جگہ چھپا دیں۔ آگے کہیں یہ گم ہو سکتی تھیں۔ کسی موقع پر فرار کے لیے یہی ایک چیز ہمارے پاس تھی۔ پیدل چلنے کے خیال سے مہرو کا چہرہ اتر گیا تھا اور اب اسے شاید جیپ کے جھٹکے اچھے لگ رہے تھے مگر مجبوری تھی۔ جیپ یہاں سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔

میں نے کم وزنی بیگ اس کی پشت پر باندھا اور وزنی بیگ اپنی کمر پر لاد لیا۔ المونیم جوڑ کر بنائی جانے والی اسٹکس ساتھ تھیں جو دشوار راستوں پر سہارے کے کام آتیں۔ ویسے بھی پہاڑی سفر میں آدمی کو لازمی کوئی چھڑی رکھنی چاہیے تاکہ وہ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے راستے کو اس کی مدد سے جانچ سکے۔ سامان میں دستی کمپاس بھی تھے جو سمتوں کا تعین کرنے میں کام آتے۔ میں نے کمپاس اپنے پاس رکھ لیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نصف کے قریب سفر طے کر چکے ہیں اور اب اتنا ہی سفر اور باقی ہے۔ یہ پورا علاقہ تہ در تہ پہاڑوں پر مشتمل تھا اور یہاں ہموار زمین نہ ہونے کے برابر تھی۔ جہاں ایک پہاڑ ختم ہوتا وہیں سے دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ اسی لیے یہاں آبادی نہیں تھی۔ پہاڑوں پر شاید کہیں چرواہوں کے گرمائی گھر تھے جنہیں بہک بھی کہتے ہیں لیکن سردیوں میں وہ نیچے کے علاقوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مجھے آس پاس کوئی ایسی نشانی نظر نہیں آئی جس سے پتا چلتا کہ یہاں لوگ بستے ہیں اور انسانوں کی آمد و رفت ہوتی ہے۔ چاروں طرف زمین فطری حالت میں نظر آ رہی تھی۔ خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے مہرو نے بھی یہ بات محسوس کر لی اس نے کہا۔ ”یہ علاقہ ویران ہے یہاں انسان نہیں رہتے ہیں۔“

”ہاں شاید یہ دشوار گزار ہے اور کسی سڑک سے دور پڑتا ہے۔“

ہم کوشش کر کے کٹی چٹان پر چڑھ گئے تھے یہاں سے آگے راستہ زیادہ تر پتھریلا تھا۔ نالے کی تہ میں پتھروں کی تہ بچھی تھی اور اس پر چلنا بہت دشوار تھا اس لیے ہم کسی قدر اوپر ڈھلان کی طرف آئے اور اس پر سفر کرنے لگے۔ سورج بلند ہونے سے دھوپ اب نیچے تک آ رہی تھی۔ لیکن اس سے سردی کی شدت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ بس صبح کے مقابلے میں دھند نہیں تھی اور راستہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھلانوں پر اونچے درخت لگے تھے۔ جنگل کی وجہ سے ہی کٹاؤ کم تھا۔ عام طور پر جنگل کنارے بسنے والے لوگ ہمیشہ جگہ چھوڑ کر درخت کاٹتے ہیں تاکہ ڈھلانوں کی زمین مضبوط رہے اور لینڈ سلائیڈنگ نہ ہو۔ گزشتہ کچھ سالوں سے آنے والے سیلاب اسی وجہ سے آ رہے ہیں کہ ٹمبر مافیا نے اوپری پہاڑوں پر اُگے جنگل کاٹ دیے ہیں اور اب سرما میں پڑنے والی برف بھی جلد پگھل جاتی ہے اور بارش ہونے کی صورت میں پانی بلا رکاوٹ تیزی سے نیچے آتا ہے۔ لینڈ سلائیڈنگ کے واقعات بھی بڑھ گئے ہیں شاہراہ قراقرم پر واقع عطا آباد میں لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے جھیل بنی ہے جس نے بے شمار دیہات کو ڈبو دیا ہے۔ شاہراہ قراقرم کا ایک حصہ بھی پانی تلے آ گیا ہے۔ یہ سب درختوں کی بے دریغ کٹائی کا نتیجہ ہے۔

شمالی علاقے کے بارے میں ہمارا گمان یہ ہے کہ یہاں ہر طرف اونچے پہاڑوں پر درخت ہی درخت ہیں اور سبزہ ہی سبزہ ہے۔ ممکن ہے آج سے کوئی چالیس سال پہلے ہمارا گمان درست ہو لیکن فی الحال بہت سارے پہاڑ درختوں اور سبزے سے محروم ہو چکے ہیں۔ کئی سرسبز مقامات چٹیل پہاڑوں میں بدل گئے ہیں۔ سبزے کی کمی کی وجہ سے آٹھ سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر بعض اوقات غضب کی گرمی ہو جاتی ہے اور انسان گرمی کی شدت سے جان بہ حق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس علاقے میں جنگل ابھی محفوظ نظر آ رہے تھے۔ راستوں کی دشواری کی وجہ سے یہاں کے جنگل محفوظ تھے۔ مگر کب تک جیسے ہی یہاں آمد و رفت کے راستے بنیں گے اور حضرت انسان کے قدم پہنچیں گے یہاں بھی تباہی کا عمل شروع ہو جائے گا۔

ڈھلان پر چلنا بھی آسان نہیں تھا برف کی وجہ سے پاؤں پھسل رہے تھے لیکن یہ نالے کے پتھروں کے مقابلے میں زیادہ آسان راستہ تھا۔ اب تک کے سفر میں مجھے غور و فکر کا موقع کم ملا تھا۔ سفر ہی اتنا دشوار تھا لیکن اس ڈھلان پر چلتے ہوئے مجھے سوچنے کا موقع ملا تھا۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ فتح خان اتنا احمق نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھ سے ایسا کوئی مطالبہ کرے

جس کا پورا کرنا نہایت دشوار ہو۔ بلکہ یہ ناممکن کام تھا۔ صرف دس دن میں جس میں سے اب صرف سات دن باقی رہ گئے تھے مجھے ہیرے تلاش کرنے تھے۔ اگر سچ مچ فتح خان کا یہ مقصد نہیں تھا تو وہ مجھ سے بلا وجہ کی یہ مشقت کیوں کرا رہا تھا اور صرف مجھ سے ہی نہیں کرا رہا تھا بلکہ خود بھی مشقت میں پڑا ہوا تھا مجھے یقین تھا کہ فتح خان میرے پیچھے تھا۔ اتنے اہم معاملے کو اپنے کسی ساتھی پر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب چل چل کر ہماری ٹانگیں دکھنے لگی تھیں اور مہرو نے اعلان کیا کہ اب اس سے مزید نہیں چلا جائے گا تو ہم آرام کرنے کے لیے ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مہرو اب فکر مند تھی۔ اس نے صبح سے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اب وہ رہ نہیں سکی تھی۔ ”فتح خان تم سے اور مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“

”اپنے بارے میں تو میں بتا چکا ہوں کہ وہ مجھ سے ایک چیز تلاش کروانا چاہتا ہے لیکن تمہارے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔“

مہرو نے سوچ کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے وہ مجھے تمہارے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ دیکھا تھا اس بازار میں اچانک وہ بدمعاش لوگ آ گئے تھے اور وہ چاہتے تو مجھے آسانی سے لے جاتے لیکن وہ جیسے کھیل رہے تھے۔ مجھے چھیڑ رہے تھے پھر تم نے دیکھ لیا اور جب ان کو مارا تو وہ کتنی آسانی سے مار کھا گئے۔“

میں نے سوچا کہ وہ عقل مند تھی۔ خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن منہ سے کہنے سے گریز کر رہا تھا اس نے کہہ دیا۔ وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ فتح خان مجھ پر دوہری نظر رکھ سکے۔ ایک جیپ کسی وجہ سے خراب بھی ہو سکتی تھی لیکن دو جیپس میں اس کا امکان کم تھا۔ دوسرے میرے ساتھ کوئی ہوتا تو میں اس سے بات کرتا اس طرح فتح خان کو جاننے میں آسانی رہتی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اکیلا آدمی کس سے بات کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ اس نے مہرو کو بھی میرے ساتھ کر دیا تھا۔ فتح خان انسانوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے میں مشاق تھا اس نے مہرو کو پہلے اپنے آدمیوں کے حوالے کیا پھر مجھے دکھا کر ڈرایا اور اب اس طرح سے استعمال کر رہا تھا حالانکہ وہ اس کے کئی اہم آدمیوں کی قاتلہ تھی۔ مگر فتح خان نے اسے احمقانہ انتقام کی بھینٹ نہیں چڑھایا تھا بلکہ وہ اسے استعمال کر رہا تھا اور جب اس سے کام نکل جاتا تب وہ اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیتا کہ وہ اپنے ساتھیوں کا انتقام لے لیں۔ مہرو ایک خوب صورت عورت تھی اور عورت کے معاملے میں فتح خان اور اس کے آدمی جانوروں سے بھی بدتر تھے، وہ اسے ایسے ہی مار دیتے قتل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

”اب تم کیا چاہتی ہو اگر واپس جانا چاہتی ہو جا سکتی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کسی آبادی میں یہ ممکن تھا لیکن یہاں سے میں کیسے واپس جاؤں اور مجھے یقین ہے فتح خان اور اس کے آدمی پیچھے ہوں گے وہ مجھے پکڑ لیں اور میرے ساتھ.....“ وہ بولتے بولتے رک گئی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ ہر عورت کی طرح اس کے لیے یہ بھی ذلت کی بات تھی، وہ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ مگر اس کا یہ خدشہ بالکل درست تھا کہ وہ لوگ پھر اس سے وہی سلوک کریں گے اور اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک وہ مر نہیں جاتی۔

فتح خان سے میرا واسطہ وقفے وقفے سے پڑتا رہا تھا۔ اس سے پہلی مڈبھیڑ میں تاثر ایسا تھا کہ وہ نہایت وحشی اور عقل و خرد سے عاری مجرم شخص ہے جو صرف قتل و غارت گری کرنا جانتا ہے۔ لیکن اپنے دوسرے دور میں وہ پہلے سے بالکل مختلف شخص نظر آیا تھا وہ نہایت چالاکی سے کام لیتا تھا اور اپنے حریفوں کو حیران کر دیتا تھا۔ جب مجھے ایسا لگتا کہ اب میں فتح خان کو سمجھ گیا ہوں تو وہ مجھے کوئی نئی چیز دکھا کر حیران کر دیا کرتا تھا۔ درحقیقت میں نے ہمیشہ اسے انڈر اسٹیمیٹ کیا تھا۔ اسے ایک معمولی درجے کا بدمعاش سمجھا۔ میں نے اسے مرشد کے پائے کا حریف نہیں سمجھا تھا حالانکہ وہ حیرت انگیز طور پر مرشد کی گرفت سے بھی نکل آیا تھا۔ پھر اس نے مرشد کو نقصان پہنچایا اور اسی کے شہر میں دندناتا پھر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا میں نے اسے کمتر سمجھ کر غلطی کی تھی اور آج مجھے اسی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ میں آزاد ہوتے ہوئے بھی اس کی مرضی کی خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

اگر مہرو کو ڈرانے اور روکنے والے فتح خان کے آدمی تھے تو انہوں نے مجھے اتنی آسانی سے پستول کیسے دے دیا تھا۔ یہ تو دشمن کو مسلح کرنے والی بات ہوتی۔ میں نے مہرو کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے جیکٹ کے اندر موجود پستول نکالا۔ اس میں سے میگزین نکال کر اس کو کھول ڈالا اور پھر اس میں سے فائرنگ پن غائب دیکھ کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے پستول اتنی آسانی سے میرے حوالے کر دیا تھا۔ میں خوش تھا کہ میں نہتا نہیں تھا لیکن اب پتا چلا کہ پستول کی حیثیت ایک کلو لوہے سے زیادہ نہیں تھی۔ میں بلا وجہ اسے اٹھائے اٹھائے گھوم رہا تھا۔ لیکن اس سے یہ تو

www.Paksociety.com

ثابت ہوگیا کہ بازار میں حملہ کرنے والے فتح خان کے ہی آدمی تھے اوران کا مقصد مہرو کو مجھ سے الگ ہونے سے روکنا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ ان کے حملے کی وجہ سے میں نے مہرو کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ میں تو اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے آرام کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے اور مزید ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اس وادی میں داخل ہوگئے۔ میں نے پہلی نظر میں وادی کو شناخت کرلیا کیونکہ اس کے وسط میں وہ قدرتی پتھریلے کھنڈر تھے جہاں ایک وقت میں فتح خان اس کا ساتھی، ایمن اور برٹ شا موجود تھے اور فتح خان ایمن کو یرغمال بنا کر اس کے باپ سے ہیرے حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ان ہی قدرتی کھنڈرات میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب پیاس سے میں اور ایمن مرنے کے قریب ہوگئے تھے۔ گرمی بلا کی تھی اور گرمی کے موسم میں یہ چٹانیں تپ جاتی تھیں۔ پانی فتح خان کے پاس تھا وہ ہمیں پانی دینے کے لیے تیار نہیں تھا اس کا ساتھی لالچ میں آگیا تھا اور دونوں میں ٹھن گئی تھی بالآخر فتح خان کا ساتھی مارا گیا اور وہ زخمی حالت میں برٹ شا کو لے کر فرار ہوگیا میں اور ایمن کئی دن تک پہاڑوں میں بھٹکنے کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے۔ وادی دیکھتے ہی مجھے ماضی کے وہ مناظر یاد آگئے تھے۔ میں ایک بار پولیس کے ساتھ بھی یہاں آیا تھا جو برٹ شا کی گمشدگی کی تفتیش کررہی تھی۔ مگر نتیجہ صفر نکلا۔

''رک کیوں گئے ہو؟'' مہرو نے مجھے خاصی دیر سے ساکت دیکھ کر کہا۔ اس وقت ہم وادی میں داخل ہونے والے حصے پر کھڑے تھے یہاں کسی قدر بلندی تھی اور سامنے دور تک پھیلی وادی کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر یہاں زیادہ برف نہیں تھی خاص طور سے وادی کا وسطی حصہ تو صاف تھا شاید یہاں پڑنے والی برف تیز دھوپ کی وجہ سے پگھل گئی تھی۔ البتہ بلند ہوتی پہاڑی ڈھلانوں پر برف دکھائی دے رہی تھی۔ مہرو کی آواز پر میں چونکا اور اس کی طرف دیکھا۔

''ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں مجھے یہیں وہ چیز تلاش کرنی ہے۔''

وہ مجھے گھور رہی تھی۔ ''کیا وہ کوئی قیمتی چیز ہے؟''

''ایسا ہی سمجھو لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے البتہ فتح خان اس کے پیچھے پاگل ہورہا ہے۔'' میں نے کہا اور نیچے اُترنا شروع کردیا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ وہ چیز کہاں ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''وہ اس ایک میل پر پھیلی وادی میں کہیں بھی ہوسکتی ہے۔''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''تب تم اسے کیسے تلاش کروگے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''لیکن میرے پاس سات دن کی مہلت ہے۔''

''سات دن۔'' وہ تقریباً چلا اُٹھی۔ ''یہاں تو کوئی چیز تلاش کرنے کے لیے سات مہینے بھی ناکافی ہیں۔ فتح خان تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے، اس نے شاید تمہیں یہاں پھنسانے کے لیے بھیجا ہے۔''

''شاید۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔ مہرو کا ردِعمل دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال آرہا تھا۔ وادی میں اُترتے ہوئے میں نے قدرتی پتھریلے کھنڈر کا رُخ کیا۔ مہرو اب خاموشی سے میرے پیچھے آرہی تھی۔ سورج اب سر پر آگیا تھا اور کچھ دیر بعد یہ ڈھلنا شروع ہوجاتا۔ کھنڈروں میں ایک غار نما جگہ منتخب کرکے ہم نے اپنا سامان رکھا اور بیٹھ کر سستانے لگے۔ میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''میں تھک گیا ہوں کچھ دیر آرام کروں گا۔''

''میں بھی تھک گئی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ بہت مشکل سفر ہے۔ کاش میں تمہاری بات مان لیتی اور واپس چلی جاتی۔''

''اس وقت مان لیتیں اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔''

میں نے کہتے ہوئے اپنی جیکٹ اُتارنی شروع کی اور اسے بھی جیکٹ اُتارنے کا اشارہ کیا اس بار وہ میری بات سمجھ گئی اور اس نے بے چوں چرا کیے جیکٹ اُتار دی۔ ہم دبے قدموں اس غار سے ذرا دور آئے جہاں سے چپس میں لگے مائیکروفون ہماری آواز کیچ نہیں کرسکتے تھے۔ پھر بھی میں نے سرگوشی سے کام لیا۔ ''مہرو اصل بات یہ ہے کہ فتح خان تمہیں واپس جانے نہیں دیتا اگر تم ایسی کوشش کرتیں تو وہ تمہیں قتل کردیتا۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے۔''

''تم نے اس کے چار نہایت اہم آدمیوں کو قتل کیا ہے اور وہ کسی صورت تمہیں معاف نہیں کرے گا۔''

''مگر اس طرح چھوڑنا سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟''

''اس نے چھوڑا نہیں ہے اب بھی تم اس کی قیدی ہو۔ وہ تمہاری اور میری مکمل نگرانی کررہا ہے ہماری آوازیں تک سن رہا ہے۔ مجھے یقین ہے اس وقت بھی وہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اس طرح تمہاری مدد سے میری نگرانی کے لیے

تمہیں چھوڑا ہوا ہے لیکن جیسے ہی اس کا کام نکلے گا وہ تمہیں مار دے گا یا اپنے درندہ صفت ساتھیوں کے حوالے کردے گا، دونوں صورتوں میں تمہارا ایک ہی انجام ہوگا۔''

مہرو ڈر گئی تھی۔ ''میں سمجھتی ہوں پر میں کیا کروں؟''

میں نے نظر جما کر اسے دیکھا۔ ''مہرو اگر تم ہمت کرو تو اپنے ساتھ میری جان بھی بچا سکتی ہو اور تمہارا مستقبل بھی محفوظ ہوسکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تمہیں کوشش کرکے یہاں سے نکلنا ہوگا اور ایک جگہ پہنچنا ہوگا وہاں سے تمہیں مدد مل جائے گی۔''

''کہاں پر؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم لیکن تمہیں مغرب کی طرف جانا ہوگا شاید ان پہاڑوں کے پیچھے۔'' میں نے مغرب کی طرف پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے پیچھے آبادی ہے وہاں تمہیں راجا عمر دراز کے بارے میں معلوم کرنا ہوگا۔ ایک بار تم اس کے پاس پہنچ گئیں تو بالکل محفوظ ہوجاؤ گی۔ پھر تم میری مدد بھی کرسکوگی۔''

''راجا عمر دراز تمہارا دوست ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے میں جاؤں گی۔'' خلافِ توقع وہ فوراً مان گئی ورنہ میرا خیال تھا کہ اس اجنبی علاقے اور پھر اس موسم میں وہ اتنی آسانی سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ ''لیکن فتح خان میرے کوٹ کی وجہ سے میرے پیچھے نہیں آئے گا۔'' اس نے نقطہ اُٹھایا۔

یہ سوچنے کی بات تھی فتح خان فوراً جان جاتا کہ وہ مجھ سے الگ ہوکر کہیں جارہی ہے۔ وہ اسے دوبارہ پکڑ لیتا یا مار دیتا۔ مجھے جیکٹ میں لگی چپ کا کچھ کرنا تھا۔ سوچتے ہوئے ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ ''دیکھو تم کسی بہانے مجھ سے لڑوگی اور یہ ظاہر ایسا ہوگا کہ تم مجھ سے لڑوگی اور میں تمہیں دھکا دوں گا تم گروگی اور کوٹ میں لگی چپ پتھر سے ٹکرا کر بے کار ہوجائے گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن میں تم سے کیوں لڑوں گی؟''

''کسی بھی بہانے ... اس لیے بھی لڑسکتی ہو کہ میں تمہیں اُجاڑ جگہ لے آیا ہوں اس طرح جب تم فرار ہوگی تو فتح خان کو یہ بھی حقیقت لگے گی ورنہ وہ بہت شاطر آدمی ہے اتنی آسانی سے کسی بات پر یقین نہیں کرتا۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ راضی ہوگئی۔

''لیکن اداکاری ٹھیک کرنا فتح خان کو ایسا لگے کہ تم سچ مچ مجھ سے لڑ رہی ہو۔'' میں نے کہا اور ہم واپس آگئے۔ میں نے اپنی جیکٹ پہن لی اور مہرو کی جیکٹ اپنے پاس رکھی۔ پھر میں نے اس سے کہا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟''

''میں تو پھنس گئی۔'' اس نے روہانسے انداز میں کہا۔ ''مجھے کیا پتا تھا تم مجھے ایسی جگہ لے آؤ گے۔''

وہ اچھی اداکاری کررہی تھی۔ میں نے اشارے سے داد دے کر کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔''

''نہیں۔'' وہ چلائی۔ ''تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔'' وہ اُٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔

''ارے... ارے تمہارا دماغ خراب ہے پیچھے ہٹو۔''

مہرو نے یوں چیخ ماری جیسے میں نے اسے دھکا دیا ہو اور وہ پیچھے جا گری ہو اور اسی لمحے میں نے مہرو کی جیکٹ کے کالر میں لگی چپ کو انگلیوں سے دبا کر توڑ دیا۔ پھر بولا۔

''کیا ہوا تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''جنگلی اتنی زور دے دھکا دیا میری گردن پتھر سے ٹکرائی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولی۔ میں نے اشارے سے اسے بہترین اداکاری پر داد دی اور بولا۔

''معاف کرنا تم پر بھی تو اچانک بھوت سوار ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے تمہیں یہاں آنے سے پہلے بتا دیا تھا۔'' میں نے جیکٹ اسے تھمائی۔

وہ جیکٹ پہنتے ہوئے بولی۔ ''میں واپس جاؤں گی۔''

''میرا نہیں خیال کہ تم واپس جاسکوگی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے فتح خان اور اس کے آدمی یہاں کہیں آس پاس موجود ہوں گے۔''

''مجھے یقین نہیں ہے وہ کہیں نظر نہیں آئے۔''

''تم فتح خان کو جانتی نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال جب تم کوشش کروگی تو تمہیں خود پتا چل جائے گا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنی جیکٹ اُتاری اور مہرو کو ذرا دور لایا۔ ''میں وادی کا جائزہ لینے نکلوں گا اور تم یہاں رہوگی۔ تم اپنے راستے کے لحاظ سے کھانے پینے کا سامان اپنے بیگ میں ڈال کر یہاں سے نکل جانا۔''

اس کے چہرے پر فکر کے تاثرات نظر آئے۔ شاید اب وہ اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ''کیا میں وہاں پہنچ جاؤں گی؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''لیکن آدمی ہمت اور کوشش کرے تو کیا نہیں کرسکتا۔

.....یوں سمجھ لو تمہیں فتح خان کی قید سے فرار ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ اس لیے تمہیں یہ سوچنا نہیں چاہیے کہ آگے کیا ہوگا۔ ...تم اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤ۔"

"تم بھی اپنی چیز کو اسی طرح توڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔" اس نے تجویز دی اس کا اشارہ جیپ کی طرف تھا۔

"میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ میری ایک عزیز ترین ہستی فتح خان کی قید میں ہے اور میں اس کے لیے ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ لیکن تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے اس لیے تم جاسکتی ہو۔"

اس نے سر ہلایا اور شاید پہلی بار مجھے ممنونیت سے دیکھا۔ "شہباز تم ایک اچھے آدمی ہو۔"

"تم بھی باحوصلہ عورت ہو، اگر کوئی اور عورت ایسے سانحات سے گزری ہوتی تو شاید مر جاتی' لیکن تمہارا حوصلہ برقرار ہے۔ اگر تم کامیاب رہیں تو یقین کرو فتح خان تمہارے قدموں میں ہوگا اور تم اس سے اپنی مرضی کا سلوک کرسکو گی۔"

فتح خان سے انتقام کا سن کر اس کے تاثرات کسی قدر غضبناک ہو گئے اور اس نے دانت پیس کر کہا۔ "اگر مجھے موقع ملا تو میں اس کی شہ رگ اپنے دانتوں سے اُدھیڑوں گی۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں اور اس دوران میں تم بیگ لے کر فرار ہوسکتی ہو۔"

"لیکن میں کس طرف سے جاؤں؟" اس نے مغربی پہاڑوں کی طرف دیکھا۔

"دیکھو جہاں تک ممکن ہو چھپ کر جاؤ درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "وہ ڈھلان دیکھ رہی ہو بس اس پر چڑھتی رہنا اسے پار کرو گی تو اس وادی سے نکل جاؤ گی۔ پھر تمہیں جہاں کہیں آبادی ملے وہاں بلا جھجک راجا عمر دراز کا نام لے لینا وہ اس علاقے میں بہت مشہور ہے اور اس کا باپ سچ مچ یہاں کا حکمران ہوتا تھا۔"

مہرو متاثر ہوئی تھی۔ "اس کا مطلب ہے' وہ بہت دولت مند ہوگا۔"

"دولت مند تو ہے لیکن یہاں اس کی بہت عزت ہے ایک بار تمہیں اس کے پاس پناہ مل گئی تو فتح خان جیسے دس بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور ہاں دولت سے یاد آیا تمہیں رقم کی ضرورت پڑے گی۔" میں نے فتح خان کی دی ہوئی رقم میں سے کچھ نکال کر اس کے حوالے کی۔ "یہ رکھ لو کام آئیں گے۔ مجھے یقین ہے کل تک تم کسی آبادی تک پہنچ جاؤ گی۔"

یہ سب میں مہرو کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ وہ فرار ہوتے وقت مایوسی کا شکار نہ ہو۔ مجھے اندازہ تھا کہ اکیلے ہوتے ہی اور پھر رات ہونے کے بعد اس کے حوصلے میں فرق آئے گا۔ کچھ بھی سہی وہ ایک عورت ہی تھی اور ہمارے ہاں عورت ہمیشہ کمزور سمجھی جاتی ہے۔ میں اسے سمجھا کر واپس آیا اور اپنی جیکٹ دوبارہ پہنتے ہوئے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" مہرو نے کہا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے کسی قدر ترش روئی سے جواب دیا۔ "مجھے اپنا کام کرنا ہے۔"

"میں اکیلی رہوں گی۔"

"ظاہر ہے۔ میرا کام تمہاری چوکیداری کرنا نہیں ہے۔" میں نے روانگی کی نیت کی اشارے سے اسے خدا حافظ کہہ کر غار سے نکل آیا۔ سورج مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر فتح خان اور اس کے ساتھی وادی کے آغاز میں موجود ہوئے تو ڈھلتے سورج میں مغرب کی طرف جاتی مہرو کو دیکھنا آسان نہیں ہوگا۔ میں شمال کی اس ڈھلان کی طرف جانے لگا جہاں میں نے بہت پہلے برٹ شا کو بندھے پایا تھا۔ یہ کام فتح خان کے ساتھی کا تھا جو برٹ شا کو لے کر چھپائے گئے ہیروں کی تلاش میں نکلا تھا۔ برٹ شا اسے بھی بھٹکا تا رہا تھا اس لیے فتح خان کے ساتھی نے باندھ کر اس پر تشدد شروع کر دیا تھا۔ لیکن وہ اس سے ہیرے حاصل نہیں کرسکا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ راجا عمر دراز کی قید سے نکالنے کے بعد فتح خان ہمیں لے کر اسی ڈھلان پر سفر کر رہا تھا جب برٹ شا نے اس کی نیت بھانپتے ہوئے ہیرے کہیں چھپا دیے تھے۔ اس لیے میری توجہ کا مرکز یہی شمالی ڈھلان تھی۔

ذرا نیچے پڑنے والی برف پگھل کر پانی کے ایک چھوٹے تالاب کی صورت میں جمع ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے پاس موجود مگے سے پانی چکھ کر دیکھا۔ یہ بہت یخ لیکن بالکل صاف ستھرا بلکہ مخصوص پہاڑی پانی کی مہک لیے ہوئے تھا۔ میں نے گزشتہ چند دنوں میں بہت کم پانی پیا تھا کیونکہ سردی کی وجہ سے پیاس ہی نہیں لگ رہی تھی حالانکہ پیاس نہ بھی لگ رہی ہو تو پانی پینا چاہیے۔ میں نے اپنی پلاسٹک کی چھاگل نما بوتل میں یہ پانی بھر لیا اور اس کے گھونٹ گھونٹ لیتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ پانی اتنا یخ تھا کہ گھونٹ فوری حلق سے اُتارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جب اس کی ٹھنڈ زائل ہو جاتی تو میں اسے پیتا تھا۔

ڈھلان پر درختوں تلے برف کم تھی البتہ کہیں کہیں پتوں سے جھڑنے والی برف کے ڈھیر پگھل رہے تھے۔ دن میں گرمی کی وجہ سے برف پگھلتی تھی لیکن رات ہوتے ہی پانی دوبارہ جم جاتا تھا اور صرف وہیں پانی ہوتا جہاں قدرتی چشمے تھے جو زمین کے اندر کی گرمی کی وجہ سے پانی کی صورت میں موجود رہتے تھے۔ مجھے کھنڈر سے نکلے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اب تک مہرو جا چکی ہوگی۔ اتنا وقت سامان سمیٹ کر نکلنے کے لیے بہت تھا، وہ کیا کیا لے جانا چاہتی تھی یہ میں نے اس پر چھوڑ دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت یہاں گزاروں اور سورج غروب ہونے کے بعد ہی واپس جاؤں کیونکہ اگر مہرو فتح خان یا اس کے ساتھیوں کی نظر میں نہیں آتی تو اس کا پتا اس وقت چلتا جب میں واپس جاتا۔

ڈھلان پر سفر کے دوران میں اسٹک سے زمین ٹھونک ٹھونک کر دیکھ رہا تھا اور اتنی بلند آواز سے فتح خان کو سنا رہا تھا کہ وہ خود بھی سن لے۔ اس نے بھی انتہا کر دی تھی۔ مجھے ایک ایسا کام سونپ دیا تھا جو بھوسے میں سوئی تلاش کرنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ میں درختوں میں گھومتا پھر رہا تھا۔ دوپہر میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ سفر میں موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس لیے آتے ہوئے میں اپنے ساتھ تلے مٹر کا ٹن لے آیا تھا۔ ایک درخت کے ساتھ بیٹھ کر میں وہ کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں غور بھی کرتا رہا تھا کہ برٹ شا ہیرے کہاں چھپا سکتا ہے۔

جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا، اس بات کو ایک عشرے سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تھا۔ اس دوران میں یہاں بے شمار تبدیلیاں آچکی تھیں جہاں کبھی گھنے درخت تھے وہاں اب خالی جگہ تھی اور جہاں کبھی خالی زمین تھی وہاں بیس پچیس فٹ اونچے درخت کھڑے تھے۔ اسی طرح بارشوں اور گرم سرد کے عوامل نے چٹانوں کو بھی جگہ جگہ توڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وادی کے وسط میں پائے جانے والے قدرتی کھنڈر کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ اس میں بہت ساری چٹانیں ٹوٹ گئی تھیں اور اوپر کی چٹانیں ٹوٹ کر کھنڈر کا روپ دھار رہی تھیں۔ گویا کھنڈر میں توسیع ہو رہی تھی۔ یہاں زمین مکمل طور پر پتھریلی تھی جس میں کوئی بڑا درخت جڑ نہیں پکڑ سکتا تھا' لیکن چھوٹے چھوٹے پودے اور جھاڑیاں کونے کھدروں میں جمع ہونے والی مٹی میں اُگ آئے تھے۔

وادی میں ہزاروں اونچے درخت تھے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں جھاڑیاں اور پودے تھے۔ چٹانیں تھیں اور کئی مقامات پر چشمے بھی تھے۔ اب برٹ شا نے ان میں سے کس کو ہیرے چھپانے کے لیے منتخب کیا تھا یہ جاننا تقریباً ناممکن تھا۔

میں نے اس بات پر غور کیا جس وقت برٹ شا ہیرے چھپا رہا ہوگا اس وقت اس کی سوچ کیا ہوگی۔ ظاہر ہے پہلی سوچ تو یہی ہوگی کہ جیسے ہی موقع ملے گا وہ یہاں سے ہیرے نکال لے جائے گا اور اس نے کم سے کم وقت ہی سوچا ہوگا۔ مگر اس کا بھی تو امکان تھا کہ اسے طویل عرصے تک ہیرے نکالنے کا موقع نہ ملے۔ اس صورت میں اس نے ہیرے چھپانے کے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کی ہوگی جہاں ہیرے طویل عرصے تک محفوظ رہ سکیں اور اس دوران میں ماحول میں اتنی تبدیلی نہ آئے کہ وہ جگہ ہی نہ ملے۔ اس کی نشانیاں ختم ہو جائیں۔

میں سوچوں میں اتنا گم ہوا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب سورج ڈوب گیا اور کب تاریکی چھا گئی۔ اچانک کوئی پرندہ بولا تو اس کی کرخت آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ پہاڑی کوا تھا جو کہیں سے کھا پی کر آیا تھا اور اس وقت آرام کے موڈ میں تھا۔ اپنے گھونسلے تلے ایک آدمی کی موجودگی کا بُرا منایا تھا اس لیے اس نے کائیں کائیں کر کے مجھے خبردار کیا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ "اچھا بھائی تم آرام کرو۔ ہم چلتے ہیں۔"

بے مروت کوّے نے ذرا بھی شکریہ ادا نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ شاخوں میں کہیں چھپا بیٹھا تھا اور بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر ہلکی سی دمک باقی تھی۔ میں نے بیگ سے ٹارچ نکال کر روشن کی اور راستہ دیکھتے ہوئے نیچے آنے لگا۔ میں نے وادی میں آنے کے بعد محسوس کیا تھا کہ یہاں سردی اتنی نہیں ہے۔ یعنی سردی ایسی نہیں تھی جو جسم کو تکلیف دیتی۔ یہاں میں نے دو بار جیکٹ اُتاری تھی لیکن مجھے محسوس نہیں ہوا ورنہ راستے میں جب جیکٹ اُتاری تھی تو جسم سن ہو کر رہ گیا تھا۔ آتے ہوئے میری نگاہیں وادی میں ہر طرف اُٹھ رہی تھیں کہ شاید مجھے کہیں روشنی نظر آئے لیکن فتح خان اور اس کے ساتھی احمق نہیں تھے۔ اگر وہ کہیں تھے تب بھی خود کو چھپا کر رکھا تھا۔ ایک جگہ خشک جھاڑیاں دیکھ کر میں نے ان سے خاصی مقدار میں لکڑیاں نکال لیں یہ رات میں جلانے کے کام آتیں۔ اگرچہ مجھے ابھی تک کوئی جانور دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ہوسکتا تھا یہاں بھیڑیے یا اس قبیل کے بڑے جانور آ جاتے ہوں۔ سردی کے ساتھ ان سے بچاؤ کے لیے آگ جلانا لازمی تھا۔ ویسے بھی دن میں گرم ہو جانے والے یہ پتھریلے کھنڈر رات کو بہت سرد بھی ہو جاتے ہیں ..... لکڑی اُٹھائے میں اندر داخل ہوتے ہوئے مہرو کو آواز دی۔

"مہرو تم کہاں ہو؟"

ظاہر ہے اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اسی طرح اسے آواز دیتا ہوا غار نما جگہ میں داخل ہوا۔ پھر

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

حیرانی سے مہرو کے غائب ہونے کا انکشاف کیا۔ اس کا بیگ اور دوسرا سامان بھی غائب تھا اور یہ دیکھ کر میں بچ بچ اُچھل پڑا کہ وہ کھانے پینے کا اچھا خاصا سامان لے گئی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ ستر فیصد لے گئی تھی اور صرف تیس فیصد چھوڑا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے غصہ آیا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں یہاں قیام کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ اگر مہرو احتیاطاً زیادہ چیزیں لے گئی تھی تو اس نے ٹھیک کیا تھا کیونکہ اسے نامعلوم علاقوں کی طرف جانا تھا۔ جبکہ میں ایک معلوم جگہ تھا اور مجھے خوراک کی ضرورت ہوتی تو میں واپس بھی جا سکتا تھا۔ مہرو دو بیس کے قریب تندوری نان چھوڑ گئی تھی جو میں پکوا کر لایا تھا۔ یہ نان خاصے عرصے تک ہمارے کام آسکتے تھے اور میں اکیلا تو دس دن سے زیادہ بھی گزارا کر سکتا تھا۔ شکر ہے وہ کافی اور اس کا سامان چھوڑ گئی تھی اس کے علاوہ وہ ٹارچیں اور بڑی تعداد میں ان کے ڈرائی سیل لے گئی تھی۔

میں نے دکھاوے کے لیے اسے کچھ بُرا بھلا کہا اور پھر لکڑی ایک طرف رکھی اور پتھر جمع کر کے الاؤ کی جگہ بنائی۔ لکڑی پر تھوڑا سا اسپرٹ چھڑک کر آگ دکھائی تو وہ دھڑا دھڑ جلنے لگی اور غار تلے خوشگوار درجہ حرارت اور خوشبو پھیل گئی تھی۔ مگر لکڑیاں جتنی تیزی سے جل رہی تھیں لگتا تھا رات گزارنے کے لیے مجھے دوبارہ لکڑی جمع کرنا پڑے گی۔ خیر ابھی تو لکڑی خاصی تھی۔ میں نے دکھاوے کے لیے مہرو کو آس پاس تلاش کیا حالانکہ میں پہلے اعلان کر چکا تھا کہ وہ سامان لے کر نو دو گیارہ ہو گئی ہے۔ میں مہرو کو نہیں بلکہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جو ممکنہ طور پر مہرو کا پیچھا کرنے کی کوشش کرتے لیکن مجھے وادی میں کہیں نقل و حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شاید فتح خان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے مہرو کو صرف مجھ پر نظر رکھنے کا ذریعہ بنایا تھا اور اب میں وادی میں تھا یہاں سے فرار کی صورت میں وہ مجھے روک سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا ڈراما کامیاب رہا تھا ورنہ فتح خان فوراً ہی یہاں آن موجود ہوتا۔

رات کے کھانے کے لیے میں نے روٹی کے ساتھ اُبلے گوشت کا ایک ٹن کھولا اور اسے الاؤ پر گرم کر کے روٹی کے ساتھ کھایا۔ کافی کی کیتلی پہلے ہی رکھ چکا تھا۔ کافی پی کر میں اونگھنے لگا۔ اس سفر کے دوران اور اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ہیرے کیسے تلاش کروں؟ کیا میں فرہاد کی طرح بنا کسی تیشے کے زمین کھودنا شروع کر دوں۔ اس کے علاوہ میں ہیرے تلاش کرنے کے لیے اور کیا کر سکتا تھا؟ جیسے جیسے میں اس پہلو پر سوچ رہا تھا میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر فتح خان نے مجھ سے اتنی احمقانہ توقع کیوں لگائی تھی؟ اگر وہ ہیروں کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا تب بھی اسے کم سے کم اپنے کیے کے بھگتان کا اندازہ ہونا چاہیے تھا۔

اس وادی میں کہیں چھپی چھوٹی سی چیز تلاش کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ یہاں تو کسی ہاتھی کو دفن کر دیا جائے تو اس کا سراغ ملنا بھی ناممکن ہوتا۔ یہ تو مٹھی میں آجانے والی چھوٹی سی چیز تھی۔ مجھے یاد ہے ہیرے ایک سیاہ رنگ کے بکس میں تھے جو شاید فولادی تھا اور اسے خاص طریقے سے چاروں طرف سے بند کیا گیا تھا۔ تبھی برٹ شا نے بلا جھجک اسے کہیں دفنا دیا تھا۔ ویسے بھی ہیرے خود بہت سخت ترین اور سوائے حرارت کے اور کسی چیز سے متاثر نہ ہونے والی چیز ہیں۔ کیونکہ یہ خالص کاربن سے بنے ہوتے ہیں اس لیے ہلکی سی آگ بھی انہیں جلا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ موسم، پانی اور تیزاب تک سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔

کافی ختم کر کے مگ الاؤ کے پاس رکھ کر میں نے خیمہ نکالا۔ یہ زمین پر خود بہ خود لگ جانے والا خیمہ تھا بس اسے کھولنا پڑتا تھا۔ ایک طرف سے چھوٹا سا گنبد نما اور دوسری طرف سے لمبا سا۔ اس میں آدمی گھس کر بس لیٹ جائے۔ یہ کسی گرم میٹریل سے بنا تھا اور باہر کی سردی سے خاصی حد تک محفوظ رکھتا تھا۔ میں نے خیمہ کھولا اور زمین پر رکھ دیا۔ یہ زپ سے مکمل طور پر بند ہو جاتا تھا اور اس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے جالی لگی تھی لیکن اس سے کیڑے مکوڑے اور اسی طرح کے دوسرے رینگنے والے جانور نہیں آسکتے تھے۔ میں نے اسے آگ سے ذرا دور رکھا تا کہ چنگاڑی اتفاق سے بھی اس پر نہ آسکے ورنہ یہ جل بھی سکتا تھا۔ میں نے گزشتہ دن سے جوتے نہیں اُتارے تھے اس لیے ابھی جوتے اُتارے تو اندر سے پیروں کی کھال گلی سی نکلی۔ اگر میں ایک دو دن اور جوتے نہ اُتارتا تو پیروں کی کھال بھی موزے کے ساتھ اُتر جاتی۔

پاؤں خشک کر کے میں کمبل لے کر خیمے میں گھس گیا۔ اس کی چھت میں ایک چھوٹی سی فکس لائٹ لگی تھی آن کیا جاتا تو وہ نائٹ لیمپ کا کام دیتی۔ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ذہن میں رہ رہ کر فتح خان اور پھر مہرو کا خیال آتا تھا اور نیند اُڑ جاتی تھی بڑی مشکل سے مجھے نیند آئی۔ پھر رات کسی وقت آنکھ کھل گئی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی ہے۔ میں نے آہستہ سے خیمے کی زپ کھولی اور دم بہ خود رہ گیا۔ وہ ذرا سا ترچھا بیٹھا تھا اور چہرہ بھی جیکٹ کے ہڈ میں چھپا تھا لیکن مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں

آئی تھی۔ وہ فتح خان تھا اس نے اپنی جگہ سے ہلے یا میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تم اُٹھ گیا ہے۔ ہمارا کوشش تھا تم آرام کرتا ابھی صبح ہونے میں وقت ہے۔"

مگر جب فتح خان سامنے ہو تو آرام کیسے کیا جا سکتا تھا۔ میں خیمے سے نکل آیا اور جوتے موزے پہن لیے۔ الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال دی گئی تھیں اس لیے وہ بجھا نہیں تھا۔ میں فتح خان کے مخالف سمت بیٹھ گیا۔ میں اسے دیکھنے کے باوجود پُرسکون تھا اور میرے اعصاب میں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ میں خوش تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ فتح خان کا اس طرح سامنے آنا ثابت کرتا تھا کہ اس کی اصل اسکیم وہ نہیں تھی جو اس نے مجھے بتا کر یہاں بھیجا تھا۔ اس کا اصل پلان کچھ اور تھا جو جلد یا بدیر میرے سامنے آجاتا میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "فتح خان تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"ایک مقصد تو پورا ہو گیا۔" اس نے بھی پورے سکون سے کہا۔ "تمہیں یہاں لانا تھا تو لے آیا۔"

"لیکن تمہارا اصل مقصد تو ہیرے ہیں۔"

"ہاں اصل مقصد تو وہی ہے۔" فتح خان بولا۔

"پھر یہ ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"سب تمہارے سامنے آجائے گا۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔ "شہباز خان جلدی مت کرو۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "فتح خان شاید تم اس وقت اپنی برتری اور کمانڈنگ پوزیشن کی وجہ سے خود کو کچھ سمجھ رہے ہو لیکن جب تمہاری یہ پوزیشن نہیں ہوگی اور میں مجبور نہیں ہوں گا تب کے بارے میں تم نے سوچا ہے؟"

"اس کا ہمیں ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بے فکری سے جواب دیا۔ "ہم ناکام ہوا تو دنیا میں نہیں ہوگا اور کامیاب ہوا تو اس ملک میں نہیں ہوگا۔ کوئی نہیں جانے گا کہ فتح خان کہاں غائب ہو گیا۔"

فتح خان جس طرح بے فکری سے یہاں بیٹھا تھا اسے یقین تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی جذباتی قدم نہیں اُٹھاؤں گا۔ مگر وہ صرف اپنے یقین پر مطمئن ہونے والا شخص نہیں تھا، مجھے یقین تھا کہ آس پاس اس کے آدمی موجود ہوں گے اور میری کسی بھی خلاف معمول حرکت پر وہ بھی حرکت میں آجائیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی حرکت کی صورت میں میرے جسم میں ایک سوراخ کا اضافہ اور ہو جائے۔ اس لیے میں نے کسی جذباتی حرکت سے گریز کیا، ویسے اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اگر میں فتح خان کو کوئی نقصان پہنچا بھی دیتا تو اس سے مجھے سویرا واپس نہیں ملتی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم میرے پیچھے ہو گے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم ٹھیک سمجھا میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا ہے۔"

میں نے کافی تیار کی اگرچہ فتح خان کو زہر دینے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن فی الحال کافی بھی دہی دے دی۔ اس نے میری اچھی خاصی زندگی کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ میں مرشد کے خلاف فیصلہ کن مرحلے کی طرف جا رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے بھی معاملات سیٹ کرانے کو کہا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں تھا کہ مرشد وہی کرے گا جو ڈیوڈ شا کہے گا لیکن اس کے شامل ہونے سے مرشد پر ایک طرح کا دباؤ ضرور آتا۔ دشمن کو ہر طرف سے گھیرنے والی پالیسی بہترین ہوتی ہے۔ اسے گھیر کر اس مقام تک لے آؤ جہاں اس سے اپنی بات منوا سکو۔ میں اور میرے ساتھی اسی حکمت عملی کے تحت کام کر رہے تھے پھر درمیان میں بریف کیس والا مسئلہ بھی آسانی سے حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ میں نے غلطی یہ کی کہ شہلا پر کچھ زیادہ بھروسا کر لیا۔ اگر میں اپنے ساتھیوں اور منصوبے کے تحت کام کرتا تو شاید یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ کم سے کم میں فتح خان کے سامنے اتنا بے بس نہ ہوتا کیونکہ اس نے سویرا کو اغوا کرنے کے منصوبے پر بہر صورت عمل کرنا تھا چاہے میں اس کے ہاتھ آتا یا نہ آتا۔

"سویرا کہاں ہے؟"

"محفوظ ہے اور فکر مت کرو اس کے ساتھ صرف شہلا ہے۔ وہی اس کا دیکھ بھال کر رہی ہے۔" اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "اُدھر ہمارا کوئی اور آدمی نہیں ہے۔"

لیکن میں اس کی تسلیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "فتح خان سویرا کو واپس حویلی بھیج دو، میں تمہارے قبضے اور تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا ہاتھ میں ایک وہی تو کارڈ ہے۔ وہ نہیں رہا تو تم قابو میں نہیں رہے گا۔"

"فتح خان میں قسم نہیں کھاتا لیکن تم کہو تو میں قسم...."

"اس کا ضرورت نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "ابھی تم ساتھ ہے اور رہے گا۔"

میں جھنجھلا گیا۔ "تب تم کیا چاہتے ہو جبکہ تم جانتے ہو اس وادی میں ایک چھوٹی سی چیز کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ اس کا رقبہ ایک میل سے زیادہ ہی ہے۔"

"میں اس ناممکن کو ممکن بنائے گا۔" اس نے یقین سے کہا۔ "ابھی تم دیکھے گا۔"

رات کا آخری پہر تھا اور سردی اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی

لیکن گرم کپڑوں میں ہم سکون سے تھے۔ پھر الاؤ کی گرمی بھی تھی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم نے مہرو کے بارے میں نہیں پوچھا۔ وہ میری غیر موجودگی میں فرار ہو گئی۔"

"اس کا ضرورت نہیں ہے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "میرا طرف سے وہ جہنم میں جائے۔"

میں نے سکون محسوس کیا گویا اس معاملے میں فتح خان کو مجھ پر شبہ نہیں تھا۔ جب مہرو والی چپ سے سگنل آنا بند ہوئے تو اس نے سوچ لیا ہوگا کہ پتھر پر مہرو کی گردن ٹکرانے سے چپ پر ضرب لگی ہوگی اور وہ ناکارہ ہو گئی ہوگی۔ میں تقریباً تین گھنٹے بعد اوپر ڈھلان سے واپس آیا تھا اور تب ان لوگوں کو پتا چلا کہ مہرو غائب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت تک مغرب میں پہاڑ عبور کر کے دوسری طرف چلی گئی ہو گی۔ اب یہ قسمت میں تھا کہ وہ راجا عمر دراز تک پہنچ پاتی ہے یا نہیں۔ اس کا بھی تو امکان تھا کہ وہ ان پہاڑوں میں بھوکی پیاسی بھٹکتی رہے یا پھر کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگ جائے۔ اس معاملے میں اس کی قسمت ویسے بھی بہت خراب تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تم نے میرا پیچھا کس طرح کیا جبکہ نظر بھی نہیں آتے تھے؟"

فتح خان نے دانت نکوسے۔ "تمہارا کیا خیال ہے میں نے کس طرح تمہارا پیچھا کیا؟"

"میرا خیال ہے تم نے گاڑی میں کوئی سگنل ڈیوائس لگائی ہے۔" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "میں نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔"

فتح خان نے اس بار مسکرانے کے انداز میں دانت نکالے۔ "وہ تم تلاش بھی نہیں کر سکتا۔ اتنا چھوٹا سا ڈیوائس کہ میں بھول جائے تو خود مجھے بھی نہ ملے۔"

وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اتفاق سے چپ دیکھ چکا تھا اور اس کی مدد سے اسے بیوقوف بھی بنا چکا تھا۔ بہر حال اس کا انجان رہنا ہی ٹھیک تھا اس لیے میں پورے خلوص سے بے وقوف بنا ہوا اس کی لاف گزاف سن رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کا ممکنہ پلان سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اس نے مجھ سے جو مطالبہ کیا تھا اور جو دس دن کی مہلت دی تھی وہ صرف ایک دھوکا تھی فتح خان جیسا زیرک آدمی اس قسم کا احمقانہ مطالبہ کسی خاص مقصد کے تحت کر سکتا تھا اس کا ایک مقصد یعنی میری وادی تک آمد تو حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا تھا یہ میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ اچانک فتح خان کے لباس سے ایک ٹون جیسی آواز آئی۔ وہ چونکا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"شہباز خان تم اُدھر رکو، اُدھر سے ہلنا مت۔"

یہ کہہ کر وہ باہر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اگر وہ نہ کہتا تب بھی میرا ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کے ساتھی کہیں باہر گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے اور ان کے وحشی ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ آدمی کو مکھی مچھر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ فتح خان کے پاس آنے والی ٹون کسی موبائل کی لگ رہی تھی۔ لیکن اس علاقے میں موبائل سگنل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تب یہ امکان تھا کہ فتح خان کے پاس کوئی لانگ رینج واکی ٹاکی یا پھر سیٹلائیٹ فون تھا۔ سیٹلائیٹ کی مدد سے کام کرنے والے موبائل سگنل کے محتاج نہیں ہوتے .... لیکن یہ نہایت مہنگے ہوتے ہیں۔ کوئی عام آدمی کیا اچھے خاصے دولت مند بھی ان کے چارجز برداشت نہیں کر سکتے..... مگر فتح خان کے پاس حرام دولت کی کمی نہ تھی اس کے اپنے دھندے بھی کم نہیں تھے لیکن ڈیوڈ شا کے لیے کام کر کے اس نے بہت کمایا ہوگا۔

الاؤ میں آگ کم ہو رہی تھی اور لکڑی اب انگاروں میں بدل رہی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے اپنے گرد کمبل لپیٹ لیا اور فتح خان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جس طرح آیا تھا ایسا لگ رہا جیسے وہ پہلے سے سب طے کر چکا تھا۔ اگر مہرو غائب نہ ہوتی تب بھی وہ یہاں ضرور آتا اور شاید مہرو کے مقدر کا فیصلہ بھی کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ بروقت نکل گئی۔ اگر فتح خان اس سلسلے میں مایوس بھی ہوا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا۔ وہ تقریباً نصف گھنٹے بعد اچانک ہی تاریکی سے نمودار ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ خوش تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کا پلان اس کی مرضی کے مطابق کام کر رہا تھا اس نے اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شہباز خان جلد تم خوشخبری سنے گا۔"

"تم سے مجھے صرف بدخبریوں کی امید رہتی ہے۔"

"تم ابھی اس بندے کو دیکھے گا جسے تم نے بہت عرصے سے نہیں دیکھا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اسے دیکھ کر تمہارا دل باغ باغ ہو جائے گا۔"

مجھے تشویش ہونے لگی۔ اب وہ میرے کس ساتھی کو اُٹھا لایا تھا۔ میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فتح خان تم آگ کو مزید بھڑکا رہے ہو ابھی تو سویرا والا قرض بھی اُتارنا ہے مجھے۔"

"قرض بھی اُتر جائے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "میرے کو کوئی جلدی نہیں ہے۔

جلدی تو مجھے تھی۔ میں نے سوچا اور کہا۔ "برٹ شا کہاں ہے؟"

"وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔"

"لیکن مجھے لگ رہا ہے وہ تمہارے ساتھ یہیں کہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" فتح خان نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"فتح خان تمہیں صرف مجھ سے مطلب ہے لیکن تمہاری ساتھی نے بلاوجہ وہ بریف کیس بھی ہتھیا لیا جس سے تمہارا یا شہلا کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

"یہ تم شہلا سے پوچھو۔"

"تمہارا اور شہلا کا معاملہ ایک ہی ہے۔"

"ایک نہیں ہے۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ "بس ہیرے کے معاملے میں ایک ہے پھر وہ اپنا راستہ لے گا اور میں اپنا راستہ لے گا۔"

"فتح خان تمہیں یقین ہے شہلا تمہیں دھوکا نہیں دے گی۔"

فتح خان نے اپنی کسی قدر بڑھی ہوئی شیو کھجائی۔ "ایسا یقین تو فتح خان اپنی ماں پر نہیں کرتا شہلا پر کیسے کرے؟"

"تب تم کیسے یقین سے کہہ سکتے کہ وہ وہی کرے گی جو تم چاہتے ہو جبکہ وہ مڈل ایسٹ جا کر ہیروں کا سودا کرے گی۔"

"ہمارے پاس اس کا تصویر ہے۔" فتح خان بولا۔ "وہ ہم کو دھوکا دینے سے پہلے دس بار سوچے گا۔"

"فتح خان شہلا بہت بڑی اداکارہ ہے اور وہ مجھے دھوکا دے گئی تو تمہیں بھی دھوکا دے سکتی ہے جبکہ تمہارے لیے اس کے دل میں نفرت بھی ہے تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اسے بھولی نہیں ہے۔"

"نہ بھولے۔" فتح خان مسکرایا۔ "بلکہ ہم چاہتا ہے یاد رکھے تاکہ اگر کبھی اس کے دل میں دھوکے کا خیال آئے تو اسے معلوم ہو اس کے ساتھ ہم کیا کر سکتا ہے۔"

"یہ تمہاری بھول ہے کہ اس پر اس چیز کا کوئی اثر ہوگا۔ عزت آبرو شہلا کے لیے بے معنی سے لفظ ہیں۔ اس کے سامنے ہمیشہ اپنا مفاد ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ کسی کو قتل بھی کر سکتی ہے۔ سفاکی کے معاملے میں وہ تم سے کم نہیں ہے۔"

"ہم کو معلوم ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "پر تم فکر مت کرو وہ ابھی پھنسا ہوا ہے اس لیے دھوکا نہیں کرے گا۔"

"تمہاری مرضی میں نے تمہیں خبردار کر دیا۔" میں نے شانے اچکائے تو فتح خان زہر خند انداز میں مسکرایا۔

"شہباز خان تم میرا ہمدرد نہیں ہے۔ اس لیے ابھی مجھ کو شہلا کے خلاف کرنے کا کوشش مت کرو۔"

"میں ایسی کوئی کوشش نہیں کر رہا۔" میں نے ٹھہرے انداز میں کہا۔ "مجھے دشمنی میں بھی گھٹیا پن پسند نہیں ہے لیکن بعد میں ایسا نہ ہو کہ تم شہلا کی وجہ سے ناکام ہو اور اس کا بدلہ بھی مجھ سے لینے کی کوشش کرو۔ کم سے کم اس معاملے میں تم وہی وحشی فتح خان ہو جو بات تمہارے ذہن میں بیٹھ جائے وہ نکلتی نہیں ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہے جو کسی کا بدلہ دوسرے سے لینے کی کوشش کرے گا۔" اس نے بُرا مان کر کہا۔

"تب تم کیا کر رہے ہو۔ تم نے برٹ شا سے ہیرے ہتھیانے کی کوشش کی۔ اس نے ہیرے چھپا دیے۔ اس میں میرا کہیں بھی کوئی حصہ یا قصور نہیں تھا۔ اب تم مجھے پکڑ لائے۔ میری ہونے والی بیوی کو میرے گھر سے اُٹھا لیا اور اس کے ذریعے مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔ اب بھی تم کہتے ہو کہ تم کسی سے دوسرے کا بدلہ نہیں لیتے۔" کہتے ہوئے میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"یہ دوسری بات ہے۔" فتح خان کھسیا گیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "اگر تم ایمن شا کو یہاں بلانے پر آمادہ ہو جاتا۔ تو میں یہ سب کرنے پر مجبور نہ ہوتا۔"

میں نے تلخ انداز میں کہا۔ "فتح خان اس وقت حالات تمہارے قابو میں ہے اس لیے تم کتے کی طرح بھونکو گے تب بھی تمہاری ہی بات درست مانی جائے گی۔"

"تم چاہے تو ایسا بھی سمجھ سکتا ہے۔" اس نے تسلیم کر لیا۔

اس دوران میں صبح کی ہلکی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ یہاں وادی میں دھند بہت کم تھی اور کسی وقت تو آسمان صاف نظر آنے لگتا تھا۔ فتح خان نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ابھی تم چاہے تو سو سکتا ہے ممکن ہے تم سو کر اُٹھے تو سرپرائز آ چکا ہو۔"

میں نے بھی فتح خان کے ساتھ سر کھپانے سے بہتر سمجھا کہ آرام کر لوں۔ میں دوبارہ کمبل لے کر خیمے میں گھس گیا اور زپ بند کر لی۔ فتح خان میری طرف سے مطمئن تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نے اس کے آدمیوں سے جو پستول چھینا تھا وہ بے کار ہے۔ یہ پستول اس وقت بھی میری جیب میں تھا۔ پستول اور اس کی گولیاں دونوں اصلی تھے لیکن ایک فائرنگ پن نہ ہونے سے یہ بے کار تھے۔ میں لیٹا رہا اور روشنی ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ فتح خان کچھ دیر بعد وہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے مجھے اسی غار نما جگہ پر محدود رہنے کی ہدایت کر کے گیا۔ ایک گھنٹے بعد روشنی مکمل طور پر نمودار ہو گئی تھی۔ اگرچہ ابھی

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

دھوپ نہیں آئی تھی لیکن اوپر پہاڑ روشنی میں نہائے تھے۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں خیمے سے باہر آ گیا اور الاؤ کے انگاروں پر کافی کا پانی رکھ دیا۔ اس دوران میں میری نظریں آس پاس بھٹک رہی تھیں لیکن جہاں تک دکھائی دیتا تھا نہ بندہ تھا نہ بندے کی ذات تھی۔ ایک اونچے پتھر پر ایک چیل بیٹھی اپنی چونچ سے جسم صاف کر رہی تھی۔ میں کافی کا مگ لے کر چہل قدمی کرنے کے انداز میں غار نما جگہ سے باہر آیا۔ یہ جگہ شمال مشرقی ڈھلان کے سامنے تھی، کچھ پتھر تھے پھر ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی میں چٹانوں کی حدود کے آخری حصے تک آیا سامنے ڈھلان سے ایک فائر ہوا اور گولی میرے پیروں سے کچھ آگے زمین پر لگی۔ مٹی اُڑی تھی۔ فائر کسی ہلکی رائفل سے ہوا تھا اور آواز زیادہ نہیں تھی لیکن وادی میں کچھ دیر گونجتی رہی تھی۔ اس وارننگ کے بعد میرے لیے آگے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے میں اُلٹے قدموں لوٹ آیا۔ فتح خان کے آدمی پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ فائر کر کے انہوں نے یہ بات مجھ پر واضح بھی کر دی تھی۔

روشنی ہونے سے پہلے میں نے ناشتا کر لینا مناسب سمجھا کیونکہ ممکن تھا کہ فتح خان جو سرپرائز لا رہا تھا۔ اس کے آنے کے بعد مجھے ناشتا بھی نصیب نہ ہوتا۔ اب دھوپ چٹانوں تک آ گئی تھی اور سردی میں کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ دس بجے تک چٹانیں دھوپ میں آنے کے بعد خاصی گرم ہو چکی تھیں اور اب میں چاہتا تو جیکٹ کے بغیر بھی گزارا کر سکتا تھا۔ پتا نہیں یہ چٹانیں کس مادے کی بنی تھیں یہ گرمی کو جذب کر لیتی تھیں اور اس موسم میں بھی ان کے اندر کا ماحول گرم ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ برف باری ہونے کے باوجود یہاں برف کا نام و نشان نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ دوپہر تک یہاں خاصی گرمی ہو جائے گی۔ دس بارہ سال سے میں کاروبار اور پھر دوسرے چکروں میں شمالی علاقوں میں بہت گھوما ہوں لیکن اس قسم کی چٹانیں میں نے کہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ میرے پاس پانی خاصی مقدار میں تھا اس لیے یہ خدشا تو نہیں تھا کہ پہلے کی طرح پیاس سے جان لبوں پر آ جائے گی۔

ناشتا بنا کر میں نے الاؤ بجھا دیا اور خود ایک چٹان پر چڑھ گیا یہاں سے چاروں طرف کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مگر کھنڈر کے پاس کا حصہ نظروں سے اوجھل تھا۔ فتح خان کے سامنے آنے سے میرے اندر موجود گھٹن میں کمی آ گئی تھی۔ جب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تو مجھے گھٹن سی ہونے لگتی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب چٹانوں کے پاس ہی کچھ افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ میں چھلانگ لگا کر چٹان سے نیچے آ گیا۔ آواز اب نمایاں تھی اور فتح خان کی تھی وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”چلو خنزیر ابھی تمہارا سارا اداکاری نکل جائے گا۔ بس کچھ دیر انتظار کرو.... آگے چلو کتے کا بچہ۔“

میں چوکنا ہو گیا۔ فتح خان کسی کو لا رہا تھا۔ کیا وہ میرے کسی ساتھی کو یوں گالیاں دے رہا تھا لیکن میرے ساتھیوں میں کوئی ایسا احمق اور بے حمیت نہیں تھا کہ فتح خان سے یوں گالیاں کھاتا۔ اول تو وہ گالیاں کھانے والا کوئی کام نہ کرتا اور پھر بھی فتح خان اسے یوں سناتا تو وہ کسی کی پروا کیے بغیر اس سے بھڑ جاتا تو پھر یہ کون تھا؟ اس سوال کا جواب ایک وحشیانہ سی ہنسی نے دیا۔ ہنسنے والا مرد تھا اور میرے ذہن میں ایک نام روشنی کی طرح چمکا تھا۔ میں بے ساختہ چند قدم آگے آیا اور برٹ شا کو دیکھ لیا۔ جس نے گرم لیکن بے حد میلا کچیلا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں اور سر کے بال یوں بڑھے ہوئے تھے جیسے انہیں سالوں سے استرا یا قینچی لگنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور ساتھ ہی وہ یوں میلے اور چکٹ ہو رہے تھے جیسے اسے مہینوں سے نہانے کا موقع نہ ملا ہو۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں یوں تاریک حلقوں میں ڈوب گئی تھیں کہ ایک نظر میں تو آنکھوں کی جگہ گڑھا ہی نظر آتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح دانت نکال نکال کر ہنس رہا تھا اور بار بار مڑ کر فتح خان کی طرف دیکھتا تھا۔ جواب میں وہ اسے گالی اور دھکا دیتا۔ فتح خان کے آخری دھکے اور ایک ناقابلِ بیان گالی نے اسے میرے قدموں میں لا گرایا۔ اسے چوٹ لگی تھی لیکن وہ ہانپتے ہوئے اب بھی رونے کے انداز میں ہنس رہا تھا۔

میں نے عرصہ پہلے اسے دیکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ پاگل نہیں ہے بلکہ فتح خان کے تشدد سے بچنے کے لیے پاگل بن گیا ہے۔ لیکن اس وقت اس کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ سچ مچ پاگل ہو چکا ہے۔ اس کے پھٹے جوتوں سے اس کی انگلیاں جھانک رہی تھیں جو مستقل بند رہنے کی وجہ سے گل کر سیاہ ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں خمیدہ اور ان کے جوڑ یوں اُبھر آئے تھے جیسے جوڑوں کے مریض کے ہوتے ہیں۔ اس کے سرخ و سفید رنگ کو میل نے چھپا لیا تھا اور اب اسے باآسانی کوئی مقامی باشندہ تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ وہ میرے قدموں میں پڑا ہانپ رہا تھا۔ میں نے افسوس سے اسے پھر فتح خان کو دیکھا۔

”فتح خان یہ پاگل ہو گیا ہے اور اگر نہیں ہوا تھا تو اب ہو گیا ہے۔“

”یہ پاگل نہیں ہے۔“ فتح خان نے اسے نفرت انگیز نظروں سے دیکھا۔ ”حرامزادہ بنتا ہے لیکن میں اس کا دماغ درست کر دے گا۔“

”اس کا حال دیکھ رہے ہو۔“ میں نے برٹ شا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ایک نفیس اور نازک مزاج پڑھا لکھا علمی آدمی تھا۔ کیا یہ صرف ہیروں کی خاطر اپنا یہ حال کر وا سکتا ہے۔“

فتح خان نے مجھے گھورا۔ ”تم بھول رہا ہے وہ پچاس ملین ڈالرز کا ہیرا ہے۔“

”سو ملین ڈالرز کا کیوں نہ ہو۔ لیکن میں بھی دولت کی خاطر اپنا یہ حال بنوانے کے لیے تیار نہیں ہوں گا۔“

”تم اپنا بات مت کرو۔ میں تم کو جانتا ہے۔ لیکن تم ان خنزیروں کو نہیں جانتا ہے۔“ اس نے برٹ شا کو لات ماری۔ ”یہ ہم کو بولتا ہے کہ ہم دولت کی خاطر اپنی ماں بیچ سکتا ہے۔ پر فتح خان نے ان گوروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک دولت کا خاطر اپنی ماں کو روز بیچ سکتا ہے۔ تم اس کے پڑھے لکھے ہونے پر مت جاؤ۔“

میں فتح خان کی بات سے متفق نہیں تھا۔ دنیا میں اچھے بُرے، شیطان اور انسان ہر قوم اور نسل میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف اچھے بُرے نظریے یا نظام کا ہوتا ہے۔ نظریہ یا نظام کسی قوم، ملک اور ملت کا چہرہ ہوتا ہے دوسرے اس کے تمام افراد کو اسی کے تحت دیکھتے ہیں۔ جیسے مغرب نے دہشت گردی اور مسلمانوں کو اس طرح نتھی کر دیا ہے کہ اب ہر مسلمان کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مغرب کا رویّہ مسلمانوں کے ساتھ بالکل الگ ہوتا ہے۔ حالانکہ دہشت گردی کا شکار تو ہم مسلمان ہیں۔ اس جنگ میں مارے جانے والے غیر مسلموں اور مسلموں کا تناسب شاید ایک اور ہزار سے بھی زیادہ ہی ہے۔ اور دہشت گرد بھی ہم ہی ہیں۔ مغربی دنیا اس معاملے میں بدترین جانبداری اور تعصب سے کام لے رہی تھی۔ اس کے باوجود میں فتح خان کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا اور اس سے بحث کرنا بھی بیکار تھا۔ میں نے کسی قدر کٹاکٹ انداز میں کہا۔

”تمہارے پاس میرے لیے یہی سرپرائز تھا؟ تو یقین کرو میں بالکل بھی حیران نہیں ہوا ہوں۔“

فتح خان مسکرایا۔ ”نہیں یہ کہاں سے سرپرائز ہو گیا۔ وہ تو اس کے لیے بھی سرپرائز ہو گا۔“

میں ایک بار پھر چونک گیا اور فوراً ہی ایک نیا خیال میرے ذہن میں سرسرایا۔ ”فتح خان کہیں تم نے ایمن.....“

”اب تم ٹھیک سمجھا۔“ وہ قہقہہ مار کر بولا۔ ”میں نے ایمن شا کو یہاں بلا لیا ہے اور کچھ دیر میں وہ یہاں پہنچ گیا ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ وجہ تھی کہ فتح خان نے مجھے اپنے قبضے میں کیا تھا۔ اس کے بغیر وہ ایمن کو کسی صورت پاکستان نہیں بلوا سکتا تھا۔ کیونکہ ایمن مجھ سے رابطہ کرتی اور میں اسے منع کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ ایمن کے آنے کا سن کر بھی برٹ شا نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اردو جانتا تھا اور فتح خان کی قید میں رہ کر اس کی اردو اور بھی بہتر ہو گئی ہو گی اس لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس نے فتح خان کی بات کا مفہوم نہ سمجھا ہو۔ مگر وہ یونہی نیچے پڑا ہنسنے کے انداز میں کراہتا رہا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”جیسے تمہیں مجھ سے اس معاملے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی .... چاہے اس کے لیے تم میرے کسی بھی پیارے کو اُٹھا لاؤ۔ اسی طرح ایمن شا کو بلانے اور اپنے قبضے میں لینے سے تمہیں ہیرے نہیں ملیں گے۔“

”ملے گا بالکل ملے گا۔“ فتح خان نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر نہیں ملا تو میں ان دونوں باپ بیٹی کو اسی وادی میں دفن کر کے جائے گا۔ میں خدا کا قسم کھاتا ہے ایسا ہی کرے گا۔“

فتح خان کا لہجہ جنونی ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ برٹ شا کی طرح وہ بھی پاگل ہو گیا تھا۔ شاید دولت چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو پاگل کر دے خاص طور سے جب وہ قیمتی ہیروں کی شکل میں ہو۔ اس وقت بھی وہ جنونی ہو رہا تھا۔ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے کہا۔ ”تم نے ایمن کو کس طرح سے بلایا؟“

فتح خان کا موڈ بدل گیا اور وہ پھر مسکرانے لگا۔ ”بہت آسانی سے، تمہارے موبائل میں انٹرنیٹ میں ایمن شا کا ای میل تھا۔ میں نے اسے ای میل کیا اور اسے بتایا کہ اس کے باپ کا سراغ مل گیا ہے وہ فوراً پاکستان آ جائے۔“

”وہ مان گئی؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا وہ بہت ذہین اور چالاک ہے۔“

”میں جانتا ہے وہ اس حرامی کا لڑکی ہے۔“ اس نے برٹ شا کے پاؤں پر ہلکی سی ٹھوکر ماری لیکن وہ یوں چیخا جیسے کوئی کتا گاڑی تلے آ کر چیختا ہے اور پھر سمٹ کر چٹان کی جڑ میں ہاتھ پاؤں جوڑ کر لیٹ گیا۔ فتح خان کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ”میں نے ایسا چکر چلایا کہ اس نے فون نہیں کیا بس ای میل پر بات ہوتا رہا۔ تمہارے ای میل کی وجہ سے سمجھتا رہا کہ تم ہی کیا ہے۔“

یہ حماقت مجھ سے ہوئی تھی شاید میں نے موبائل سے

www.Paksociety.com

انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے اپنی یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ محفوظ کر دیا تھا اور فتح خان نے اسے کھول لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایمن کو بلانے کا منصوبہ مجھے قبضے میں لینے کے بعد بنا تھا۔ اس سے پہلے فتح خان سویرا کے ذریعے مجھے مجبور کرنا چاہ رہا تھا کہ میں کسی بھی طریقے سے اس کے لیے ہیرے تلاش کروں اور اس کے پیچھے منطق یہ تھی کہ بہ قول اس کے میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہ کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے۔ مگر اب اس کے پاس زیادہ بہتر اور قابل عمل پلان آ گیا تھا اور اس نے اس پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا تھا۔ مجھے چار پانچ دن تک بے ہوش رکھنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس دوران میں اس نے ایمن کو پاکستان آنے پر راضی کر لیا تھا۔ اب وہ یہاں آ گئی تھی اور فتح خان کے قبضے میں بھی آ گئی تھی۔

"وہ خاموشی سے آنے پر کیسے رضامند ہو گئی؟"

"بس ہو گیا۔" فتح خان نے دانت نکالے۔ "شہباز خان میں ٹھیک کہتا تھا تمہارے ساتھ اس کا کوئی چکر ہے۔ ورنہ میرے کو بھی حیرت ہے وہ اتنی آسانی سے میرا تمام بات مانتا گیا۔ ابھی چند گھنٹے قبل میرے آدمیوں نے اسے سوات سے لیا ہے اور اسے ادھر لا رہا ہے۔ مجھے اسی کا اطلاع ملا تھا۔"

"یہاں موبائل نیٹ کے سگنل نہیں آتے ہیں پھر تمہیں کیسے اطلاع ملی؟"

"بس مل گیا۔" اس نے گول مول انداز میں کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ایمن نے حماقت کی تھی صرف میرا ای میل دیکھ کر وہ یہاں آنے پر آمادہ ہو گئی۔ "فتح خان تمہارا اندازہ پہلے بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے وہ اصل میں اپنے باپ سے بہت پیار کرتی ہے اور اسی وجہ سے اتنی آسانی سے تمہارے جال میں پھنس گئی۔"

"میں نہیں مانتا۔" فتح خان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ مغرب کا لوگ اپنے رشتوں سے اتنا پیار نہیں کرتا ہے، ان کو بس خود سے پیار ہوتا ہے یا پھر ایک ہی رشتے سے مطلب ہوتا ہے۔" فتح خان نے ایک واہیات سا اشارہ کیا۔ "ان کو نہ ماں باپ سے مطلب ہوتا ہے اور نہ اپنے بچوں سے۔"

دیکھا جائے تو فتح خان ٹھیک کہہ رہا تھا مگر میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "تب تم یہ توقع کیوں کر رہے ہو کہ برٹ شا اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے تمہیں ہیرے دے دے گا؟"

فتح خان نے ایک بار پھر خونی نظروں سے برٹ شا کو دیکھا۔ "اگر نہیں دے گا تو خود بھی مرے گا اور اس کا بیٹی بھی مارا جائے گا۔ اب میں یہ قصہ ختم کر جائے گا۔ یہ یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔ میں اسے پالتے پالتے تنگ آ گیا ہے۔"

بہ ظاہر تو ایسا لگ رہا تھا کہ فتح خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ مگر میں اسے اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ برسوں کے صبر آزما انتظار کے بعد معاملے کو یوں اچانک ختم کر دے۔ برٹ شا اس کی قید میں پڑا تھا اور اس کا کچھ نہیں جا رہا تھا۔ اب ایمن بھی آنے والی تھی۔ فتح خان ہیرے نکلوانے کے لیے برٹ شا کو دھمکا رہا تھا۔ اگر وہ اسے مار دیتا تو ہیرے قیامت تک نہیں مل سکتے تھے۔ میرے حساب سے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے تم یا تو ہیرے لے کر جاؤ گے یا ان دونوں کو یہاں دفن کر کے جاؤ گے لیکن اس سارے معاملے میں تم نے میرا ذکر نہیں کیا میرا کیا ہو گا؟"

"تم جلد جان جائے گا۔" فتح خان مسکرایا۔ "میں تم مارے گا نہیں پر سویرا کو مرشد کے حوالے ضرور کر دے گا۔"

"اور اس کے بعد میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟" میں نے اسے گھورا۔

"مت چھوڑنا اگر میں مل جائے اور تم مجھ پر قابو پا لے تو بے شک میرا ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دینا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "پر تم کو سویرا کو بچانا ہے تو ہیرے تلاش کرنا ہوں گے۔"

میں نے برٹ شا کی طرف دیکھا۔ "مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں ہے کہ اسے ہیروں والی جگہ یاد ہو گی۔ اگر یہ پاگل نہیں بھی تھا تو اب ہو گیا ہے اور اس سے کچھ معلوم نہیں ہو گا۔"

"معلوم ہو گا یہ بنا ہوا ہے۔ شہباز خان تم بہادر اور ہوشیار آدمی ہے لیکن تم نے ابھی انسان کو صحیح سے نہیں جانا ہے۔ یہ بہت سخت جان ہوتا ہے اور دولت کے لیے اس سے بھی زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔" فتح خان نے اپنا تجربہ پیش کیا۔ "میں نے جو زندگی گزارا ہے اس میں انسان کو بہت پاس سے دیکھا ہے۔ میرے کو معلوم ہے انسان کتنا بڑا اداکار ہوتا ہے۔ جب یہ دوستی جتا رہا ہوتا ہے تو اس وقت یہ تم کو قتل کرنے کا سوچ رہا ہوتا ہے۔ یہ بالکل بھی پاگل نہیں ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن مجھے لگ رہا ہے یہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے۔"

"ابھی یہ اپنا لڑکی کو دیکھے گا تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" فتح خان نے یقین سے کہا۔ "پھر یہ بتائے گا کہ ہیرا کہاں چھپایا ہے؟"

"فتح خان اس میں ایک معاملہ اور بھی ہے۔ برٹ شا اگر بنا ہوا پاگل ہے تو بھی وہ اتنی آسانی سے تمہیں نہیں بتائے گا کیونکہ اسے لازمی یہ خطرہ ہو گا کہ ہیرے حاصل کر کے بھی تم

اس کے اور ایمن کے ساتھ یہی سلوک کرو گے۔ یعنی اس وادی سے ان کی واپسی نہیں ہو سکے گی۔ جب تک اسے اپنی اور ایمن کی زندگی کی ٹھوس ضمانت نہ مل جائے یہ ہیروں کے بارے میں بتانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"کیا مطلب مجھے ان کا کیا کرنا ہو گا؟" فتح خان نے جلدی سے کہا۔ "میں ان کو چھوڑ دوں گا۔"

"واقعی؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "فتح خان تم خود اتنے سادہ ہو یا دوسروں کو سمجھتے ہو۔ یہ بات لازمی ان کے ذہن میں آئے گی کہ ہیرے حاصل کر کے تم انہیں یہیں دفن کر دو گے۔"

یہ ساری گفتگو برٹ شا کے سامنے ہو رہی تھی لیکن وہ بہ ظاہر سن نہیں رہا تھا۔ فتح خان سے لات کھا کر وہ ایسا چٹان کی جڑ میں گھسا تھا کہ وہاں سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ فتح خان نے مجھے گھورا۔ "تم اس کے سامنے بات کر رہا ہے تم اسے اکسانا چاہتا ہے کہ یہ ہیروں کا پتا نہ بتائے۔"

"میں کب اکسا رہا ہوں۔" میں نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "فتح خان تم پھر دوسروں کو نادان سمجھ رہے ہو۔ اگر یہ ڈراما نہیں کر رہا ہے تو اتنی عقل اس کے پاس بھی ہو گی۔ دوسرے میں تمہارا کوئی خیر خواہ نہیں ہوں جو اس سے چھپ کر تمہیں سمجھاؤں۔"

"میں ایسا نہیں کرے گا مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"لیکن نقصان تو ہو سکتا ہے۔ آزاد ہونے کے بعد برٹ شا اور ایمن تمہارے خلاف رپورٹ کرائیں گے اور تمہیں معلوم ہے ہمارے حکمران آج بھی گوروں کے جوتے چاٹنے کو تیار رہتے ہیں۔ برٹ شا ایک معزز برٹش فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی شکایت پر کان دھرا جائے گا اور پولیس یا ایف آئی اے تمہیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ تم مشکل میں پڑ سکتے ہو۔"

"کوئی مشکل نہیں ہو گا۔" فتح خان نے اعتماد سے کہا۔ "پولیس یا ایف آئی اے میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔"

بات مکمل کر کے فتح خان چٹانوں سے باہر چلا گیا اس بار اس نے مجھے باہر آنے سے منع نہیں کیا تھا اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے باہر آنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھیوں نے فائر کر کے مجھے خبردار کیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے برٹ شا کی طرف دیکھا جو فتح خان کی عدم موجودگی میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا لیکن اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بدستور چٹان سے لگا رہا۔ میں نے بھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے جیکٹ میں لگی چپ کا خیال تھا۔ اگر برٹ شا اداکاری کر رہا تھا تو شاید فتح خان کو غیر موجود دیکھ کر اپنی اداکاری برقرار نہیں رکھ پاتا۔

ایمن کی آمد اور پھر فتح خان کے ہتھے میں جانے کا سن کر میں فکر مند ہو گیا تھا۔ یہ اچھا نہیں تھا۔ ایمن سے میرا کوئی دلی تعلق نہیں تھا لیکن میں اس کے لیے اچھے جذبات ضرور رکھتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتی تھی لیکن اس کی یہ پسند اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ سب چھوڑ کر میرے چکر میں پڑ جاتی۔ یہ پسند کا خالص مغربی انداز تھا۔ بہرحال میں پسند نہیں کرتا کہ فتح خان یا کوئی بھی اس سے کوئی غلط سلوک کرے یا اسے کسی قسم کا نقصان پہنچائے اور یہاں آثار اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ایمن فتح خان کے قبضے میں آ چکی تھی اور اس کا باپ پہلے ہی فتح خان کے قبضے میں تھا۔ فتح خان یقیناً ایمن کے حوالے سے دھمکی دے کر برٹ شا کو ہیروں کی نشان دہی پر مجبور کرتا۔ سوال یہ تھا کہ برٹ شا اسے ہیروں کے بارے میں بتا دیتا؟

اگر وہ پاگل بنا ہوا تھا تب اس میں اتنی عقل ضرور ہو گی کہ فتح خان کو ہیرے دینے کے بعد بھی اس کی اور ایمن کی گلو خلاصی نہیں ہو گی۔ کم سے کم مجھے فتح خان کی بات پر یقین نہیں تھا کہ وہ ان باپ بیٹی کو چھوڑ دے گا۔ کم سے کم ہیرے نہ دینے کی صورت میں فتح خان یقیناً ایمن اور برٹ شا کو نقصان پہنچاتا۔ دوسری طرف اگر برٹ شا سچ مچ اپنے حواس کھو چکا تھا تو اسے کیا پروا ہوتی کہ فتح خان اس کے یا ایمن کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ فتح خان انہیں اپنے وحشی ساتھیوں کے حوالے کر دیتا تو وہ انہیں ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ ایمن کو لڑکی ہونے کے ناطے جان کے ساتھ آبرو کا خطرہ بھی تھا۔ ناکامی کی صورت میں فتح خان مجھے بھی اس کا ذمے دار قرار دیتا اور وہ بتا چکا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا لیکن سویرا کو ضرور مرشد کے حوالے کر دے گا۔ میں نے برٹ شا کی طرف دیکھا اب معاملہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

فتح خان بہت ہوشیاری سے اپنے پتے چل رہا تھا اس نے اب تک بہترین پلاننگ کی تھی اور حالات کے لحاظ سے اس میں بڑی تیزی سے مناسب تبدیلیاں لایا تھا۔ ایک طرف وہ خود کو برافروختہ ظاہر کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور اس بار وہ ہیرے لے جائے گا یا سب کو برباد کر دے گا۔ لیکن دوسری طرف اس نے مجھے اپنے قابو میں رکھا تھا۔ وہ مجھ سے کیا کام لینے والا تھا میں اس سے بے خبر تھا بس اندازہ تھا کہ وہ مجھے آگے رکھے گا کہ میں

برٹ شا کو قائل کروں اور خود پیچھے رہے گا۔ پھر وہ جیپ کی مدد سے ہم پر نظر رکھ سکتا تھا۔ لیکن یہ مفروضہ تھا فتح خان کے ذہن میں کیا تھا یہ کچھ دیر میں سامنے آنے والا تھا۔

میرے موجودہ مصائب کے ذمّے دار شمال کی طرف کیے جانے والے دو سفر تھے ایک جب میں کاکول جانے سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ نکلا تھا اور سرمد کے ساتھ اس کے گاؤں پہنچا تھا۔ راجا عمر دراز اور فتح خان سے وہیں واسطہ پڑا تھا۔ دوستی اور دشمنی کا یہ تعلق آج بھی برقرار تھا۔ پھر میں مونا اور سفیر کے ساتھ مری کی طرف گیا تھا جہاں منحوس نادر سے سامنا ہو گیا اور اس کی نحوست کا سایہ ہمارے زندگیوں پر محیط ہو گیا تھا۔ وہ اور اس کا کینہ پرور بھائی مرشد ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اپنی فرعونیت کے زعم میں وہ بہر صورت ہمیں اپنے آگے جھکا کر تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ کتنے ہی طاقتور سہی اس کائنات کا نظام چلانے والی ہستی کوئی اور ہے اور انسانوں کی زندگی و موت کے فیصلے وہی کرتی ہے۔

میں سوچوں میں گم تھا کہ مجھے کسی عورت کے چلّانے کی آواز آئی۔ آواز دور سے آئی تھی اس لیے اتنی واضح نہیں تھی لیکن وہ کسی نسوانی آواز ہی۔ میں بے اختیار چٹانوں کے باہر والے حصے کی طرف بڑھا۔ وہاں فتح خان ایمن کے ساتھ موجود تھا۔ اس بار اس کے ساتھ دو افراد اور تھے جو ایمن کو پکڑے ہوئے تھے اور شاید یہی اسے یہاں تک لائے تھے۔ ایمن نے فتح خان کو دیکھا تو جان گئی کہ وہ کس جال میں پھنس گئی ہے۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی۔ شاید اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور فتح خان کے آدمی اسے بازوؤں سے پکڑے کھینچے لیے چلے آرہے تھے۔ فتح خان نے مجھے دیکھا اور ہنس کر ایمن سے کہا۔ ''لو دیکھو تمہارا لوور بھی اِدھر ہے۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''فتح خان مہربانی کر کے فضول باتوں سے گریز کرو۔''

''شہباز۔'' ایمن چلّائی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا پھر وہ فتح خان کے آدمیوں سے خود کو چھڑا کر میری طرف آئی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے پاپا اس کے قبضے میں ہیں۔''

ایمن کا جسم مارے ہیجان کے کانپ رہا تھا۔ اس نے موسم کی مناسبت سے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ اونی ٹوپی تلے اس کے سنہری مائل سرخ بال جھانک رہے تھے اور سردی سے اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ میں نے نرمی سے اسے خود سے الگ کیا اور اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ہاں برٹ شا یہیں ہے۔''

''پاپا زندہ ہیں.... وہ زندہ ہیں۔'' ایمن کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ برسوں سے جس باپ کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی آئی تھی کہ وہ زندہ ہے یا نہیں اور یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہی تھی آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔ وہ اتنی ہیجان میں تھی کہ اسے صورتِ حال کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ ''پاپا کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملواؤ.... پلیز شہباز۔''

''ایمن آرام سے.... آرام سے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''خود کو سنبھالو ابھی تمہیں آگے بہت مشکل مراحل دیکھنے ہیں۔ ہم سب بہت مشکل صورتِ حال سے دوچار ہیں۔''

''فتح خان۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آرہی ہوں۔''

''اسے یوں پتا چلا کہ اصل میں اسی نے تمہیں دھوکا دے کر یہاں بلوایا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

''اس نے بلایا ہے لیکن ای میل پر تو تم سے بات ہوئی تھی۔''

''بدقسمتی سے میرا سیل فون فتح خان کے ہاتھ لگ گیا اور اس میں میرے ای میل اکاؤنٹ کا پاس ورڈ محفوظ تھا۔ اس کے بعد اس کے لیے تمہیں دھوکا دینا مشکل نہیں تھا۔''

ایمن کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''میرے خدا تو وہ تم نہیں تھے؟''

''ظاہر ہے میں تو خود فتح خان کی قید میں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم نے یہ حماقت کیوں کی کہ صرف میری طرف سے ای میل پر بھاگی چلی آئیں؟''

اس نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ''اس نے دھوکا ہی ایسا دیا تھا کہ تمہیں بیک وقت بہت سارے دشمن تلاش کر رہے تھے اور ان کی وجہ سے تم فون استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے صرف ای میل پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ پھر پاپا کا سن کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ اس نے بتایا کہ تم سوات میں چھپے ہو لیکن جب میں اس پتے پر پہنچی تو وہاں فتح خان کے آدمی تھے وہ مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔''

''کیا کسی کو معلوم ہے کہ تم یہاں آئی ہو؟''

''کسی کو بھی نہیں معلوم، حد یہ کہ میں جہاں جاب کر رہی ہوں وہاں بھی نہیں بتایا۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ یعنی اب اس بات کا کوئی امکان بھی نہیں تھا کہ ایمن کو تلاش کرتا ہوا کوئی آجائے۔ میرا اندازہ درست تھا کہ ایمن اپنے باپ کے بارے میں سن کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ فتح خان اور اس کے آدمی دور رہے تھے انھوں نے پاس آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایمن خود پر قابو پا رہی تھی ویسے بھی وہ مضبوط اعصاب کی تھی اور اس کا کام ہی آؤٹ ڈور تھا۔ اسے مختلف حالات اور لوگوں کا سامنا کرنا آتا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''سوری میں پاپا کے بارے میں سن کر اتنی جذباتی ہو گئی کہ تم سے ہیلو ہائے کرنا ہی بھول گئی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں اسے اندر لے جاتے ہوئے بولا۔ ''اپنے باپ کو دیکھنے کے لیے دل ذرا مضبوط رکھنا۔''

وہ رک گئی۔ ''پاپا ٹھیک ہیں؟''

''ہاں لیکن اتنے عرصے فتح خان کی قید میں رہ کر ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا.... آؤ دیکھو انہیں شاید تمہیں پہچان لیں۔''

ایمن بے تابی سے آگے جا رہی تھی اور جیسے ہی اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی وہ اس کی طرف لپکی اور اس کی حالت کی پروا کیے بغیر اس سے لپٹ گئی۔ وہ چلّائی تھی۔ ''پاپا یہ کیا ہوا آپ کو؟''

لیکن برٹ شا اسے دیکھ کر دوبارہ چٹان کی جڑ میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اسے ایمن سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہو۔ اس کے انداز سے قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ اس نے ایمن کو پہچانا ہو۔ ایمن اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی مسلسل بول رہی تھی۔ ''پاپا.... کیا ہو گیا ہے آپ کو.... مجھے پہچانیں.... میں ایمن ہوں۔ آپ کی بیٹی پاپا۔''

مگر وہ بدستور اجنبی انداز میں چٹان کے ساتھ دبکا رہا۔ اس نے ایمن کی خود کو اٹھانے کی کوشش ناکام بنا دی۔ ایمن تھک ہار کر پیچھے ہٹ گئی اور اس نے میری طرف دیکھا اور روہانسے لہجے میں بولی۔ ''شہباز پاپا مجھے نہیں پہچان رہے۔''

''اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اتنے برسوں سے فتح خان کی قید میں تھا اور اس نے اس پر تشدد بھی کیا ہے۔''

''تشدد۔'' وہ تڑپ اٹھی۔ ''لیکن کیوں؟''

''تم جانتی ہو۔ فتح خان کو ہیرے چاہئیں جو برٹ شا نے اسی وادی میں کہیں چھپا دیے تھے۔ اس نے تمہیں بھی اسی مقصد کے لیے دھوکے سے یہاں بلوایا ہے اب یہ تمہارے ذریعے برٹ شا پر دباؤ ڈالے گا۔''

''پاپا پر۔'' اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ ''مگر ان کو تو کچھ یاد نہیں ہے۔ اپنی بیٹی بھی یاد نہیں ہے۔''

میں ایمن کو ایک طرف لے آیا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''فتح خان کو شبہ ہے کہ برٹ شا پاگل نہیں ہے بلکہ بنا ہوا ہے۔''

''بکواس کرتا ہے وہ کتّا۔'' ایمن نے تند لہجے میں کہا۔ ''کوئی اس طرح بھی پاگل بنتا ہے۔''

''برٹ شا اب سے نہیں بلکہ بہت عرصے سے پاگل ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے ایمن کو یہ نہیں بتایا کہ میں بہت پہلے برٹ شا کو فتح خان کی قید میں دیکھ چکا تھا اس لیے کہ وہ جان جاتی کہ میں نے اسے باپ کی زندگی اور اس کی حالت سے بے خبر رکھا تھا اور یہ کام میں نے اپنی غرض سے کیا تھا۔ سچی بات بھی یہی تھی اگر میں ایمن کو بتا دیتا کہ اس کا باپ زندہ اور فتح خان کی قید میں ہے تو وہ سیدھا پاکستان کا رُخ کرتی اور اس وقت تک کے لیے یہاں ڈیرا ڈال کر بیٹھ جاتی جب تک اس کا باپ نہیں مل جاتا اور مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا جبکہ مجھے اپنے جھمیلوں سے فرصت نہیں تھی۔ اس لیے بھی میں نے اسے مطلع نہیں کیا تھا۔

''میرے خدا!'' وہ رونے والی ہو رہی تھی۔ ''اس ذلیل شخص نے پاپا کا کیا حال کر دیا ہے، میں اسے قتل کر دوں گی۔''

ایمن کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ذلیل شخص ہماری باتیں سن رہا تھا اور ممکن ہے ایمن کو ان گالیوں کی قیمت بھی چکانی پڑتی۔ اسے فتح خان سے نفرت تھی کیونکہ وہی اس کے اور اس کے باپ کے مصائب کا ذمّے دار تھا۔ اس نفرت کی ایک وجہ شینا بھی تھی جو فتح خان کی داشتہ تھی اور اس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی قید میں شینا نے مجھے رجھانے کی کوشش کی تھی اور یہ سب ایمن کے سامنے ہوا تھا۔ ایمن کے انداز میں بھی میرے لیے پسندیدگی تھی۔ اس پر دونوں خواتین میں جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ میں نے ایمن سے کہا۔ ''ایمن میری بات غور سے سنو! ہم نہایت سنگین حالات سے دوچار ہیں۔ فتح خان نے میری بھائی کی بیوہ سویرا کو حویلی سے اغوا کر کے اپنی قید میں رکھا ہے اور اب تم بھی اس کی قید میں آگئی ہو۔ برٹ شا پہلے ہی اس کے قبضے میں ہے۔''

سویرا کا نام سن کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اس نے کہا۔ ''یہ سویرا وہی ہے نا جو شروع سے تمہارے گھر میں رہتی آئی ہے۔''

''ہاں یہ وہی ہے۔''

''اب تمہارے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے تب بھی کیا یہ تمہارے گھر میں رہ رہی ہے؟''

کہتے ہیں کہ خواتین میں کچھ اضافی حسیں بھی ہوتی ہیں جیسے کون سا مرد ان کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے یا کون ان کو پسند کر

www.paksociety.com

رہا ہے، اسی طرح ایک حس یہ بھی ہوتی کہ وہ جسے پسند کرتی ہیں اگر کوئی اور عورت اسے پسند کرے تو انہیں اس کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ جب میں نے سرسری سے انداز میں سویرا کو ایمن کے بارے میں بتایا تھا تب اس کا ردِعمل بھی کچھ ایسا ہی تھا اور اس نے ایمن کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا تھا کہ میرا اس سے کیا تعلق ہے اور وہ اب مجھ سے ملتی ہے یا نہیں؟

''ہاں وہ اب بھی اس گھر کا ایک فرد ہے۔'' میں نے جواب دیا اور موضوع بدل دیا۔ ''اس وقت مسئلہ فتح خان کا ہے، وہ ہیروں کے لیے پاگل ہو رہا ہے جن کی مالیت اس وقت کم سے کم پچاس ملین ڈالرز ہو چکی ہے۔''

''پچاس ملین ڈالرز۔'' وہ حیران رہ گئی۔ ''اتنی قیمت ہے ان مٹھی بھر ہیروں کی؟''

''حالانکہ تمہیں بہتر معلوم ہونا چاہیے۔ تمہارا تعلق ایک لارڈ فیملی سے ہے۔''

''لارڈ فیملی سے تھا۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''اب میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔''

''فتح خان ہیرے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دے دی ہے کہ ناکامی کی صورت میں وہ سویرا کو مرشد کے حوالے کر دے گا اور تم جانتی ہو کہ مرشد میرا کتنا بڑا دشمن ہے۔''

ایمن متفکر ہو گئی۔ ''تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

''کچھ نہیں لیکن فتح خان کا خیال ہے میں ہیرے تلاش کر سکتا ہوں اس لیے پہلے اس نے مجھے اغوا کیا اور پھر سویرا کو بھی اغوا کر لیا تاکہ اس کی مدد سے مجھے مجبور کرے۔''

''تب وہ میرے ساتھ تو اس سے بھی برا کر سکتا ہے۔'' ایمن بولی۔ ''ہیروں کے بارے میں صرف پاپا کو علم ہے اور میں ان کی بیٹی ہوں۔''

''میں بھی اسی طرف تمہاری توجہ دلانا چاہ رہا ہوں۔ فتح خان اس وقت بہت خطرناک موڈ میں ہے۔''

''وہ کب خطرناک نہیں ہوتا۔ وہ دشمن ہے اور اس سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھی جا سکتی ہے۔'' ایمن نے حقیقت بیان کی۔

''یہ ٹھیک کہتا ہے۔'' فتح خان وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خودکار رائفل تھی جس کا ایک ہی برسٹ ہم سب کو موت کی نیند سلانے کے لیے کافی تھا۔ ''دشمن ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔ اچھا بات ہے اب تم سے اور تمہارے باپ سے بات کرنے کا مزہ آئے گا۔''

''یہ ہوش میں نہیں ہیں۔'' ایمن نے برٹ شا کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے بتائیں گے کہ ہیرے کہاں ہیں؟''

''اگر نہیں ہے تو جلد اسے ہوش آ جائے گا۔'' فتح خان کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز میں ایمن کو لے جائے گا۔ کل سے تمہارے اور برٹ شا کے پاس سات دن کا مہلت ہے۔ آٹھویں دن میں ایمن کے ٹکڑے کر کے اِدھر ڈالنا شروع کرے گا۔ جب تم صبح اُٹھے گا تم کو اس کا جسم کا ایک حصہ ملے گا۔ چار پانچ دن بعد اس خبیث کے پاس بیٹی ٹکڑوں کا شکل میں ہو گا یہ چاہے تو جوڑ کر دوبارہ اسے بنا لے پر یہ زندہ نہیں ہو گا۔ تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے وہ تم کو بتا دیا ہے۔ پھر تم اور یہ پاگل کا بچہ زندہ رہے گا اور سارا عمر اپنے نقصان کا ماتم کرتا رہے گا۔''

ایمن کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ تھوڑی بہت اردو اسے بھی آتی تھی۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ ''شہباز یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ فتح خان کیا کہہ رہا ہے۔ وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''کیسے نہیں جائے گا۔'' فتح خان رائفل لہرا کر غرایا۔ ''دوست خان... شیر خان۔''

فوراً ہی فتح خان کے دو ساتھی اپنے شانوں پر دو عدد تھیلے اُٹھائے نمودار ہوئے اور وہ انہوں نے غار نما حصے کے سامنے رکھ دیے۔ فتح خان نے ان کو ایمن کو وہاں سے لے جانے کا حکم دیا۔ اس نے مزاحمت کی تو میں نے کہا۔ ''ایمن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ہم ابھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے صبر کرو اور وقت کا انتظار کرو۔''

''شہباز۔'' وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔

''شہباز ابھی پنجرے میں ہے۔'' فتح خان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

''تم فکر مت کرو مجھے اللہ پر بھروسا ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی تو وہ حسرت سے مجھے اور برٹ شا کو دیکھتی ہوئی فتح خان کے آدمیوں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

''فتح خان۔'' ایمن کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''ایمن تمہارے ساتھ جا رہی ہے لیکن اگر بلاوجہ اسے ایک خراش بھی آئی تو تمہیں اس کا حساب دینا ہو گا۔''

میری بات پر فتح خان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تشویش نظر آئی۔ مگر فوراً ہی وہ مسکرانے لگا اس نے دانت نکال کر کہا۔ ''تم فکر مت کرو ہم اسے پھول کی طرح رکھے گا۔''

''فتح خان اسے شہلا یا مہر دیکھنے کی غلطی بھی مت کرنا تم عقل مند آدمی ہو اور عقل مند آدمی اسی وجہ سے بچا رہتا ہے وہ اپنی عقل استعمال کرتا ہے، اس پر جذبات کو حاوی آنے نہیں دیتا۔ میری بات سمجھ رہے ہو تا ایسا نہ ہو کہ تم اپنی کسی وقتی خواہش کے پیچھے اپنا مقصد گنوا دو۔''

فتح خان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم اس کا طرف سے بے فکر رہو میں نے جو کہا ہے اس کے علاوہ اس کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔''

''اور تم دونوں کا بہتری اس میں ہے کہ ہیرا سات دن میں مل جائے۔ ورنہ تم جانتا ہے میں کیا کرے گا۔''

''فتح خان تم پھر بلاوجہ مجھے ایک معاملے میں گھسیٹ رہے ہو اور اب میری اور تمہاری دشمنی کا باب دوبارہ کھل گیا ہے، ایک بار یہ قصہ ختم ہونے دو اس کے بعد ہم دوبارہ ملیں گے۔''

فتح خان میری بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں انتظار کرے گا۔ ان تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان ہے۔ سات دن آرام سے چل جائے گا۔ کچھ دوسرا چیز ہے جو اِدھر کام آئے گا۔''

وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے کہا۔ ''ایک منٹ تم... ہمارا تم سے رابطے کی کیا صورت ہو گی؟''

''اس تھیلے میں ایک سرخ رنگ کا جھنڈا ہے اگر تم ہیرا تلاش کر لے تو یہ جھنڈا اُدھر کھنڈر کی سب سے اوپر والی چٹان پر لگا دینا۔'' اس نے چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ''پر بلاوجہ مت لگانا اور جب جھنڈا لگا دینا تو تم اور برٹ شا دونوں اُدھر باہر موجود ہونا ورنہ میں اِدھر نہیں آئے گا۔''

''اس کا مطلب ہے تم اور تمہارے آدمی یہیں ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''شہباز خان تمہارے اور اس پاگل کے پاس صرف سات دن کا مہلت ہے۔'' فتح خان نے میرا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''ابھی اِدھر رکو ایک گھنٹا سے پہلے یہاں سے باہر مت جانا ورنہ میرا آدمی اس بار زمین پر گولی نہیں مارے گا۔ ایک گھنٹے بعد بھلے تم وادی میں گھومے یا یہاں سے فرار ہو جائے۔''

میں ہنسا۔ ''اگر میں نے تمہارے مشورے پر عمل کیا اور فرار ہو گیا تو؟''

''تب میں سات دن کا انتظار نہیں کرے گا۔'' فتح خان نے جواب دیا اور جھٹکے سے مڑ کر چٹانوں سے باہر چلا گیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران برٹ شا اسی انداز میں چٹان کے ساتھ چپکا رہا۔ اس نے نہ تو ایمن پر توجہ دی تھی اور نہ ہی یہاں ہونے والی گفتگو پر توجہ دی تھی۔ وہ خود میں گم تھا۔ فتح خان اور ایمن کے جانے کے بعد بھی اس کے پوز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اگر وہ پاگل نہیں بنا ہوا تھا تو اس کی اداکاری بلاشبہ کمال کی تھی۔ وہ میری طرف بھی متوجہ نہیں تھا، لیکن جب میں اس کے پاس آیا تو وہ کسی ہرن کی طرح خوفزدہ اور چوکنا ہو گیا حالانکہ میں بہت آہستگی سے اس کے پاس آیا تھا۔ میں اس کے پاس زمین پر بیٹھا اور بولا۔

''برٹ شا تم نے سن لیا ہے کہ فتح خان تمہاری اکلوتی بیٹی ایمن کے بارے میں کیا عزائم رکھتا ہے۔'' میں نے کہا اور اس دوران میں زمین پر انگلی سے لکھا۔ ''کوئی ایسی بات منہ سے مت نکالنا جس سے تمہارا پول کھل جائے۔ فتح خان ہماری گفتگو سن رہا ہے۔'' لکھ کر میں نے منہ سے کہا۔ ''اگر تم نے ہیروں والی جگہ نہیں بتائی تو فتح خان سات دن بعد اسے قسطوں میں قتل کرنا شروع کر دے گا اور اس کے ٹکڑے یہاں پھینک کر جائے گا۔''

برٹ شا کی نظریں زمین پر لکھی تحریر پر مرکوز تھیں۔ زمین بھی پتھریلی تھی لیکن اس پر گرد کی ایک تہ آ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پھیر کر پُرانی تحریر مٹا دی اور لکھا۔ ''برٹ شا اگر تم ہوش میں ہو تو اس معاملے میں پوری سنجیدگی سے سوچو۔'' میں نے منہ سے کہا۔ ''اب مہلت نہیں ہے۔ فتح خان ایمن کے ساتھ میری ہونے والی بیوی کو میرے دشمن مرشد کے حوالے کر دے گا۔''

برٹ شا نے گرد پر لکھی تحریر کو دیکھا اور یوں آنکھیں بند کر کے اونگھنے لگا جیسے میری کہی اور لکھی ہوئی ایک بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ سورج سر سے ہو کر ذرا سا ڈھل گیا تھا لیکن اس کی تابناکی برقرار تھی۔ چٹانیں دھوپ سے اس طرح گرم ہو گئیں تھیں کہ اب پہنی ہوئی جیکٹ بھی بوجھ لگ رہی تھی۔ میں نے گرد کی تحریر صاف کی اور اُٹھ کر تھیلوں کا سامان دیکھنے لگا۔ اس میں تقریباً سارا ہی ٹن پیک اور ڈبا بند غذا اور منرل واٹر کی بوتلیں تھیں حالانکہ یہاں منرل واٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ چاروں طرف منرل واٹر ہی تھا۔ جو یقیناً اس بوتل بند پانی سے کہیں بہتر تھا۔ دوسرے سامان میں ایک عدد سلیپنگ بیگ تھا جو یقیناً برٹ شا کے لیے تھا کیونکہ کھلا سونا ممکن نہیں تھا۔ سر پر باندھنے والی جدید ترین ٹارچیں جو بیس پچیس گھنٹے تک روشن رہ سکتی تھیں یہ یقیناً رات کے لیے تھیں۔ دشوار گزار جگہوں پر جانے کے لیے رسیاں اور کوہ پیمائی کی کچھ چیزیں تھیں۔ لیکن

چالاک فتح خان نے ایسی کوئی چیز نہیں دی تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتا۔ سوائے ایک ناکارہ پستول کے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

برٹ شا شاید بھوکا تھا کیونکہ وہ ٹن بند خوراک کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی صحت سے لگتا تھا کہ فتح خان اسے بھوکا بھی رکھتا ہوگا، شاید وہ اسے اس طرح سزا دیتا تھا۔ بعض لوگوں کے لیے بھوک سے زیادہ خوفناک سزا اور کوئی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے ایک فرائی آلو کا ٹن کھول کر اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بے صبری سے اُچک لیا اور جلدی جلدی کھانے لگا جیسے اسے خطرہ ہو کہ میں کہیں واپس نہ لے لوں۔ میں نے اپنے لیے ایک ٹیونا کا ٹن نکالا۔ یہ سرد نہیں رہا تھا اس لیے میں نے آرام سے خشک تندوری نان کے ساتھ کھا لیا۔ پھر اسپرٹ سے جلنے والا برنر نکال کر اس پر کافی تیار کی اور ایک مگ برٹ شا کی طرف بڑھا دیا جو اب ٹیونا کا ٹن خالی کر رہا تھا۔ ٹن خالی کر کے اس نے حریص نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی بھوک مٹی نہیں تھی بس پیٹ بھر گیا تھا۔

"اس وقت کے لیے اتنا کافی ہے زیادہ ٹیونا کھانے سے پیٹ خراب ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لو کافی پیو، نیس کیف ہے۔"

برٹ شا نے جلدی سے مگ تھام لیا اور ایک گہری سانس لے کر پہلے کافی کی خوشبو محسوس کی اور پھر اس کے گرم ہونے کی پروا کیے بغیر ایک گھونٹ بھرا۔ اس کا منہ جل گیا تھا لیکن وہ بدمزہ نہیں ہوا۔ جیسے ہی اس کے منہ کی جلن کم ہوئی اس نے پھر ویسا ہی بڑا سا گھونٹ لیا۔ میں اس کے پاس ایک پتھر پر ٹک گیا۔ کھانے پینے کے معاملے میں برٹ شا ہوشیار نظر آرہا تھا اسے معلوم تھا کہ کھایا کیسے جاتا ہے اور کون سی چیز پینے والی ہے۔ پھر وہ کھانے پینے کی چیزوں سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ لیکن یہ کسی کی ہوشیاری جانچنے کا پیمانہ نہیں ہے کیونکہ بھوک تو پاگل کو بھی لگتی ہے۔ میں نے کہا۔ "برٹ شا تم میری بات سن رہے ہو؟"

اس نے کافی پیتے پیتے منہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ "برٹ شا کیا تمہیں ہیرے یاد ہیں؟" اس سوال پر بھی وہ اسی طرح دیکھتا رہا۔ "تمہیں یاد ہے تمہارا تعلق ایک معزز انگلش فیملی سے ہے۔ تمہیں معلوم ہے تمہاری گمشدگی کا فائدہ اُٹھا کر تمہارے کزن ڈیوڈ شا نے تمہاری جاگیر اور خطاب پر قبضہ کرلیا ہے اور تمہاری اکلوتی بیٹی ایمن کو کچھ نہیں ملا ہے۔ تم نے ایمن کو دیکھا ابھی آئی تھی۔ فتح خان نے اسے پکڑ لیا ہے اور اگر تم نے اسے ہیرے نہ دیے تو وہ ایمن کو قتل کردے گا۔"

میری گفتگو کے دوران وہ اسی طرح منہ اُٹھائے دیکھتا رہا جیسے غور سے میری بات سن رہا ہو لیکن جیسے ہی میں خاموش ہوا وہ پورے خضوع و خشوع سے کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لگتا تھا میرا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ جب سے وہ آیا تھا میں نے اس کے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں سنا تھا وہ بس چیختا تھا یا ہنستا تھا۔ مجھے اب تشویش ہونے لگی تھی اگر وہ سچ مچ دیوانہ ہوگیا تھا تو ہیروں کے بارے میں کون بتاتا۔ اگر فتح خان کو وہ لعنتی ہیرے نہیں ملتے تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر گزرتا۔ اس وقت مجھے غصہ آگیا اور شاید میں برٹ شا کی گردن پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کردیتا لیکن مجھے بروقت خیال آگیا۔ اگر وہ ہوش مند تھا تو میں نے ہی اسے فتح خان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ہماری باتیں سن رہا ہے اس لیے وہ بدستور پاگل بنا ہوا تھا۔ اس لیے اگر وہ مجھ سے کوئی بات کرنا بھی چاہتا تو کس طرح کرسکتا تھا۔

میں نے سوچا اور پہلے اُٹھ کر برٹ شا کو ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں اس کے لباس میں بھی تو کوئی ایسی چپ نہیں چھپی ہے۔ وہ ڈری ڈری آوازیں نکالتا رہا لیکن اس نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ اچھی طرح اطمینان کر کے میں وہاں سے اُٹھ کر ذرا دور آیا اور جیکٹ اُتار کر ایک پتھر پر رکھ دی۔ یہ غار نما جگہ سے کوئی تیس چالیس فٹ دور تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنے فاصلے سے جیکٹ میں لگی چپ ہماری آواز کیچ نہیں کرسکے گی۔ پھر میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر سامان بھی غار کے سب سے اندرونی حصے میں رکھ دیا ممکن ہے اس میں بھی کوئی ایسی چیز ہو۔ پھر میں برٹ شا کے پاس آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے صرف چوکنا نظروں سے مجھے دیکھا وہ خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

"مسٹر برٹ شا اگر تم بنے ہوئے پاگل ہو تو فوری طور پر اپنا پاگل پن ترک کردو۔ کم سے کم میرے سامنے، میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ اس وقت فتح خان ہماری گفتگو نہیں سن رہا ہے کیونکہ میں جیکٹ دور رکھ آیا ہوں۔ گفتگو سننے والا آلہ اسی میں لگا ہوا ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو ایک بار پہلے بھی میں فتح خان سے تمہاری اور تمہاری بیٹی کی جان بچا چکا ہوں۔ اس وقت بھی میں تم دونوں کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فتح خان نے مجھے ٹریپ کیا ہے لیکن میں اس کی چال سے واقف ہو چکا ہوں۔ اب میں اس کی چال اسی پر اُلٹ دینا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم میرا ساتھ دو۔ تم میری بات سن رہے ہو نا؟"

اس اچانک سوال پر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میرا کہا ہوا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ میں کچھ دیر اس سے سر مارتا رہا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے کل سے میں تمہیں پوری وادی میں گھماؤں گا۔ تم یاد کرنے کی کوشش کرو گے کہ ہیرے کہاں ہیں؟"

میں نے واپس جا کر جیکٹ پہنی اور چٹانوں سے باہر نکل آیا کیونکہ فتح خان کی دی ہوئی ایک گھنٹے والی وارننگ ختم ہو چکی تھی۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا لیکن کہیں کوئی نظر نہیں آیا۔ شاید فتح خان جنوب مشرق کی طرف جا چکا تھا جہاں سے ہم اس وادی میں داخل ہوئے تھے۔ وہ وہیں سے ہماری نگرانی کرتا اور اس کے لیے اس کے پاس چپ کا سگنل ریسیور موجود تھا۔ جو نہ صرف میری لوکیشن بتاتا بلکہ میری اور برٹ شا کی گفتگو بھی اسے سناتا۔ کھنڈر سے باہر آ کر میں وادی کی ڈھلانوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کا قطر ایک میل سے کچھ ہی کم تھا بلکہ اگر اوپری ڈھلانوں کو شامل کرلیا جاتا تو وادی ایک مربع میل سے زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھلانوں پر گھنے جنگل تھے اور نیچے کوئی پانچ سو فٹ قطر میں خشک اور چٹیل چٹانیں تھیں جن کا بلند وسطی حصہ موسم کے سرد و گرم سہہ کر کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

شاید کسی زمانے میں اس وادی میں کوئی آتش فشاں پھٹا تھا اور یہ چٹیل میدان اس کے لاوے سے بنا تھا۔ کیونکہ پورا علاقہ ایک ہی چٹان پر مشتمل تھا اور اتنی بڑی چٹان صرف لاوے سے وجود میں آسکتی ہے۔ جہاں جنگل اور ڈھلان شروع ہو رہی تھی وہاں برف اور جابجا نشیب میں چھوٹے چھوٹے تالاب بن گئے تھے جن میں پانی تھا۔ رات کو شاید یہ جم جاتا تھا اور صبح دوبارہ پانی کی صورت اختیار کرجاتا۔ میں جنگل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور کوئی دو میل سے زیادہ کا فاصلہ طے کر کے اسی جگہ آگیا جہاں سے چلا تھا۔ جہاں سامان رکھا تھا وہ جگہ شمال مشرق کی سمت تھی اور یہاں سے ڈھلان دو سو گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

چٹانوں سے باہر موسم سرد تھا اور دھوپ میں بھی سردی واضح محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں چٹانوں میں داخل ہوا تو سورج ڈھلنے لگا تھا اور کچھ دیر میں شام سر پر ہوتی۔ اس سفر کے دوران مجھے جہاں بھی خشک اور پڑی ہوئی لکڑی نظر آئی میں نے اُٹھالی اس طرح رات کو الاؤ جلانے کے لیے خاصی لکڑی مل گئی تھی۔ میں غار نما حصے میں داخل ہوا تو برٹ شا وہاں نہیں تھا جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ اسے غائب پاکر مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر کہیں نکل گیا ہے۔ وہ اگر سچ مچ پاگل تھا تو بھی مجھے اسے یوں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا اور اگر ہوش مند تھا تو اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دیا تھا۔ میں غصے میں غار نما حصے کی طرف آیا اور پھر رک گیا۔ برٹ شا دو تھیلوں کے درمیان دبکا ہوا بے خبر سو رہا تھا اور اس کے کھلے منہ سے خفیف سی سیٹی نما آواز نکل رہی تھی۔ میں نے لکڑی الاؤ والی جگہ رکھ دی اور برٹ شا کے لیے لایا جانے والا سلیپنگ بیگ نکال کر اس پر ڈال دیا۔ اس نے سوتے میں اسے پکڑ لیا۔

اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ بنا ہوا پاگل نہیں ہے اس کا دماغ سچ مچ جواب دے گیا تھا۔ مستقل تکلیفوں اور اذیتوں نے بالآخر اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ نہ جانے فتح خان اور اس کے اس سے بھی زیادہ وحشی ساتھی اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے رہے ہوں گے؟ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا اس کے انداز میں کہیں ایک لمحے کو بھی بناوٹ نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے اتنے سالوں بعد اپنی اکلوتی بیٹی کو بالکل کسی انجان کی طرح دیکھا تھا۔ کوئی انسان خود پر کتنا ہی قابو کیوں نہ رکھے کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کے سامنے وہ بناوٹ نہیں کرسکتا ہے۔ یہ خاصی خوفناک بات تھی اگر برٹ شا سچ مچ پاگل ہوگیا تھا تو ہیرے ہاتھ سے گئے تھے۔ ان کی جگہ سے وہی واقف تھا۔ اب تک فتح خان کی ساری حکمتِ عملی اسی پر منحصر تھی کہ برٹ شا اصل میں اداکاری کر رہا ہے اور اپنی جان اور ہیرے بچانے کے لیے اس نے خود پر مصنوعی پاگل پن طاری کرلیا ہے۔ وہ کسی صورت یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ برٹ شا سچ مچ پاگل ہوگیا ہے۔

صرف فتح خان ہی نہیں خود میری بھی یہی سوچ تھی کہ برٹ شا اداکاری کر رہا ہے۔ جب آخری بار میں نے اسے فتح خان کی قید میں دیکھا تھا تو اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ پاگل نہیں بلکہ بنا ہوا ہے۔ اسی بنا پر میرے ذہن میں آیا تھا کہ وہ اب بھی اپنی اداکاری پر قائم ہوگا۔ مگر گزشتہ چند گھنٹوں میں میں نے جس برٹ شا کو دیکھا تھا وہ سچ مچ ہوش و حواس سے بے گانہ محسوس ہو رہا تھا اور اس پاگل کو فتح خان نے میرے سر مار کر ہیرے تلاش کرنے کا کام سونپ دیا تھا۔ برٹ شا نے اب تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ بنا ہوا پاگل ہے اس کا انداز بالکل فطری تھا۔ اس میں بناوٹ مشکل سے ہی تلاش کی جاسکتی تھی۔

سورج ڈھلنے کے باوجود چٹانوں کی تپش کم نہیں ہوئی تھی۔ یہاں موسم بھی نہایت خشک تھا اس لیے گلا بار بار خشک

www.paksociety.com

ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک کولڈ ڈرنک ٹن نکالا اور جب اسے کھولا تو گیس نکلنے کی آواز سن کر برٹ شا اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے منہ چلاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے بھی ایک ٹن کھول دیا۔ اس نے چند گھونٹ میں ٹن خالی کر دیا اور پھر اسے بے پروائی سے ایک طرف پھینک کر اُٹھ کر باہر جانے لگا۔ میں اُٹھ کر دبے قدموں اس کے پیچھے آیا۔ لیکن وہ باہر جانے کے بجائے وہ ایک طرف چٹان کی آڑ میں جا کر فارغ ہونے لگا۔ میں ایک بار پھر شک میں پڑ گیا۔ وہ پاگل تھا تو اسے یہ احساس کیسے تھا کہ رفع حاجت کسی جگہ چھپ کر کی جاتی ہے۔ اپنا کام کر کے وہ واپس آیا اور اسی چٹان سے ٹک کر اونگھنے لگا۔

"برٹ شا تم بول سکتے ہو؟" میں نے پوچھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زبان کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور دل میں کہا۔ "ٹھیک ہے بیٹا تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس سے پالا پڑا ہے۔"

میں اندر آیا ایک طاقتور ٹارچ اور سہارا لینے والی اسٹک اور رسّی اُٹھائی اور باہر آیا۔ میں نے برٹ شا کا بازو پکڑ کر اُٹھایا۔ اس کے ایک ہاتھ پر رسّی باندھی اور بغیر کچھ کہے اسے لے کر چل پڑا میں نے شمال مغربی ڈھلان کا رُخ کیا تھا۔ ممکنہ طور پر برٹ شا نے ہیرے ان ہی اطراف میں کہیں چھپائے تھے۔ وہ کمزور تھا اور اتنی آسانی سے نہیں چل پا رہا تھا لیکن میں اسے کھینچتا ہوا ڈھلان والے جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں نے چلتے چلتے کہا۔ "برٹ شا اس جنگل کو غور سے دیکھو تم یہاں بارہ سال پہلے آئے تھے اور تم نے یہاں ہیروں سے بھرا ایک فولادی بکس چھپایا تھا۔ یاد کرو تم نے کہاں چھپایا تھا؟"

مگر وہ چلتا اور کراہتا رہا زبان سے اس نے ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ہی اس نے میرے سوال پر کوئی ردِعمل ظاہر کیا تھا۔ میں بار بار اسے ہیروں کا ذکر کر کے یاد کرنے کو کہتا رہا۔ جنگل تلے تاریکی چھانے لگی تھی حالانکہ اوپر ابھی دھوپ اور روشنی تھی۔ مگر گھنے درختوں تلے بہت کم روشنی آ رہی تھی بعض مقامات پر تو اتنا اندھیرا تھا کہ مجھے ٹارچ روشن کرنا پڑی تھی۔ جب تک اوپر بھی مکمل تاریکی نہیں پھیل گئی میں برٹ شا کو لے کر گھومتا رہا۔ دو گھنٹے بعد اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اب اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ کئی بار وہ لڑکھڑایا لیکن میں نے اسے گرنے نہیں دیا تھا۔ اس طرح کی دشوار پہاڑی ڈھلانوں پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے اچھے خاصے صحت مند لوگ تھک جاتے ہیں برٹ شا تو ایک کمزور اور بوڑھا انسان تھا۔ جب میں اسے لے کر کھنڈرات میں واپس آیا تو وہ گر جانے کے انداز میں سلیپنگ بیگ پر لیٹ گیا تھا۔ تھکن تو مجھے بھی تھی لیکن میں پُر مشقت زندگی کا عادی ہو گیا تھا۔

چھ بجے اندھیرا چھانے لگا تھا اور ساڑھے چھ بجے تک باہر مکمل تاریکی نے ڈیرا جما لیا تھا۔ میں نے الاؤ روشن کیا تو غار نما حصہ گرم ہونے لگا تھا کیونکہ سورج ڈوبتے ہی چٹانیں بہت تیزی سے ٹھنڈی ہو گئی تھیں اور اب سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ سرد ہونے کے دوران چٹانوں سے عجیب و غریب چٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ شاید گرمی سردی کا یہ چکر ہی ان چٹانوں کی شکست و ریخت کا باعث تھا۔ جب چٹانیں گرم ہوتی ہیں تو پھیلتی ہیں اور جب سرد ہوتی ہیں تو سکڑ جاتی ہیں۔ اسی دوران میں یہ کہیں کہیں سے چٹختی ہیں اور ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر ان دراڑوں میں بارش کا پانی جاتا ہے اور وہ سردی سے جم کر پھیلتا ہے تو ان دراڑوں کو مزید توڑتا ہے۔ ہزاروں سال کے اس چکر سے چٹانیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ الاؤ روشن کر کے میں نے کافی کا پانی رکھا جب کافی کی خوشبو پھیلی تو برٹ شا سونگھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اسے بھی کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے بھی نکالی اور کہا۔ "کھانے پینے کے معاملے میں تم ہوشیار ہو۔"

اس نے دانت نکال کر میری طرف دیکھا اور نہایت انہماک سے کافی پینے لگا میں نے اچانک پوچھا۔ "تمہیں نیس کیف پسند ہے؟"

ایک لمحے کو لگا جیسے وہ اثبات میں سر ہلانے والا ہے۔ لیکن پھر اس نے معمول کے مطابق منہ اُٹھا کر مجھے دیکھا اور کافی پینے لگا۔ میں نے دل میں کہا۔ "بڑے میاں اگر تم پاگل نہیں ہو تو نہایت پکے ہو۔ بہر حال ابھی ہمارے پاس سات دن ہیں اس کے بعد جو ہوگا وہ تم بھی دیکھو گے اور میں بھی۔"

کافی پی کر میں بہ ظاہر سامان دیکھنے اور ان کو الگ الگ ترتیب سے رکھنے لگا لیکن اصل میں میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں سامان میں کوئی اور سگنل دینے والی ڈیوائس تو نہیں ہے۔ میں نے کھانے کی ٹن بند اور ڈبا پیک چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ اسی طرح کولڈ ڈرنک کے ٹن اور کافی بنانے کا سامان ایک طرف کیا۔ ٹارچز اور دوسری کام کی چیزیں ایک بیگ میں کر دیں۔ پھر میں نے برٹ شا کو سمجھایا کہ سلیپنگ بیگ کیسے استعمال کرتے ہیں اور اسے باقاعدہ اس کے اندر گھس کر لیٹ کر دکھایا۔ یہ بستر کا کام بھی دیتا تھا اور کمبل کا بھی۔ دو تین بار سمجھانے پر برٹ شا سمجھ گیا اور اس نے اس

اندر گھس کر لیٹ کر دکھایا۔ اس کا خوف خاصی حد تک کم ہو گیا تھا اور اب وہ مجھ سے بھڑک نہیں رہا تھا۔

منرل واٹر کی بوتلیں میں نے ایک طرف رکھ دی تھیں۔ فتح خان نے جو سامان دیا تھا اس میں پنیر، مکھن اور ملک کیا ہوا ڈبا بند گوشت بھی تھا۔ میں نے رات کے کھانے کے لیے گوشت اور پنیر نکالا۔ اسے چھوٹے سے فرائی پین میں گرم کیا۔ پھر آگ کے پاس رکھ کر نان گرم کیے۔ میں تو خوب کھا رہا تھا۔ لیکن برٹ شا بھی آج کم نہیں چلا تھا اس کا بھوک سے بُرا حال تھا اس لیے جب میں نے کھانے کی تیاری شروع کی تو وہ پہلے سے آ کر بیٹھ گیا اور للچائی نظروں سے کھانے کی چیزوں کو دیکھتا رہا مگر اس نے خود سے کوئی چیز نہیں چھیڑی۔ میں نے ڈنر گرم کر کے اس کے سامنے رکھا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک بار پھر بے سدھ ہو کر پڑ گیا۔ میں نے چلا چلا کر اسے تھکا مارا تھا اور آج تو آغاز تھا۔

گزشتہ رات نہ تو کوئی بڑا جانور اس طرف پھٹکا تھا اور نہ ہی ان کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ایسے جانور یا تو یہاں پائے ہی نہیں جاتے تھے یا سردیوں میں یہاں سے کہیں اور چلے جاتے تھے۔ پھر بھی احتیاطاً کھانے پینے کا سامان غار کے سب سے اندر والے حصے میں رکھا تھا۔ اس کے چکر میں کوئی جانور اس طرف آ جاتا تو بلاوجہ بڑبونگ مچتی یا وہ دوسری چیزیں بھی خراب کر دیتا۔ برٹ شا بھی اندر ہی سو رہا تھا اسے پھر سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی وہ خود سلیپنگ بیگ میں گھس کر سو گیا تھا۔ میں نے اس کے بعد نیا خیمہ لگایا اور اس سے آگے الاؤ تھا جس کی حدت غار کو بھی گرم کر رہی تھی۔ سونے کے لیے لیٹا تو..... مجھے مہرو کا خیال آیا۔ نہ جانے وہ کہاں بھٹک رہی ہو گی؟ ویسے وہ کم سے کم اس وادی سے دور جا چکی ہو گی۔

میں مہرو پر انحصار نہیں کر سکتا تھا ایک تو میں نے ایک چانس لیا تھا۔ دوسرے اس کی موجودگی مجھ پر بوجھ تھی اور میرے ہاتھ پاؤں کہیں اس کی وجہ سے رک سکتے تھے۔ اب میں کم سے کم اس کے بوجھ سے آزاد تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنا راستہ لیتی اور راجا عمر دراز تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتی۔ وہ فتح خان کے چنگل سے نکل جاتی تو اس کے لیے یہی بہت ہوتا۔ میرے حساب سے تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ پلٹ کر واپس آنے کے لیے نہیں گئی تھی۔ وہ جوان اور خوب صورت عورت تھی اسے سہارا دینے والے بھی بہت مل جاتے۔ وہ مرد کے معاملے میں تجربہ کار تھی اس لیے اس کے دھوکا کھانے کا امکان بھی کم تھا۔ پھر اس میں ایک نوع کی خانہ بدوش ہوشیاری پائی جاتی تھی۔ وہ خود کو سنبھال سکتی تھی۔

ان دنوں میں جس خیال سے سب سے زیادہ بچنے کی کوشش کرتا تھا وہ سویرا کا خیال تھا۔ کیونکہ اس کے بارے میں سوچتے ہی میرے اندر جیسے کچھ چبھنے لگتا تھا۔ مجھے یہ خیال بے چین کر دیتا کہ وہ قید میں نہ جانے کس حال میں ہو گی؟ وہ میرے بارے میں سوچتی ہو گی کہ میں اسے رہا کرانے کے لیے کچھ کیوں نہیں کر رہا ہوں؟ اس وقت بھی مجھے سویرا کا خیال آیا اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی وقت مجھے نیند آ گئی۔ پھر میری آنکھ کھٹ پٹ سے کھلی۔ میں نے خیمے کی زپ کھولی تو برٹ شا کو کھانے پینے کی چیزیں اُلٹتے پلٹتے پایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا تو وہ بھڑک کر جلدی سے واپس اپنی جگہ آ گیا۔ وہ چیزوں کو دیکھ رہا تھا اس نے کسی چیز کو کھولا نہیں تھا۔ صبح قریب تھی اور شاید اسے دوبارہ بھوک لگ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "سو جاؤ ابھی صبح ہی کچھ کھانے کو ملے گا اس سے پہلے نہیں مل سکتا۔"

وہ سعادت مندی سے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ میں باہر آیا۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ میں ٹارچ لے کر چٹانوں کے درمیان آیا۔ دن میں یہ چٹانیں جتنی گرم ہو جاتی تھیں اس وقت اتنی ہی ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ پانی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے میں منرل واٹر کی بوتل لے گیا تھا کیونکہ باہر اس وقت کہیں پانی موجود بھی ہوتا تو وہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوتا۔ میں فارغ ہو کر واپس آیا اور الاؤ میں مزید لکڑی ڈالی اس میں آگ کم رہ گئی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں کمبل لے کر الاؤ کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

فتح خان نے اگرچہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا تھا لیکن اس نے ہمارے گرد ایسی دیواریں کھڑی کر دی تھیں جن کو عبور کرنا کم سے کم میرے بس کی بات نہیں تھی۔ سویرا کی ذات پر میں ایک ذرا سا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ برٹ شا اگر ہوش مند تھا تو وہ بھی یقیناً ایمن کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا لیکن ابھی اس کے پاس مہلت تھی۔ اگر وہ سچ مچ دیوانہ تھا تو فتح خان کی تگ و دو ہی بیکار تھی۔ فتح خان ہماری نگرانی کر رہا تھا اس کے آدمی یقیناً اس وادی میں بھی تھے۔ پھر چپ کی مدد سے بھی نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ رات کو نگرانی کے لیے اس نے کیا کیا ہو گا۔ ممکن ہے اس کے آدمیوں کے پاس تاریکی میں دیکھنے والی عینکیں اور دوربینیں ہوں۔

اس قسم کی چیزیں آج کل بازاروں میں عام مل جاتی ہیں۔ ان میں خاص لینس لگے ہوتے ہیں جو حرارت کو دیکھ

www.paksociety.com

لیتے ہیں اس لیے اگر بالکل اندھیرے میں بھی کوئی حرارت والا جسم ہو جیسے زندہ انسان یا جانور یا پھر کوئی ایسی بے جان چیز جو حرارت خارج کرتی ہو تو ان کی مدد سے انہیں بہ خوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ خود ہمارے پاس اس قسم کی عینکیں اور دور بین تھیں۔ لازمی بات تھی کہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کے پاس اس قسم کی رات میں دیکھنے والی چیزیں ہوں گی۔ میں سوچتا اور اونگھتا رہا۔ فی الحال مجھے سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ برٹ شا کو لے کر وادی میں چکراتا رہوں اور اسے ہیروں والی جگہ بتانے پر اُکساتا رہوں۔

برٹ شا کی استقامت حیران کن تھی۔ اب نہ جانے یہ اس کی ہیروں سے محبت تھی یا اپنی ذمّے داری کا احساس تھا کہ اس نے اتنے سال فتح خان کی قید میں گزار دیے۔ وہ بدترین حال میں رہا اور شاید ہی کوئی تکلیف ایسی ہو جو اس نے نہ سہی ہو پھر بھی اس نے فتح خان کو ہیروں کے بارے میں بتایا نہیں تھا۔ ابھی میں اس کی ذہنی حالت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے پہلے جب میں نے اسے فتح خان کی قید میں دیکھا تھا تو وہ بنا ہوا دیوانہ تھا۔ اس وقت فتح خان اسے اصلی دیوانہ سمجھتا تھا اور اب شاید وہ سچ مچ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا تو فتح خان کو یقین تھا کہ وہ ہوش میں ہے اور اداکاری کر رہا ہے۔

میں سوچتا کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو بہت پہلے فتح خان سے تصفیہ کر چکا ہوتا۔ لیکن یہ میرا خیال بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میں اس معاملے کو باہر سے دیکھ رہا تھا۔ اصل احساس تو اس کے پاس ہوتا ہے جس پر گزر رہی ہوتی ہے نہ جانے کیوں برٹ شا اب تک ہیرے نہ دینے پر اڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایک اذیت ناک قید میں گزار دیے تھے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ میں اپنے ذہن سے سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے مجھے ان حالات سے واسطہ پڑتا جن سے برٹ شا کو پڑا تھا تو میں بھی اسی کی طرح سوچتا اور اسی کی طرح فتح خان کے سامنے ڈٹ جاتا۔ ہر آدمی میں عزتِ نفس اور اس کا معیار ہوتا ہے۔ میری عزتِ نفس اور اس کا معیار یہ تھا کہ میں مرشد علی کے سامنے ڈٹ جاؤں اور اس کی تمام تر طاقت اور جبر کے باوجود اس کے سامنے ہتھیار نہ ڈالوں کیونکہ یہ میری اور میرے ساتھیوں کی عزت کا سوال تھا۔ ایسی ہی عزتِ نفس اور اس کا معیار برٹ شا بھی رکھتا تھا۔ وہ اس کی خاطر جان دے سکتا تھا اور ہر ظلم برداشت کر سکتا تھا لیکن ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔

مگر اس دنیا میں ہر چیز کی ایک حد ہے۔ انسان اپنی عزتِ نفس کو بھی صرف ایک حد تک دیکھ سکتا ہے بعض اوقات اس کے سامنے ایسی صورتِ حال آجاتی ہے جس میں اسے اپنی عزتِ نفس یا اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگ جن کے نزدیک سوائے اپنی اور کسی کی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی عزتِ نفس کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنے پیاروں کو قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ عزتِ نفس نہیں بلکہ خود پرستی ہے جس میں انسان بس خود کو ہی سب سمجھتا ہے اور کسی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ برٹ شا اس وقت مجھے ایک ایسا ہی شخص لگ رہا تھا اس میں خود پرستی تھی۔ اسے اپنی اکلوتی بیٹی کی پروا بھی نہیں تھی جو دشمنوں کے قبضے میں آچکی تھی۔ خیالوں کے دوران دوبارہ نیند نے غلبہ پالیا اور دوسری بار آنکھ کھلی تو الاؤ راکھ ہو رہے تھے اور صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔ میں ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور پھر یہ انگڑائی اَدھوری رہ گئی کیونکہ برٹ شا کا سلیپنگ بیگ خالی تھا۔

میں تیزی سے اُٹھا اور کمبل پھینک کر باہر نکل آیا۔ میں نے برٹ شا کو آواز دینے سے گریز کیا اور دبے قدموں چٹانوں کے درمیان چلتے ہوئے اسے تلاش کرنے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ فرار نہیں ہوا ہے تو کہاں گیا ہے؟ مگر جلد میں نے اسے ایک جگہ مخصوص پوز میں بیٹھے پایا۔ وہ رفع حاجت کر رہا تھا۔ میں اس سے کچھ دور ہو گیا لیکن میں نے اطمینان کر لیا کہ اگر وہ یہاں سے اُٹھے گا تو لازمی میری نظروں میں رہے گا۔ اسے علم نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ وہ فراغت حاصل کرنے کے ساتھ کچھ گنگنا بھی رہا تھا میں نے غور کیا تو وہ کچھ اشعار گنگنا رہا تھا۔ کم سے کم الفاظ کی ترتیب سے تو یہ شاعری لگتی تھی۔ ویسے مجھے انگریزی کی شاعری اور نثر میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ہے۔ ممکن ہے ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کا نقطہ نظر مختلف ہو۔ کل سے اب تک میں پہلی بار اسے کچھ بولتے سن رہا تھا۔ آواز دھیمی اور لہجہ صاف تھا۔ غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ میں سو رہا ہوں اس لیے وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر بولنے کی خواہش پوری کر رہا تھا۔

انسان حیوانِ ناطق ہے اور بولے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب کوئی اس کی بات نہیں سنتا تو یہ الفاظ کو سجا بنا کر پیش کرنے کا فن سیکھتا ہے۔ گانے اور گنگنانے کا فن ایجاد کرتا ہے اپنی بات دوسروں کو سنانے کے لیے شاعری تک کرتا ہے۔ غرض کہ انسان بولے بغیر نہیں رہ سکتا۔ برٹ شا بھی انسان ہی تھا۔ اس نے پاگل بنے رہنے کے لیے اداکاری کی انتہا کر دی تھی لیکن اپنی بولنے کی خواہش نہیں دبا پایا تھا۔ لیکن یہ اس کے ہوش و حواس میں ہونے کی حتمی دلیل نہیں تھی۔ پاگل انسان

بھی گنگنا سکتا ہے اور پورے پورے اشعار ٹھیک طرح سے گا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی پتلون چڑھاتا ہوا اس حصے سے باہر آیا اور مجھے بیدار پا کر سٹپٹا گیا تھا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے مخصوص انداز میں دانت نکالے تھے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پلٹ کر غار کی طرف آگیا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے گنگنانے کی آواز فتح خان تک نہیں پہنچی ہو گی۔ خود میں بہت مشکل سے سن پا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے پیچھے آیا اور اندر جانے کے بجائے الاؤ کے پاس بیٹھ کر پُرامید نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے کھانے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے ناشتے کا سامان نکالنا شروع کیا۔ الاؤ پر کافی کا پانی رکھ کر میں منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ چٹانوں میں ایک جگہ مجھے کچھ پانی مل گیا تھا جو نہایت یخ تھا لیکن اس سے منہ ہاتھ دھو کر میں تازہ دم ہو گیا تھا۔

اس سردی میں تقریباً کھلی جگہ سونا کسی طرح آرام دہ نہیں تھا اس لیے جسم میں تھکن کی کیفیت تھی جسے اس سرد پانی نے زائل کر دیا۔ دانت صاف کر کے میں واپس آیا اور ناشتا تیار کیا۔ میں اور برٹ شا دونوں ناشتے سے فارغ ہوئے اور میں تیار ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے رسّی نکالی برٹ شا ڈری ڈری آواز نکال کر پیچھے ہٹا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے پھرتی سے اس کا بازو پکڑ کر رسّی اس کے ہاتھ میں اس طرح باندھ دی کہ وہ اسے ایک ہاتھ سے نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”آج سارا دن گھومنے پھرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ امید ہے اس سے تمہاری یادداشت پر کچھ نہ کچھ فرق پڑے گا۔“

میں اسے لے کر روانہ ہوا۔ میرا شام سے پہلے واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے خوراک کے پیکٹ، کولڈ ڈرنکس اور پانی کی بوتل ساتھ لے لی تھی۔ برٹ شا فی الحال تازہ دم تھا لیکن وہ مرے مرے انداز میں میرے ساتھ چل رہا تھا۔ رسّی مستقل ہاتھ میں تھامے رہنے کی زحمت سے بچنے کے لیے میں نے اس کا لچھا شانے پر ٹانگ لیا تھا۔ سامان بیگ میں پشت پر بندھا تھا اور ہاتھ میں اسٹک تھی۔ دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ میں چڑھائی کے سفر کے دوران برٹ شا سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے ان سالوں میں دنیا کتنی بدل گئی ہے جو تم نے ایک احمقانہ چیز کے پیچھے فتح خان کی قید میں گزار دیے۔ ہیروں کو میں احمقانہ چیز ہی کہوں گا۔ ٹھیک ہے یہ بہت قیمتی ہوتے ہیں لیکن انسان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے۔ اس بارہ تیرہ سالوں میں دنیا بدل کر رہ گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے امریکا میں نائن الیون کا سانحہ پیش آیا اور اس بہانے امریکا دنیا پر چڑھ دوڑا۔ جب تم یہاں آئے تو موبائل فون کی پہلی نسل تھی آج موبائل فون کی پانچویں نسل آچکی ہے۔ موبائل کمپیوٹر بن چکا ہے اور کمپیوٹر نہ جانے کیا بن گیا ہے۔ اب تو اس پر پوری پوری فلمیں بن رہی ہیں۔“

پتا نہیں برٹ شا سن رہا تھا یا نہیں۔ وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے سفر کر رہا تھا۔ میں اس سے بات کرتا رہا اسے ایمن کے بارے میں بتاتا رہا ڈیوڈ شا کے بارے میں بتاتا رہا۔ اپنے اور فتح خان کے بارے میں بتاتا رہا اور درمیان میں ہیروں کا ذکر بھی کر دیتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے اسے دس منٹ کا آرام دیا۔ لیکن اس کی حالت اتنی بُری ہو رہی تھی کہ یہ دس منٹ کا آرام اس کے لیے ناکافی تھا۔ دس منٹ بعد میں نے اس کی رحم طلب نظروں کی پروا کیے بغیر اسے اُٹھایا۔ اس سارے دن میں نے اسے کوئی چھ گھنٹے گھمایا۔ ہر ایک گھنٹے بعد دس منٹ کے لیے رکے اور تین گھنٹے بعد میں نے کھانے کا وقفہ دیا۔ یہ بھی صرف آدھے گھنٹے کا تھا۔

شام تک میں خود تھک گیا تھا لیکن برٹ شا تو غشی کی کیفیت میں تھا اور بادلِ ناخواستہ میرے پیچھے گھسٹ رہا تھا اور رونے کے انداز میں کراہ رہا تھا اور آخری دو گھنٹوں میں تو کئی بار گرا تھا۔ مگر میں نے اس پر ترس نہیں کھایا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ بھی فتح خان سے کم نہیں تھا۔ فتح خان ہیروں کے پیچھے پاگل ہو رہا تھا کیونکہ وہ دولت کا لالچی ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ مگر برٹ شا ایک معزز لارڈ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ بے شک ہیرے بہت قیمتی تھے۔ مگر اس کی اور اس کی بیٹی کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنی بیٹی کو فتح خان کی قید میں دیکھ کر ہتھیار ڈال دیتا مگر برٹ شا کے انداز میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا شک بڑھ رہا تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اس پر میرا غصہ بھی بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ اس سے وہی سلوک کروں جو اب تک فتح خان کرتا آیا تھا۔

غار نما حصے میں پہنچتے ہی وہ چٹان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں بند تھیں اور منہ سانس لینے کے لیے کھلا ہوا تھا۔ میں نے رسّی کا ایک ٹکڑا الگ سے لیا اور اس سے برٹ شا کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح باندھ دیے کہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو لیکن وہ خود کو آزاد بھی نہ کرا سکے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آزاد ہونے کی صورت میں وہ فرار ہو جائے گا۔ آج میں

www.Paksociety.com

نے اسے بہت چلایا تھا۔ میں خود بھی تھک گیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ مگر آرام کرنے سے پہلے میں فتح خان کو کچھ ناگفتنی سنائیں جس نے مجھے اس مشقت میں ڈال دیا تھا جس کا کوئی انجام نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ باہر سردی بڑھ رہی تھی۔ میں برٹ شا کو اندر لے آیا اور اس کا سلیپنگ بیگ اس پر ڈال دیا۔ وہ بالکل بے سدھ تھا۔ ایک لائٹ آن کر کے اس طرح رکھ دی کہ غار کسی قدر روشن دکھائی دینے لگا۔ یہ کام کر کے میں دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ برٹ شا کا چہرہ میری طرف تھا اور میں وقفے وقفے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ایک بار میں نے اونگھتے ہوئے یوں سر جھکا لیا جیسے تقریباً نیند میں چلا گیا ہوں لیکن میری آنکھ خفیف سی کھلی ہوئی تھی۔ برٹ شا اگر دیکھتا تو اسے میں سوتا ہی نظر آتا۔ میں خاصی دیر اس پوز میں رہا۔ وہ بھی ساکت لیٹا رہا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے لگا کہ بچ سچ سو چکا ہے اور میں سیدھا ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ برٹ شا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر کسمسانے لگا۔

وہ جاگ رہا تھا یا اب جاگ گیا تھا لیکن اس کے انداز میں پہلے جیسی تھکاوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میں ہلا تو وہ پہلے کی طرح بے سدھ بن گیا۔ میں نے اُٹھ کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور یوں حرکت میں آیا جیسے اس سے چھپ کر کوئی کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے جیکٹ سے پستول نکالا پھر اس سے میگزین نکال کر جیکٹ کی سامنے والی جیب میں رکھ لیا اور خالی پستول اس بیگ میں رکھ دیا جس میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ باقی سامان پڑا تھا۔ یہ کام میں نے اس طرح کیا جیسے برٹ شا سے چھپا کر کر رہا ہوں اور اسے معلوم بھی ہو جائے کہ میں نے پستول خالی کر کے رکھا ہے اور میگزین اپنی جیکٹ میں رکھ لیا ہے۔ یہ کام کر کے میں نے ایک بار پھر برٹ شا کو غور سے دیکھا اور وہ سوتا بن گیا جبکہ ایک منٹ پہلے وہ اُٹھا تھا۔ کوئی ہوشیار ہی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے برٹ شا کے ہاتھ پیر سے بندھی ہوئی رسّی کھول دی اور باہر آیا جہاں جلانے والی لکڑیاں پڑی تھیں۔ الاؤ روشن کر کے میں کچھ دیر آگ تاپتا رہا پھر رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ گوشت بھوننے کی خوشبو پھیلی تو اندر برٹ شا تڑپ گیا تھا۔ دوپہر میں اس نے مجھ سے زیادہ ہی کھایا تھا پھر بھی اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے اوں آں کر کے آواز نکالی۔ میں نے اندر جھانکا۔ ”ہاں ہاں میرے بوڑھے بچے کھانا تیار ہے لیکن تم کھانے کے بجائے اپنی بیٹی کی فکر کرو جسے فتح خان چھ دن بعد ٹکڑوں میں تقسیم کر کے وادی میں پھینکنے کی دھمکی دے چکا ہے۔“

ظاہر ہے برٹ شا نے اس بات پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ وہ اُٹھ کر الاؤ کے پاس آ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کمزور تھا لیکن اتنا بھی نہیں جتنا نظر آتا تھا۔ اس کے جسم میں جان تھی ورنہ جتنا آج وہ چلا تھا اس عمر کا کوئی آدمی پہاڑوں پر اتنا چلتا تو اس سے اتنی جلدی اُٹھا نہیں جاتا۔ کچھ دیر پہلے والی حرکت سے یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ اتنا بھی دیوانہ نہیں تھا جتنا خود کو ظاہر کر رہا تھا اس میں اتنی ہوشیاری تھی کہ کسی کو دھوکا دے سکے۔ جیسے ہی میں نے بھنا گوشت اور روٹی اس کے سامنے رکھی وہ اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب صاف کر گیا۔ میں بھی کھا رہا تھا لیکن اس کی خوراک ایک بار پھر مجھ سے زیادہ ثابت ہوئی تھی۔ اپنے حصے کا کھا کر اس نے پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”بس اتنا ہی ملے گا۔ ہمارے پاس خوراک زیادہ نہیں ہے اور ابھی ہمیں چھ دن گزارا کرنا ہے۔ البتہ اس کے بعد شاید کھانے پینے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔“

کھانے کے بعد کافی بنائی اور کافی پی کر وہ اندر چلا گیا۔ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے اندر دیکھ سکتا تھا۔ برٹ شا نے اس بیگ کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی جس میں میں نے پستول رکھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں اس لیے وہ شرافت سے اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹ گیا۔ میں کچھ دیر الاؤ کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر اندر آیا اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ”آج بہت تھک گیا ہوں، تمہارا کیا حال ہے اولڈ بوائے؟“

اولڈ بوائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بساکت لیٹا ہوا تھا جیسے نیند میں چلا گیا ہو۔ میں نے اپنا خیمہ لگایا اور اس میں گھس کر لیٹ گیا۔ یہ سچ تھا کہ میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن میں سونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ برٹ شا میرے بچھائے جال میں پھنستا ہے یا نہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اور میں اس کھیل کو جلد از جلد کسی انجام تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ بے شک اس کے لیے مجھے ہیرے فتح خان کے حوالے کرنا پڑتے۔ فتح خان ان کی مالیت بچاس ملین ڈالرز بتاتا تھا لیکن مجھے ان کی مالیت سے کوئی غرض نہیں تھا بے شک ان کی مالیت اس سے سینکڑوں گنا زیادہ ہوتی لیکن میرے لیے وہ سویرا کی ایک انگلی کا نعم بدل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

میرے لیے ایمن کی زندگی ان سے کہیں بڑھ کر قیمتی تھی۔ مسئلہ برٹ شا بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے جان کا خوف نہیں تھا بلکہ ان ہیروں کا لالچ تھا۔ ورنہ کم سے کم اپنی اولاد کی جان کا خطرہ کوئی مول نہیں لے سکتا..... اسی وجہ سے مجھے برٹ شا فتح خان جیسا آدمی لگا تھا اور اسی وجہ سے مجھے اب اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں نے اسے پکڑ لیا تو رگڑ کر رکھ دوں گا۔ یہی سوچ کر میں نے یہ ایکٹ ترتیب دیا تھا اور مجھے امید تھی کہ برٹ شا اس جال میں پھنس جائے گا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر برٹ شا دیوانہ بنا ہوا تھا اور میں اسے پکڑ لیتا تب بھی یہ بات فتح خان پر ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے ”سوتے“ ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا لیکن ابھی تک برٹ شا کی طرف سے کوئی حرکت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ نہیں باندھا تھا اور شاید اس نے اسے میری بھول سمجھا تھا۔ اب میں اس پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اس لیے اسے نہیں باندھا تھا کہ میں اس کی ہوش مندی اور دیوانگی کا امتحان لے رہا تھا۔ ورنہ میں اسے باندھ کر رکھتا۔ میں اس کے فرار کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ورنہ فتح خان اسے بھی میرے کھاتے میں ڈال دیتا۔ میں اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ یہ معمول کی حرکت تھی۔ ایسا لگا جیسے اس نے سوتے میں کروٹ لی ہو۔ میں نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور پہلے کی طرح گہرے سانس لیتا رہا۔ شاید اس نے مجھے چیک کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر خلافِ توقع اس نے پھر کوئی حرکت نہیں کی اور تھوڑی دیر بعد اس کے خرخرانے کی آواز آنے لگی۔

اس رات کچھ بھی نہیں ہوا اور کوشش کے باوجود میں بھی نہ جاگ سکا تھا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو باہر روشنی ہو چکی تھی اور برٹ شا الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں اُٹھ کر اس کے پاس آیا۔ ”کیا حال ہیں اولڈ بوائے رات کیسی گزری؟“

جواب میں اس نے دانت نکال دیے۔ اب تک اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ دھیمے مزاج کا اور نرم خو دیوانہ تھا کسی کو یا خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ یہ بڑی مناسب قسم کی دیوانگی تھی۔ میں نے خود بھی منہ ہاتھ دھویا اور اس کے رونے کرانے کے باوجود اسے بھی منہ ہاتھ دھونے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نہایت غلیظ ہو رہا تھا اور میں دو دن میں عادی ہو گیا تھا ورنہ شروع میں اس کے پاس سے نہایت گندی بدبو آتی تھی۔ شاید وہ سالوں سے نہیں نہایا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ اب تک بیمار کیوں نہیں ہوا۔ جب میں نے اس کے منہ ہاتھ دھونے کے درمیان اس سے کہا۔ ”کیا خیال ہے آج تمہیں غسل نہ دے دیا جائے۔ ممکن ہے اس سے تمہارا دماغ ٹھکانے پر آ جائے۔“

میری بات سن کر اس کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نظر آئے تھے۔ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا کہ وہ میری اس تجویز سے متفق نہیں ہے۔ ناشتے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ سے رسّی باندھی تو اس نے کسی مظلوم بکرے کی طرح مجھے دیکھا۔ میں نے اسے گھورا اور بولا۔ ”برٹ شا آج دوسرا دن ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ یاد رکھنا کہ اگر تمہاری اور فتح خان کی وجہ سے مجھے یا میرے کسی ساتھی کو ذرا بھی نقصان ہوا تو میں تم دونوں کو ہی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں تو اسی وادی میں دفن کر دوں گا اور بعد میں فتح خان کو بھی لا کر تمہاری قبر میں ڈالوں گا تاکہ تم دونوں قیامت تک ہیروں کے لیے آپس میں معاملہ کرتے رہو۔“

برٹ شا نے گزشتہ رات کوئی حرکت نہ کر کے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر کچھ نہ کچھ کرے گا۔ اس کی بے عملی میرے لیے غیر متوقع رہی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے اس کے بارے میں اپنا خیال تبدیل کر لیا تھا۔ اس نے کسی وجہ سے رات حرکت میں آنا مناسب نہیں سمجھا تھا ورنہ وہ پستول کی جگہ دیکھ چکا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے میگزین نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا ہے۔ ایک طرح سے اب چور سپاہی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چور کو معلوم نہیں تھا کہ سپاہی اس کی تاک میں ہے۔ لیکن کیا چور کو واقعی نہیں معلوم تھا؟

ممکن ہے برٹ شا میری اس حرکت سے چوکنا ہو گیا ہو کہ میں اسے آنے کے بعد تو باندھ دیا لیکن رات کھلا چھوڑ کر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ یہ مجھ سے حماقت ہوئی تھی مجھے اسے شام کو بھی نہیں باندھنا چاہیے تھا یا پھر رات کو بھی باندھ دینا چاہیے تھا اور اپنا ڈراما میں اگلے روز کے لیے بھی اُٹھا کر رکھ سکتا تھا اس طرح برٹ شا کو شک نہ ہوتا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہوں۔ مگر میں نے رات کو نہیں باندھا تو وہ کھٹک گیا۔ اگر وہ ہوش میں تھا تو اس کی ہوشیاری میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اتنے عرصے سے فتح خان جیسے شاطر کو بے وقوف بنا رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ صورتِ حال نے میری قوتِ فیصلہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ

www.Paksociety.com

موجودہ صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فتح خان اور برٹ شا نے مل کر مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ بلکہ اصل مسئلہ سویرا کا تھا اگر وہ فتح خان کے قبضے میں نہ ہوتی تو شاید میرے یہاں آنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مگر میں پھنس گیا تھا اور یہی انسان کے بے بس ہونے کی دلیل ہے۔ وہ کتنا ہی ذہین، طاقتور اور خوش نصیب کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں آ کر وہ بھی پھنستا ہے۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اس مشکل سے نکلنے میں میری مدد کرے گا اور اگر اس نے میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر لیا تھا تو مجھے صبر دے گا۔

اس دن بھی میں برٹ شا کو گھماتا رہا۔ گزشتہ روز کی طرح سورج نہایت آب و تاب سے چمک رہا تھا اور چٹانوں میں سردی کم ہوئی تھی۔ اگرچہ اوپر پہاڑوں اور درختوں کے نیچے خنکی تھی لیکن چلنے کی مشقت کی وجہ سے اس خنکی کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ میں برٹ شا کو لے کر گھومتا رہا اور جب دس منٹ کا آرام کا وقفہ آتا تو میں اس سے ہیروں اور ایمن کی بات کرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ ویسے وہ بے توجہی سے میری بات سنتا تھا لیکن جب میں ہیروں یا ایمن کا ذکر کرتا تو وہ اونگھنے لگتا تھا۔ یہ بے نیازی ظاہر کرنے کا ایک انداز تھا نارمل میں وہ نہیں اونگھتا تھا۔ چھ گھنٹے کی جنگلی یاترا کے بعد ہم واپس آئے تو آج گزشتہ روز جیسی تھکن نہیں تھی۔ برٹ شا بھی کل جیسا بے حال نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے قدم لڑکھڑانے کے بجائے زمین پر مضبوطی سے جم رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ آ کر کل ہی کی طرح بے حال انداز میں چٹان کے ساتھ لڑھک گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔

ہم صبح جلدی نکل گئے تھے اس لیے چٹانوں میں ابھی روشنی تھی۔ دھوپ کی حدت سے چٹانیں کسی قدر گرم ہو رہی تھی۔ غار میں جیکٹ اُتار کر میں ایک سطح چٹان پر لیٹ گیا اور اس کی حرارت سے محظوظ ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد برٹ شا بھی میرے پاس آ کر لیٹ گیا۔ وہ حسبِ معمول خاموش تھا۔ میں جیکٹ کے بغیر تھا اس لیے فتح خان ہماری گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ میں نے بہ ظاہر خود سے کہا۔ ”فتح خان نہایت سفاک آدمی ہے۔ جب اس سے مقابلہ ہو تو آدمی کو ہمیشہ ہوشیار ہونا چاہیے کیونکہ وہ صرف دھمکی دینے کا قائل نہیں ہے بلکہ اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ یہ اس کی انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ فتح خان صرف دھمکی دے کر رہ جائے گا تو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر رہا ہے۔“

برٹ شا اس بات پر بھی خاموش رہا اور میں جھنجلا کر رہ گیا۔ میری اس نئی زندگی میں ایسے مواقع بہت کم آئے تھے جب میں کسی صورتِ حال میں اتنی بے بسی اور جھنجلاہٹ کا شکار رہا ہوں۔ ایسی کیفیت بہت پہلے اس وقت طاری ہوئی تھی جب بابا نے مجھے کاکول کی تیاری کا حکم دیا تھا اور میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے حکم سے کھل کر انکار کرنے کی سزا میں ایک بار بھگت چکا تھا۔ اس لیے اندر کی گھٹن سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگ نکلا اور پھر راجا عمر دراز کی وادی جا پہنچا تھا۔ یہیں سے میں فتح خان اور ہیروں کے منحوس چکر میں آیا تھا۔

ہیرے برٹ شا کے قبضے میں تھے اور وہ دیوانہ بنا ہوا تھا۔ فتح خان ہیروں کے لیے اس سے بھی بڑا دیوانہ بنا ہوا تھا اور سویرا اس کی قید میں تھی۔ میں برٹ شا سے کس طرح ہیرے نکلواؤں؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس پر تشدد بیکار تھا کیونکہ فتح خان اس پر ہر ممکن تشدد کر چکا تھا۔ جب اس کا تشدد بیکار ثابت ہوا تھا تو میں اس سے زیادہ کیا کر لیتا۔ البتہ دو دن میں فتح خان کی اس بات سے میں مکمل طور پر متفق ہو گیا تھا کہ برٹ شا دیوانہ بنا ہوا ہے ورنہ وہ ٹھیک تھا۔ اسے دیوانہ بننے میں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی ایک تو اسے فتح خان کی قید میں رہ کر اس کی پریکٹس ہو گئی تھی۔ پھر تشدد اور خراب حلیے نے پاگل پن کے کاسٹیوم کو بھی پورا کر دیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی چٹانوں کی حدت تیزی سے زائل ہوئی تھی اور ہم نیچے آنے پر مجبور ہو گئے۔ غار کی طرف جانے سے پہلے میں نے برٹ شا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”برٹ شا میں نے جو تم سے کہا ہے اس پر غور کرنا، ورنہ چھ دن بعد یہ ہوگا کہ ہیرے تو اسی وادی میں کہیں دفن رہیں گے۔ ان کے ساتھ تم اور ایمن بھی یہیں دفن کر دیے جاؤ۔ میرے ساتھ جو ہوگا تمہیں یقیناً اس کی فکر نہیں ہوگی لیکن تمہیں کم سے کم اپنی اور بیٹی کی فکر کرنی چاہیے۔“

میں بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھے بغیر غار کی طرف بڑھ گیا۔ جیکٹ پہن کر میں نے الاؤ جلایا۔ لکڑی میں جمع کر کے لے آیا تھا۔ کافی تیار کی اور ایک مگ برٹ شا کو دے دیا۔ اس موسم میں پسینا بہت کم آتا ہے لیکن گرم کپڑوں میں جسم پر لازمی پسینا آتا ہے۔ میں کئی دن سے نہایا نہیں تھا اور اس وقت مجھے شدت سے غسل کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس وقت تو نہانا ناممکن تھا چٹانوں کے ساتھ چشموں میں پانی ٹھنڈا ہو چکا ہوتا ہے شاید صبح کے وقت یہ پانی کسی قدر گرم ہوتا۔ میں نے صبح نہانے کا سوچا۔ کھانا کھا کر برٹ شا سونے چلا گیا اور میں بھی کسی قدر ہوشیاری کے ساتھ لیٹ گیا۔ اگر برٹ شا موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا تو اس کے لیے پستول کے ساتھ میگزین حاصل کرنا بھی لازمی تھا۔ میگزین حاصل

کرنے کے لیے اسے میرے پاس آنا پڑتا۔ وہ میری بے خبری میں میگزین تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اگلی صبح میں جلدی اُٹھ کر ان چشموں تک آیا جن میں زمین سے پانی نکل رہا تھا اور حسبِ توقع یہ پانی گرم آ رہا تھا۔ میں نہایا اور مجبوراً وہی کپڑے پہنے کیونکہ میرے پاس اور کوئی کپڑے نہیں تھے۔ اس دن بھی ہم گھومتے پھرتے رہے اور اس کے بعد آنے والے تین دن تک ہمارا یہی معمول رہا تھا۔ برٹ شا نے اس دوران میں ایسی کوئی حرکت نہیں جس سے میں اسے پکڑ سکتا اور اس کی دیوانگی کا پول کھل جاتا۔ وہ میری تمام گفتگو یوں سنتا جیسے بھینس بین کی آواز سنتی ہے۔ اس رات ہم سونے کے لیے لیٹے تو میرے ذہن میں تھا کہ کل آخری دن ہے اور اس کے بعد فتح خان اپنی دھمکی پر عمل کرے گا۔ برٹ شا حسبِ معمول کھاتے ہی لیٹا اور کچھ دیر میں خراٹے لینے لگا۔ آج اس کے خراٹے کچھ بلند اور کرخت تھے۔

میں بے چین تھا اس عالم میں مجھے نیند کیسے آتی جب ذہن میں صرف سویرا کا خیال تھا۔ میں نے برٹ شا کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر اسے گھسیٹ کر سلیپنگ بیگ سے نکالا۔ وہ بڑبڑا گیا تھا اور اس نے چونکنے کی اداکاری بھی کی تھی لیکن مجھے محسوس ہوا وہ اصل میں جاگ رہا تھا۔ اس نے گونگوں کے انداز میں احتجاج کیا اور منہ سے کچھ نہیں بولا۔ مگر میں کھینچ کر اسے باہر لے آیا۔ آسمان صاف تھا اور اس پر شاید گیارھویں کا چاند تھا۔ اس لیے چاروں طرف معقول روشنی تھی اور مجھے ٹارچ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باہر آ کر میں نے پہلے اس کی جیکٹ اُتاری اور پھر اس کی شرٹ اور پتلون بھی اُتار دی۔ وہ مستقل مزاحمت کرتا رہا۔ مگر میرے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی اور کچھ دیر میں وہ صرف انڈر ویئر میں کھڑا تھا۔ اس نے سردی سے تھر تھر کانپنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے غرا کر کہا۔

”برٹ شا اب تم اس وقت تک اس طرح بغیر کپڑوں کے رہو گے جب تک مر نہیں جاتے یا پھر اپنی دیوانگی چھوڑ کر ہیروں کا پتا بتانے کو تیار نہیں ہوتے۔“

وہ جواب دینے کے بجائے دونوں ہاتھ سینے سے لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ درجۂ حرارت یقیناً منفی میں تھا۔ میں نے اس کے کپڑے غار کے پاس پھینک دیے اور واپس برٹ شا کے پاس آ گیا۔ وہ ایک چٹان میں دبک رہا تھا لیکن میں نے اسے وہاں سے گھسیٹ کر کھلی جگہ پھینک دیا۔ ”برٹ شا کل کا دن تمہاری بیٹی اور سویرا کے لیے تباہ کن ہوگا۔ لیکن میں نے سوچ لیا ہے کہ اگر تم نے ہیرے نہ دیے تو کم سے کم تم یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ بعد میں میں فتح خان کو بھی دیکھ لوں گا۔“

میں جانتا تھا کہ فتح خان ہماری گفتگو سن رہا ہوگا۔ برٹ شا کا اس طرح مر جانا یقیناً گوارا نہیں تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح سے برٹ شا کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اس کے آس پاس ہی ٹہل رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”برٹ شا تم ایک سرد ملک کے رہنے والے ہو اس لیے تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ سردی کس طرح آدمی کی جان لیتی ہے۔ کچھ دیر بعد تمہیں ہائپو تھرمیا شروع ہو جائے گا اور تمہارے جسم کا درجہ حرارت گرنے لگے گا۔ ایک ایک کر کے یہ نیچے آئے گا اور جب یہ گر کر ستاسی درجے فارن ہائیٹ پر پہنچے گا تو تمہارا دل رک جائے گا اور تم ایک لمحے میں مر جاؤ گے۔ یہ مرحلہ ابھی دور ہے لیکن اتنا دور بھی نہیں ہے۔ صبح ہونے سے پہلے تمہاری زندگی پر موت کی رات چھا جائے گی۔“

برٹ شا نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کانپتا اور منہ سے ہو ہو کی آوازیں نکالتا رہا۔ باہر سردی اتنی تھی کہ میں جیکٹ میں بھی محسوس کر رہا تھا اور ایک جگہ کھڑے ہونے پر سردی باقاعدہ کاٹتی تھی اس لیے میں مستقل حرکت میں تھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ بغیر کپڑوں کے برٹ شا کا کیا حال ہوگا۔ اسے پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ فتح خان کی جانب سے ابھی تک کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ اتنا دور تھا کہ اسے یا اس کے ساتھیوں کو یہاں آنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ وقت لگتا۔ کیا وہ کسی چوٹی پر تھے؟ میں نے سوچا۔ برٹ شا سے اب بیٹھا نہیں جا رہا تھا اور وہ بار بار سرد زمین پر لڑھک رہا تھا اور جیسے ہی اس کے جسم کا کوئی حصہ زمین پر لگتا تو وہ اُچھل کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد ٹھنڈ اس کے جسم کو سن کر دیتی اور پھر وہ بے ہوش ہو جاتا یا غشی میں چلا جاتا۔ اس کے بعد اسے شاید ہی ہوش آتا۔ میں اس مرحلے سے پہلے اسے اندر لے جاتا لیکن ابھی میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ہتھیار ڈالتا ہے یا نہیں۔

آدھا گھنٹا ہونے والا تھا۔ برٹ شا نے نہ تو زبان کھولی تھی اور نہ ہتھیار ڈالے تھے اور نہ بے ہوش ہوا تھا، وہ اب بھی سردی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس عمر میں اس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز تھی۔ اچانک چٹانوں کے باہر سے روشنیاں لہرانے لگیں اور کچھ دیر بعد فتح خان اپنے ایک ساتھی سمیت پہنچ گیا دونوں مسلح تھے۔ فتح خان نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے تم؟“

”اس سے ہیروں کا پتا اُگلوا رہا ہوں۔“ میں نے

جواب دیا۔ ”سات دن سے یہ دیوانہ بنا ہوا ہے اب میں اسے ہوش میں لا رہا ہوں۔“

”اس طرح یہ مر جائے گا۔“

”مر جائے یہ اور تم دونوں فساد کی جڑ ہو۔ یہ مر جائے ہیروں کا قصہ ہی ختم ہو جائے پھر میں تمہیں دیکھوں گا۔“

فتح خان نے رائفل کا رُخ میری طرف کر دیا۔ ”شہباز اسے کپڑے دو اور اندر لے چلو یہ مر گیا تو....“

”تم اس کا بدلہ بھی مجھ سے لوگے۔“ میں نے طنز کیا۔

”اُٹھو خانہ خراب۔“ فتح خان نے برٹ شا سے کہا۔ ”اندر جا کر کپڑا پہنو۔“

مگر خانہ خراب اپنی جگہ بیٹھا کپکپا رہا تھا اس نے شاید فتح خان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ فتح خان نے اپنے ساتھی کو حکم دیا کہ وہ اسے اُٹھا کر اندر لے جائے اور اسے کپڑے پہنائے۔ وہ برٹ شا کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک ہی وادی میں دور کہیں تیز فائرنگ ہوئی۔ ایسا لگا تھا جیسے کئی رائفلوں سے بیک وقت برسٹ مارے گئے ہوں۔ فتح خان اُچھل پڑا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

”یہ.... یہ کیا؟“ بولتے ہوئے فتح خان نے اپنی جیب سے ایک واکی ٹاکی نکالا اور دھاڑا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے فائر کس نے کیا ہے؟“

دوسری طرف سے بھی کوئی چلّا رہا تھا اس کی الفاظ سمجھ نہیں آ رہے تھے لیکن آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ پہلے فائرز کے بعد چند سیکنڈز کا وقفہ آیا تھا اس کے بعد دوبارہ سے تیز فائرنگ شروع ہوئی تھی اور میرے کانوں تک ایک چیخ آئی جو واکی ٹاکی پر بولنے والے کی تھی۔ فتح خان چیخ چیخ کر اسے آوازیں دے رہا تھا لیکن شاید وہ اس کی بات سننے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فتح خان نے واکی ٹاکی بند کر دیا اور خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”شہباز خان یہ کیا ہے؟“

میں نے بھنّا کر کہا۔ ”فتح خان تم شاید ہوش گنوا چکے ہو مجھے کیا معلوم کہ کہاں کیا ہوا ہے؟“

”بکواس مت کرو تم نے میرے کو یہاں بلایا اور پیچھے میرے آدمیوں پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ میرا شاید سارا ساتھی مارا گیا ہے۔“

”اگر ایسا ہوا ہے تو میں بھی اتنا ہی لاعلم ہوں جتنا کہ تم ہو۔“

”تم نے جان بوجھ کر....“ فتح خان بولتے بولتے رکا اور اس نے چونک کر دیکھا۔ ”برٹ شا کدھر ہے؟“

واقعی برٹ شا اپنی جگہ نہیں تھا۔ فائرنگ نے کچھ دیر کے لیے ہم تینوں کو اس کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ فتح خان نے دھاڑ کر اپنے ساتھی سے کہا۔ ”تلاش کرو اسے۔“

وہ بدحواسی میں چٹانوں سے باہر کی طرف بھاگا۔ فتح خان خود چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ رائفل کا رُخ میری طرف کیے کیے غار کی طرف بڑھا تھا کہ اندر سے برٹ شا نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رُخ فتح خان کی طرف تھا وہ چونکا اور جلدی سے کہا۔ ”برٹ شا کوئی حماقت مت کرنا میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ پستول پھینک دو، یہ تمہارے کسی کام نہیں آئے گا۔“

فتح خان جانتا تھا کہ پستول بیکار ہے اس میں فائرنگ پن نہیں ہے اس لیے فائر کیسے کرے گا۔ لیکن برٹ شا یہ بات نہیں جانتا تھا اس لیے وہ پستول تانے رہا۔ اب اس کے چہرے پر دیوانگی کے بجائے نفرت کے تاثرات تھے اس نے باہوش انداز میں کہا۔ ”فتح کھان اس لمحے کے لیے میں نے برسوں انتظار کیا ہے اب بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم مرنا نہیں چاہتے ہو تو رائفل پھینک دو۔“

فتح خان نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا تھا کہ اچانک ہی ایک طرف سے فائر ہوا اور برٹ شا لڑکھڑا کر منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے اس کے سینے میں سوراخ ہوتے دیکھ لیا تھا۔ فتح خان چیخ اُٹھا۔ فائر اس کے ساتھی نے کیا تھا جو برٹ شا کو تلاش کرتا باہر گیا تھا اور اب واپس آ کر سمجھا کہ برٹ شا فتح خان کو شوٹ کرنے والا ہے اس نے پہلے ہی گولی چلا دی۔ فتح خان نے دھاڑ کر اپنے ساتھی سے کہا۔

”خنزیر کا بچہ یہ کیا کیا؟“

اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا فتح خان نے اسے گولی مار دی۔ میں تیزی سے برٹ شا کے پاس آیا اور اسے سیدھا کیا۔ گولی اس کے سینے پر دل سے ذرا اوپر لگی تھی۔ خون فوارے کی طرح اُچھل رہا تھا اور وہ چند لمحوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس کے منہ سے بھی خون اُبل پڑا تھا۔ آخری سانسوں کے دوران اس نے دو الفاظ کہے۔

”نارتھ.... بگسٹ ٹرنک۔“

اس سے پہلے میں اس سے ان الفاظ کے معنی پوچھتا اس نے دم توڑ دیا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(بشریٰ بلوچ، کراچی کا جواب)

آصفہ کریم..........لطیف آباد

اپنا بھی شہر بھر میں شناسا کوئی نہ تھا
اچھا ہوا جو راہ میں تنہائی مل گئی

تابش فہمی..........تلہ گنگ

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اِک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

نوازش حسن خان..........گجرات

اب صرف یادِ یار میں رہنے لگا ہے دل
کس کس معاملے میں پریشان تھا کبھی

عبدالقیوم اسد..........رحیم یار خان

اپنے ہی تجربات کی سب بھینٹ چڑھ گئے
جس نے شہر اُجاڑے وہ کوئی وبا نہ تھی

عشرت سراج..........لاہور

اس گھر کو میں کس طرح کہوں اپنا
جس کی ہر چیز ہی پرائی ہے

(پروین صبا، حافظ آباد کا جواب)

حبیب الرحمٰن..........گوجرہ

اس ادا کا کیا ٹھکانا اس روش کا کیا جواب
بات رنجش کی نہ ہو پھر بھی خفا ہوتے ہیں لوگ

سلطان فریدالدین..........قطر

اسے بھی کوئی ستارہ منزل سے دور کر دے
اسے بھی راستہ نظر آئے تو اس سے پوچھوں

کنور فرید..........چنیوٹ

ابھی تو رات باقی ہے ابھی شب خون کا ڈر ہے
حریف اب کے بھی نادیدہ ہے لوگو جاگتے رہنا

زرینہ جونیجو..........لاڑکانہ

ابھی تو ضد ہے اسے راستہ بدلنے کی
کبھی وہ روئے گا خود میری چاہتوں کے لیے

فرحت حسین..........چنیوٹ

آ جا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آ جا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے

(عقیل الرحمٰن، گھاٹاں کا جواب)

اعجاز علی..........گوجرہ

یہ کامیابیاں، عزت، یہ نام آپ سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام آپ سے ہے

(راجا ثاقب نواز، ساہیوال کا جواب)

نصرت جاوید..........کراچی

اس کا جیسا نہیں ہے کوئی تو پھر
اس کی تصویر ہی دکھا مجھ کو

انعم حیات..........لاہور

اِک نہ اِک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر
آدمی محوِ سجودِ سرِ خوباں کیوں نہ ہو

فصاحت اللہ..........اوسلو، ناروے

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

عمر افتخار..........ساہیوال

اماوس کی اندھیری رات اور تنہائی کا عالم
مقدر میں ہمارے گردشِ ایام باقی ہے

فرخندہ جبیں..........جھنگ

ابھی کہوں تو کسی کو نہ اعتبار آئے
کہ مجھ کو راہ میں اِک رہنما نے لوٹ لیا

سرفراز احمد..........ملتان

ان کے قدموں تلے چاند ستارے دیکھے
اپنی راہوں میں سلگتے ہوئے پائے پتھر

عدیل اختر..........دینہ، جہلم

آپس میں رسم و راہ کا فقدان ہو گیا
دیوانہ وار ملنے کی عادت نہیں رہی

(فرحت حسین، چنیوٹ کا جواب)

ملک ثاقب شاد تنولی..........حویلیاں

یہ ہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

www.Paksociety.com

PAKSOCIETY.COM

(بشریٰ بانو ناگوری، کراچی کا جواب)

شرمین مصطفیٰ..........شیخوپورہ

تصور ہوگیا ہے دل میں کیا زلف پریشاں کا
مرا دل بیٹھے بیٹھے کیوں پریشاں ہوتا جاتا ہے

(سلطان فریدالدین، قطر کا جواب)

جمیل احمد..........ملتان

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

نصرت شاہین..........حیدرآباد

تجھے کیا خبر تیری یاد نے مجھے کیسے کیسے ستا دیا
کبھی خلوتوں میں ہنسادیا کبھی محفلوں میں رُلا دیا

فرمان علی سید..........حیدرآباد

تمہارے چاند سے چہرے کا عکس لگتا تھا
فلک پہ تنہا ستارہ ہلال سے آگے

نصرت جہاں..........کراچی

توبہ کے بعد پھینک دیے ساغر و سبو
یادش بخیر گھر میں یہ سامان تھا کبھی

دعا زہرا..........کوئٹہ

تمہارے بس میں اگر ہو تو بھول جاؤ ہمیں
تمہیں بھلانے میں شاید ہمیں زمانہ لگے

انوشہ اختر..........اسلام آباد

تمہیں بھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں
جو اختیار میں ہوتا تو کیا بھلا لگتا

یاسمین پاملا..........فیصل آباد

تیری قربتیں بھی سراب ہیں یہ بھلا ہوا جو ملی نہیں
تیری دوریاں بھی عذاب ہیں میرے دشتِ جاں سے ٹلی نہیں

(نصیحہ ارشاد، سرگودھا کا جواب)

محمد سعید قاسمی..........ڈلوال

راہوں میں اب کھڑا ہوں پھیلائے ہاتھ خالی
غم تھے مرا اثاثہ اور غم نہیں رہے ہیں

(محمد افتخار، ساہیوال کا جواب):

رفیق ضیا..........منڈی بہاءالدین

نئے امکان کا ستارہ ہوں
اس بلندی سے مت گرا مجھ کو

(مرزا افرحال بیگ، حیدرآباد کا جواب)

تبسم فاطمہ..........جہلم

حمد خدا لکھی تو ملی دل کو روشنی
آنکھوں میں بصیرت و بینائی آ گئی

(عقیلہ فہیم، کراچی کا جواب)

اطہر حسین..........حسن ابدال

نہیں ممکن کوئی تعریف ان ہونٹوں کی اب انجم
کبھی یاقوت لگتے ہیں کبھی مرجان لگتے ہیں

(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

انیس مرزا..........سکھر

یارب یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے
انسان کو اور غم میں گرفتار کردیا

رفعت کوثر..........رحیم یار خان

یہی اس زمانے کا دستور ٹھہرا
کوئی غم زدہ کوئی مسرور ٹھہرا

(نوازش علی زیدی، ساہیوال کا جواب)

منیزہ مہر..........راولپنڈی

نعمتیں بٹ رہی تھیں روزِ الست
میں نے بڑھ کر وفا اٹھائی تھی

(طٰہٰ یاسین، حیدرآباد کا جواب)

ناہید فراز..........راولپنڈی

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاک رہگزر

عصمت آرا..........حیدرآباد

نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

(شہباز قمر، کراچی کا جواب)

باسط فراز..........لاہور کینٹ

خدا نصیب کرے تم کو اس قدر خوشیاں
تمہارے نام کے آگے کسی کا نام نہ ہو

(اشرف ممتاز، بہاولپور کا جواب)

نصیرالدین ملک..........اٹک

موڑ تو بے شمار آئیں گے
تھک نہ جانا جدا نہ ہو جانا

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کررہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

www.Paksociety.com

علمی آزمائش۔ 79

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں اُبھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اپریل 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جاتا ہے۔ بچپن سے اب تک وہ ایک ہی خواب دیکھتے رہے ہیں کہ انہیں آزادی نصیب ہو۔ مسلسل کشمیر کی جدوجہدِ آزادی میں معروف رہے۔ پہلے ایک گردہ خراب ہوا جسے انہوں نے نکلوا دیا، اب خبر آئی ہے کہ دوسرے گردے میں بھی کینسر کے جراثیم در آئے ہیں۔ 1989ء میں ان کا پاسپورٹ حکومتی اہلکاروں نے چھین لیا۔ 2005ء میں حج پر جانے کے لیے دیا گیا لیکن واپسی کے بعد ضبط ہو گیا۔ مگر ان کا جوشِ جہاد کم نہ ہوا۔

علمی آزمائش 77 کا جواب

احمد شاہ پطرس بخاری 1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے کلیدی عہدے پر فائز رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سفارتی امور انجام دینے لگے۔ 1950ء سے وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رئیس رہے۔ لسانیات کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے بے شمار نثر پارے کلاسک میں شمار ہوتے ہیں۔

* * *

شمارہ مارچ میں علمی آزمائش 77 کا جواب شائع کر دیا گیا تھا مگر بعد میں بھی اچھی خاصی تعداد میں جوابات آ گئے اس لیے 78 کا جواب شائع نہ کر کے 77 کا صحیح جواب دینے والوں کے بقیہ نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

انعام یافتگان

1- نعیمہ اختر، کراچی- 2 زرولی خان، پشاور- 3 سلطنت خان، اٹک
4- نگار حسن، لاہور 5- فوزیہ عصمت، جہلم

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے: عارفہ سلطان، منور علی، نصرتِ فاروقی، کہکشاں شبنم، نواز علی شاہ، ملک سرفراز گوندل، ابرار احمد، کلیم اللہ فہمی، ناصر افروز، انصار حسین، وجیہہ الحسن، رجب علی مرزا، عنایت مسیح، نور احمد، نگار صہبائی، کاوش اختر، علی احمد، تنویر حسین زیدی، بختاور شاہ، نجم الدین حیدر، فہیم اللہ فہیم، جبار علی، خلش معظم۔ لاہور سے: تابش عطاری، نازش خان، ملک جاوید، ممتاز الحسن، نیاز احمد، ناصر حسین، ابرار حیدر، پروین ضیا، نعمان اشرف، زبیر اسلم، انعام الحق، اکرام صدیقی، فہیم مرزا، ارشاد علی، نثار اختر، گل زیبا، احمد بشیر بٹ، احمد علی مشرقی، نعمان اشرف، حدیقہ اشرف، خالد علی، ارباز خان، عقیل سندھو، برق ضیائی۔ ملتان سے: جنید ارشد، نیاز احمد ملتانی، توفیق سلطان، بیگم احمد دین، مناف سید، ندا یونس، اشرف علی شیروانی، فضل الحق، اعزاز احسن، جمیل ملک، زبیر شاہ، بہادر خان، مہوش زرولی خان ڈرائیور، کوکب جہاں، نگار سلطانہ، فہیم اللہ فاروقی، ابریز بشیر، خالد ڈار، نشاط جہاں، زاہد خان، زینب چوہان، قدوس بخش، اللہ دتہ، فاضل خان اچکزئی۔ جہلم سے: رحمان بنگش، سرفراز حسین، نذر کلیم چغتائی، عثمان علی شاہ، شاور ترمذی۔ چکوال سے: صدر الدین، کمال احسن کمال، اقبال حسن، زریاب خان، ملک شفاعت۔ کوئٹہ سے: نذر خان، ممتاز احسن ملک، کنیز فاطمہ، چنگیزی، نصرت چنگیزی، خاقان اعوان، راؤ رشید۔ سرگودھا سے: خلیق حق، حیات خان، سلیم اللہ خان، خضر حیات، مصطفیٰ اکمل ٹوانہ، فصیح الزماں۔ شجاع آباد سے: ارباز خان، زدار حسین زیدی۔ ٹنڈو آدم سے: شریف الرحمن، سکھن شاہ۔ حیدر آباد سے: تہمینہ سلطان، نواز عثمان آبادی، عبدالقیوم حسن خان، انوار علی زبیری، کاشان دولتانہ، امتیاز حسن، زاہد خان، فتح شیر خان حسن زئی، آمنہ قائم خانی، فصاحت اللہ۔ ساہیوال سے: ممتاز فخر، فدا حسین، نوازش حسن، امجد سروش۔ حاصل پور سے: خالد بن ماجد، اختر عباس، مہوش ملک، شیخ فخر الدین۔ ڈی جی خان سے: فرحت اللہ شیرازی، نعمت خان، گل شیر میو۔ ڈی آئی خان سے: نصیر الدین نصیر، محمد سہیل انجم، رانا وجدانی۔ بہاولپور سے: تجمیم وٹو، میثم حسن، نازش کریم، فہیم شیخ۔ کمالیہ سے: محمد الطاف فاروق، فرحت شاہ۔ نواب شاہ سے: ارحم شاہ، مسکین شاہ۔ جہانیاں سے: خضر خان، زبیر خان۔ مظفر گڑھ سے: نوید تونانی، عزیر حسن، عزیز الدین۔ کوٹ ادو سے: اطہر حسین سید۔ شہر سلطان سے: فرید انصاری، سنجیدہ احمد۔ حسن ابدال سے: کرم الٰہی، سید محمد رضا۔ چھوٹالہ سے: ثنا احمد، فلک شاہ۔ باغ آزاد کشمیر سے: کاشف حسین، نصرت رند۔ بہاولنگر سے: نبیل احمد۔ میانوالی سے: نوشین احمر۔ پاک پتن سے: سدرہ شفیق۔ بھکر سے: غازی شاہ۔ جھنگ سے: امتیاز حسن، زویا رفیق، عجب گل، ملک سرفراز۔ سکھر سے: نعمان شیخ، ٹنڈو آدم سے: ناصر بگھیو۔

ممالک غیر سے: شہباز خان، ارتضیٰ حسن، نعمانہ شیراز (ٹورنٹو، کینیڈا) محمد شہباز (ٹوکیو، جاپان)

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عکسِ ماضی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ !
سلام مسنون
یہ دلچسپ سچ بیانی آپ کی خدمت میں ارسال کررہی ہوں لیکن یہ بھی بتادوں کہ یہ میری آپ بیتی نہیں ہے، یہ میری ایک سہیلی کی آپ بیتی ہے۔ اس بے چاری کی زندگی کیسے گزری، یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

طیبہ شرمین مصطفی
(اوسلو، ناروے)

دیکھا گیا ہے کہ آدمی دوسروں کو نصیحت کرنے میں بہت پُرجوش اور فیاض ہوتا ہے مگر جبھی خود اس نصیحت پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو یا تو تاویلات پیش کر کے بچنے کی کوشش کرتا ہے یا اسے یاد ہی نہیں آتا کہ اس نے کسی دوسرے کو کیا نصیحت کی تھی۔ اسی طرح ہم میں بہت سے افراد ایسے ہوتے ہیں جو بزرگی کا درجہ پانے کے بعد یہ بھول جاتے ہیں کہ خود اپنی نوعمری یا نوجوانی میں ان سے کیسی کیسی حماقتیں اور غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں اور ویسی ہی غلطیوں کے لیے اپنی اولاد کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمیں تاریخ اس لیے پڑھائی جاتی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اپنے تجربات خود کرنے پر اصرار نہ کریں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بزرگ کھلے دل سے اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہوئے اولاد کو سمجھائیں کہ جو غلط روش انہیں نقصان پہنچا چکی ہے وہ اولاد کے لیے بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔

میرا نام طیبہ ہے۔ میں جو آپ بیتی سرگزشت کے قارئین کی نذر کرنے لگی ہوں، وہ براہِ راست میری کہانی نہیں۔ یہ کسی دوسرے کی داستان ہے لیکن میرا ان واقعات سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لیے میں اسے اپنی زندگی کے تجربات کا ہی ایک حصہ کہہ سکتی ہوں۔ میرا تعلق ایک شریف، تعلیم یافتہ متوسط خاندان سے ہے۔ ہم چار بہن بھائی تھے لیکن چونکہ ان کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں اس لیے ان کا ذکر نظرانداز کررہی ہوں۔ بچپن سے جوانی تک کا زمانہ بڑے سکھ چین سے گزارا۔ پڑھنے پڑھانے سے مجھے بے حد لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ فارغ اوقات میں حسبِ توفیق محلّے کے بچوں کو پڑھاتی رہتی تھی۔ اسی شوق کی خاطر میں نے بی اے کے بعد بی ایڈ بھی کیا۔ ایم ایڈ کرنے کا بھی ارادہ تھا مگر حالات نے اجازت نہیں دی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ جب تک میں نے بی اے پاس کیا، سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میرے لیے بھی کئی اچھے رشتے آئے لیکن میں انکار کرتی رہی۔ بی ایڈ جوائن کرلیا۔ والد صاحب نے بھی میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے زیادہ مجبور نہیں کیا۔ میں بی ایڈ کے نتیجے کا انتظار کررہی تھی کہ والد صاحب کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ اس سے سنبھل تو گئے مگر ان کی یہ خواہش اور زیادہ ہوگئی کہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ میرے فرض سے بھی سبکدوش ہوجائیں۔

ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ انہیں کسی بھی قسم کا کوئی جذباتی صدمہ نہیں پہنچنا چاہیے۔ ان کے وسیع حلقۂ احباب سے ایک اچھا رشتہ آیا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلاکر بڑے پیار بھرے اصرار سے کہا کہ بیٹی اب انکار مت کرنا۔ مجھے یہ اطمینان حاصل کرنے دو کہ میں اپنی زندگی میں خدا کی دی ہوئی تمام ذمے داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں اپنے محبت کرنے والے شفیق والد کی اس آخری خواہش سے انکار نہیں کرسکی۔ دو ماہ بعد میری شادی ہوگئی اور میرے والد جیسے اس آخری فرض کی ادائیگی کا انتظار ہی کررہے تھے کہ کچھ ہی دن بعد انہیں دل کا دوسرا دورہ پڑا اور وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔

ہماری رہائش حیدرآباد کے ایک قریبی قصبے میں تھی۔ دو بھائی کراچی میں رہتے تھے۔ مجھ سے بڑی بہن کی شادی بھی کراچی میں ہوئی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد تھے۔ میرے شوہر حیدرآباد پولیس میں انسپکٹر تھے۔

www.Paksociety.com

گویا مجھے بھی شادی کے بعد اپنا گھر اور آبائی قصبہ چھوڑ کر حیدرآباد آنا پڑا تھا مگر میں چونکہ سب بہن بھائیوں کے مقابلے میں گھر سے نسبتاً قریب تھی اس لیے ہر ہفتہ والدہ سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ میرے شوہر بہت شریف مزاج، خوش اخلاق اور بلند کردار انسان تھے۔ محکمۂ پولیس کے بارے میں عام لوگوں کی طرح میری رائے بھی کچھ اچھی نہیں تھی مگر میں نے جلد ہی اندازہ کرلیا کہ میرے شوہر ان گنے چنے افسروں میں سے ایک ہیں جن کی وجہ سے اس محکمہ کا بھرم کچھ نہ کچھ قائم چلا آرہا ہے۔ شادی کے بعد وہ تین سال جو میں نے ان کی رفاقت میں گزارے، میری زندگی کا سنہری دور تھا۔ مگر انسان تقدیر کے فیصلوں کے سامنے بالکل بے بس ہوتا ہے۔ ان تین برسوں میں زندگی کی کوئی راحت، کوئی خوشی ایسی نہیں تھی جو مجھے حاصل نہ ہو۔ بس کبھی کبھی ایک خیال دل کو افسردہ کردیا کرتا تھا کہ میں ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی۔ میرے شوہر نے اس بات کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ وہ کہتے تھے کہ بچے بھی خدا کی دین ہوتے ہیں۔ جب اس کی رحمت کو منظور ہوگا، ہم صاحبِ اولاد ہوجائیں گے۔ اور یہ تو ایک طرح سے اچھی بات ہے کہ شادی کے فوراً بعد ہمیں خدا نے اس امتحان میں نہیں ڈالا، جب تک آزاد ہو، خوب جی بھر کے گھوم پھر لو، تفریح کرلو، موج اُڑالو ورنہ پھر یہ فرصت کے رات و دن کہاں میسر آئیں گے۔ مگر میں جانتی تھی کہ سسرال میں چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں۔ ساس سسر کے ذہن میں خود سے یہ خیال ہو یا نہ ہو مگر دوسروں کے گھروں کے سکھ چین کے دشمن ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے ہیں کہ یہ بہو تو بانجھ ہے، وہ جلد سے جلد بیٹے کی دوسری شادی کردیں۔ مسلسل ایک ہی بات کانوں میں پڑتی رہے تو آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اب نہیں تو کچھ دن بعد یہ مسئلہ میری خوشگوار گھریلو زندگی کو خراب بلکہ برباد کرسکتا ہے۔

میں نے اپنے شوہر سے تفصیلی گفتگو کی اور انہیں آمادہ کرلیا کہ وہ پہلے میرا مکمل ڈاکٹری معائنہ کرائیں۔ وہ ابھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے مگر میرے اصرار سے مجبور ہوگئے۔ ہم نے ایک ماہر اور تجربے کار لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کرایا، اس نے مختلف ٹیسٹ لیے اور خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کر بتایا کہ میں ہر اعتبار سے قطعی نارمل ہوں۔ اولاد نہیں ہورہی ہے تو یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے۔ یوں مزید احتیاط کے لیے اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ میرے شوہر بھی اپنا تفصیلی چیک اپ کرالیں۔ وہ اس کے لیے قطعی آمادہ تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا معائنہ کرا سکتے، تقدیر نے مجھے ایک سنگین انقلاب سے دوچار کردیا۔

سندھ کے اندرونی علاقے اور جنگلات عموماً ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ اُن دنوں ان کی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ ایک بدنام ڈاکو کے بارے میں پولیس کو بڑے معتبر ذرائع سے اطلاع ملی کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا ہے۔ فوراً ایک ڈی ایس پی اور دو انسپکٹروں کی سربراہی میں ایک بڑی پولیس پارٹی ترتیب دے کر رات کی تاریکی میں اس گاؤں کا محاصرہ کرلیا گیا۔ اس ڈاکو کو بھی پولیس چھاپے کی خبر مل گئی اور اس نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے مقابلہ کرتے ہوئے لڑ بھڑ کر نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ میرے شوہر چند کانسٹیبلز کو ساتھ لے کر عقبی حصے سے آگے بڑھے، دوسرے انسپکٹر نے ڈاکوؤں کو سامنے کی طرف متوجہ رکھا اور اتنی زبردست فائرنگ کی کہ ڈاکو گھبرا گئے۔ تب تک ان کے دو ساتھی بھی مارے جاچکے تھے۔ سردار ڈاکو نے عقبی حصے سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ نکلا ہی تھا کہ میرے شوہر اور ان کے ہمراہ چار کانسٹیبلز نے فائرنگ شروع کردی۔ مگر سردار ڈاکو کے پاس ایک سب مشین گن بھی تھی۔ اس کی گولیاں زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ابھی تک اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ اب موت کو سر پر دیکھتے ہوئے اس نے مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ میرے شوہر سب سے آگے تھے۔ ان کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہوگیا اور وہ آن کی آن میں موت کی آغوش میں جاسوئے۔

یہ منحوس خبر مجھ پر... قیامت بن کر ٹوٹی۔ ظاہر ہے کہ یہ تقدیر کا فیصلہ تھا مگر میری سسرال والوں نے اسے میرے قدموں کی نحوست سے تعبیر کیا کہ اس نصیبوں جلی کی کوکھ تو اُجاڑ تھی ہی اس نے ہمارے گھر کو بھی اُجاڑ دیا۔ سوئم کی فاتحہ کے بعد ہی مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ میں نے ہر چند منت خوشامد کی کہ مجھے کم سے کم اپنے شوہر کے گھر میں عدت تو پوری کرلینے دیں مگر وہ سنگدل کسی طور نہ مانے۔ میرے بہن بھائیوں نے بھی کہا کہ ایسی سوچ کے مالک ہوتے ہوئے اگر ان لوگوں نے مجھے رہنے کی اجازت دے بھی دی تو اُٹھتے بیٹھتے طنز و طعنوں سے میرا جینا حرام کردیں گے اس لیے بہتر ہے کہ والدہ کے پاس چلی جاؤں اور یوں تین سال کے بعد میں پھر اپنے میکے واپس آگئی۔

☆☆☆

وقت کا مسیحا بڑے سے بڑے زخم بھی بھر دیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جن کی کسک ہم ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتے، ان کی خلش گاہے گاہے ہمیں تڑپاتی اور رلاتی رہتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھے بھی اپنے عظیم نقصان پر صبر آگیا۔ والد کے انتقال کے بعد سے تمام بھائی بہن مل کر والدہ کی کفالت کررہے تھے۔ وہ ہر دو چار ماہ کے بعد کراچی چلی جاتی تھیں اور باری باری ہر بیٹے اور بیٹی کے گھر میں مہینا پندرہ دن گزار کر پھر قصبہ واپس آجاتی تھیں لیکن میری واپسی کے بعد وہ نہ مجھے گھر میں اکیلا چھوڑ کر جاسکتی تھیں اور نہ ہی اپنے ساتھ لے جاسکتی تھیں۔ خدا کے فضل و کرم سے تمام بہن بھائی بڑی خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں سے کسی کے لیے بھی مجھے اور والدہ کو ایک ساتھ مستقل طور پر اپنے گھر میں رکھنا مشکل نہ تھا مگر والدہ جانتی تھیں اور مجھے بھی اندازہ تھا کہ مستقل طور پر ساتھ رہنے میں کچھ ایسے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں جو بہت آہستہ آہستہ کسی دیمک کی طرح باہمی تعلقات کی قربت اور یگانگت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کردیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے مستقل طور پر قصبے میں ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ بھائیوں نے اس خرچ میں معقول اضافہ کردیا جو وہ والدہ کو دیتے تھے اور یوں خاصی اچھی گزر اوقات ہونے لگی۔

سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ مجھے کبھی اشارتاً اور کبھی واضح طور پر یہ مشورے دیے جانے لگے کہ میں دوسری شادی کرلوں۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ اب نہیں تو شاید کبھی آگے چل کر مجھے کچھ ایسا ہی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ زندگی بڑی بے رحم ہے، یہ اپنی ضرورتوں اور اپنے تقاضوں کے سامنے کسی کو ٹھہرنے نہیں دیتی۔ بلاشبہ کچھ عورتیں ہوتی ہیں جو جوانی میں بیوہ ہونے کے باوجود ساری زندگی تنہائی میں گزار دیتی ہیں اور اسی طرح ایسی کچھ مثالیں مردوں میں بھی مل جاتی ہیں مگر زندگی کے اصول و ضوابط کو مستثنات پر نہیں جانچا جاتا۔ ممکن ہے کہ کبھی آگے جاکر میں بھی کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کروں لیکن کم سے کم اس وقت تک میرا ذہن کسی اور مرد کو شوہر کے روپ میں دیکھنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا اور شاید صحیح سوچا کہ میرا اضافی خرچ بھائیوں کو مستقل میری موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے اس لیے اگر میں آمدنی کے لیے کچھ کرنے لگوں تو اس سے دو فائدے ہوں گے، اوّل تو میں بھی مصروف ہوجاؤں گی اور یوں مجھے اپنا غم بھولنا آسان ہوجائے گا اور دوسرے مجھے اپنے اخراجات کے لیے بھائیوں کا مرہونِ منت نہیں ہونا پڑے گا۔ میں بی ایڈ تھی، کسی اسکول یا کالج میں بھی ملازمت کی کوشش کرسکتی تھی لیکن اس کے لیے مجھے حیدرآباد جانا پڑتا۔ روزانہ جانا آنا ممکن نہیں تھا اور اکیلے حیدرآباد میں قیام نہیں کرسکتی تھی۔ یوں بھی مجھے اس شہر کے نام سے ہی وحشت ہونے لگی تھی اس لیے میں نے قصبے میں ہی اپنا ایک پرائیویٹ اسکول کھولنے کا ارادہ کرلیا۔

گھر سے قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے کر میں نے اپنے پرائمری اسکول کا آغاز کردیا۔ شروع میں نتائج کچھ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ لوگوں میں علم حاصل کرنے کی ضرورت کا کچھ زیادہ احساس نہیں تھا۔ آبادی کا بیشتر حصہ کاشتکاروں اور مزدور پیشہ افراد پر مشتمل تھا۔ مجھے اپنے گاؤں اور گرد و پیش کے علاقوں میں گھر گھر جاکر رابطہ قائم کرنے اور لوگوں میں تحصیلِ علم کا شعور بیدار کرنے کے لیے بھی ایک اہم

معروف نومسلم محمد الیگزینڈر رسل وہب

ڈپلومیٹ، مصنف اور صحافی الیگزینڈر وہب 1846ء میں نیویارک کے قریب ہڈسن کے مقام پر پیدا ہوئے۔ عملی زندگی کا آغاز انہوں نے مضمون نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے کیا پھر وہ میدانِ صحافت میں اترے اور ''سینٹ جوزف گزٹ'' اور ''میسوری ریپبلکن'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ 1887ء میں انہیں منیلا (فلپائن) میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کا قونصل مقرر کیا گیا۔ یہیں انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور بالآخر اس کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اسلامی دنیا کا وسیع اور طویل دورہ کیا اور باقی زندگی اشاعت اسلام کے لیے وقف کردی۔ وہ امریکا میں ادارۂ اشاعت اسلام کے صدر بھی تھے، ان کا انتقال اکتوبر 1916ء میں ہوا۔ وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

مجھ سے دریافت کیا گیا ہے کہ امریکا کا باشندہ ہوکر جہاں برائے نام حد تک سہی عیسائیت کا دور دورہ ہے اور جہاں کی زندگی پر مادیت و لامذہبیت اور الحاد کا تسلط ہے، میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں گہرے اور وسیع مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسلام وہ واحد اور بہترین نظامِ حیات ہے جو انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

مرسلہ: عائشہ جونیجو، لاڑکانہ

چلانا پڑی۔ مسلسل کوشش سے رفتہ رفتہ اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور دو سال کے بعد میرے اسکول کی ہر کلاس میں بچوں کی تعداد اتنی ہوگئی کہ انتہائی معمولی فیس کے باوجود اتنی آمدنی ہونے لگی کہ میں اپنی اور والدہ کی جملہ ضروریات کے لیے بھائیوں کی امداد سے بے نیاز ہوگئی۔ اگرچہ انہوں نے اس کے بعد بھی اپنا تعاون بند نہیں کیا جس سے میں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی کا ایک حصہ پس انداز کرنے کے بعد میں باقی سب کچھ اسکول کی حالت اور معیار کو مزید بہتر بنانے پر خرچ کرنے لگی۔ پہلے بچے چٹائیوں پر بیٹھتے تھے، پھر میں نے باری باری ہر کلاس میں میزوں اور کرسیوں کا انتظام کردیا۔ پہلے میرے علاوہ صرف دو استانیاں اور تھیں جو تمام کلاسوں کو پڑھاتی تھیں۔ پھر ہر کلاس کے لیے ایک ایک ٹیچر مقرر کردی گئی۔ تین چار سالوں میں اسکول ترقی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ سالانہ نتائج بھی دوسرے تمام پرائمری اسکولوں سے بہتر ہونے لگے، یہاں تک کہ میں یہ غور کرنے لگی کہ اب دوسری بڑی عمارت کرائے پر لے کر اسکول کو مڈل کلاسوں تک بڑھا دیا جائے۔

وقت گزرتا گیا۔ میں اس تذکرے کو زیادہ طویل کرنا نہیں چاہتی۔ رفتہ رفتہ پندرہ برس بیت گئے۔ میرے اسکول کو مڈل اسکول کا درجہ دے دیا گیا اور میں اسکول کی ذمے داریوں میں اتنی منہمک ہوئی کہ کبھی اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ وہ حالات و واقعات پیش آنے لگے جن کا اس کہانی سے مرکزی تعلق ہے۔

☆☆☆

اپنے مرحوم شوہر کے حوالے سے میرے پاس ایک بندوق اور ایک ریوالور کا لائسنس تھا جن کی تجدید کرانے کے لیے مجھے سال میں ایک مرتبہ حیدرآباد جانا پڑتا تھا۔ میں صبح کو جاتی تھی اور سہ پہر تک کام مکمل کرکے واپس آجاتی تھی۔ اس دن بھی میں اسی ضرورت سے حیدرآباد گئی تھی۔ کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ دفتری کارروائی میں مجھے معمول سے زیادہ تاخیر ہوگئی۔ چھ بجے شام کی بس پکڑنے کے خیال سے میں تانگے کے بجائے ایک رکشا میں بس اسٹینڈ روانہ ہوئی۔ ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ میں نے سڑک پر ایک تانگے میں ایک نوجوان لڑکی کو پانچ چھ سالہ بچی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ رکشا ابھی دور ہی تھا کہ میں نے تین چار سائیکل سواروں کو اس تانگے کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ تعاقب کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ وہ سائیکل سوار تانگے کے اردگرد چل رہے تھے۔ کبھی ان میں سے کوئی تانگے کے بالکل قریب پہنچ کر اس کی چھتری کا ڈنڈا پکڑ لیتا اور لڑکی سے کچھ کہتا اور پھر قہقہے لگاتا ہوا یا تو پیچھے ہٹ جاتا یا آگے نکل جاتا۔ میں نے اپنے رکشا ڈرائیور کو رفتار آہستہ کرنے کے لیے کہا۔ سڑک پر کچھ زیادہ ٹریفک نہیں تھا مگر جو بھی کچھ تھا وہ اپنی راہ گزرتا چلا جارہا تھا۔ کسی کو بھی یہ دیکھنے کی توفیق نہیں ہورہی تھی کہ وہ تین چار غنڈے اس نوجوان اور تنہا لڑکی کو کس طرح پریشان کررہے ہیں۔ وہ اسے پریشان ہی کررہے ہیں، اس کا یقین مجھے لڑکی کی خوف زدہ سہمی سہمی حالت اور اس کی بچی کے رونے سے ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے رکشا ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ رکشا بڑھا کر تانگے کے آگے کھڑا کرکے اسے رکنے پر مجبور کردے۔

میں حیدرآباد کا سفر کرتے ہوئے عموماً اپنے ہینڈ بیگ میں ریوالور رکھتی تھی۔ اس دن بھی ریوالور میرے بیگ میں موجود تھا۔ رکشا رکتے ہی میں نیچے اُتری۔ تانگا بھی ٹھہر چکا تھا۔ ان غنڈوں میں سے دو آگے نکل گئے تھے اور دو تانگے کے رکتے ہی خود بھی سائیکل روک کر کھڑے ہوگئے تھے۔

''تم لوگ اس لڑکی کو کیوں پریشان کررہے ہو؟'' میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''اگر تم بھی پریشان ہونا نہیں چاہتیں تو اپنا راستہ لو۔'' ان میں سے ایک غنڈے نے ڈھٹائی سے جواب دیا ''یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ یہ لڑکی میری بھابی اور میرے دوست کی بیوی ہے، ہم اسے اسٹیشن چھوڑنے جارہے ہیں۔''

''یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں بیگم صاحبہ!'' وہ لڑکی بول اُٹھی ''ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا کے لیے مجھے ان سے نجات دلائیں۔''

میں نے بیگ سے ریوالور نکال لیا اور ڈپٹ کر بولی ''میں ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی ہوں اور تم دونوں فوراً ہی یہاں سے دفع نہیں ہوگئے تو میں گولی چلانے سے قطعی دریغ نہیں کروں گی۔''

ریوالور پر نظر پڑتے ہی سائیکل سواروں کی ساری شوخی ہوا ہوچکی تھی۔ پولیس انسپکٹر کا نام سن کران کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔

''باپ رے!'' اس پہلے والے بدمعاش کے منہ سے نکلا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا ''بھاگ بھیا فضلو ورنہ یہ تھانے دارنی سچ مچ گولی ماردے گی۔''

اور اس کے ساتھ وہ دونوں اتنی پھرتی سے اپنی اپنی سائیکلوں پر بیٹھ کر بھاگے کہ مجھے یقین ہے کہ میل بھر آگے جانے سے قبل انہوں نے نہ ہی پیڈل مارنا بند کیے ہوں گے اور نہ پلٹ کر دیکھا ہوگا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے تو

میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ایک حسین لڑکی تھی جس کی عمر میرے اندازے کے مطابق ستائیس اٹھائیس برس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چہرے مہرے سے تعلیم یافتہ اور کسی شریف خاندان کی فرد معلوم ہوتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے بہن اور تم کہاں جارہی ہو؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''میرا نام رضوانہ ہے۔'' اس نے جواب دیا ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ نہ آتیں تو خدا جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''

''مگر تم جا کہاں رہی ہو؟''

''جہاں بھی نصیب لے جائیں۔'' بے اختیار رضوانہ کی زبان سے نکل گیا۔

''کیا مطلب.....؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں دنیا میں بالکل تنہا اور بے سہارا ہوں۔'' رضوانہ نے جیسے آنسو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا ''میرے شوہر کا ایک حادثے میں انتقال ہوچکا ہے۔ سسرال والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میکے میں کوئی ایسا نہیں جس کی چھت مجھے آسرا دے سکے۔ خدا کی رحمت کے سہارے چل کھڑی ہوئی ہوں تو اب جہاں بھی قسمت لے جائے۔''

''کچھ پڑھی لکھی ہو؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''بی اے پاس ہوں۔''

''سنو رضوانہ میرا نام طیبہ ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا ''یہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک قصبے میں رہتی ہوں۔ وہاں میرا ایک پرائیویٹ اسکول ہے۔ مجھے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔ حیدرآباد ایک ضروری کام سے آئی تھی، اب واپس جارہی ہوں۔ تم مجھ پر اعتماد کرسکو تو میرے ساتھ چلو۔ میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں، بیوہ ہوں۔ کوئی بچہ بھی نہیں ہے، بھائی بہن ہیں مگر وہ سب کراچی میں سیٹل ہیں۔ تم بہ آسانی میرے گھر میں رہ سکتی ہو اور اپنی اور بچی کی گزراوقات کے لیے میرے اسکول میں ملازمت کرسکتی ہو۔ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھوں گی اور خدا نے چاہا تو تمہیں میرے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

رضوانہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟'' اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ''آپ میرے حق میں کسی نیکی کے فرشتے کی طرح آئی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ تقدیر مجھے کہاں لے جائے گی۔ میرا اور میری بچی کا کیا ہوگا؟ مگر خدا بڑا کارساز ہے۔ اس نے میری دعائیں سن لیں اور آپ کو میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ میں کس طرح اس مہربانی سے انکار کرسکتی ہوں۔ میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گی، سوال صرف میرے اعتماد کا نہیں، آپ کے اعتماد کا بھی ہے اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ کبھی آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

میں نے رضوانہ کو گلے سے لگا کر اسے تسلی دی۔ تانگے والے کو اس کا کرایہ ادا کیا۔ رضوانہ کو اپنے ساتھ رکشا میں بٹھا لیا، اس کی بیٹی بھی بہت پیاری تھی۔ میں نے اسے بھی گود میں لے کر پیار کیا اور ہمارا رکشا ایک مرتبہ پھر بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

قصبے میں ایک بڑا زمیندار خاندان تھا۔ تقریباً بیس اکیس سال قبل اس خاندان کے ایک فرد رانا محمد اسلم سے میری ایک سہیلی فریدہ کی شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی محبت کی شادی تھی۔ اسلم اور فریدہ بہت پہلے سے ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔ دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان اور برادری سے تھا اس لیے بزرگوں نے ان کی چاہت دیکھتے ہوئے ان کی منگنی کردی تھی۔ پھر دو تین سال کے بعد ان کی شادی بھی ہوگئی۔ اس شادی سے ان کے یہاں دو بچے ہوئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام محمد خالد تھا اور لڑکی کا ثمینہ۔ پھر بھی شادی کے دوسرے ہی سال کچھ مخصوص حالات کی وجہ سے اسلم اور فریدہ نے ایک مقامی یتیم خانے سے ایک تین چار سالہ لڑکے عرفان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ عرفان نے خالد اور ثمینہ کے ساتھ ایک ہی حویلی اور کم و بیش ایک ہی جیسے حالات میں رہتے ہوئے پرورش پائی تھی۔ اسلم اور فریدہ دونوں اسے اپنے بچوں کی طرح ہی چاہتے تھے۔ بدقسمتی سے اسلم اور فریدہ کا ساتھ زیادہ مدت تک نہیں رہا۔ شادی کے تقریباً تیرہ چودہ سال بعد اسلم سانپ کے کاٹنے سے مرگیا۔ تب عرفان کی عمر لگ بھگ سترہ سال کی تھی۔ بڑا ہونے کی وجہ سے اسلم زیادہ تر عرفان کو ہی اپنے ساتھ زمینداری کے کاموں میں لگائے رکھتا تھا اس لیے اسلم کے انتقال کے بعد عرفان نے تمام زمینداری کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا اور یوں اسے فرسٹ ایئر کے بعد اپنی تعلیم ترک کرنا پڑی۔

عرفان کے برعکس خالد اور ثمینہ پر کوئی ذمے داری نہیں تھی اس لیے فریدہ نے جو انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی

www.paksociety.com

تھی، قصبہ کے کالج سے ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد دونوں کو یکے بعد دیگرے کراچی بھیج دیا جہاں خالد انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کررہا تھا اور ثمینہ کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ عرفان اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچا تو فریدہ نے بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کردی۔ شادی کے ایک سال بعد عرفان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس نے کامران رکھا۔ مگر بیٹے کی پیدائش کی خوشی کے ساتھ ہی اسے ایک المیہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اس کی بیوی کامران کے پیدا ہونے کے آٹھ دس دن بعد ہی کسی اندرونی خرابی کے باعث انتقال کرگئی۔ عرفان اپنے بیٹے کو بڑی محبت اور شفقت سے پرورش کرنے لگا۔ فریدہ اس کی دوسری شادی کرنا چاہتی تھی لیکن عرفان اس کے لیے آمادہ نہیں ہورہا تھا۔ اسی طرح پانچ چھ سال بیت گئے۔

☆☆☆

رضوانہ نے بڑی خوش اسلوبی سے اسکول میں اپنی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ وہ بہت توجہ اور لگن کے ساتھ بچوں کو پڑھاتی تھی۔ اس طرح اس نے میرے گھر میں بھی کچھ اس انداز سے اپنی جگہ بنالی جیسے ہمیشہ سے رہتی چلی آرہی ہو۔ میری امی بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور رضوانہ کی گڑیا سی بیٹی یاسمین کو پاکر تو گویا انہیں دل بہلانے کا ایک کھلونا مل گیا تھا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ رضوانہ نے یاسمین کو گھر میں ابتدائی قاعدہ اور تھوڑا بہت حساب پڑھادیا تھا۔ اگلے سال اس نے مجھ سے یاسمین کو پہلی جماعت میں داخل کرنے کی اجازت مانگی۔ اگرچہ اپنی قابلیت کے اعتبار سے اسے دوسری جماعت میں بھی داخلہ دیا جاسکتا تھا۔ مگر میں نے رضوانہ کے خیال سے اتفاق کیا کہ اگر اسے پہلی جماعت سے داخل کیا جائے گا تو اگلی کلاسیں اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوں گی۔ بنیاد مضبوط ہو تو بچہ خود اپنے آپ بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب یہ ایک اتفاق تھا کہ اسی سال عرفان نے بھی اپنے بیٹے کامران کو پہلی جماعت میں داخل کرنے کے لیے میرے اسکول کو ترجیح دی حالانکہ وہ اس کی حویلی سے کافی فاصلے پر تھا اور اسے میرے اسکول میں داخل کرانے کا مطلب تھا کہ روزانہ کوئی ملازم یا وہ خود بچے کو اسکول چھوڑنے اور چھٹی کے بعد گھر لے جانے کے لیے آیا کرے۔ میں نے کامران سے دو چار باتیں کیں۔ وہ بھی بڑا ہوشیار اور ذہین لڑکا معلوم ہوتا تھا اور یہ بھی لگتا تھا کہ اسے گھر پر ہی ابتدائی تعلیم دے دی گئی ہے۔ میں نے داخلہ فارم بھر کے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ عرفان کو رضوانہ کے پاس بھیج دیا کیونکہ پہلی کلاس کو وہ ہی پڑھاتی تھی اور اس طرح عرفان اور رضوانہ کی پہلی ملاقات ہوئی۔

اب یہ اتفاق تھا یا اس میں کوئی ارادی کوشش شامل تھی۔ یہ میں نہیں جانتی لیکن اس کے بعد زیادہ تر عرفان ہی کامران کو اسکول چھوڑنے یا اسے گھر واپس لے جانے کے لیے آتا تھا اور یوں گاہے گاہے اس کی ملاقات رضوانہ سے ہوتی رہی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ ملاقاتوں میں تواتر آجائے تو آدمی صرف دعا وسلام یا خیر و عافیت پوچھنے پر تو اکتفا نہیں کرتا یقیناً ان دونوں کے درمیان کچھ دوسرے موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی ہوگی۔ خود میں نے انہیں چھٹی کے بعد اکثر و بیشتر اپنے اپنے بچوں کو ہاتھ پکڑے اسکول سے گھر واپس جاتے دیکھا۔ جو سڑک ہمارے اسکول تک آتی تھی وہ تقریباً دو تین فرلانگ آگے جاکر ایک دوراہے میں تبدیل ہوجاتی تھی جس میں سے ایک راہ عرفان کی حویلی تک جاتی تھی اور دوسری میرے گھر تک اس لیے یقیناً وہ دونوں ہی اس دوراہے تک تو ساتھ جاتے ہی ہوں گے۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اسکول کے وقفے کے دوران رضوانہ کی بیٹی یاسمین اکثر کامران کے ساتھ ہی کھیلتی یا باتیں کرتی نظر آتی تھی۔ گویا عرفان اور رضوانہ کے مابین ہی نہیں بلکہ ان کے بچوں کے درمیان میں دوستی اور یگانگت بڑھتی جارہی تھی۔

میرے اسکول کی شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ داخلہ کے لیے آنے والے بچوں میں برابر اضافہ ہورہا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے پہلی جماعت میں دوسرے سیکشن کا اضافہ کرنا پڑا۔ ایک نئی ٹیچر بھی رکھنا پڑی۔ پھر جب یہ دوسرا سیکشن پاس ہوکر دوسری کلاس میں پہنچا تو لازمی طور پر اس کے دو سیکشن ہوگئے۔ اب مجھے ایک ٹیچر کی ضرورت اور پڑی۔ رضوانہ دو سال سے پڑھارہی تھی چنانچہ میں نے اسے اسی سیکشن کے ساتھ دوسری جماعت میں ٹرانسفر کردیا اور پہلی جماعت کے دوسرے سیکشن کے لیے ایک نئی ٹیچر رکھ لی۔ یہ محض ایک انتظامی معاملہ تھا اور یہ فیصلہ کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ اس طرح میں رضوانہ اور عرفان کے تعلقات کو بھی دوسرے برس اسی انداز میں جاری رہنے کا موقع فراہم کررہی ہوں۔

اس کا احساس مجھے پہلی مرتبہ اس دن ہوا جب عرفان مجھ سے ملنے آیا۔ اسکول کی مصروفیات کے باعث اب میرے اور فریدہ کے تعلقات میں وہ گرم جوشی نہیں رہی تھی جو پندرہ بیس سال قبل ہوا کرتی تھی۔ وہ تو دوسرے تیسرے مہینے

میرے گھر آتی رہتی تھی لیکن ...... میرا خیال ہے کہ میں تقریباً دو سال سے اس کی حویلی نہیں گئی تھی۔ عرفان بھی گاہے گاہے میرے گھر آتا رہتا تھا مگر اس وقت جب اسے فریدہ کسی ضرورت سے بھیجتی تھی اور ایسا عموماً تب ہوتا تھا جب فریدہ کے باغات سے موسم کے پھل آتے تھے یا گندم اور چاول کی فصلیں کٹتی تھیں اور فریدہ مجھے کچھ تحفے کے طور پر بھجوایا کرتی تھی۔ مگر اس دن ایسا کوئی امکان بہ ظاہر نہیں معلوم ہوتا تھا اس لیے مجھے عرفان کی آمد پر کچھ حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا "آج کیسے آنا ہوا، فریدہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیا میں آپ کے گھر بغیر ضرورت کے نہیں آسکتا آنٹی؟" عرفان نے قدرے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں آسکتے۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن آج تک تمہیں کبھی خود سے اپنی آنٹی کا خیال نہیں آیا تھا، اس لیے پوچھ لیا۔"

"میں کافی دنوں سے آپ کے پاس آنے کا ارادہ کررہا تھا۔ مگر بات کچھ ایسی تھی کہ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔" عرفان نے کچھ سنجیدگی سے جواب دیا "آج بھی بہت ہچکچاتے ہوئے آیا ہوں۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے کہ تمہیں مجھ سے کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہورہی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا "تم میری عزیز ترین سہیلی کے بیٹے ہو اور اس رشتے سے میں تمہاری ماں کے برابر ہوں، جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو، بلا جھجک کہہ دو۔"

"مجھے ایک اہم معاملے میں آپ کے مشورے اور اجازت کی ضرورت ہے۔"

"اچھا۔ ایسا کون سا مسئلہ پیش آگیا جس کے لیے تمہیں میرا مشورہ ہی نہیں، اجازت بھی درکار ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہے کہ امی مسلسل مجھ سے دوسری شادی کے لیے اصرار کررہی ہیں؟"

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ آخر تم شادی کر کیوں نہیں لیتے؟"

"مجھے دوسری شادی کی ضرورت اور اہمیت سے کبھی انکار نہیں رہا۔" عرفان نے جواب دیا "لیکن اب تک جو بات مجھے آمادگی سے روکتی رہی وہ یہی تھی کہ ایسی لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جو پہلی بیوی کی اولاد کو حقیقی ماں جیسا پیار دے سکیں۔ جبکہ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اپنے آرام اور سکون کی خاطر میں کامران کے مستقبل کو قربان کردوں۔ سوتیلی ماں کے گھر میں آنے سے ایسے کتنے ہی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ اگر انہیں سنبھالنے کے لیے کوئی ہوشمند ساتھی نہ ہو تو گھریلو زندگی بچوں کے ساتھ ہی شوہر اور بیوی کے لیے بھی جہنم بن جاتی ہے۔ میں کسی ایسی ہم مزاج، مخلص، سنجیدہ اور سمجھ دار لڑکی کی تلاش میں تھا جسے اگر اس آزمائش میں ڈالا جائے تو وہ خوش اسلوبی سے اس دشوار ذمے داری کو نباہ سکے۔"

"تو کیا میں یہ سمجھوں......" میں نے اب مسکراتے ہوئے کہا "کہ تم اپنی تلاش میں کامیاب ہوگئے ہو؟"

"میرا اندازہ تو یہی ہے لیکن میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" عرفان نے کہا "کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ اس لڑکی کو جتنے قریب سے اور جتنے بہتر انداز میں جانتی ہیں .... کوئی اور اتنا نہیں جانتا ہوگا۔"

"اچھا!" میں نے حیرت ظاہر کی "گویا وہ کوئی ایسی لڑکی ہے جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں؟"

"جی ہاں۔" عرفان نے اثبات میں سر ہلایا "نہ صرف جانتی ہیں بلکہ وہ آپ کے گھر میں رہتی ہے۔"

"کیا!" میں بے اختیار چونک پڑی "تمہارا مطلب ہے......رضوانہ!"

"جی ہاں، رضوانہ۔ میں اسے پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اس سے مل رہا ہوں، باتیں کررہا ہوں اور جتنا جتنا اسے سمجھنے کا موقع مل رہا ہے۔ یقین ہوتا جارہا ہے کہ مجھے رضوانہ سے بہتر کوئی ساتھی نہیں مل سکتا۔ میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیا اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہے یا میں دماغ کے بجائے جذبات سے کام لے رہا ہوں۔"

"رضوانہ اس سے کہیں زیادہ اچھی لڑکی ہے جتنا تم نے اس کے بارے میں اندازہ لگایا ہے۔" میں نے جواب دیا "اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر تم چراغ لے کر بھی تلاش کرو تو اس سے بہتر ساتھی نہیں پاسکو گے۔ میرے دل کی بات پوچھو تو مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت ہی مناسب ہو بلکہ شاید قدرت نے اسے تمہارے لیے ہی میرے حوالے کیا تھا۔ مگر بیٹے اس طرح کے معاملات کبھی یک طرفہ طور پر انجام نہیں پاتے۔ کیا رضوانہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ کیا تم نے کبھی اس سے اپنے دل کی بات کی ہے؟"

"سچ پوچھیے آنٹی، تو ہمارے درمیان کبھی آج تک اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔" عرفان نے گردن جھکاتے

www.Paksociety.com

ہوئے کہا "لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتی اور پھر کامران اور یاسمین جس طرح ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں وہ تو آپ بھی جانتی ہوں گی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتے ہیں، ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اور رضوانہ بچے ہوتے تو شاید ہم بھی ایسا ہی کرتے۔"

"جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ اگر تمہاری اور رضوانہ کی شادی ہو جائے تو یہ ایک بہترین تخوگ ہوگا۔" میں بولی "لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لیے رضوانہ کی مرضی معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ میرے ساتھ رہتی ضرور ہے، میرا بے حد احترام بھی کرتی ہے۔ مگر میں نے کبھی اس کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ اب بھی اگر اس کو کوئی اعتراض ہوا تو میں اپنے تعلق کے حوالے سے اسے مجبور نہیں کرسکوں گی۔"

"میں اس پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا بھی نہیں۔" عرفان نے کہا "آپ کے پاس اسی لیے آیا تھا کہ اول تو اس بارے میں آپ کی رائے معلوم کروں اور اگر آپ کو میرے خیالات سے اتفاق ہو تب پھر آپ سے درخواست کروں کہ آپ اپنے طور پر اس کی رائے جاننے کی کوشش کریں۔"

"تم خود بات کیوں نہیں کرلیتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تم دونوں اتنے کم عمر بھی نہیں ہو کہ بات کرتے ہوئے شرماؤ یا ذہن کے بجائے جذبات سے کوئی فیصلہ کرو۔"

"بات کرنے کو میں بھی کرسکتا ہوں۔" عرفان نے جواب دیا "لیکن یہ موضوع اتنا نازک ہے کہ شاید ہم دونوں ہی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہ کرسکیں یا اخلاقاً مروت اور پاسداری رضوانہ کو کوئی واضح جواب دینے سے باز رکھے۔ آپ بات کریں گی تو وہ صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کرسکے گی۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے ہامی بھرلی "میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر اس سے پوچھوں گی...... مگر تم نے فریدہ سے بھی کہا یا نہیں؟"

"امی تو ویسے ہی ایک مدت سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔" عرفان نے جواب دیا "انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑیں گی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "مجھے یونہی اندیشہ سا ہے کہ شاید انہیں رضوانہ کی بیوگی پر اعتراض ہو کیونکہ تمہارے لیے تو ایک سے ایک اچھی اور کنواری لڑکی بھی مل سکتی ہے۔"

"رضوانہ اگر بیوہ ہے تو میں بھی تو کنوارہ نہیں ہوں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ امی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیں گی۔ آپ تو بس رضوانہ کی مرضی معلوم کرلیں۔ وہ اگر آمادہ ہو تو پھر امی کو راضی کرنا میرا کام ہے۔"

☆☆☆

دو تین دن کا وقفہ دے کر آخر ایک رات جبکہ ہم سب کھانے سے فارغ ہوچکے تھے اور یاسمین بھی سوگئی تھی، میں رضوانہ کے کمرے میں پہنچی۔ مجھے اس وقت اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر اسے کچھ حیرت ہوئی۔

"آپ نے کیوں زحمت کی باجی، مجھے بلالیا ہوتا۔" اس نے کہا۔

میں نے رضوانہ سے کوئی خواہش ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ مجھے کسی نام سے پکارے مگر چونکہ اسکول میں تمام ٹیچر اور بچے مجھے باجی کہتے تھے اس لیے اس نے بھی یہی کہنا شروع کردیا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔" میں نے جواب دیا "اور میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات کسی دوسرے کے کانوں تک پہنچے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرے کمرے کے برابر ہی کا کمرا ہے۔"

"ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اتنی رازداری کی ضرورت ہے۔" رضوانہ نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"اگر میں تم سے کچھ ذاتی نوعیت کی گفتگو کروں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری اپنی ذات کے حوالے سے تو تم برا تو نہیں مانو گی۔"

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں باجی! میں بھلا آپ کی کسی بات کا بُرا مانوں گی۔" رضوانہ نے فوراً جواب دیا "آپ نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دے کر وہ احسان کیا ہے جس کا صلہ میں ساری زندگی نہیں اُتار سکتی۔"

"یہ کوئی احسان نہیں، میرا انسانی فرض تھا، تم اس کا بار بار تذکرہ کرکے مجھے شرمندہ کردیتی ہو۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا "اس کے علاوہ میں جو کچھ تم سے کہنا چاہ رہی ہوں اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہے اور ظاہر ہے کہ میں نے کچھ بھی کیا ہو، مجھے تمہاری نجی زندگی کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے۔" رضوانہ نے بڑے خلوص سے جواب دیا "میرے دل میں آپ کے لیے جس قدر عزت واحترام ہے، اس کا آپ کو اندازہ نہیں۔ آپ نہ صرف مجھ سے ہر موضوع پر بات کرسکتی ہیں بلکہ حکم بھی دے سکتی ہیں۔"

"تمہاری اس محبت اور خلوص کا شکریہ!" میں نے کہا "بہرحال میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اگر کوئی شریف نوجوان تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہے تو کیا تم اس کی پیشکش کو قبول کرسکو گی؟"

"کیا ایسی کوئی پیشکش آپ کے توسط سے کی گئی ہے؟" رضوانہ نے پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"میں تقریباً تین سال سے آپ کے ساتھ رہ رہی ہوں اور برسوں سے قبل بھی عرفان صاحب کو شام کے وقت آپ سے ملنے آتے نہیں دیکھا۔ تو کیا میں یہ اندازہ لگانے میں کچھ غلطی پر ہوں کہ یہ پیشکش انہی کی جانب سے ہے؟"

"تم بہت ذہین لڑکی ہو۔" میں مسکرادی "تمہارا اندازہ درست ہے۔ اب بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے؟"

رضوانہ نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بولی "اس میں کوئی شک نہیں کہ تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور سے اگر ساتھ میں کوئی بچہ بھی ہو۔ ماں یا باپ میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو تو بچے کو زندگی بھر ایک تشنگی کا احساس رہتا ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی مجھے کسی کا سہارا لینے کا فیصلہ کرنا ہی پڑے اور جس فیصلے کے امکانات ہوں اس پر آج بھی غور کیا جاسکتا ہے اور کل بھی۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پچھلے ایک ڈیڑھ برس میں، میں نے جس حد تک بھی عرفان صاحب کو سمجھا ہے، وہ ایک آئیڈیل شوہر ثابت ہوسکتے ہیں اس لیے اگر میں آپ کی بات کا جواب نفی میں دوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ان میں کوئی کمی ہے۔"

"تو پھر تم نفی میں کیوں جواب دو گی؟" میں نے اس کے واضح طور پر انکار کرنے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

"اس لیے کہ شاید میں ان کے قابل نہیں ہوں۔" رضوانہ نے ایک افسردگی کے ساتھ سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔" میں نے کچھ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا ورنہ رضوانہ کی تمہید نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا "جبکہ میں اور عرفان دونوں اس کے برعکس خیال کرتے ہیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو میرے پورے حالات کا علم نہیں ہے۔"

"ماضی کی پروا مجھے ہے اور نہ میرا خیال ہے کہ عرفان کو ہوگی۔" میں نے کہا "ہم دونوں تمہیں آج کی بنیاد پر جانتے ہیں اور آج جو کچھ تم ہو، اس کے پیشِ نظر عرفان کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ یہ رفاقت دونوں کے لیے مفید اور مبارک ثابت ہوگی۔"

"یہ آپ کی محبت ہے۔" رضوانہ نے سنجیدگی سے جواب دیا "کہ جو میرے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتی ہیں۔ پھر بھی باجی، کبھی کبھی ماضی میں کچھ ایسی باتیں ہوجاتی ہیں جو نہ صرف آدمی کے حال بلکہ اس کے مستقبل تک کو متاثر کرتی ہیں۔ میں عرفان صاحب کی بے حد عزت کرتی ہوں۔ انہوں نے سفر زندگی میں رفاقت کے لیے میرا انتخاب کیا یہ ان کی مہربانی ہے مگر میں پھر بھی یہ کہوں گی کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔"

"اگر تمہارے ماضی میں کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے تمہارا خیال ہے کہ تم عرفان کے لائق نہیں ہو تو پھر اس بات کا فیصلہ خود اسی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اپنے بارے میں سب کچھ مجھے یا عرفان کو بتادو۔" میں نے کہا "وہ بات بھی جس کی وجہ سے تم انکار کررہی ہو اور پھر یہ فیصلہ عرفان کو کرنے دو کہ وہ تمہارا ماضی اور اس کے تمام حالات جاننے کے بعد بھی تمہاری رفاقت قبول کرتا ہے یا نہیں؟"

رضوانہ ایک بار پھر خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگی۔

"آپ کا مشورہ بہت مناسب ہے۔" آخر اس نے کہا "لیکن میں عرفان صاحب سے شاید کھل کر بات نہ کرسکوں یا وہ میرے سامنے دیانت داری سے کوئی فیصلہ نہ کرسکیں اس لیے میں آپ کو اپنی آپ بیتی سناتی ہوں۔ آپ عرفان صاحب کو بتادیں پھر وہ جو بھی فیصلہ کریں گے، مجھے منظور ہوگا۔"

اس کے بعد رضوانہ نے قدرے توقف کے ساتھ جو کچھ مجھے بتایا، وہ کچھ یوں تھا۔

"میرا تعلق ایک شریف مگر غریب خاندان سے ہے۔" اس نے کہنا شروع کیا "میرے والد ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھے۔ ہم چھ بہن بھائی تھے جن کی گزراوقات والد کی معمولی سی تنخواہ میں بہ مشکل ہوتی تھی۔ بچوں کی تعلیم کا مرحلہ بھی انتہائی مشکل تھا۔ مگر میری والدہ میٹرک تک پڑھی ہوئی تھیں، انہوں نے گھر پر جتنی تعلیم وہ دے سکتی تھیں اپنے بچوں کو دی۔ کسی نہ کسی طرح بھائیوں کو اسکول میں بھی داخل کرادیا کہ کسی قابل بن جائیں تو گھر کی کفالت میں والد کا ہاتھ بٹائیں۔ لڑکیوں میں صرف میں ہی ایسی خوش قسمت تھی جسے اسکول جانا میسر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے بچپن سے ہی

پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پرائمری اسکول کی ہر جماعت میں اوّل آتی رہی۔ اسی وجہ سے مجھے میرٹ کا وظیفہ ملنے لگا جس نے میری مزید تعلیم کو آسان بنا دیا۔ اسی طرح اپنی محنت سے وظیفہ حاصل کرتے ہوئے میں کالج تک پہنچ گئی۔

کالج کے دوران تعلیم میں ایک دولت مند خاندان کے شریف اور مخلص نوجوان عابد سے محبت کرنے لگی۔ عابد بھی مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مگر ہماری ملاقاتوں نے کبھی اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ میں نے بی اے پاس کرلیا۔ عابد کے والد کاروبار کرتے تھے۔ وہ کالج سے نکل کر ان کے بزنس میں مدد دینے لگا۔ میرے گھر میں تو میری شادی کی ایسی کوئی جلدی نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ سے بڑی دو بہنیں بھی کنواری بیٹھی تھیں اور غربت کی وجہ سے ان کے لیے.... اچھے رشتے نہیں آرہے تھے۔ مگر عابد کے والدین کو اس کی شادی کرنے کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ عابد شادی سے انکار کرکے کئی رشتے مسترد کرتا رہا۔ مگر پھر اس کے والد نے اپنے ایک دوست کی بیٹی کے ساتھ اس کا رشتہ طے کردیا۔ عابد نے اس رشتے سے بھی انکار کیا اور کہا کہ اگر اس کے والدین اس کی شادی کے ایسے ہی خواہش مند ہیں تب اسے اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت دیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ اس کی پسند کیا ہے اس لیے پہلے انہوں نے اجازت دے دی لیکن جب عابد نے بتایا کہ وہ مجھ سے، ایک غریب گھر کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو انہوں نے بڑی شدت سے مخالفت کی۔

بات اتنی بڑھی کہ عابد نے اپنا گھر چھوڑ دیا اور اپنے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگا۔ پھر اس نے اپنے اسی دوست کی معرفت میرے والدین کو شادی کا پیغام دیا۔ میرے والدین اس رشتے سے بے حد خوش ہوئے۔ انہیں صرف ایک ہچکچاہٹ تھی کہ وہ بڑی بہنوں سے پہلے میری شادی کیسے کردیں؟ عابد نے وعدہ کیا کہ وہ میری بہنوں کے رشتے کے لیے بھی کوشش کرے گا۔ ممکن تھا کہ بات بن جاتی لیکن جب میرے والدین کو یہ معلوم ہوا کہ عابد یہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہے، اس شادی میں اس کے والدین اور عزیز واقارب شامل نہیں ہوں گے نیز یہ کہ اس کے ماں باپ نے اس مسئلے پر اسے گھر سے نکال دیا ہے تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اس کے باوجود شاید ہماری شادی راضی خوشی ہو جاتی لیکن میرے خاندان کے کچھ ایسے لوگ جنہیں اس بات سے جلن اور حسد تھا کہ ایک غریب گھر کی لڑکی ایسے امیر گھر کے لڑکے سے بیاہی جارہی ہے، انہوں نے میرے والدین کو بھڑکایا اور انہوں نے شادی سے انکار کردیا۔

مجھے اس انکار سے بے حد دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ میں عابد کی اس قربانی سے بہت متاثر تھی کہ اس نے میری خاطر اپنا گھر، اپنے ماں باپ، بھائی بہن سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو خط لکھا کہ اگر وہ آمادہ ہو تو میں بھی اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہوں۔ ہم شادی کرنا چاہتے تھے اور شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے، نہ ہی اپنی مرضی سے شادی کرنا دین وشریعت کے خلاف ہے۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہمارے والدین بغیر کسی جائز وجہ کے ہماری شادی کی مخالفت کررہے ہیں چنانچہ عابد نے میری پیشکش قبول کرلی۔ میں ایک دن اپنی سہیلی سے ملنے کا بہانہ کرکے گھر سے نکل گئی۔ عابد نے اپنے دوست کی مدد سے شادی کا تمام انتظام کرلیا تھا اور یوں بالآخر ہم نے شادی کرلی۔

عابد نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا۔ تلاش کرنے سے اسے ایک مناسب ملازمت بھی مل گئی اور ہم نے اس گھر میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کردیا۔ ہماری گزراوقات اگرچہ تنگی ترشی سے ہورہی تھی مگر ہم بہت خوش تھے۔ دوسرے سال یاسمین پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش کے سلسلے میں عابد کافی مقروض ہوگیا۔ پھر یاسمین کی وجہ سے ہمارے خرچ میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ عابد نے کسی دوسری بہتر ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ اخبارات میں ضرورت ہے کے اشتہارات دیکھ کر وہ جگہ جگہ درخواستیں بھیجنے لگا۔ کئی مرتبہ اسے انٹرویو کے لیے بھی بلایا گیا۔ زیادہ تر اشتہارات کراچی میں ملازمت کے ہوتے تھے اس لیے اسے بار بار کراچی بھی جانا پڑتا تھا۔ مگر پورا ایک سال کوشش کرنے کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اگلے سال اتفاق سے عابد کے دوست کے ایک جاننے والے کے دفتر میں جگہ خالی ہوئی۔ عابد کے دوست نے اپنے واقف کاروں سے عابد کی سفارش کی اور اس نے عابد کو جگہ دینے کا وعدہ کرلیا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا۔ ایک دن عابد کو اپائنٹ منٹ لیٹر مل گیا جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ وہ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ سے ڈیوٹی جوائن کرلے۔ ملازمت کراچی میں تھی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور بعد میں رہائش کی جگہ بھی ملنے کی امید تھی۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ مہینے کی آخری تاریخ کو عابد خوش خوش کراچی روانہ ہوا۔ وہ کراچی پہنچ بھی گیا مگر بدقسمتی سر پر منڈلا رہی تھی۔ اپنی ملازمت کی جگہ پہنچنے کے لیے عابد کو لانڈھی پر اُترنا تھا۔ اس کا اسے خیال نہیں رہا۔ جب ٹرین چلنے لگی تب اچانک کسی مسافر کے کہنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ لانڈھی کا اسٹیشن تھا۔ اس نے جلدی میں چلتی

ٹرین سے اُترنا چاہا مگر اس کا پیر پھسل گیا، وہ پلیٹ فارم اور ٹرین کے درمیانی خلا میں گرا اور ٹرین کے پہیے کے نیچے آکر اس بُری طرح زخمی ہوا کہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ وہ کیا گیا، میری تو دنیا ہی تاریک ہوگئی۔

تین سال کی مدت میں نہ عابد کے والدین اور بہن بھائیوں نے ہمیں معاف کیا تھا اور نہ ہی میرے ماں باپ کو میرے بارے میں کوئی اطلاع تھی کہ میں کہاں ہوں؟ میرے گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے غالباً بدنامی اور رسوائی کے خیال سے مجھے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ محلّہ ہی چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے اس طرح مجھے بھی ان کا پتا معلوم نہیں ہوسکا۔ عابد کے انتقال کے بعد میں نے تقریباً ڈیڑھ سال حالات کا مقابلہ کیا۔ گھر میں بچوں کو پڑھا کر محلے والوں کے کپڑے سی سی کر گزراوقات کرتی رہی۔ مگر ایک تنہا عورت کا اس معاشرے میں عزت واحترام سے رہنا انتہائی مشکل ہے۔ محلّے کے غنڈا صفت افراد نے میرا گھر سے باہر نکلنا مشکل کردیا۔ عابد کے دوست کبھی کبھی میری خیریت معلوم کرنے آجاتے تھے، ان کے حوالے سے مجھے اس قدر بدنام کیا گیا کہ میرا وہاں رہنا ناممکن ہوگیا۔

ہر طرف سے مجبور ہوکر، میں محض اپنی بیٹی یاسمین کے اچھے مستقبل کے خیال سے ایک دن اپنی سسرال پہنچی۔ ان لوگوں کو بتایا کہ یاسمین انہی کے خاندان کی شمع اور ان کے اپنے بیٹے کی آخری نشانی ہے۔ وہ سر چھپانے کی جگہ دیں یا نہ دیں لیکن اپنے خون کو تو ٹھوکریں کھانے سے بچالیں مگر شاید وہ لوگ انسان نہیں پتھر تھے کہ میری التجاؤں پر ان کا دل تو کیا پسیجتا، انہوں نے اُلٹا مجھ پر الزام لگا دیا کہ میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ یاسمین عابد کی بیٹی ہے۔ وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ عابد نے کبھی مجھ سے شادی کی تھی۔ اگر کی تھی اور میرے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے تو لاکر دکھاؤں۔ ورنہ تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نہ جانے کس کا گناہ ان کے سر منڈھنے کی کوشش کررہی ہوں۔

یہ تذلیل آمیز باتیں سن کر ظاہر ہے، مجھے بے انتہا صدمہ ہوا۔ میں عابد کے دوست کے پاس گئی اور ان سے درخواست کی کہ جن قاضی صاحب نے میرا اور عابد کا نکاح پڑھایا تھا، ان سے نکاح کا تصدیق نامہ لادیں۔ وہ وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نقل سکونت کرکے لاہور جاچکے ہیں اور وہاں ان کا کیا پتا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ گویا اب میرے اور عابد کے دوست کے علاوہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میری اور عابد کی واقعی شادی ہوئی تھی اور نہ ہی میرے پاس اس کا کوئی دستاویزی ثبوت تھا۔

ان حالات میں میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ حیدرآباد چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں مگر کہاں؟ اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا اور جہاں بھی جاؤں گی وہاں گزراوقات کیسے ہوگی؟ اس کا بھی کوئی حل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بس میں خدا پر بھروسا کرکے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ سوچا تھا اسٹیشن پر جو بھی ٹرین مل جائے اس میں بیٹھ کر وہ جہاں لے جائے گی، چلی جاؤں گی لیکن تقدیر اچھی تھی کہ راستے میں آپ سے ملاقات ہوگئی اور آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔

یہ ہے میری داستانِ حیات۔ ایسی صورت میں اوّل تو مجھے یہی امید نہیں کہ عرفان صاحب کی والدہ مجھے قبول کرلیں گی اور بالفرض انہوں نے بھی مجھ سے یہی سوال کردیا کہ میرے پاس اپنی سچائی کا کیا ثبوت موجود ہے تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا اور اگر اس بات نے کچھ شدت اختیار کی تو میرا یہاں رہنا بھی مشکل ہوسکتا ہے۔ آپ کے لیے بھی مسئلہ بن جائے گا کہ میری رسوائی اور بدنامی کے بعد مجھے اپنے اسکول میں رکھیں یا الگ کردیں۔

اب بتایئے کہ جب امکانات ایسے تاریک ہوں تو میں عرفان صاحب کی پیشکش کس طرح قبول کرسکتی ہوں۔

میں پوری توجہ سے رضوانہ کی آپ بیتی سن رہی تھی اور مجھے اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ سچ کہہ رہی ہے لیکن اس نے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا اس کی پوری کہانی سن کر میرے اپنے ذہن میں بھی وہی اندیشہ پیدا ہونے لگا تھا۔ میں فریدہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے اپنی دولت، اپنے خاندان، اپنی معاشرتی برتری کا واضح احساس تھا۔ مجھے یہ مشکل ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرفان کو رضوانہ جیسی لڑکی سے شادی کی اجازت دے دے گی۔

☆☆☆

تین چار دن کے بعد عرفان دوبارہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔

”کہیے، آپ نے رضوانہ سے بات کی تھی؟“ اس نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

”ہاں کی تھی۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا ”اور میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ اگر اس بات کا کچھ بھی اتفاق ہو کہ تم رضوانہ کے علاوہ کسی اور کا انتخاب کرسکو تو بے شک ایسا کرلو۔ وہ شاید زیادہ بہتر ہوگا۔“

”کیا میں اس کا یہ مطلب سمجھوں کہ رضوانہ نے انکار

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

کر دیا ہے؟'' عرفان کا چہرہ اُتر گیا۔

''نہیں، اس نے انکار تو نہیں کیا۔'' میں نے جلدی سے کہا ''لیکن مجھے یہ توقع نہیں کہ فریدہ تمہاری اس پسند کو قبول کرلے گی۔''

''کیا اس وجہ سے کہ رضوانہ بیوہ اور ایک بچی کی ماں ہے؟''

''کچھ اس وجہ سے اور زیادہ تر ان حالات کے باعث جن میں رضوانہ کی زندگی گزری ہے۔'' میں نے جواب دیا ''ظاہر ہے کہ اگر تم رضوانہ سے شادی کا خیال ظاہر کرو اور فریدہ کو رضوانہ کی بیوگی پر اعتراض نہ ہو تب بھی وہ یہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گی کہ رضوانہ کا تعلق کس خاندان سے ہے۔ اس کی شادی کہاں اور کس کے ساتھ ہوئی تھی؟ پھر وہ کن حالات میں بیوہ ہوئی اور یہ کہ اب اس کے والدین یا کوئی بھی عزیز و اقارب کہاں ہیں؟ اور رضوانہ نے مجھے اپنی زندگی کے جو حالات بتائے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ رضوانہ ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی اور اگر اس نے دیا تو فریدہ کبھی ہرگز اسے بہو کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گی۔''

''مگر کیوں....؟ آخر رضوانہ کی پچھلی زندگی میں ایسی کیا بات ہے؟'' عرفان نے حیرت سے پوچھا۔

اور میں نے اس کے جواب میں قدرے مختصر الفاظ میں وہ تمام روداد دُہرا دی جو رضوانہ نے مجھے سنائی تھی۔

''رضوانہ کا کہنا ہے۔'' میں نے آخر میں کہا ''کہ اگر یہ حالات جاننے کے بعد تم اور تمہاری والدہ اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں تب وہ تمہاری پیشکش کے جواب میں ہاں کہہ سکتی ہے۔''

''رضوانہ کے اس اقدام سے میری نظروں میں اس کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔'' عرفان نے جواب دیا ''اور جو کچھ اس نے بتایا ہے اسے سچ ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت ہو یا نہ ہو میں اسے سچ تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اسی سے اس کے خلوص اور دیانت داری کا اندازہ کرسکتی ہیں۔ وہ چاہتی تو کوئی جھوٹی داستان بھی بیان کرسکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ میرے نزدیک یہی اس کے سچے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ میں امی سے بات کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان لیں گی۔''

لیکن فریدہ نے صاف انکار کردیا۔ اس کے اعتراضات وہی تھے جو معاشرتی رسم و رواج کی اندھی تقلید میں جکڑے ہوئے کسی ذہن کے ہوسکتے تھے۔ اس نے کہا کہ جو لڑکی اپنے گھر سے بھاگ کر ماں باپ کی عزت کو داغ لگا سکتی ہے، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی کسی بات کو سچ مانا جائے۔ کون جانتا ہے کہ اس نے عابد سے شادی کی بھی تھی یا نہیں اور یہ کہ یاسمین اس کی جائز اولاد ہے یا ناجائز۔ بلکہ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یاسمین عابد ہی کی بیٹی ہے۔ آگ لگتی ہے تو دھواں اُٹھتا ہے۔ بات ہوتی ہے تو بتنگڑ بنتا ہے۔ کون جانے اس کے محلے والے عابد کے دوست کے ساتھ اس کے تعلقات میں جس شبہے کا اظہار کرتے تھے وہ سچ تھا یا جھوٹ۔ پھر یہ کہ جس لڑکی کو اس کے ماں باپ اور ساس سسر نے قبول نہ کیا ہو میں اسے اپنی بہو بنا کر گھر میں نہیں لاسکتی۔

عرفان نے ہرچند فریدہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر رضوانہ سے اس کی شادی نہ ہوئی تب پھر وہ ساری زندگی یونہی تنہائی میں گزار دے گا۔ مگر فریدہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجبور ہوکر عرفان ایک بار پھر میرے پاس آیا۔

''آنٹی، میں نے رضوانہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ بولا ''چاہے اس کے لیے مجھے اپنا گھر ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔ مجھے زمینداری کے کام کا اتنا وسیع تجربہ ہے کہ کئی بڑے زمیندار مجھے اپنا منشی اور کارندہ بنانے کے لیے تیار ہیں۔ میں رضوانہ سے شادی کرکے اپنا الگ گھر بساؤں گا اور مجھے خدا کی رحمت سے پوری توقع ہے کہ اتنا کما لوں گا جو اس کی اور میری ضروریات کے لیے کافی ہو۔''

میں نے یہی بات رضوانہ تک پہنچا دی۔

''نہیں باجی!'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا ''اب میں کوئی دوسرا تجربہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اپنے والدین اور عزیز و اقارب سے کٹ کر اپنی پسند اور اپنی محبت کی شادی کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ شادی صرف دو افراد کے درمیان تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ دو خاندانوں کے درمیان بھی ایک تعلق قائم کرتا ہے۔ آدمی معاشرے سے کٹ کر جن پریشانیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے اس کا اندازہ سب سے الگ ہوکر جینے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جذبات کی خاطر اپنے والدین کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تو کیا مگر مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ عابد کو بھی اس کے ماں باپ سے الگ کردوں۔ بلاشبہ ہمیں اپنی پسند کو حاصل کرنے کا حق ہے لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کے بدلے ہم کیا کچھ قربان کررہے ہیں۔ عرفان کو ان کے گھر سے الگ کرکے میں ایک اور عابد کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی۔''

میں نے عرفان کو رضوانہ کا جواب بتایا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''آنٹی، اب آپ ہی بتائیے کہ کوئی لڑکی کسی مرد کو اپنی انگلیوں کے اشارے پر چلانے کی طاقت رکھنے کے باوجود یہ جواب دے سکتی ہے، تو اسے پانے سے محروم رہ جانا بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟'' وہ بولا ''کاش امی سمجھ سکتیں یا کوئی انہیں سمجھا سکتا کہ وہ رضوانہ کو پہچاننے میں کتنی بڑی بھول کررہی ہیں۔ کیا آپ بھی انہیں اپنی ضد چھوڑنے پر آمادہ نہیں کرسکتیں؟''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ''میں کوشش کروں گی کہ فریدہ اس شادی کی اجازت دے دے۔''

☆☆☆

اور پھر ایک دن میں دوپہر کے وقت فریدہ سے ملنے گئی۔ دوپہر کے وقت جانے میں مصلحت یہ تھی کہ اس وقت عرفان عموماً زمینوں پر ہوتا تھا۔ کامران اسکول سے آکر کھانا کھا کر سو جاتا تھا اور حویلی کے ملازمین بھی کم و بیش آرام کررہے ہوتے تھے اور میں تنہائی میں فریدہ سے کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتی تھی جو سب کے سامنے نہیں کرسکتی تھی۔

''آج تو مجھے محلے میں مٹھائی تقسیم کرنا چاہیے۔'' فریدہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''میرا خیال ہے کہ دو ڈھائی سال کے بعد میرے گھر میں قدم رکھ رہی ہو۔''

''تمہاری شکایت درست ہے لیکن اسکول کی وجہ سے میں کتنی معروف رہتی ہوں، تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ظاہر ہے کہ جب نت نئے کام اپنے ذمے لیتی جاؤ گی تو معروفیت تو بڑھے گی ہی۔'' فریدہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو نا، پہلے بچوں کی تعلیمی اور اسکول کے تعلیمی مسائل تھے۔'' فریدہ نے جواب دیا ''مگر اب شاید تم نے اپنے اسکول میں شادی دفتر بھی کھولنے کا ارادہ کرلیا ہے؟''

''ارادہ تو نہیں تھا مگر اب تم نے توجہ دلائی ہے تو اس بارے میں بھی ضرور سوچوں گی۔'' میں نے کہا ''ویسے سچ پوچھو تو میں آئی بھی کچھ اسی سلسلے میں تھی۔ تم نے خود بات چھیڑ کر میرا کام آسان کردیا ہے۔''

''کیسا کام؟'' فریدہ نے دانستہ انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''عرفان میرے گھر آیا تھا......!''

''ہاں، مجھے بھی معلوم ہوا ہے کہ آج کل وہ تمہارے گھر کے چکر لگانے لگا ہے۔'' فریدہ نے بات کاٹی۔

''تمہارے طنز کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔'' میں بولی ''اس لیے اپنی شوخیٔ طبع کو پھر کسی موقع پر آزما لینا۔ ابھی ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات سن لو۔''

''اچھی بات ہے، کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''عرفان میرے پاس میرے اسکول کی ایک ٹیچر رضوانہ سے شادی کرنے کے بارے میں مشورہ کرنے آیا تھا۔''

''اور تم نے اسے بجائے سمجھانے کے اور اکسایا کہ وہ ضرور اس مشتبہ کردار کی لڑکی سے شادی کرلے۔''

''تم پھر بیچ میں بولیں؟'' میں نے اسے ٹوکا ''پہلے میری پوری بات سن لو پھر کچھ کہنا۔ میں تقریباً تین سال سے رضوانہ کو جانتی ہوں اور جانچ کیا ہوں، وہ میرے ساتھ، میرے ہی گھر میں رہ رہی ہے۔ اس عرصے میں جو کچھ میں نے اسے سمجھا اور دیکھا ہے اسی کی وجہ سے میرے خیال میں عرفان اور اس کی شادی میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے عرفان سے وعدہ کرلیا کہ میں اس کی بات رضوانہ تک پہنچا دوں گی۔''

اس کے بعد میں نے مختصر طور پر جو کچھ اب تک عارف اور رضوانہ کے درمیان پیش آیا تھا دہرا دیا۔

''ان حالات میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم کس وجہ سے اس شادی کی مخالفت کررہی ہو؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''اس لیے کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ کچھ اپنے بارے میں بتا رہی ہے وہ سچ ہے۔'' فریدہ نے جواب دیا ''میرے نزدیک وہ ایک مشتبہ کردار کی لڑکی ہے جس نے گھر سے بھاگ کر اپنی آوارگی کا ثبوت بھی فراہم کردیا ہے۔ مجھے یہ بھی اعتبار نہیں کہ اس نے کسی سے شادی کی تھی۔ یاسمین اس کی ناجائز اولاد بھی ہوسکتی ہے۔ پھر اس کا بھی کیا ثبوت ہے کہ وہ مرد جس کے پاس رہ رہی تھی، سچ مچ کسی حادثے میں مرگیا۔ یہ بھی تو ممکن ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنا دل بھر جانے کے بعد اسے گھر سے نکال دیا ہو۔ خود تمہارے بہ قول جب وہ تمہیں ملی تھی تو کچھ غنڈے اس کا پیچھا کررہے تھے اور غنڈے کبھی کسی شریف لڑکی کے پیچھے نہیں لگتے۔ پھر میں ایک ایسی لڑکی کو جس کا کردار ہی اچھا نہ ہو کس طرح اپنے گھر کی بہو بنا لوں؟''

''میں تمہیں دلائل سے سمجھانے آئی ہوں۔'' میں نے کچھ غصے سے کہا ''لیکن تم نے اتنی گری ہوئی بات کرکے مجھے

www.Paksociety.com

کچھ تلخ یادیں کریدنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کیسی تلخ یادیں؟" فریدہ چونک پڑی۔

"آج مجھے اپنی ایک سہیلی یاد آ رہی ہے جو ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔"

"کسی عام اور آوارہ لڑکے سے نہیں بلکہ اپنے خاندان کے ایک لڑکے سے جس سے اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔" فریدہ نے تلخی سے کہا۔

"عام اور خاص سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے جواب دیا "کسی کو پسند کرنا یا اس سے محبت کرنا اگر تمہارے نزدیک بُرا ہے تو وہ ہر صورت میں بُرا ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ محبت منگنی کے بعد نہیں ہوئی تھی، بلکہ بزرگوں نے عقل مندی سے کام لے کر ان کی محبت کو غلط راستے پر بھٹکنے سے بچانے کے لیے منگنی کر دی تھی۔"

"یونہی سہی۔" فریدہ کو کہنا پڑا "مگر بعد میں ان کی شادی بھی ہوئی تھی، باقاعدہ شادی جس کا گواہ پورا گاؤں تھا۔"

"ہاں ...... مگر شادی سے پہلے ان دونوں نے کیا گل کھلائے تھے شاید وہ تم بھول گئیں؟" میں نے جواب دیا۔

فریدہ جو بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی، ایک دم خاموش ہو گئی۔

"اور اگر تم بھول گئی ہو تو میں تمہیں یاد دلاتی ہوں۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی "وہ اپنی محبت کے جوش میں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے، کھیتوں میں، باغوں میں، دن میں رات میں۔ اور ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ شادی ہونے کے یقین نے انہیں بے پروا کر دیا اور وہ شادی سے قبل ہی میاں بیوی بن گئے۔ نتیجہ جو نکلنا چاہیے تھا، وہی نکلا۔ مگر خاندان کی بات تھی اس لیے دونوں طرف کے بزرگوں نے اسے دبا دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس کا ایک آسان حل تو یہ تھا کہ ان دونوں کی فوراً شادی کر دی جاتی لیکن بدقسمتی سے ان ہی دونوں خاندان کے ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا اور رسم و رواج کے مطابق اب سال بھر سے پہلے شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نکلنے والے نتیجے کو چھپانے کے لیے لڑکی کو دوسرے شہر بھیج دیا گیا جہاں اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہ بیٹا ان دونوں کی محبت کی نشانی تھا۔ نہ لڑکی اس سے دستبردار ہونا چاہتی تھی اور نہ لڑکا۔ پھر بہر حال وہ ان کا خون تھا۔ اس لیے لڑکے نے اس ننھی جان کو ایک یتیم خانے کے سپرد کر دیا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ دو تین سال بعد اس بچے کو واپس لے لیا جائے گا تب تک کے لیے اس کی پرورش کے اخراجات بھی اسی کے ذمے رہیں گے۔

کچھ دن بعد لڑکی صحت یاب ہو کر واپس آ گئی اور سال بھر بعد ان دونوں کی شادی بھی ہو گئی۔ ان کے یہاں ایک بیٹا اور بیٹی بھی پیدا ہوئے مگر وہ اپنی پہلی اولاد کو نہیں بھول سکے چنانچہ چار سال کے بعد لڑکا یتیم خانے سے اس بچے کو گھر لے آیا اور اسے اپنے بچوں کی طرح پرورش کیا۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کام صرف نیکی کے جذبے سے یتیم بچے کو سرپرستی مہیا کرنے کے لیے کیا گیا تھا مگر میں جانتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے اور اب تم مجھے جواب دو کہ بالفرض تمہارے اعتراضات درست بھی ہوں تو اس لڑکی اور رضوانہ میں فرق کیا ہے؟ وہ لڑکی کیوں ایک عزت دار گھرانے کی بہو بن گئی اور رضوانہ کیوں کسی شریف اور معزز خاندان کی بہو نہیں بن سکتی۔"

فریدہ کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں ...... تمہیں یہ حالات کیسے معلوم ہوئے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ جب تمہارے قدم بہکے تھے تو سب سے پہلے تم نے میرے ہی پاس آ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔" میں نے اسے بتایا "میں اس بہکنے کے نتیجے کا احساس ہونے تک تمہاری راز دار رہی پھر تمہارے گھر والوں نے تمہارا گھر سے نکلنا اور دوسروں سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ پھر تم اپنے رشتے کی خالہ کے پاس رہنے کے بہانے سے کسی دوسرے شہر چلی گئیں، اس کے بعد بے شک تم نے یا کسی اور نے مجھے کچھ نہیں بتایا مگر خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے ضرور پہچانا ہے۔ نو دس ماہ کے بعد تمہاری واپسی، پھر اسلم بھائی کے ساتھ شادی اور ...... بلا سبب یعنی گھر میں دو بچے ہوتے ہوئے یتیم خانے سے کسی بچے کو گود لینا یہ بڑی عقل پر کہانی واضح کر سکتے ہیں، یہ دو اور دو چار کا معاملہ ہے۔"

میری بات میں ...... دھمکی بھی چھپی ہوئی تھی۔ اسے بھی ڈر ہوا کہ میں نے اگر زبان کھول دی تو اس عمر میں اس کی عزت نیلام ہو جائے گی، وہ جھٹکے سے اٹھی اور میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے اسے رونے دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا، ساون کی اس جھڑی کے بعد پوری تابناکی سے سورج چمکے گا اور یہی ہوا بھی۔ وہ راضی ہو گئی۔ آج اس واقعے کو بارہ سال گزر چکے ہیں۔ گھر میں دو مزید بچوں کا اضافہ ہو چکا ہے مگر عرفان اور رضوانہ کا پیار کم نہیں ہوا۔

بزنس از بزنس

محترمہ مدیراعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم!
انسان کی فطرت میں لالچ مخفی ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے کیا نہیں کرتا ہے، اب میں ابا ہی کو دیکھ لیں۔ انہوں نے کتنا گھناؤنا، کراہیت بھرا بزنس شروع کیا تھا مگر دعا دیں میری بیوی کو کہ اس نے بس ایک جملے میں ان کی زندگی بدل دی۔

ارشاد حسن انصاری
(کراچی)

"ابا، یہاں کیوں رک گئے؟" میں نے ابا سے پوچھا۔

"ابے، اپنی کوٹھی بنتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔" ابا نے قبروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابا۔ اب یہاں تو قبر ہی بنے گی، کوٹھی کیسے بن سکتی ہے۔"

"تُو یہ باتیں نہیں سمجھے گا۔" ابا نے پھنکاری لی "ابے تجھے کیا معلوم، میری نگاہیں کہاں تک دیکھ رہی ہیں۔"

"چلو تم ہی بتا دو۔"

"چل پہلے رحیم چاچا کے لیے فاتحہ پڑھ لے۔" ابا نے کہا۔

"ابا، تم بھول گئے، ہم فاتحہ پڑھ چکے ہیں، اب واپس جا رہے ہیں۔"

"ابے، یہ بونس کی فاتحہ ہے۔" ابا مسکرا کر بولے "نہ ہم رحیم چاچا کی قبر پر آتے، نہ یہ آئیڈیا ذہن میں آتا۔ چل ہاتھ اُٹھا اور خوب دل لگا کر پڑھنا۔ مجھے اندازہ ہے کہ پہلی بار تُو نے یوں ہی ٹرخا دیا تھا۔ صرف ہونٹ ہلائے جا رہا تھا۔"

ابا نے چوری پکڑ لی تھی۔ اس لیے میں بھی کھسیانا سا ہو گیا تھا۔ ہم بہت دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے تھے۔ ایک بات یہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ابا رحیم چاچا پر اچانک اتنے مہربان کیوں ہو گئے تھے۔ حالانکہ بے چارے رحیم چاچا جب تک زندہ رہے، ابا جان ان سے بھاگتے ہی رہے تھے۔

وہ کبھی گھر آتے تو ابا میرے ذریعے کہلوا دیتے کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ پھر اچانک رحیم چاچا کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔

ان کی موت کے بعد ابا جیسے ان کے فراق میں تڑپنے لگے تھے۔ ہر جمعرات کو مجھے لے کر فاتحہ کے لیے آجاتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ ''ابا، رحیم چاچا کی قبر سے تم کو کیا دلچسپی ہوگئی ہے؟''

''ابے تیرا رحیم چاچا بہت فرشتہ آدمی تھا۔ اس نے مجھے معاف کردیا ہے۔''

''کس چیز کے لیے معاف کردیا ہے؟''

''میں نے رحیم چاچا سے پانچ ہزار اُدھار لیے تھے، وہ اس نے معاف کردیے ہیں۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو ابا۔ ہوسکتا ہے رحیم چاچا قیامت میں تمہارا گریبان پکڑلیں؟''

''ابے نہیں، میں نے سنا ہے کہ جو بندہ کسی کو قرض دے اور وصول کیے بغیر مرجائے۔ وہ پھر اس کے خواب میں بھوت .... بن کر آتا ہے۔ آج تیسرا مہینا ہوگیا ہے رحیم چاچا کی موت کو لیکن ایک بار بھی خواب میں نہیں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے معاف کردیا۔''

''یہ تو بہت کمزور لاجک ہے ابا۔''

''لاجک کمزور ہو یا طاقت ور، مجھے تو سکون مل گیا ہے نا۔ اس لیے میں اس فرشتہ صفت انسان کی قبر پر آیا کرتا ہوں۔''

''لیکن تم مجھے کیوں لے کر آتے ہو، یہ تمہارا اور رحیم چاچا کا معاملہ ہے۔ تم خود ہی آجایا کرو۔''

''ابے، تجھے اس لیے لے کر آتا ہوں کہ ان کی روح کو پتا چل جائے کہ اس فاتحہ خوانی میں تو بھی برابر کا شریک ہے۔ ایسا نہ ہو کل بھوت بن کر تیری گردن دبوچ لیں۔''

تو ایسے تھے میرے ابا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے ابا کے پاس پیسے نہ ہوں۔ بہت دولت تھی ان کے پاس لیکن مجال ہے کہ جو زندگی کو آسان بنانے کی بات کریں۔

مجھے تو یہاں تک یقین ہے کہ اگر خدا دنیا میں ان کو خوش خبری دے دیتا کہ جا تجھے جنت دے دی ہے تو ہوسکتا تھا کہ چار پیسوں کے لالچ میں وہ جنت بھی کسی کے ہاتھ بیچ دیتے۔

اب یہی دیکھ لیں کہ انہوں نے رحیم چاچا کی قبر پر فاتحہ خوانی کے وقت بھی بزنس کا پہلو نکال لیا تھا۔

''اب جا اور قبرستان کے گورکن کو بلا کر لے آ۔'' ابا نے حکم دیا ''اس سے کہنا بہت بڑا بزنس آیا ہے۔''

''ابا، کچھ تو مجھے بھی بتا دو۔''

''ابھی نہیں، پلاننگ کے دوران مت ٹوکا کر۔'' ابا نے کہا۔

میں ابا کے کہنے پر گورکن کو بلا کر لے آیا۔ وہ بھی ایک ہی قسم کا منحوس صورت انسان تھا۔

''کاروبار کیسا چل رہا ہے آج کل؟'' ابا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بتاؤں صاحب!'' اس نے ایک گہری سانس لی ''لوگوں نے تو مرنا ہی چھوڑ دیا ہے اور ویسے بھی اگر مرجائیں تو میرا کیا فائدہ ہوگا۔''

''کیوں، فائدہ کیوں نہیں ہوگا؟''

''اس لیے کہ یہ قبرستان پوری طرح بھر چکا ہے صاحب!'' گورکن نے بتایا ''اب تو ایک قبر کی بھی جگہ نہیں ہے۔ ہاں تمہاری بات اور ہے، تم کہو تو تمہاری قبر کی جگہ نکال سکتا ہوں۔''

''ابے، میں ابھی نہیں مر رہا۔'' ابا اس کی بات سن کر بھڑک گئے تھے ''میں کوئی اور بات کر رہا ہوں۔''

''وہ کیا ہے صاحب؟''

''وہ جگہ کس کی ہے؟'' ابا نے قبروں کے درمیان ایک خالی زمین کی طرف اشارہ کیا۔

اب میری بھی نظر اس طرف چلی گئی۔ وہ خاصی بڑی جگہ تھی اور کم از کم بیس قبروں کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

''وہ جگہ تو بکی ہوئی ہے صاحب!'' گورکن نے بتایا ''ایک پارٹی نے اپنے خاندان والوں کے لیے خریدی ہوئی ہے۔''

''کون ہے وہ پارٹی؟'' ابا نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی ابا نے سو کے دو نوٹ گورکن کے ہاتھ پر رکھ دیے تھے۔

''ابھی ان کا کارڈ لے کر آتا ہوں صاحب!'' گورکن ایک دم سے خوش ہوگیا تھا۔

''ابا، یہ کیا چکر چلا دیا تم نے؟'' میں نے گورکن کے جانے کے بعد پوچھا ''اتنی قبروں کا کیا کرو گے؟''

''ابے خاندان والوں کو دفن کروں گا۔''

''تو کیا سب کے سب کسی بیماری میں ایک ساتھ مرنے والے ہیں؟''

''ابے یہ بزنس کی باتیں تو نہیں سمجھے گا۔'' ابا نے کہا ''بزنس از بزنس۔''

اتنی دیر میں گورکن ایک خستہ حال سا وزیٹنگ کارڈ لے کر آگیا تھا ''یہ لیں جی۔ یہ ہے اس پارٹی کا کارڈ۔''

ابا نے کارڈ دیکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کارڈ دیکھا۔ اس پر کسی نسیم ایڈووکیٹ کا نام لکھا ہوا تھا اور فون نمبر کے ساتھ اس کا پتا بھی تھا۔

ہم گھر واپس آگئے۔

گھر آکر میں نے ہنگامہ شروع کردیا ''ابا۔ تم کن چکروں میں پڑے رہتے ہو۔ اتنی قبریں لے کر کیا کرو گے؟''

''اچھا یہ بتا، مونگ کی دال کیسی بنی ہے؟'' ابا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت بُری، میں تو تنگ آگیا ہوں مونگ کی دال سے۔'' میں نے کہا۔

''بس، تو میں اسی لیے یہ چکر چلا رہا ہوں۔'' ابا مسکرا دیے ''تاکہ تجھے مرغی کھانے کو ملے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''تو یہ فکر چھوڑ...... اور یاد رکھ، کل ہمیں اس بندے کے پاس جانا ہے۔'' ابا نے بتایا۔

دوسری صبح ہم دونوں اس پتے پر پہنچ گئے۔ وہ بہت بڑا مکان تھا۔ ابا نے جب نسیم ایڈووکیٹ کا نام لیا تو ایک ملازم نے ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھا دیا اور خود نسیم کو بلانے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جو بندہ کمرے میں داخل ہوا وہ حد سے زیادہ لاغر تھا۔ وہ نسیم ایڈووکیٹ تھا ''ابے، اس کو تو اب تک خود اس قبرستان میں چلے جانا چاہیے تھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' ابا نے میری طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

ابا کی بات سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ برداشت کی تھی۔

''جی فرمائیں!'' اس آدمی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا ''اگر کوئی کیس لے کر آئے ہیں تو میں یہ بتا دوں کہ میں نے پریکٹس چھوڑ دی ہے۔''

''آپ کی تو ایسی کنڈیشن ہے صاحب کہ آپ کو تو دنیا چھوڑ دینی چاہیے۔'' ابا نے کہا۔

ابا کچھ اسی ٹائپ کے منہ پھٹ انسان تھے۔ جب بولتے بے تکا بولتے لیکن شکر ہے کہ اس آدمی نے یا تو ابا کی بات سنی نہیں تھی یا سن کر درگزر کر گیا تھا۔

''پھر بھی پتا تو چلے کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم آپ سے قبروں کا سودا کرنے آئے ہیں۔'' ابا نے بتایا۔

''قبروں کا سودا؟'' وہ بھڑک اٹھا تھا ''کیا میں آپ کو

www.Paksociety.com

صورت سے گورکن دکھائی دے رہا ہوں؟"

"ہرگز نہیں جناب! گورکن لوگ تو بہت صحت مند ہوتے ہیں۔" ابا نے پھر ایک بے تکی بات کردی۔

"اچھا اچھا، صاف صاف بتائیں کیوں آئے ہیں؟" اس نے پھر درگزر کردیا تھا۔

"جناب، آپ نے ایک قبرستان میں تقریباً بیس قبروں کی جگہ گھیر رکھی ہے۔" ابا نے بتایا۔

"گھیری نہیں، خریدی ہوئی ہے۔" اس نے کہا "لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیوں، کیا سب کے سب ٹھکانے لگ گئے؟" ابا نے پوچھا۔

"نہیں، سب کے سب یہاں سے امریکا جاکر آباد ہوگئے ہیں۔" اس نے بتایا "صرف میں رہ گیا ہوں۔ میں خود بھی اگلے ہفتے یہاں سے جارہا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہیں، اسی قبرستان میں؟" ابا نے پوچھا۔

اس باراس نے ابا کی بات سن لی تھی اس لیے بھڑک کر پوچھا "بھائی، آپ بتائیں، آپ کیوں آئے ہیں؟"

"میں آپ کے خاندان کی قبروں والی پوری جگہ خریدنا چاہتا ہوں۔" ابا نے کہا۔

"کیوں، کیا پورے خاندان کا انتقال ہوچکا ہے؟"

"ابھی تو نہیں ہوا لیکن ہونے کی امید ہے۔" ابا نے کہا "آپ بتائیں، کتنے میں دیں گے کیونکہ اب تو آپ کو ضرورت نہیں رہی۔"

"ہاں، اب تو واقعی ضرورت نہیں ہے، سب کے سب ہی شفٹ ہوگئے ہیں۔"

"دیکھیں، میں آپ کو فی قبر ایک ہزار دوں گا۔" ابا نے کہا "بیس کے بیس ہزار بنتے ہیں۔ وہ تم مجھ سے لے لو۔"

"چلو دے دو۔" وہ جیسے تیار بیٹھا تھا۔

"کل لاکر دے دوں گا۔" ابا نے کہا "لیکن پوری لکھت پڑھت ہوگی، قانونی کارروائی کے ساتھ لوں گا۔"

"ہاں ہاں، پوری قانونی کارروائی کے ساتھ ہی دوں گا۔"

ہم اس شخص سے اجازت لے کراس کے گھر سے باہر آگئے۔ میں اس وقت بہت بھنایا ہوا تھا "ابے، تیرا کیوں منہ پھولا ہوا ہے؟" ابا نے پوچھا۔

"یہ کیا بات ہوئی ابا! میں نے بائیک کے لیے پچیس ہزار مانگے تھے۔ وہ تم سے دیے نہیں گئے اور اب قبریں خرید رہے ہو۔"

"ابے سودا تو ہوجانے دے۔ پھر دیکھ لینا، بائیک کیا چیز ہے، گاڑی دلادوں گا۔"

"پھر وہی بات، لیکن کروگے کیا؟"

"تو بس دیکھتا رہ، میں کیا کرتا ہوں؟"

پھر واقعی ایک ہفتے کے اندر سارے کاغذات وغیرہ تیار ہوگئے اور قبرستان میں بیس قبروں کی زمین ابا کو مل گئی۔ ابا نے اسی دن قبرستان جاکر گورکن کو بھی آرڈر دکھادیا تھا اور اس کے ہاتھ پر پھر پانچ سو کا نوٹ رکھ دیا "دیکھ بھائی، آج سے تیرا کام شروع ہوا ہے۔ یہ بتا اس قبرستان میں کتنے لوگ نئی قبر کے لیے آتے ہیں؟"

"دن بھر میں بارہ تیرہ تو آہی جاتے ہیں۔" گورکن نے بتایا "کیونکہ یہ قبرستان شہر کے بیچ میں ہے، آنے جانے والوں کو یہاں بہت آسانی رہتی ہے۔"

"پھر تم کیا کرتے ہو، قبر دے دیتے ہو؟"

"نہیں صاحب، کہاں سے دوں گا؟ یہاں جگہ ہی نہیں ہے۔" گورکن نے کہا۔

"شاباش! اور اب جو بھی آئے، اس کو میرا فون نمبر دے دینا۔" ابا نے بیس پچیس پرچیاں گورکن کے حوالے کردیں۔ وہ ان پر اپنے موبائل کا نمبر لکھ کرلائے تھے۔

"ابا، میں سمجھ گیا۔" میں گھر پہنچ کر بولا "اب تم یہ قبریں ضرورت مندوں کو بیچو گے۔"

"شکر ہے کہ تو سمجھ گیا۔ ورنہ تو آج کل بہت دیر میں سمجھنے لگا۔"

"ابا، شرم نہیں آئے گی ایسا کام کرتے ہوئے؟" میں نے کہا۔

"ابے، اس میں شرم کی کیا بات ہے، بزنس از بزنس۔"

"یہ بتاؤ، کتنے میں بیچو گے؟"

"ابے، تو دیکھتا جا...... میں کئی سو فیصد منافع میں بیچوں گا۔" ابا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"ابا، یہ کیا اندھیر ہے؟"

"تو چپ رہ، تو کیا جانے ...... پیسے سے پیسے کو کیسے کھینچتے ہیں؟" ابا نے مجھے ڈانٹ دیا۔

اسی وقت ابا کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف وہی گورکن تھا۔ وہ ابا کو کسی پارٹی کے آنے کی خبر دے رہا تھا۔

"چلو، بھیج دو اس کو۔" ابا نے اپنا ایڈریس سمجھاتے ہوئے کہا، پھر موبائل بند کرکے میری طرف دیکھا "اب تو

ایسا کر، کہیں چلا جا۔"

"چلا جاؤں...... پر کہاں چلا جاؤں؟"

"ابے جب کوئی پارٹی آئے گی تو تیری انسانیت کی رگ پھڑکنے لگے گی اور تو سارا کام خراب کردے گا۔"

"نہیں، میں کچھ نہیں کہوں گا، صرف تماشا دیکھوں گا۔"

"تیرا یقین تو نہیں ہے...... پھر بھی مجبوری ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ لوگ آگئے تھے۔ وہ جوان لڑکے تھے۔ پڑھے لکھے، مہذب سے۔ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اس کے لیے قبر کی جگہ تلاش کررہے تھے۔

"جگہ تو بہترین ہے میرے پاس۔" ابا نے بتایا "ایسی جگہ ہے کہ خود تمہارا بھی دل چاہے گا کہ لیٹ جاؤ لیکن پچاس ہزار روپے ہوں گے۔"

"پچاس ہزار!" ان دونوں سے زیادہ خود میں اُچھل پڑا تھا "ابا!" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"جا...... تو اندر جا۔" ابا نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"دیکھیں جناب! پچاس ہزار تو بہت ہوتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ اپنی والدہ کو اس قبرستان میں کیوں رکھنا چاہتے ہو؟" ابا نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ہمارے گھر کے قریب ہے۔ ایک نے بتایا "ہمارے والد صاحب تو مریض آدمی ہیں۔ وہ کہیں دور دو فاتحہ کے لیے نہیں جاسکتے۔"

"بیٹے، ماں باپ سے اتنی ہی محبت ہے تو مال خرچ کرو۔" ابا بے رحمی سے بولے "قیامت کے دن تک ان کی روحیں دعائیں دیتی رہیں گی۔"

"کچھ تو کم کریں جناب!"

"دیکھو بیٹے، اس قبرستان میں جتنی جگہ ہے نا، وہ سب ہمارے باپ دادا کی یادگار ہیں۔" ابا نے کہا "وہ جگہ میرے دادا نے خریدی تھی۔"

"ابا!" میں تڑپ اٹھا۔ ابا کتنی روانی سے جھوٹ بولے جارہے تھے۔

ابا نے پھر غصے سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ بہرحال سودا ہوگیا تھا۔ یعنی وہ زمین جو ابا نے صرف ایک ہزار میں خریدی تھی۔ پچاس ہزار میں بیچ دی۔

"دیکھ لیا، اسے کہتے ہیں بزنس!" ابا نوٹ گنتے ہوئے بولے۔

"لیکن ابا ایسی بے رحمی کا بزنس مجھے پسند نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو چپ رہ۔ دیکھ لینا یہ بیس قبریں مجھے کیا دے کر جاتی ہیں۔ ہاں ایک کام تو کر بیٹا۔" ابا کا لہجہ اچانک نرم ہوگیا تھا۔

"ہاں بتاؤ، کیا کام ہے؟"

"تو تو ویسے ہی فارغ بیٹھا رہتا ہے۔ ذرا دو چار قبرستانوں کا سروے تو کرلے۔ ایسے موقع کی جگہ دکھائی دے جائے تو مجھے آکر بتانا۔ سودابازی میں خود کرلوں گا۔ یہ تیرے بس کا روگ نہیں۔"

"نہیں ابا، میں یہ کام نہیں کرسکوں گا، مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔"

"تو پھر مفلس ہی رہنا ساری زندگی۔"

تیسرے دن ابا نے دو اور قبروں کی جگہ بیچ دی۔ اس بار انہوں نے کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ پورے دام وصول کرلیے تھے۔ کیا خوب بزنس ہاتھ آیا تھا۔

ایک دن ایک خوبصورت سی لڑکی آگئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک باوقار سا شخص بھی تھا۔ دونوں بہت پڑھے لکھے اور اچھے خاندان کے معلوم ہورہے تھے لیکن ابا کو ایسی باتوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ ان کے لیے تو وہ صرف ایک گاہک تھے۔

اس لڑکی کی ماں یعنی اس شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ ابا نے ان سے بھی پچاس ہزار کی ڈیمانڈ کی تھی۔

"کیا یہ رقم زیادہ نہیں ہے؟" اس آدمی نے کہا۔

"بھائی جان، اگر زیادہ لگ رہی ہے تو اپنی میت کو کہیں اور لے جاؤ۔"

"اوکے، اوکے، یہ لو...... پچاس ہزار۔" اس آدمی نے گڈی نکال کر ابا کی طرف بڑھادی "اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں زیادتی برداشت نہیں کرسکتا لیکن اس وقت مجبوری ہے۔"

ابا پر ایسی جگرخراش باتوں کا کیا اثر ہونا تھا۔ ابا نے اس بندے سے پوری رقم وصول کرلی تھی۔ اس کے بعد مجھے ابا سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں انہیں سمجھایا کرتا "دیکھو ابا! تم جو کچھ کررہے ہو نا، یہ خدا کو ناپسند ہے۔"

"ابے تو کیا خدا کو ہماری مفلسی پسند ہے؟"

"توبہ کرو ابا! تم مفلس کہاں ہو، تمہارے پاس تو بہت کچھ ہے۔"

"ابے یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ تیرے نزدیک یہ بہت کچھ ہوگا، میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

PAKSOCIETY.COM

"ٹھیک ہے ابا، جیسی تمہاری مرضی۔"

ایک بار ایک اور پارٹی آئی۔۔۔ یہ غریب لوگ تھے۔ ان کا بھائی مر گیا تھا۔ انہیں جگہ چاہیے تھی۔ ابا نے ان سے بھی پچاس ہزار کا مطالبہ کر دیا۔

مرنے والے کا بھائی ایک سر پھرا انسان تھا۔ اس نے ابا کا گریبان تھام لیا" ہوش میں آ بڈھے۔ کس بات کے پچاس ہزار مانگ رہا ہے، کیا ہم دو گز زمین پر کمرشل پلازا بنانے جا رہے ہیں؟"

ابا نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ وہ نوجوان بُری طرح ابا کو جھنجوڑنے لگا تھا۔ مجھے ایک طرح سے روحانی خوشی ہو رہی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ جس کا گریبان پکڑا گیا تھا وہ میرا باپ تھا۔ اسی لیے بیچ بچاؤ کرانا پڑ گیا۔ بہرحال ان لوگوں سے سودا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ واپس چلے گئے تھے۔

میں نے ایک بار ابا سے پوچھا "ابا فرض کرو، اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

"کرنا کیا ہے، تیری قبر کے بھی پچاس ہزار وصول کروں گا۔"

"کس سے کرو گے؟ میں تو مر چکا ہوں گا۔ کیا اپنے آپ سے وصول کرو گے؟"

"ابے تیرے دوستوں سے چندا کر کے ایک لاکھ جمع کر لوں گا۔" ابا نے بتایا۔

"کیا مطلب؟ یعنی تم خود کچھ نہیں کرو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابے، میں کس خوشی میں کروں گا، میں تو چیز بیچ رہا ہوں۔"

"افسوس ہے ابا، تمہاری ذہنیت پر۔"

"اچھا اچھا، منشی فاضل مت بن۔ جس وقت تو مرے گا، اس وقت دیکھی جائے گی۔"

اور ایک دن میں گھر پر ہی تھا جب محلّے کے ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے، وہ میرا باپ تھا۔ میں نے بے قرار ہو کر اسپتال کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابا کا ایک چھوٹا آپریشن کر دیا گیا تھا۔

پتا چلا کہ یہ ایکسیڈنٹ کچھ اس طرح کا ہوا تھا کہ ابا بس کی ٹکر سے فٹ پاتھ پر جا کر گر گئے تھے۔ شکر یہ تھا کہ ان کے سر پر چوٹ نہیں آئی تھی۔

وہ۔۔۔۔ بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ ایک وارڈ میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ان کو نلکیاں لگی ہوئی تھیں، خون دیا جا رہا تھا۔

یعنی ڈاکٹروں نے انہیں بچانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی۔ بہ ظاہر ان کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ بہت دیر بعد ابا کو ہوش آ گیا تھا۔

مجھے اپنے پاس دیکھ کر مسکرا دیے "ابے قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔"

ابا ایک ہفتے تک اسپتال میں رہے۔ ان کا علاج بھی ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں کی طرف سے بھی کوئی کوتاہی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ سنبھل نہیں پا رہے تھے۔ ان کے منہ سے خون آنے لگا تھا۔

کئی طرح کے ٹیسٹ ہوئے اور یہ پتا چلا کہ ان کے پھیپھڑے متاثر ہو چکے ہیں اور شہر میں صرف ایک ڈاکٹر ہے جو ان کے پھیپھڑوں کو آپریٹ کر کے علاج کر سکتا ہے۔ اس کا نام تھا سرجن حمید۔

"ابے بلا لے۔ اس سرجن حمید کو۔" ابا نے کہا۔

"ابا، مجھے پتا چلا ہے کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"تو اس کی فکر مت کر۔ کسی طرح اس کی منت سماجت کر ہی لوں گا۔" ابا نے کہا۔

میں نے اسپتال والوں سے کہہ دیا کہ وہ سرجن حمید کو بلا لیں۔

اور جب سرجن حمید کمرے میں داخل ہوا تو یہ وہی باوقار سا آدمی تھا جو اپنی بیوی کی قبر کے لیے آیا تھا اور ابا نے اس سے پچاس ہزار روپے وصول کر لیے تھے۔

سرجن حمید نے بھی ابا کو پہچان لیا تھا "اوہ۔۔۔۔ تو یہ تم ہو۔"

ابا نے شرمندہ ہو کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ سرجن حمید نے اسی وقت دو چار ٹیسٹ کروائے اور یہ بتایا کہ ابا کا علاج ہو سکتا ہے لیکن فیس بہت تگڑی دینی ہو گی۔

"یہ تو بتاؤ ڈاکٹر کہ کتنی فیس لو گے؟" ابا نے پوچھا۔

یہ مکالمہ بازی کمرے میں ہی میرے سامنے ہو رہی تھی۔

"تم یہ بتاؤ کہ تم نے بزنس کے لیے کتنی قبریں رکھی ہوئی ہیں۔"

"کیوں شرمندہ کر رہے ہو ڈاکٹر!"

"تم سے ایک بات پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

"اب میرے پاس صرف پندرہ قبریں رہ گئی ہیں۔" ابا نے بتایا "بیس تھیں، جن میں سے پانچ بیچ چکا ہوں۔"

www.Paksociety.com

"ان میں سے دو مجھے دے دیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ کو، وہ کیوں؟" ابا بُری طرح چونک پڑے تھے "وہ تو بہت مہنگی ہیں، ایک ایک لاکھ کی۔"

"میری فیس بھی اتنی ہی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "اب فیصلہ خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر آپ کیا کریں گے؟" میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"میں ایک فلاحی ادارہ بھی چلا رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے بتایا "جو مریض نادار ہوتے ہیں، ان کے لواحقین کے پاس آخری رسومات کی استطاعت نہیں ہوتی۔ انہیں ہمارا ادارہ مفت سارے انتظامات فراہم کردیتا ہے۔ دو میتوں کو دو قبریں آپ کی طرف سے ہوجائیں گی۔"

"دے دو ابا! یہ تو بہت ثواب کا کام ہے۔" میں نے کہا۔

"ابے چپ! جب قبریں ہی دے دوں گا تو میرے پاس کیا بچیں گی۔"

"مرضی ہے تمہاری۔" ڈاکٹر نے کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

ابا نے بوکھلا کر آواز دی "ڈاکٹر صاحب، بس ایک منٹ...... بات سنتے جائیے۔"

"ہاں کہو۔" ڈاکٹر حمید وہیں دروازے پر رک گئے تھے۔

"چلو ٹھیک ہے، لے لینا دو قبریں لیکن آپریشن بالکل چوکس ہونا چاہیے۔"

آپریشن بالکل چوکس ہوگیا۔ سرجن حمید واقعی باکمال سرجن تھا۔ اس نے ابا کے پھیپھڑوں کی خرابی دور کردی تھی۔ ابا اس کے بعد بھی پندرہ بیس دنوں تک اسپتال ہی میں رہے تھے۔

ابا صحت یاب ہوکر گھر واپس آگئے۔ گھر واپس آکر بھی وہ حساب کتاب میں مصروف رہے تھے "ابے، اب کتنی قبریں رہ گئی ہیں؟"

"تیرہ رہ گئی ہیں ابا!"

"دیکھ۔ تیرہ لاکھ سے کم ایک پیسا بھی قبول نہیں کروں گا۔ خواہ مخواہ دو لاکھ کا نقصان ہوگیا۔"

"ابا۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ تم موت کے منہ سے نکل کر آئے ہو۔" میں نے کہا "تم کو تو چاہیے تھا کہ صرف ایک قبر اپنے پاس رکھ کر باقی مستحق لوگوں میں بانٹ دو۔"

"اور وہ ایک کیوں رکھوں اپنے پاس؟"

"خود اپنے لیے۔ اب تمہاری زندگی کا کیا بھروسا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

ابا نے اس پر کئی عدد گالیاں دے ڈالی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد ابا نے دو اور ٹھکانے لگادیں۔ بیماری کے بعد ان کا دل اور بھی سخت ہوگیا تھا۔ اب وہ ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔

"ابے یہ بتا، کیا اس ڈاکٹر نے میرے ساتھ رعایت کی تھی؟"

"لیکن ابا، یہ تو دیکھو کہ اس ڈاکٹر کی نیت کیا تھی؟" میں نے سمجھانے کی کوشش کی "اس نے غریبوں کی مدد کی ہے۔"

"ابے، تو پھر میں بھی تو غریب ہوں۔ میں نے کون سے ہوائی جہاز خرید لیے ہیں۔"

اب ابا کو کون سمجھاتا۔

ایک دن ایک لڑکی ابا کے پاس آگئی۔ اس لڑکی کی کہانی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنے دکھ سمیٹ کر وہ یہاں تک پہنچی ہوگی۔

اس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کے خاندان میں اور کوئی نہیں تھا۔ محلے والوں نے سارے انتظامات کردیے تھے لیکن قبر خریدنے کی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ اس لڑکی کے محلے والے بھی خود اسی کی طرح غریب تھے۔

ابا نے خود اس سے بھی ایک لاکھ مانگ لیے تھے۔ وہ لڑکی تڑپ اُٹھی تھی "خود سوچیں۔ کہاں سے دوں گی میں ایک لاکھ۔ کفن تک کا بندوبست تو محلے والوں نے کیا ہے۔"

"میں یہ سب نہیں جانتا لڑکی! بزنس از بزنس۔" ابا نے کہا "میں نے آج تک کسی سے رعایت نہیں کی۔ تم چلی جاؤ گی تو میرے پاس اور بھی پارٹیز ہیں۔"

اس وقت میں بپھر اُٹھا "ابا۔ اب یہ نہیں ہوگا۔ اب مجھ سے تمہاری باتیں برداشت نہیں ہورہیں۔ اس بے چاری پر رحم کھاؤ، دے دو اس کو ایک قبر۔"

"ابے تو کیوں بیچ میں بول رہا ہے؟" ابا نے کہا۔

اس لڑکی نے چند لمحوں تک ابا کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے بولی "چلو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے، جو کہنا ہے یہیں کہو، یہ میرا بیٹا ہے۔" ابا نے میری طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، میں الگ ہوکر کہوں گی، کسی کے سامنے نہیں۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ!" ابا اسے دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ میں وہیں کھڑا رہا تھا۔

ذرا سی دیر میں دونوں کی واپسی ہوئی تھی۔ ابا کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ان کے پیر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے باہر آکر اس لڑکی سے کہا "ٹھیک ہے بیٹی! ایک قبر تمہاری ماں کے لیے، میری طرف سے اور ہاں....." انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھا دیے "یہ رکھ لو اور ضرورت ہو تو بتا دینا۔"

حیرت سے میری آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

ابا کا یہ روپ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہوگا۔

ابا اور کسی پر رحم کرجائیں اور وہ بھی اس حد تک کہ خود اپنی جیب سے پیسے دے رہے تھے۔ ایک لاکھ کی قبر اس کو دے دی تھی۔ یہ سب انتہائی حیرت انگیز تھا۔

نہ جانے اس لڑکی نے کمرے میں جاکر ابا سے کیا کہہ دیا تھا؟ میں نے ابا سے پوچھا "ابا، اس لڑکی نے کیا کہا تھا کہ تم اس پر اتنے مہربان ہوگئے؟"

"ابے جانے دے۔ وہ بے چاری اپنی مفلسی کا رونا رو رہی تھی۔ بس دماغ ہی تو ہے، پھر گیا اور میں نے اس کی مدد کردی۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

لیکن مجھے اندازہ تھا کہ بات صرف یہی نہیں ہے بلکہ اور بھی کچھ ہے۔ ورنہ ابا اس طرح اتنی آسانی سے مہربان ہونے والے تو نہیں تھے۔

بہرحال اس کے بعد یہ ہوا کہ ابا نے قبروں کا بزنس ہی ختم کردیا بلکہ کئی قبریں انہوں نے مفت میں دے دی تھیں۔ اصل رقم بھی نہیں لی تھی۔ یہ حیرت کی بات تھی۔ نہ جانے وہ لڑکی کون سا جادو پھونک کر چلی گئی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ابا نے ایک اور حیرت انگیز بات کی "دیکھ بیٹے! اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا۔ پھیپھڑے تک جواب دے گئے ہیں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تیری شادی کردی جائے۔"

"ابا۔ میں اتنی جلدی کیسے شادی کرلوں؟"

"جلدی کہاں ہے، اس مہینے کے آخر تک تیری شادی ہونی ہے۔"

"لیکن ابا۔ مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونے دو۔" میں نے کہا۔

"اب اور کتنا کھڑا ہوگا، اچھی طرح کھڑا تو ہو چکا ہے۔"

"میرا مطلب ہے ابا۔ کوئی کام وام تو کرنے دو۔"

"سب ہوجائے گا۔ میرے پاس پیسے ہیں، ان سے اپنا کاروبار سیٹ کرلینا۔ میں نے تو تیرے لیے لڑکی بھی پسند کرلی ہے۔"

"وہ کون ہے ابا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی، جو اس دن اپنی ماں کی قبر کے لیے آئی تھی۔" ابا نے بتایا "بہت اچھی لڑکی ہے۔ زندگی بھر تجھے خوش رکھے گی۔"

"ابا، کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"اچھی طرح جان گیا ہوں اس کو۔" ابا نے کہا "وہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔ تیری قسمت بدل دے گی۔"

میں انکار کرتا رہا لیکن ابا کی ضد کے سامنے ایک بھی نہیں چل سکی اور ہوا بھی یہی۔ ٹھیک ایک مہینے کے بعد عالیہ سے میری شادی ہوگئی۔

شادی کے بعد پتا چلا کہ زندگی کی اصل خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔ عالیہ انتہائی اچھی لڑکی تھی۔ انتہائی خدمت گزار، فرمانبردار، اس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف ایک ماں تھی، جس کا گزشتہ دنوں انتقال ہوگیا تھا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے بچوں کو پڑھانا شروع کردیا تھا۔

یہ بہت اچھا تھا کہ اس کا پورا محلہ بہت اچھا تھا۔ محلے کا ہر شخص اس کی خبر گیری کرتا۔ محلے کی عورتوں نے اسے تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیا اور محلے کے مرد اس کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔

اس کی شادی بھی محلے والوں نے مل جل کر کرائی تھی۔

ابا نے عالیہ کے بارے میں ایک دن مجھے بتایا "ابے ایک دن میں نے اس کے بارے میں محلے والوں سے پوچھ تاچھ کی تھی۔ سب ہی اس کی شرافت کی گواہی دے رہے تھے۔ پھر میں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا۔"

"ابا ایک بات تو بتاؤ۔"

"کون سی بات؟"

"عالیہ نے اس دن تم سے کیا کہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ابے کیوں اس بات کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔" ابا نے کہا "بھول جا اس کو۔ بس عالیہ کی قدر کر۔ اس کو کبھی تکلیف نہ ہونے دینا۔"

ابا کے پاس اب چند ہی قبریں رہ گئی تھیں۔ اب وہ کسی قبر کا معاوضہ بھی نہیں لیتے تھے۔ نہ جانے کیوں، بس ایک آن میں ان کی دنیا بدل کر رہ گئی تھی۔

میں نے ایک دو بار عالیہ سے بھی پوچھا "تم نے اس دن ابا سے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ بدل کر رہ گئے؟"

www.Paksociety.com

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔" عالیہ نے جواب دیا۔

ابا اب بیمار رہنے لگے تھے۔ سرجری کے بعد ان کے پھیپھڑوں میں وہ طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے ہانپنے لگتے۔ لیکن ان کی زبان کا وہی حال تھا۔ وہی انداز گفتگو جو ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔

میری بیوی عالیہ نے اس حال میں ان کی بہت خدمت کی۔

وہ مجھ سے کہا کرتے "ابے دیکھ لیا، میں نے عالیہ کے لیے کیا کہا تھا، ایسی بیوی قسمت والوں کو ملتی ہے۔"

"ہاں ابا، تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

ابا نے صرف ایک قبر کی زمین بچا کر رکھی تھی۔ باقی سب اِدھر اُدھر دے دیں۔ میں نے ایک دن ان سے کہا "ابا، اب یہ آخری زمین بھی کسی کو دے دو۔"

"ابے نہیں، یہ میں نہیں دے سکتا کیونکہ یہ تو میں نے خود اپنے لیے رکھی ہوئی ہے۔"

ابا نے اب نمازیں بھی شروع کر دی تھیں۔ محلّے والے انہیں بہت حیرت سے دیکھا کرتے کیونکہ انہوں نے ابا کو کبھی نماز روزے کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

پھر ابا ایک دن بیمار پڑ گئے۔

ان کے پھیپھڑوں کی کمزوری پوری طرح سامنے آ گئی تھی۔ میں اور عالیہ ان کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔

ایک دن ابا نے بیماری کی حالت میں کہا "ابے جب میں زندگی میں پہلی بار کوئی نیک کام کرنے جا رہا ہوں تو تم دونوں پریشان ہو رہے ہو۔"

"ابا، کس نیک کام کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابے، مرنے جا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ نیک کام اور کیا ہوگا؟" ابا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

اور ایک دن وہ مر ہی گئے۔

بہت خاموش اور پُرسکون موت ہوئی تھی ان کی۔ وہ رات کو بستر پر لیٹے لیکن دوسری صبح اُٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ سوتے ہی میں مر گئے تھے۔

اور ان کی تدفین اسی قبر میں ہوئی تھی جس کو انہوں نے روک کے رکھا تھا۔ اندازہ کیجیے، قبروں کا یہ سفر کہاں سے شروع ہوا تھا۔

بیس قبروں کی زمین، ان کی سودے بازی، ایک ایک قبر پر لاکھوں کا منافع، پھر ان کی حالت بدل جانا اور قبریں مفت تقسیم کر دینا، یہ سب آخر کیا تھا؟

کیسے آدمی تھے ابا!

ان کی موت کے کئی مہینوں کے بعد میں نے ایک بار پھر عالیہ سے پوچھ لیا "عالیہ! کم از کم اب تو بتا دو کہ تم نے اس دن ابا سے کیا کہا تھا؟"

"ہاں، اب بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" عالیہ نے کہا "کیونکہ اب تو ابا ہی دنیا میں نہیں رہے۔ جس وقت اماں کا انتقال ہوا، اس وقت کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس۔ بہت مجبور ہو کر ابا کے پاس آئی تھی لیکن انہوں نے زمین دینے سے انکار کر دیا تھا۔"

"ارے بھائی، یہ سب معلوم ہے مجھ کو۔" میں نے کہا "تم تو اصلی بات بتاؤ۔"

"اصل بات یہ ہے کہ میں نے ابا کو الگ لے جا کر ان سے یہ کہا تھا کہ میں اپنی ماں کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس پیسے تو نہیں ہیں لیکن عزت ہے، اگر چاہیں تو عزت لے لیں۔" عالیہ نے وہ بات بتا ہی دی تھی۔

"او خدا!! اتنی بڑی بات......" میں کانپ کر رہ گیا تھا۔

"ہاں، اور یہ سنتے ہی ابا کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ نہ جانے انہیں کیا ہوا، وہ پورے بدن سے کانپنے لگے۔ وہ بُری طرح رو رہے تھے۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہنے لگے، بیٹا، آج سے میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہیں زندگی میں کوئی دکھ، کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا اور انہوں نے باپ بن کر دکھا بھی دیا۔" عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

عالیہ رو رہی تھی اور اس کے ساتھ میں بھی رو رہا تھا۔

میرا باپ بہت بڑا آدمی تھا۔ ظاہر میں کچھ اور اندر سے کچھ اور۔ قبروں کا سودا کرتے کرتے اس نے بہت خاموشی اور ہوشیاری کے ساتھ اپنی قبر منور کر لی تھی۔

اب میں اور عالیہ جب بھی قبرستان کی طرف جاتے ہیں تو ابا کی قبر بہت پاکیزہ پاکیزہ سی لگتی ہے اور اس وقت ابا کی آواز کانوں میں آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے "ابے، میں نے کہا تھا نا کہ بزنس از بزنس۔ میں کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔"

"ہاں ابا! تم کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے۔ میرا یقین ہے کہ تم نے اپنی قبر میں جنت کی کھڑکی ضرور کھول لی ہے اور یہی کہا ہوگا۔ ابے کم از کم ایک کھڑکی تو کھول دو۔ اور فرشتوں نے کئی کھڑکیاں کھول دی ہوں گی، یہ ہمیں یقین ہے۔"

خالہ روشنا

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

امید ہے کہ مکمل طور پر ٹھیک ہوں گے۔ یہ ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں، گو یہ کہانی مختصر سہی مگر میرے دل کی آواز ہے کیونکہ ہم نے انسانوں کے بنائے ہوئے کھیل میں بہت کچھ کھویا ہے، بہت سی لاشیں تحفے میں ملی ہیں، میں کوئی باقاعدہ لکھاری تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی کوشش کی ہے، امید ہے نوک پلک سنوار کر کسی قریبی اشاعت میں شامل کریں گے۔

حامد تابانی

(کبل، سوات)

میری خالہ، میری سب سے چھوٹی اور میری سب سے پیاری خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ ان کی یاد بہت آتی ہے۔ جب بھی میں ان کو یاد کرتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ کیسے مری ہوں گی، کیسے جان دی ہوگی؟ یہی سوچ، یہی لحات مجھے رلاتے ہیں، کیا ان کی میت پر کوئی رویا ہوگا، کیا کوئی دکھی ہوا ہوگا؟

میں نے اپنی خالہ کا آخری دیدار تک نہیں کیا، جب مجھے خبر ہوئی تو وہ منوں مٹی تلے سو چکی تھیں۔

روشنا میری خالہ کا نام تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ یعنی میرے ماموں اور خالاؤں میں سب سے

www.Paksociety.com

چھوٹی۔ جبکہ میری امی اپنے بہن بھائیوں میں بڑی تھیں۔ میری اماں روشنا خالہ کو اپنی اولاد جیسا ہی سمجھتی تھیں۔ وہ اکثر بتاتی تھیں کہ جب ان کی شادی ہوئی تو اس وقت روشنا تقریباً ایک سال کی تھی۔

کہتے ہیں کہ زندگی آزمائشوں کا مسکن ہے یا پھر زندگی کا دوسرا نام آزمائش ہے۔ خالہ روشنا کی زندگی آزمائشوں اور پل پل آزمائشوں سے عبارت تھی۔ وہ سب سے لاڈلی تھیں لیکن بڑے کہتے ہیں کہ جو لاڈلا ہوتا ہے وہ زندگی میں ہمیشہ خوار اور ذلیل ہوتا ہے۔ روشنا خالہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ ان کے صرف دو بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ چاروں بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ ان کے بھائیوں کی بھی شادیاں ہوچکی تھیں۔ وہ اپنے بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب تک نانی زندہ تھیں، گھر پر خالہ ہی کا راج تھا۔ ماں کی مثال ایک درخت کی ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتی ہے۔ جب ماں سامنے ہو تو دنیا جہاں کا حوصلہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی خالہ روشنا کی ماں یعنی میری نانی اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ گھر کا بٹوارا ہوگیا۔ میرے ماموں تو پہلے ہی ایک دوسرے کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ نانی کے انتقال کے بعد ان میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ بڑے ماموں تو زیادہ تر پردیس میں ہوتے اور ان کی بیویاں توبہ، بات بات پر جھگڑا کرتی تھیں۔ جب دونوں بھائیوں میں علیحدگی ہوئی تو نانا اور خالہ بڑے بھائی کے ساتھ تھے لیکن بھابی کے تیور ان کے لیے اچھے نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ خالہ کو ذلیل کرنے کا بہانہ ڈھونڈتیں۔

خالہ کی گھر پر حکمرانی ختم ہوگئی اور وہ بھائی اور بھابی کی محتاج ہوگئیں۔ حالانکہ نانا ابھی زندہ تھے لیکن پتا نہیں خالہ کی بھابی نے ان کو کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی بجائے اپنی بہو کی طرف داری کرتے تھے۔ ان دنوں ایک رشتہ خالہ کے لیے آیا۔ تمام بہنوں نے یہ رشتہ قبول کرلیا۔ وہ شخص جو بعد میں میرے خالو بنے، پہلے ٹھیک ٹھاک تھے لیکن پتا نہیں شادی کے بعد ان کو کیا ہوگیا تھا۔ میرے خالو کے والدین مرچکے تھے، صرف ایک بہن اور ایک بھائی تھے جو اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ خالو کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ محنت مزدوری تو کرتے لیکن اپنی بہن کے ہاں ہی رہتے تھے۔ اسی بہن نے رشتے کی بات کی تھی۔ جیسے تیسے ان کی شادی ہوگئی۔ بھابیوں نے شکر ادا کیا کہ مصیبت ٹل گئی۔ وہ خالہ کو ہمیشہ مصیبت کہتی تھیں۔

یہ بات ہمیں بعد میں معلوم ہوئی کہ خالو کی ایک شادی ناکام ہوئی تھی۔ جب شادی کو دو سال گزر گئے تو خالو نے اپنا رنگ دکھانا شروع کردیا۔

وہ خالہ روشنا سے بیزار سے رہنے لگے۔ خالہ نے اپنے شوہر کو کرایے کے مکان میں رہنے کے لیے کہا تو خالو نے مان لیا اور یوں وہ کرایے کے مکان میں اٹھ آئے۔ وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ مویشی پالتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح گزربسر ہو ہی جاتی تھی۔ روشنا خالہ نہایت ہی کفایت شعار تھیں۔ وہ کافی بچت کرلیا کرتیں، ان کا خواب تھا کہ اپنا گھر ہو۔

چار سال گزر گئے لیکن خالہ کی گود ہری نہ ہوئی، پھر معلوم ہوا کہ خالو میں کوئی خامی ہے۔ خالہ نے اپنے خاوند کا علاج کرایا لیکن بے سود۔ خالہ کو بچوں کی بہت خواہش تھی، انہوں نے ایک لڑکی کو گود لے لیا۔

وقت گزرتا رہا۔ خالو کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ وہ نشہ کرنے لگے تھے۔ خالہ نے جو رقم بچائی تھی، وہ خالو کے علاج پر خرچ ہونے لگی۔ مجبوراً مویشیوں کو بھی اونے پونے بیچنا پڑا۔ خالو کے علاج کے سلسلے میں کسی نے بھی خالہ کی مدد نہیں کی۔ غیروں نے انہیں ڈاکٹر کے پاس پہنچایا۔ خالو تو ٹھیک ہوگئے لیکن ان میں پہلے جیسا حوصلہ نہیں رہا۔ کام کاج کوئی نہیں کرتے، بس ایک سگریٹ پیتے، دوسرا سلگاتے۔ وہ خالہ کے رحم وکرم پر رہنے لگے تھے۔

خالہ کی کوئی نوکری نہیں تھی کہ ان کا مالی بوجھ اٹھاتی رہتیں۔ اسی دوران لوگوں نے میرے نانا کو مجبور کیا کہ آپ کی اتنی زیادہ زمینیں ہیں، اپنی بیٹی کو گھر کے لیے تھوڑی سی زمین دے دیں۔ نانا راضی ہوگئے اور تقریباً تین مرلہ زمین ان کو گھر بنانے کے لیے دے دی۔ خالہ نے زیور بیچ کر ایک کمرا اور چاردیواری اٹھالی اور کرایے کے مکان سے نجات مل گئی۔

جب خالہ اپنے نئے مکان میں شفٹ ہوئیں تو وہ بہت خوش تھیں۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔ میں ماں کے ساتھ ان کو مبارک دینے کے لیے گیا تھا۔

• گھر کی خوشی ملی لیکن شوہر راہِ راست پر نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ انسان تقدیر کے آگے بے بس ہے۔ وہ تقدیر کے آگے جھکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ خالہ بھی بے بس تھیں۔ شوہر ان سے روز جھگڑتا اور پیسے مانگتا، یہاں تک کہ برتن وغیرہ بھی بیچنے لگا، روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر وہ اپنی گود لی گئی بیٹی کے ساتھ باپ کے گھر آگئیں لیکن وہاں ان کے ساتھ بھابی اور باپ کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ ان کی بیٹی سے تو حد سے زیادہ نفرت کرتے تھے۔ خالہ نے ان کے رویّے کو دیکھا تو واپس اپنے گھر چلی گئیں۔ وہ مار کھاتیں، گالیاں سنتیں اور جب بہت زیادہ تنگ آجاتیں تو اپنی بہنوں کے ہاں چلی جاتیں اور کچھ دن گزار آتیں لیکن کب تک، رفتہ رفتہ لوگ ان سے بیزار ہونے لگے۔

خالہ ہمارے گھر بھی آتیں۔ میری ماں ان کو بہن سے زیادہ بیٹی سمجھتی تھیں۔ ان کی گود لی گئی بیٹی سے بھی پیار کرتی تھیں۔ جب بھی خالہ آتیں، میری ماں کے سامنے روتیں، فریاد کرتیں۔ میں نے ہمیشہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ماں ان کو حوصلہ دیتیں اور صبر کی تلقین کرتیں۔ وہ ہر طرف سے نامراد ہوئی تھی۔ رشتہ داروں نے خالہ کی کوئی مدد نہیں کی، گاؤں میں ان کے چار چچا تھے، کسی نے بھی خالہ کی مدد نہیں کی۔

جب بھائی اور باپ نے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کی تو دوسروں کی کیا بات، ایک دفعہ میرے بڑے ماموں سعودی عرب سے تقریباً تین سال بعد لوٹے تو خالہ نے ان کو اپنا معاملہ بتایا۔ خالہ کو بڑی امید تھی ان سے لیکن انہوں نے بھی اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا حالانکہ بڑے بھائی کے ناتے ان کا فرض تھا۔ بڑے ماموں بیوی سے ڈرتے تھے۔ جب وہ واپس پردیس جانے لگے تو انہوں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن سے مل لیں۔

خالہ انسانی آسروں سے حد درجہ مایوس ہوگئی تھیں۔ ٹھوکریں ہمہ وقت ان کی منتظر جو تھیں۔ اسی دوران اچانک ہمارے علاقے میں شورش کے جراثیم پھیل گئے اور سارے علاقے لپیٹ میں آگئے۔ ہر کوئی ہتھیار بند ہورہا تھا، علاقے میں حکومت کی عمل داری مکمل طور پر ایک سوچے سمجھے منصوبے کی تحت ختم ہوگئی تھی۔ کبھی اسکول جاؤ تو کبھی پل اور کبھی تھانہ۔ ہر روز سربریدہ لاشیں چوکوں میں ملتی تھیں۔ گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پروازوں اور شیلنگ نے لوگوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا کیونکہ بے گناہ لوگ بھی متاثر ہورہے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خالہ روشنا چھٹے رمضان المبارک کو ہمارے گھر آئیں اور کہا کہ یہاں حالات ٹھیک نہیں ہیں، آپ سب ہمارے گھر آجائیں۔

خالہ کا گاؤں دوسرا تھا، وہاں حالات نارمل تھے۔ اس دن تقریباً تین بجے فائرنگ شروع ہوئی اور اس میں شدت آتی گئی، ایسا لگتا تھا کہ کسی دشمن ملک نے حملہ کردیا ہو۔ مارٹر گولے گرتے رہے، سب لوگ گھروں میں محصور ہوگئے۔ ہم نے کمروں میں پناہ لے لی۔ ہمارے کچھ رشتے دار ہمارے گھر کو محفوظ سمجھ کر پناہ کے واسطے آئے ہوئے تھے۔ خالہ اور اماں ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے کمروں سے باہر نکلی تھیں کہ اچانک ایک مارٹر گولہ آیا اور ہمارے آنگن میں پھٹا، میں بھاگتا ہوا پہنچا تو وہاں دھوئیں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میں انہیں کسی نہ کسی طرح کمرے میں لے آیا۔ جب کچھ شدت کم ہوئی تو میں نے ماں کو ایک سوزوکی میں ڈال دیا۔ جنگ آزما حریفوں نے راستے مسدود کیے ہوئے تھے، ہمیں لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اسپتال پہنچ کر باقیوں کا پتا پوچھا تو بتایا گیا کہ سب خیر ہے۔

لیکن خیر کہاں، شام کو روزہ افطار کرنے سے کچھ قبل کسی نے اطلاع دی کہ خالہ روشنا شہید ہوگئیں۔ وہ تو شرپسند نہیں تھیں لیکن دوسروں کے بنائے ہوئے کھیل میں ہم نے لاشوں کے تحفے پائے، گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس رہا تھا۔ میں بہت رویا کیونکہ مجھ پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔ خالہ روشنا نے روزے کی حالت میں جان دی تھی۔ اب وہ منوں مٹی تلے سوئی ہوئی ہیں۔ آج ان کی قبر کے کتبے پر یہ شعر لکھا ہے۔

اتنے چپ چاپ کہ رستے بھی رہیں گے لاعلم
چھوڑ جائیں گے کسی روز نگر شام کے بعد

زندگی بھر دکھ جھیلنے والی خالہ اب بھی مجھے بہت یاد آتی ہیں۔

محبت کیا ہے

حضرت منصور حلاج کو قید میں جب اٹھارہ دن ہوئے تو شبلی نے جاکر دریافت کیا۔ منصور محبت کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ سوال کل پوچھنا۔ دوسرے دن اسے مقتل کی طرف لے جایا جارہا تھا کہ شبلی پہنچ گئے۔ انہوں نے اس سے کہا۔ محبت کی ابتدا جلنا اور انتہا قتل ہوجانا۔

این ایس آر مدثر کا تعاون
بلدیہ ٹاؤن کراچی سے

www.Paksociety.com

سفید کوا

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
میں نے اس سے پہلے کوئی کہانی نہیں لکھی۔ یہ بھی کوئی فرضی کہانی نہیں ہے۔ اس کے کئی کردار آج بھی زندہ ہیں۔ میں خود بھی اس کا ایک کردار ہوں۔ گوکہ یہ قصّہ میرے بچپن کا ہے لیکن اس لیے لکھ بھیجا ہے کہ پڑھنے والوں کو سبق حاصل ہو۔ امید ہے ، اسے سرگزشت میں جگہ ضرور ملے گی۔

محمد منوّر
(ساہیوال)

ممکن ہے قارئین کو اس سچ بیانی میں کہانی کی کمی محسوس ہو لیکن یہ ہے حسب حال۔ وہ حال جس سے ہم سب گزر رہے ہیں، جس سے یہ پورا ملک گزر رہا ہے۔ روز ایک نیا تماشا دیکھتے ہیں۔ درحقیقت تماشا ہمارا ہوتا ہے اور تماشائی بھی ہم خود ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہم سمجھ نہیں پاتے کہ اصل تماشا تو ہمارا ہی ہے۔ ہمارے سامنے جو مداری اور کرتب باز ہیں ان کے پاس کوئی کرتب یا تماشا نہیں ہے۔ وہ اصل میں ہمیں اتنے سلیقے سے آئینہ دکھاتے ہیں کہ ہم اسے تماشا سمجھتے ہیں اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے یا جی بہلاتے ہیں۔ کبھی کبھی تماشا زیادہ کھلنے لگے تو خون جلاتے ہیں۔ مگر دھوکا ہمیشہ کھاتے ہیں۔ کبھی اسے اپنا تماشا سمجھنے کو تیار نہیں ہوتے۔

جب میں چھوٹا تھا تو والد صاحب معمولی کلرک تھے اور اسی مناسبت سے ہم ایک چھوٹی سی آبادی میں رہتے تھے۔ یہ غریبوں کی بستی تھی جس میں زیادہ تر مزدور اور ملوں کے معمولی ملازم رہتے تھے بعض ابو کی طرح وہائٹ کالر کلرک بھی تھے۔ یہ اور بات تھی کہ شام گئے جب وہ بس میں دھکے کھاتے آتے تو ان کی قمیص کا کالر بھی دوسروں کی طرح سیاہ ہو رہا ہوتا۔ شہر سے متصل آبادیوں سے ہٹ کر یہ محلّہ تھا جس میں چند گلیاں اور ان کے چاروں طرف میدان تھا۔ بس یوں سمجھ لیں یہ قصبہ اور گاؤں کے درمیان کا علاقہ تھا۔ یہاں پانی اور بجلی میسر تھی۔ سیوریج کے لیے لوگوں نے گٹر بنا لیے تھے اور گیس کی جگہ لکڑی یا مٹی کا تیل استعمال ہوتا تھا کیونکہ یہ دونوں چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ لکڑی تو چاروں طرف تھی کہ چند گلیوں کو چھوڑ کر میدان میں کیکر کے پیڑ بھرے پڑے تھے اور مٹی کا تیل بھی ان دنوں غریبوں کا ایندھن سمجھا جاتا تھا لیکن اسے بھی بس چند لوگ ہی لے سکتے تھے۔ جن گھروں میں مٹی کے تیل کے چولہے جلتے تھے وہ ذرا اونچے درجے کے شمار ہوتے تھے کیونکہ اکثر گھروں سے سرِ شام ہی دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا تھا۔

ہمارے گھر میں کل چار لوگ تھے۔ میں یعنی منور، میرا بڑا بھائی احمر، ابو اور امی۔ لوگ کم تھے اس لیے گزارا آسانی سے ہو جاتا تھا۔ ہفتے میں دو دن گوشت بن جاتا تھا اور ہم پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ احمر اور میں نزدیکی سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسکول جانے کے لیے ہمیں جھاڑیوں سے بھرے ایک بڑے میدان سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس میدان میں کوئی آبادی نہیں تھی اس لیے یہاں سے اکیلے گزرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے۔ اسکول جانے والے درجن سے بھی زیادہ بچّے تھے اس لیے ہم بے فکری سے ہنستے کھیلتے آتے جاتے تھے۔ اس میدان کے بارے میں ایسی ہی کہانیاں مشہور تھیں جیسی کہ اس قسم کے میدانوں کے بارے میں مشہور ہو جاتی ہیں۔ کسی نے رات کو یہاں سر کٹا دیکھا تھا اور کسی کو دن دھاڑے کہیں درختوں سے چھن چھن کی آواز آئی تھی۔ بعض لوگوں کو نام لے کر پکارا جاتا تھا۔ یہ کہانیاں ہم بچوں نے بھی سن رکھی تھیں اور ظاہر ہے اکیلے اس میدان سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار اسکول میں ملنے والی سزا کے سلسلے میں مجھے دیر ہو گئی اور احمر بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ چلا گیا۔

میں اسکول سے نکلا تو کوئی بھی ساتھ جانے والا نہیں تھا۔ میدان سے گزرنے کی وجہ سے کوئی لڑکا اکیلا جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا اس لیے جیسے ہی ہمارے محلّے کا جتھا تیار ہوتا وہ روانہ ہو جاتے۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا میرا کسی نے خیال ہی نہیں کیا کہ مجھے بھی لے کر جانا ہے۔ میرا دم خشک ہو گیا یہ سوچ کر کہ مجھے اکیلے ہی اس میدان سے گزرنا ہو گا۔ میں نے دل ہی دل میں احمر اور دوسرے لڑکوں کو دل بھر کر بُرا بھلا کہا جو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے، کچھ دیر انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا لیکن جانا مجبوری تھی۔ میں مرے قدموں سے چل پڑا۔ اسکول کے ساتھ والی آبادی ختم ہوئی اور میدان شروع ہوا تو میرے پاؤں باقاعدہ لرزنے لگے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگوں لیکن یہاں تو چلنا ہی محال ہو رہا تھا۔ ہر جھاڑی میں مجھے کوئی سر کٹا یا چڑیل چھپی محسوس ہو رہی تھی اور سچ تو نہیں لیکن میرے کان یوں بج رہے تھے جیسے چاروں طرف سے میرے نام کی صدا آ رہی ہو۔ میں بس سر جھکائے چلا جا رہا تھا، نظر بھی اُٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں کسی جھاڑی میں گھسنے سے کیسے محفوظ رہا۔ راستہ لاشعور میں بس گیا تھا اس لیے قدم خود بہ خود درست اُٹھتے رہے۔

"ڈر رہے ہو؟"

اچانک ہی آواز آئی تو میں اُچھل پڑا تھا۔ دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو جھاڑی تلے ایک آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ اس نے سادہ شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر شاید چالیس کے آس پاس تھی۔ سفید ہوتے گھنے گھنگریالے بال اور آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ اس کے چہرے پر بڑی نرم سی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ دیکھ کر میرا خوف اس حد کم ہوا کہ میں نے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ورنہ میں بھاگنے کے لیے اسٹارٹ بھی لے چکا تھا۔ آدمی کے شانے پر ایک سفید پرندہ بیٹھا تھا اس وقت میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "ڈر رہے ہو؟"

میں نے سر ہلایا۔ "ہاں جی.... یہاں سے اکیلے گزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ میں اسکول میں پیچھے رہ گیا اس لیے اکیلے جا رہا ہوں۔ آپ کو یہاں ڈر نہیں لگ رہا؟"

وہ کیکر کی اس جھاڑی تلے اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے اپنے گھر میں ہو۔ میری بات سن کر مسکرایا۔ "ڈر کیسا

www.Paksociety.com

یہاں تو سب اپنے دوست ہیں، کوئی نقصان نہیں کرتے۔ کیوں دوست ٹھیک کہا نا میں نے۔" اس نے شانے پر بیٹھے پرندے سے کہا اور اس نے کوّے کی طرح کرخت کائیں کائیں کی تو میں اُچھل پڑا تھا۔

"یہ کوا ہے.... سفید کوا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میرا کوا سفید ہے۔"

ابھی تک میں اس سے دور کھڑا تھا لیکن سفید کوا دیکھنے کی چاہ میں اس کے پاس چلا آیا۔ کوا تھا سچ کا اور پورا سفید تھا، سر سے پاؤں تک۔ صرف اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور یہ سفید رنگت خوفناک لگ رہی تھی۔ "میں نے آج تک سفید کوا نہیں دیکھا۔"

"یہ میرا کوا ہے۔" وہ فخر سے بولا۔ "میں نے کہا نا میرا کوا سفید ہوتا ہے۔"

اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ کوا سفید ہونا ایک محاورہ ہے۔ اس لیے میں اس کی بات کو عام معنوں میں لے رہا تھا۔ میرا سارا خوف غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ایک بچکانہ تجسس نے لے لی تھی۔ میں نے بالکل پاس سے کوّے کا معائنہ کیا۔ "آپ نے کہاں سے لیا ہے اسے؟"

"یہ میرا ہے۔" اس نے پھر وہی جواب دیا اور کوّے کو گود میں لے لیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا میں اسے چھو سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" اس نے فوراً انکار کر دیا۔

میرے تجسس کا رُخ اس کی طرف مڑ گیا۔ "آپ کون ہیں؟"

میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میں تمہاری بستی میں رہتا ہوں منور۔"

مجھے تعجب ہوا۔ "آپ کو میرا نام معلوم ہے۔ لیکن میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"میں ابھی آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "آؤ میرے ساتھ تمہیں اپنا گھر بھی دکھاؤں گا تم اچھے بچے ہو جب چاہو مجھ سے ملنے آ سکتے ہو۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم بستی تک آئے اور وہ میدان کی طرف سے پہلے مکان کے سامنے رکا۔ "یہ میرا گھر ہے۔"

بستی کا یہ کھنڈر نما مکان عرصے سے خالی پڑا تھا، ایک کمرے کے اس مکان میں صرف ایک دروازہ تھا اور یہ بھی جھولتا رہتا تھا کیونکہ جب مکان خالی تھا تو محلے کے لڑکے دروازے پر لاتیں مارتے تھے۔ یہ ان کا کھیل تھا۔ یہاں پانی اور بجلی بھی نہیں تھی۔ گویا وہ شخص یہاں آ گیا تھا۔ وہ یقیناً حال میں ہی آیا تھا ورنہ اب تک ہمارے گھر میں بھی اس کا ذکر ہو چکا ہوتا۔ چھوٹی بستی کی یہی خاص بات ہوتی ہے کوئی بھی بات ہو اور کتنی خفیہ کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ دو دن میں سب کے علم میں آ چکی ہوتی تھی۔ میں نے گھر آتے ہی امی کو اس آدمی کے بارے میں بتایا۔ امی کو سفید کوّے کا سن کر تعجب ہوا تھا اور ہنسی آئی تھی۔ انہوں نے میری بات کا یقین کرتے ہی پڑوسن کو اطلاع دی۔

"اری زینب سنتی ہو۔"

"کیا ہوا باجی؟" زینب فوراً دیوار پر نمودار ہوئی۔

"کونے والے کھنڈر میں ایک آدمی آیا ہے جس کا کوا سفید ہے۔"

پڑوسن زینب ہنسی۔ "کوا سفید ہے؟"

"ہاں زینو باجی۔" میں نے مداخلت کی۔ "میں نے ابھی اسکول سے آتے ہوئے دیکھا ہے بالکل سفید کوا ہے اس کے پاس۔"

"تجھے کیسے پتا چلا کہ کوا ہے، ہو سکتا ہے کوئی اور پرندہ ہو۔" اس نے بحث کی۔ وہ میٹرک پاس تھی اس لیے ہر بات میں بحث کرتی تھی۔

"میں نے خود کائیں کائیں کرتے سنا ہے اور وہ آدمی بھی بار بار کہہ رہا تھا کہ میرا کوا سفید ہوتا ہے۔"

میری اس بات پر امی اور زینو باجی نے خوب قہقہے لگائے تھے۔ میں اس وقت بھی نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے قہقہے کیوں لگائے؟ بہر حال شام تک ساری بستی کو معلوم ہو گیا تھا کہ کھنڈر مکان میں ایک شخص آیا ہے۔ جس کے پاس سفید کوا ہے۔ جب مرد گھر آئے اور ان کو پتا چلا تو کچھ دیر آرام کے بعد وہ حسب معمول بیٹھک جمانے شیخ صاحب کے مکان کے سامنے چلے گئے۔ شیخ صاحب کا مکان اسٹاپ کی طرف سے بستی کا پہلا اور سب سے بڑا مکان تھا۔ بستی میں سب سے اچھی حالت ان کی ہی تھی۔ اس لیے وہ ایک طرح سے بستی کے سربراہ تھے اور لوگ معاملات اور جھگڑے طے کرانے انہی کے پاس جاتے تھے۔ شام کو ان کے مکان کے سامنے خالی جگہ پر کرسیاں اور چارپائیاں رکھ کر بیٹھک بنائی جاتی تھی جس میں محلے کے مرد بیٹھ کر گپ شپ کرتے تھے۔ ان غریبوں کی یہی تفریح تھی کیونکہ ٹی وی بہت کم گھروں میں

تھا۔ زیادہ سے زیادہ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر ہوتا تھا وہ بھی عورتوں اور لڑکیوں کی تفریح کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ سارے دن کے تھکے ہارے مرد اسی طرح تازہ دم ہو جاتے تھے۔

مردوں کی طرح عورتیں بھی ٹولیاں بنا کر مختلف جگہوں پر جمع ہوتی تھیں۔ یہ محفلیں رات کے کھانے کے بعد ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں صرف بڑے ہی حصہ لے سکتے تھے۔ بچوں اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ان محفلوں میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ لڑکیاں تو گھر میں رہتی تھیں لیکن بڑے لڑکے موقع پا کر نکل جاتے اور کہیں اپنی محفل جماتے تھے۔ اس رات ابو شیخ صاحب کی بیٹھک سے واپس آئے تو انہوں نے امی سے کہا۔ "یہ ماموں تو بڑا گنی آدمی ہے اس کے پاس صرف سفید کوا ہی نہیں بلکہ اور بھی چیزیں ہیں، سنیاسی باوا بھی ہے اور عامل بھی۔"

"اچھا جادو منتر جانتا ہے۔" امی نے حیرت سے پوچھا۔ "اور یہ ماموں کیا نام ہوا؟"

"اپنا نام تو ماموں بتایا لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ سب اسے ماموں کہتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ جادو منتر بھی جانتا ہو۔ اکیلا ہے اور کوئی کام بھی نہیں کرتا۔۔ سارا دن جنگل میں گھومتا رہتا ہے۔ شاید وہاں سے جڑی بوٹیاں جمع کرتا ہے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟" امی نے تشویش سے کہا۔ "ہماری بستی میں سارے اچھے اور شریف لوگ رہتے ہیں۔ اگر یہ غلط سلط نکلا تو پوری بستی کا ماحول خراب ہو جائے گا۔"

"نہیں آج شیخ صاحب نے اسے تعارف کے لیے بلالیا تھا گھر میں دعوت بھی کی تھی۔ اس کے بعد دو ڈھائی گھنٹے ہمارے ساتھ رہا ہے۔ پہلے کسی دوسرے شہر میں تھا اب یہاں آ گیا ہے۔"

"دوسرے شہر سے کیوں آیا؟"

"آیا ہو گا کسی وجہ سے۔" ابو نے سمجھایا۔ "بلاوجہ کسی پر شک نہیں کرتے جب تک اس کی کوئی غلط حرکت نہ دیکھ لو... بظاہر تو شریف اور اچھا ہی آدمی ہے۔ باتوں اور لہجے سے پڑھا لکھا بھی لگتا ہے پتا نہیں اس چکر میں کیوں پڑ گیا؟"

"جنگل میں گھومتا ہے، بچے بھی اکثر کھیلتے ہوئے اسی طرف چلے جاتے ہیں۔"

"بچے ہیں کتنا روک سکتے ہیں۔ منور اور احمر تو مغرب سے پہلے گھر آتے ہیں نا؟"

اتفاق میں برکت ہے

31 مارچ 1948ء کو ڈھاکا میں قائداعظم محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اگر ہم خود کو بنگالی، پنجابی، بلوچی اور سندھی پہلے اور مسلمان اور پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان لازماً پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گا۔" آج جب پاکستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار کو دیکھا جاتا ہے تو دل میں عجیب سا قلق پیدا ہو جاتا ہے کہ یہاں ہر کوئی نفسانفسی کے عالم میں مبتلا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو پنجابی، کوئی سرائیکی، کوئی پٹھان، کوئی سندھی اور کوئی بلوچی سمجھ رہا ہے اور ایک دوسرے پر تنقید اور شک کی نگاہ ڈال رہے ہیں۔ اگر نفاق کا یہی عالم رہا تو ہم کسی بڑے حادثے کا شکار ہو جائیں گے اور قائد کی روح تڑپتی رہے گی۔

مرسلہ: ابوفرحان، کوٹ ڈیجی

"بالکل، اگر ایک منٹ کی دیر کر دیں تو ایسی مرمت کرتی ہوں کہ دماغ ٹھکانے آ جاتے ہیں۔"

امی ہم سے بہت پیار کرتی تھیں لیکن ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھیں، ذرا سی کوتاہی پر سچ مچ ہماری شامت آ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بھائی امی اور ابو کی دی ہدایت سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ عصر سے لے کر مغرب تک ہمیں باہر جا کر کھیلنے کی اجازت تھی، اس کے علاوہ ہم بلاضرورت گھر سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اس وقت میں شاید بارہ سال کا تھا اور ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ احمر عمر اور جماعت میں مجھ سے ایک سال آگے تھا۔ اس لیے ہم میں چھوٹے بڑے بھائی والی بات نہیں تھی۔ آپس میں برابری کا پیار اور لڑائی ہوتی تھی۔ مزے کی بات تھی کہ ہماری لڑائیوں میں امی ابو دخل نہیں دیتے تھے، چاہے ہم ایک دوسرے کے ساتھ مار پیٹ کیوں نہ کریں۔ البتہ کوئی ایسی چوٹ لگانے کی ممانعت تھی جس سے خون نکل آئے۔

البتہ امی ایک عجیب سزا دیتی تھیں کہ لڑائی کے بعد ہم بارہ گھنٹے تک ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ آپ یقین کریں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ یہ بارہ گھنٹے گزرنے کے بعد ہمارے دلوں میں کوئی کدورت باقی رہی ہو۔ بلکہ ہم دونوں بھائی تو بات کرنے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ آج خیال آتا ہے کہ بھائیوں کی لڑائی میں اس

سے دانش مندانہ سزا ماں باپ دے ہی نہیں سکتے۔ پھر بارہ گھنٹے کی اس بندش نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم حتیٰ الامکان لڑائی سے گریز کریں۔ بہت بعد میں جب امی ابو گزر گئے اور خود ہم بھائی بچوں والے ہو گئے تو ایک بار ہماری لڑائی ہوئی اور اس کے بعد ہم بارہ گھنٹے تک ایک دوسرے سے دور رہے۔ امی نہیں تھیں لیکن ان کی تربیت ہمارے خون میں رچ بس گئی تھی اور جب یہ بارہ گھنٹے گزرے تو ہم بھائی کتنی دیر ایک دوسرے سے گلے لگ کر روتے رہے تھے۔ اس روز امی ہمیں بہت شدت سے یاد آئی تھیں۔

خیر ذکر ہو رہا تھا ماموں کا، چند دن میں بستی کے چھوٹے بڑے سب اسے ماموں کہنے لگے تھے۔ اس کی زبان میں بڑی تاثیر تھی، جس سے ایک بار بات کر لیتا وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ میں نے اسے بڑوں سے بات کرتے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ جب میں نے اسے بڑوں سے بالکل مختلف انداز میں بات کرتے دیکھا۔ جبکہ اس دن جنگل میں وہ مجھ سے بہت سیدھے انداز میں بات کر رہا تھا۔ یہاں اس کی گفتگو میں بہت ٹھہراؤ پھراؤ اور چاشنی تھی۔ حد یہ کہ بستی کی عورتیں جو غیر مردوں سے بلا ضرورت بات نہیں کرتی تھیں گلیوں میں اس سے گپ شپ کرتی نظر آتیں اور ہر عورت اس کی تعریف کرتی تھی۔ کیونکہ عورتوں سے بات کرتے ہوئے وہ نظریں جھکا کر رکھتا۔ لوگ اپنے مسئلوں کے سلسلے میں اس سے مشورہ لینے لگے تھے اور وہ ان کو ایسے مشورے دیتا جن پر عمل کرنے سے ان کے مسائل حل ہو جاتے تھے۔

لیکن وہ نہ تو کسی سے کچھ مانگتا تھا اور نہ ہی اپنے بارے میں بات کرتا تھا، اگر کوئی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا تو وہ اسے اس طرح ٹالتا کہ اگلے کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا، وہ اسے کسی اور بات میں لگا لیتا۔ اس کے سفید کوے کے بارے میں سب کو تجسس تھا۔ ہمارے علاقے میں کبھی کسی نے سفید کوے کے بارے میں سنا نہیں تھا اس لیے جاننا چاہتے تھے کہ اس نے یہ کوا کہاں سے حاصل کیا؟ ماموں اس کے بارے میں بتاتا کہ وہ اسے کہیں سے ملا تھا اس نے لے کر پال لیا۔ کوا ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ جب وہ باہر نکلتا تو کوا اس کے شانے پر ہوتا تھا لیکن وہ اسے کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ کہتا کہ بس دور سے دیکھو ہاتھ لگانے کی نہیں ہو رہی ہے۔ کوے کے معاملے میں وہ اتنا حساس تھا کہ ایک بار ہماری گلی میں رہنے والے چچا عبدل نے اس کے کوے کو چھو لیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے جیسے شعلے پھوٹنے لگے تھے۔ عبدل چچا ڈر کر پیچھے ہو گئے اور وہ خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ کوے کے معاملے میں محتاط ہو گئے تھے۔ دور دور سے دیکھتے تھے۔ پاس جانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا تھا۔

وہ دن بھر بستی کے پاس میدانوں میں گھومتا رہتا تھا۔ اس وقت اس کی پشت پر ایک تھیلا ہوتا تھا اور وہ اسی تھیلے میں نہ جانے کیا کیا جمع کر کے لاتا تھا۔ شام کے بعد وہ باہر نہیں نکلتا تھا۔ اپنی کوٹھری میں بند نہ جانے کیا کرتا تھا، کبھی کبھی اس کی کوٹھری کے پاس سے گزرنے والے لوگوں کو روشن دان سے دھواں نکلتا دکھائی دیتا تھا جس سے عجیب و غریب خوشبو یا بدبو آ رہی ہوتی تھی اور یہ کھانا بنانے کی بو نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ آگ جلا کر اس پر کچھ پکاتا یا اُبالتا تھا۔ وہ کیا کرتا تھا، کسی کو اس بارے میں علم نہیں تھا؟ میں نے بتایا نا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی کرنا چاہے تو وہ بات ٹال جاتا تھا۔

ماموں کی کوٹھری سے کچھ دور ایک بیوہ عورت رہتی تھی، اس کے شوہر کا دو سال پہلے ہی بس حادثے میں انتقال ہوا تھا اب وہ ایک فیکٹری میں کام کر کے اپنا اور اپنے اکلوتے بیٹے کا پیٹ پال رہی تھی۔ اس کا بیٹا پانچ سال کا تھا۔ ایک دن وہ کام سے آئی تو اس نے اپنے بیٹے کو گھر میں یوں بے ہوش پڑے پایا کہ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ عورت نے رونا پیٹنا مچا دیا۔ شور کی آواز سن کر سب ہی اس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے۔ اتفاق سے اس دن ماموں گھر پر تھا۔ وہ بھی شور سن کر آ گیا پھر اس نے بچے کو دیکھا تو عورت سے کہا۔ ”سنو! اگر تم اجازت دو میں اس کا علاج کروں اسے سانپ نے کاٹا ہے یہ دیکھو۔“ اس نے بچے کا پاؤں دکھایا جس پر سانپ کے کاٹنے کا نشان تھا۔ وہ بلبلا کر بولی۔

”بچاؤ.... خدا کے لیے بچاؤ میرے بچے کو۔“

”لیکن میں اسے اپنی کوٹھری میں لے جاؤں گا اور علاج کے دوران کوئی وہاں نہ آئے نہ دروازے کو بجائے سب کو سکون سے انتظار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ عورت نے جلدی سے کہا تو ماموں بچے کو اٹھا کر اپنی کوٹھری میں لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ عورت تو اس کی کوٹھری کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی اور لوگ بھی وہیں جمع ہو گئے۔ ان کو تجسس تھا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ماموں بچے کو کس طرح بچاتا ہے؟ لوگ آپس میں اس قسم کی بحث کر رہے تھے کہ بچہ بچے گا یا نہیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ ماموں کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے اور وہ بچے پر کوئی تجربہ کرنا چاہ رہا ہے لیکن بعض کا خیال تھا کہ ماموں سنیاسی ہے اور اس کے

معروف نومسلم سر عبداللہ آرکیبالڈ ہملٹن

پہلی ہی نظر میں مجھے اسلام کی دلکشی و رعنائی نے گھائل کر دیا اور پھر تو معاملہ یہ ہوا کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو دراصل اس کے پیچھے دل اور ضمیر کا پُر زور اصرار شامل تھا۔ میں پھر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس وقت سے میں اپنے آپ کو پہلے کے مقابلے میں بہتر اور سچا انسان سمجھتا ہوں۔ یہ امر اپنے اندر دلچسپی کے بہت سے پہلو رکھتا ہے کہ جاہل اور متعصب لوگ جتنا اسلام سے بدکتے ہیں کسی اور مذہب سے نہیں بدکتے لیکن کاش یہ لوگ جانتے کہ اسلام ہی وہ دین رحمت ہے جو کمزور کے لیے طاقتور سہارا اور ہر غریب کا امیر دوست ہے۔ انسانیت عموماً تین طبقوں میں بٹی ہوتی ہے ایک وہ طبقہ جو مالدار اور صاحبِ ثروت ہوتا ہے اور دوسرا وہ جسے زندگی گزارنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور تیسرا بے روزگار اور تہی دست و کنگال ہوتا ہے اور اس تیسرے طبقے کی دنیا میں غالب اکثریت ہے۔

اسلام یوں تو ان تینوں طبقوں کے لیے رحمت و برکت کا موجب ہے مگر موخر الذکر طبقے پر اس کی خاص نظرِ شفقت ہے۔ یہ شرف انسانیت کا علمبردار ہے اور فرد واحد کا بڑا احترام کرتا ہے۔ اس کا طرزِ عمل سراسر تعمیری ہے اور تخریب کا یہاں گزر نہیں مثال کے طور پر ایک ایسا زمیندار جو پہلے ہی بہت امیر ہو، اسے زمین کاشت کرنے کی ضرورت بھی نہ ہو وہ زمین کو کچھ مدت کے لیے یونہی بغیر کاشت کے چھوڑ دے تو یہ زمین سرکاری ملکیت میں چلی جاتی ہے اور اسلامی قانون کے مطابق ان لوگوں کو دے دی جاتی ہے جو اسے کاشت کرتے ہوں۔

قصہ کوتاہ یہ کہ جہاں اسلام روز مرہ زندگی میں اپنے پیروکاروں کی صاف ستھری اور روشن شاہراہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہاں آج کی نام نہاد عیسائیت نظریاتی اعتبار سے بالواسطہ طور پر عملی اعتبار سے براہِ راست اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ اتوار کا ایک دن تو وہ خدا کی عبادت (Pray) کریں اور ہفتے کے باقی دن بندگانِ خدا کی خدمت (Pray) میں معروف رہیں۔

اقتباس: میں کیوں مسلمان ہوا

مرسلہ: عائشہ جونیجو، لاڑکانہ

پاس سانپ کے کاٹے کا علاج ہوگا ورنہ وہ اتنے یقین سے بچے کا علاج کرنے کا ذمہ نہ لیتا۔ ماموں کو اندر گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ کچھ لوگ چلے گئے اور چند ایک رہ گئے البتہ عورت دروازے پر ہی بیٹھ گئی تھی۔ شاید تین گھنٹے بعد ماموں نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور بچہ اس کے ساتھ کھڑا تھا عورت نے جھپٹ کر بچے کو اٹھایا اور اسے پیار کرنے لگی۔ ماموں نے تھکی آواز میں کہا۔

”اسے لے جاؤ اور دودھ میں اصلی گھی ڈال کر دو، ایک دو دن تک پلاؤ تو زہر کے باقی اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔“

عورت نے بچے کو چھوڑا اور ماموں کے پیروں سے چمٹ گئی وہ اسے دعائیں دے رہی تھی کہ اس نے اس کے بچے کی جان بچا لی۔ ”شاہ جی میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”بہن پاؤں چھوڑ دو میں کوئی شاہ جی نہیں ہوں۔ تمہاری طرح عام سا انسان ہوں۔“

لیکن عورت اسے دعائیں دیے جا رہی تھی اور ماموں شرمندہ ہو رہا تھا۔ پھر کسی نے مجمع سے نعرہ لگایا۔ ”شاہ ماموں....“

”زندہ باد۔“ باقی سب نے مل کر جواب دیا۔

اس شام بستی کے ہر گھر کا موضوع یہی تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ماموں کے پاس ایسی کون سی دوا تھی کہ اس نے چند گھنٹے میں زہر کے شکار بچے کو ٹھیک کر دیا۔ کیونکہ چند سال پہلے ایک آدمی کو میدان سے گزرتے ہوئے کسی زہریلے سانپ نے کاٹ لیا اور اسے فوری طور پر اسپتال بھی لے جایا گیا تھا لیکن وہ دو گھنٹے کے اندر مر گیا تھا۔ لوگوں نے ماموں کو شاباش دی اور اس دن کے بعد سے وہ شاہ ماموں مشہور ہو گیا۔ اسے بستی میں آئے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا لیکن اس کی نجی زندگی کی پُراسراریت ابھی تک برقرار تھی، کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور یہاں اپنی کوٹھری میں رات بھر کیا کرتا رہتا ہے؟ جن لوگوں نے اس کی کوٹھری کی اندر سے ایک جھلک دیکھی ہوئی تھی ان کا کہنا تھا کہ اس نے وہاں عجیب و غریب چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔ جیسے چھوٹے مردہ جانور اور بڑے جانوروں کے جسمانی اعضا، اسی طرح مختلف طرح کے پودے اور جڑی بوٹیاں بھی رکھی تھیں۔ لیکن یہ جھلک بس کچھ لوگوں نے دیکھی تھیں اور ان کی باتوں پر کسی نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ شاہ ماموں سنیاسی اور عامل ہے۔

www.Paksociety.com

بہر حال اس واقعے کے بعد لوگ شاہ ماموں پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ وہ بہت سارے گھریلو مسائل کے بارے میں ٹوٹکے بھی جانتا تھا۔ پہلے مردوں کو بتایا اور بعد میں عورتیں خود اس سے پوچھنے پہنچ جاتی تھیں۔ جب عورتیں زیادہ ہی آنے لگیں تو اس نے اس کام کے لیے مغرب سے ذرا پہلے کا وقت مقرر کرلیا۔ وہ باہر سے آتا اور کوٹھری کے دروازے پر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ جس عورت کو اس سے جو پوچھنا ہوتا تھا وہیں جا کر پوچھ لیتی تھی۔ کیونکہ یہ سب کھلے عام ہوتا تھا اس لیے کسی مرد کو اعتراض بھی نہیں ہوا کہ اس کی عورت شاہ ماموں کے پاس کیوں جاتی ہے ورنہ بستی میں ایسے قدامت پرست مرد بھی تھے کہ اپنی بیوی کو کسی غیر مرد سے باتیں کرتے دیکھ لیں تو اس کی ہڈی پسلی ایک کردیں۔

لیکن شاہ ماموں کے لیے یہ خاص رعایت تھی پھر اس نے اپنے کردار سے اس بات کو ثابت بھی کیا تھا۔ ایک سال ہونے کے باوجود اس کے بارے میں کسی نے ذرا بھی شکایت نہیں کی تھی کہ اس نے کسی عورت یا لڑکی کو میلی نظر سے دیکھا ہو۔ وہ سب سے نظریں جھکا کر بات کرتا تھا اور ہر عورت اور لڑکی کو باجی کہہ کر بات کرتا تھا۔ وہ کسی کے گھر نہیں جاتا تھا چاہے کوئی کتنا ہی اصرار کیوں نہ کرے اور نہ کسی کو اپنے گھر بلاتا تھا۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا ہاں کسی گھر سے کھانے کی کوئی چیز آئے تو انکار نہیں کرتا تھا۔ ویسے اسے کھانے پینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ بستی کے اسٹاپ کے ساتھ ہی جھگی ہوٹل تھا جس میں تین وقت کا کھانا مل جاتا تھا۔ وہ وہیں جا کر کھاتا پیتا تھا۔ بستی والوں سے صرف پانی لیتا تھا۔ وہ آس پاس کے کسی گھر میں اپنے دو عدد بڑے ڈرم دے دیتا جب پانی آتا تو وہ بھر لیتے اور شام کو شاہ ماموں ڈرم اپنے گھر لے جاتا تھا۔

یوں رفتہ رفتہ شاہ ماموں کا بستی میں ایک تاثر بنتا گیا تھا اور وہ بستی کا ایک حصہ بن گیا۔ کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی اور کوئی اس سے ناخوش نہیں تھا بلکہ اکثر لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس پر اعتماد کرتے تھے کیونکہ اس نے آج تک ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی۔ اُلٹا وہ لوگوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتا تھا۔ جیسے اس نے غریب عورت کے بچے کو بچایا تھا۔ اسی طرح وہ غریب لوگ جو ڈاکٹروں کے فیس اور دوائیوں کی قیمت ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے وہ انہیں اپنے پاس سے دوائی دے دیتا۔ مگر اس کے دوائی دینے کا انداز بڑا عجیب تھا۔ وہ بیمار کو دیکھتا اور پھر اسے اپنی کوٹھری کے پاس بلا کر اپنے ہاتھ سے دوا دیتا اور اسی وقت اپنے سامنے استعمال کراتا تھا۔ وہ کسی کو دوا لے جا کر گھر میں استعمال کے لیے نہیں دیتا تھا۔ چاہے کسی عورت کو ہی کیوں نہ دوا دینی ہو۔ بے چارے غریب لوگ اس کی یہ شرط مان جاتے تھے۔ وہ اس دوا کی کوئی قیمت بھی نہیں لیتا تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ اس کی دوا کی ایک ہی خوراک سے لوگ ٹھیک ہو جاتے تھے اور انہیں دوبارہ اس کے پاس نہیں جانا پڑتا تھا۔

شاہ ماموں کسی کے گھر نہیں جاتا تھا اور نہ کوئی اس کے گھر آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ساری بستی کا شناسا بن گیا، وہ ان کا نام جانتا تھا اور ہر فرد کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے اور کس گھر میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ شروع میں بڑوں کو اس کے بارے میں تجسس رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اس پر سمجھوتا کرلیا کہ شاہ ماموں کی شخصیت ہی سب کچھ ہے، انہیں اس کے ماضی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم بچوں کو اس کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن ہم اس بارے میں ضرور متجسس رہتے تھے کہ وہ کرتا کیا ہے۔ میدان والے جنگل میں ہم نے اسے بارہا دیکھا تھا کہ وہ جھاڑیوں اور گھاس میں گھسا ہوا چیزیں تلاش کررہا ہے۔ زمین سے جڑی بوٹیاں نکال رہا ہے اور جھاڑیوں سے گرگٹ اور نیولے کی نسل کے جانور پکڑ رہا ہے۔ وہ درختوں سے نکلنے والی گوند بھی جمع کرتا تھا اور ان سب چیزوں کو اپنے تھیلے میں ڈال کر کوٹھری میں لا کر ان پر نہ جانے کیا تجربات کرتا تھا۔

ہم بچوں اور خاص طور سے مجھے اسی بات کا تجسس تھا کہ وہ کرتا کیا ہے؟ ہاں ایک بات میں بتانا بھول گیا کہ وہ مداری بھی تھا اور اسے ہاتھ کی صفائی کے بہت سارے کرتب آتے تھے۔ کبھی کبھی وہ موڈ میں ہوتا اور شام کو جلدی گھر آجاتا تو ہم بچوں کو جمع کرکے عجیب عجیب کرتب دکھاتا تھا جیسے میری جیب میں سکہ رکھ کر اسے کسی اور بچے کی جیب سے نکال لیتا۔ وہ مخصوص نشانی والا سکہ استعمال کرتا تھا اور جیب میں رکھنے کے بعد مجھے جیب پر ہاتھ بھی رکھواتا تھا سکہ پھر بھی دوسرے بچے کی جیب سے نکل آتا۔ اسی طرح کاغذ پر لکھ کر کچھ کرتا اور کاغذ پھر سے صاف ہو جاتا۔ وہ کاغذ کے پرزے پرزے کرکے کسی بچے کی ہتھیلی میں دباتا اور جب اس سے ہتھیلی کھلواتا تو اس میں سالم کاغذ ہوتا تھا۔ کبھی دھاگا توڑ کر اسے دوبارہ سے جوڑ دیتا تھا۔ ہم بچوں کو اس کے تماشوں میں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ ہم سے کہتا کہ ہم اسے پکڑنے کی کوشش کریں مگر ہم اسے پکڑ نہیں سکتے البتہ ایک بار وہ پھنس گیا تھا۔

میرے پاس ایک گیند تھی۔ اس زمانے میں ہم ربر کی بنی گیند سے کرکٹ کھیلتے تھے۔ ٹینس والی گیند اس زمانے میں بہت مہنگی پڑتی تھی۔ میری یہ گیند ٹوٹ گئی۔ اتفاق سے اسی دن شاہ ماموں کرتب دکھا رہا تھا اور اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ یہ اصلی جادو ہے۔ مجھے خیال آیا اور میں نے جیب سے ٹوٹی گیند کے دونوں ٹکڑے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''اگر تم سچ مچ جادو جانتے ہو تو اس گیند کو جوڑ دو۔''

شاہ ماموں گڑبڑا گیا۔ ''میں.... اسے جوڑ دوں۔''

''ہاں تم کہتے ہو نا کہ تم جادو جانتے ہو۔'' میں نے کہا تو دوسرے بچے بھی شور مچانے لگے کہ وہ جادو سے ہماری گیند جوڑ کر دے۔ شاہ ماموں نے محسوس کیا کہ وہ پھنس گیا ہے اور اگر اس نے گیند جوڑ کر نہیں دی تو بچوں پر اس کی جو دھاک بیٹھ چکی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''اچھا کرتب کا وقت ختم.... تم یہ گیند مجھے دے جاؤ میں کل اسے جادو سے بالکل ٹھیک کردوں گا۔''

اب ہوا یہ کہ شاہ ماموں اتفاق سے ہمارے اسکول کے پاس ہی واقع کھیلوں کے سامان کی دکان سے گیند خرید رہا تھا۔ میں نے اور محلے کے چند دوسرے بچوں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ گیند خرید کر چلا گیا۔ ہم بچے ہونے کے باوجود سمجھ گئے تھے کہ اس نے کیا چالاکی کی ہے وہ شام کو اسی گیند کو ہمیں تھما دیتا کہ یہ میری گیند ہے۔ اس وقت بچوں نے کچھ نہیں کہا کیونکہ ہم اسے گھر تک پہنچانا چاہتے تھے۔ شام کو ہم اس کی واپسی کا انتظار کررہے تھے۔ وہ میدان کی طرف سے آیا اور ہمیں کوٹھری کے باہر جمع دیکھ کر اس نے ہنس کر کہا۔ ''اتنی بے چینی.... میں نے تمہاری گیند ٹھیک کردی ہے رکو ابھی لاتا ہوں۔''

وہ کوٹھری کے اندر گیا اور گیند لے آیا۔ اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ گیند کو کسی چیز سے رگڑ کر ویسا بنانے کی کوشش کی تھی جیسی میری گیند تھی۔ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔ سوائے سالم ہونے کے یہ ہر اعتبار سے میری گیند جیسی تھی۔ لیکن وہ ایک چیز بھول گیا تھا کہ وہ جو گیند لایا تھا وہ دوسری کمپنی کی تھی اور یہ اندر سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس لیے جب اس نے گیند مجھے دی تو میں نے کہہ دیا۔ ''شاہ ماموں یہ وہ گیند نہیں ہے تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔''

''میں بے وقوف نہیں بنا رہا یہ وہی گیند ہے۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''یہ وہ گیند نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور ایک بچے سے بولا۔ ''پپو جا کر اپنے گھر سے چھری لے آؤ۔''

ہم بھاگ کر چھری لے آیا اور میں نے اسے گیند کا ربر کاٹ دیا وہ اندر سے لال نکلی تھی جب کہ میری گیند اندر سے سیاہ تھی۔ شاہ ماموں کھسیا گیا۔ ''لگتا ہے جادو کے اثر سے گیند اندر سے بدل گئی ہے۔''

''شاہ ماموں.... ہم نے خود تمہیں دکان سے یہ گیند خریدتے دیکھا ہے۔'' میرے ساتھ کھڑے لڑکے نے چلا کر کہا۔

''ہاں ہم نے بھی دیکھا تھا۔'' دوسرے لڑکے بھی چلانے لگے۔ ''شاہ ماموں تم نے دھوکا دیا ہے۔''

وہ سمجھ گیا کہ اب ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکے گا اس لیے اس نے تسلیم کرلیا کہ اس نے گیند خریدی تھی کیونکہ وہ جادو سے ہماری گیند نہیں جوڑ سکا تھا۔ پھر اس نے ہمارا منہ بند رکھنے کے لیے ہمیں مٹھائی کھلائی تھی۔ ہم بچے اس سے بہل گئے تھے۔ میں نے نہیں بتایا لیکن کچھ بچوں نے اپنے گھر میں یہ بات بتائی بھی ہوگی تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ شاہ ماموں نے لوگوں پر اپنا ایسا ہی اعتبار بٹھا رکھا تھا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے اس نے اس طرح لوگوں پر اپنا اعتبار چیک کیا تھا۔ اگر لوگ اسے بچوں کے حوالے سے کہتے تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کا اعتبار کچا پڑ گیا ہے لیکن جب کسی نے اسے کچھ نہیں کہا تو وہ سمجھ گیا کہ اب بات پکی ہے اور اس کے اصل کھیل کا وقت سامنے آگیا ہے۔

میں نے بتایا کہ شاہ ماموں نے دو سال میں جان لیا تھا کہ کس گھر کی کیا حالت ہے اور کہاں سے اسے مال مل سکتا ہے، اس نے ان گھروں کی عورتوں کو تاڑا۔ وہ ان کے چھوٹے موٹے مسائل حل کرتا تھا اور جواب میں کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کرتا تھا۔ یہ عورتیں اس پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھیں۔ یہ بستی کے ایسے گھر تھے جو نسبتاً کھاتے پیتے تھے اور یہاں عورتوں کے پاس زیور کی شکل میں سونا تھا۔ وہ بہت سستا زمانہ تھا اور غریب سے غریب عورت کے پاس بھی سونے کی کوئی نہ کوئی چیز ہوتی تھی چاہے وہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو۔ ان عورتوں کے پاس زیادہ سونا تھا۔ شاہ ماموں نے نہ جانے کس طرح ان سے الگ الگ بات کی اور انہیں اپنے ڈھب پر لے آیا۔ اس نے انہیں جھانسا دیا کہ وہ کیمیا گر ہے سونا بنا رہا ہے لیکن اسے ایک سیر سونا بنانے کے لیے پانچ تولے اصل سونا بھی درکار ہے۔ اگر کوئی اس کے ساتھ سونا ملائے تو اسے آدھا سونا دے گا۔

نصف سیر سونے کا لالچ ایسا تھا کہ اسے نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ پانچ تولے لگا کر پچاس تولے حاصل کیے

جاسکتے تھے اور وہ بھی بنا کوئی قیمت دیے۔ شاہ ماموں نے رازداری کی شرط لگائی تھی۔ عورتیں اس کے دھوکے میں آگئیں اور بستی کی دس مختلف عورتوں نے اسے کم وبیش چالیس تولے سونے کے زیوارت دیدیے۔ کچھ عورتوں کے پاس کم سونا تھا تو شاہ ماموں نے اسے بھی نہیں چھوڑا اس نے کہا کہ وہ باقی اپنے پاس سے ملا لے گا۔ بچے تو نہیں جانتے تھے لیکن بڑوں کو شبہ تھا کہ شاہ ماموں کیمیا گر ہے۔ یہ بات عورتیں بھی جانتی تھیں اس لیے جب اس نے کیمیا گر ہونے کا دعویٰ کیا تو انہوں نے مان لیا۔ انہیں مزید پکا کرنے کے لیے شاہ ماموں نے انہیں میر سونے کی تیار اینٹ بھی دکھائی جس کا سونا کچا تھا۔ اسے خالص بنانے کے لیے اسے پانچ تولے خالص سونا درکار تھا۔ جس دن اس نے آخری عورت سے بھی اس کے زیور وصول کیے اس سے اگلی صبح اس کی کوٹھری خالی پڑی تھی اور اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ عقب سے دیوار میں سوراخ کرکے فرار ہوا تھا کہ کوئی اس کی نگرانی بھی کررہا ہوتا تو نہ دیکھ سکتا۔ صبح سے پہلے کسی کو نہیں پتا چل سکا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔

شاہ ماموں نے مختلف عورتوں سے زیور اس طرح حاصل کیا تھا کہ ان کو سونا تیار ہونے کی مدت ایک ہفتہ بتائی تھی اور اس صبح ایک ہفتہ پورا ہونے والا تھا اور جس نئی دلہن نے اپنا سارا زیور شاہ ماموں کو دیا تھا وہ صبح ہی اس کی کوٹھری پر پہنچ گئی۔ خاص بات یہ تھی کہ ان عورتوں کو سونے کی تیاری کا یقین دلانے کے لیے اس نے دن میں میدان کی طرف جانا بند کردیا تھا۔ وہ دن رات گھر میں ہی ہوتا تھا۔ اس لیے جن عورتوں نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر سونا دیا تھا اب وہ بے تابی سے واپسی کی منتظر تھیں۔ سب سے پہلے نئی دلہن پہنچی تھی اور اس نے شاہ ماموں کا دروازہ بجایا لیکن وہ اندر ہوتا تو کوئی جواب دیتا۔ کچھ دیر بعد اس عورت نے شور بھی مچانا شروع کیا اور پھر دہائیاں دینا شروع کردیں۔ ایک گھنٹے کے اندر مزید کئی خواتین اس کے واویلے میں شامل ہوگئی تھیں۔ اس سے ان کا لٹا سونا واپس نہیں ملا تھا لیکن بستی میں سب کو پتا چل گیا۔ لوگوں نے کوٹھری کا دروازہ توڑ دیا اور تب پتا چلا کہ پچھلی دیوار میں سوراخ ہے اور شاہ ماموں اسی سوراخ سے سونے اور اپنے سامان سمیت فرار ہوا تھا۔ اس نے کوٹھری میں جو عجیب وغریب چیزیں جمع کررکھی تھیں اب ان میں سے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

دوپہر میں ہم بچے اسکول سے آئے اور ہمیں شاہ ماموں کے فراڈ کا پتا چلا تو ہم کشاں کشاں اس کی کوٹھری پہنچ گئے۔ کوٹھری اب خالی تھی اگر کچھ سامان تھا تو وہ کوئی لے گیا تھا۔ ہم بچے بھی کوٹھری میں گھس گئے۔ میری نظر فرش پر پڑے ایک چھوٹے سے سفید چیز پر پڑی۔ میں نے اسے اُٹھالیا یہ پرندے کا پَر تھا اور شاہ ماموں کے پاس صرف ایک سفید کوا تھا یہ اسی کا پَر ہوسکتا تھا۔ میں دوسرے بچوں سے نظر بچا کر باہر آگیا ورنہ کسی دوسرے کو پتا چل جاتا تو وہ اسے مجھ سے چھین بھی سکتا تھا۔ باہر آکر میں نے تیز دھوپ میں پَر کا معائنہ کیا تو مجھے لگا جیسے پَر سے سفید رنگ سا اُتر رہا ہے اور اس کے نیچے کالا رنگ ہے۔ میں نے تھوک لگا کر پَر رگڑا تو فوراً اس کا اصل کالا رنگ سامنے آگیا۔ میں حیران رہ گیا۔ شاہ ماموں کا کوا سیاہ تھا لیکن وہ اسے سفید کرکے دکھاتا تھا۔ وہ ہر چیز سے دوسروں کو بے وقوف بناتا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا تھا لیکن یہ بات آج بھی مجھے یاد ہے۔

جن کی عورتوں کا سونا گیا تھا ان کے گھر والوں نے مشتعل ہوکر اس کوٹھری کے مالک کو پکڑا جو ایک نزدیکی آبادی میں چوکیدار تھا۔ اس نے کہا کہ اسے نہیں معلوم کہ شاہ ماموں کہاں ہے وہ اسے بس اتنا جانتا ہے جتنا بستی کے دوسرے لوگ جانتے ہیں۔ مگر لوگ نہیں مانے اپنے نقصان کا مطالبہ کرنے لگے۔ معاملہ تھانے تک گیا اور پولیس چوکیدار کو لے گئی لیکن کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ دیا۔ اس دوران میں لوگوں کو بھی اپنے نقصان پر صبر آگیا تھا۔ چوکیدار بھی اپنی کوٹھری بیچ کر نو دو گیارہ ہوگیا۔ اب کسے پکڑتے۔ اس لیے تھانے اور بستی میں کیس داخل دفتر کردیا گیا تھانے میں ویسے ایف آئی آر نہیں کٹی تھی۔

کتنے ہی عرصے تک شاہ ماموں اور اس کی چالاکی کا ذکر ہوتا رہا کس طرح اس نے ہم پر اپنا اعتماد قائم کیا اور جب اس کے اعتبار کا سکہ پوری طرح جم گیا تو اس نے سونا بنانے کا جھانسا دے کر بستی کی عورتوں کو بے وقوف بنایا اور ان کے زیور لوٹ کر چلتا بنا۔ اس کا دھندہ یہی ہوگا۔ کہیں جاتا ہوگا۔ ایک دو سال میں اسی طرح اپنا سکہ جماتا ہوگا اور جب موقع دیکھتا تو کام کرکے نکل جاتا۔ دو سال میں چالیس تولے سونا بُرا نہیں تھا آج کے حساب سے اسے کوئی بیس بائیس لاکھ کی رقم سمجھیں جو بہت بڑی نہیں ہے لیکن کچھ کم بھی نہیں ہے، ایک آدمی چاہے تو اس میں خاصے آرام سے زندگی بسر کرسکتا ہے۔ ممکن ہے شاہ ماموں نے دس بارہ جگہوں پر فراڈ سے اتنا سونا جمع کرلیا ہو اور اب عیش وآرام سے اپنی زندگی کے آخری دن بسر کررہا ہو۔ آج کل تو اس جیسے دھوکے بازوں کے لیے حالات اور بھی سازگار ہیں۔

جب اماں

بخدمت مدیرہ اعلیٰ صاحبہ

السلام علیکم!

انسان پوری دنیا سے لڑسکتا ہے مگر قسمت کے آگے ہار جاتا ہے۔ میں بھی قسمت سے لڑرہا ہوں جب تک میری آپ بیتی آپ تک پہنچے گی، میں پاکستان سے بہت دور جاچکا ہوں گا ویسے یہ بھی بتادوں اس آپ بیتی میں جگہ اور مقام میں نے بدل دیے ہیں کیونکہ مجھے اپنے دشمنوں کا خوف ہے۔

فراز خان

(نوشکی)

یہ پانچ سال پُرانی رات کی بات ہے لیکن آج بھی مجھے اور نیہا کو لگتا ہے جیسے یہ کل رات کی بات ہو۔ اس رات کی بات جسے ہم پانچ سال سے اپنے سینے میں دبائے بیٹھے ہیں۔ کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن آج میں اسے قلم کے سپرد کررہا ہوں۔ میں جگہ کا نام نہیں لکھوں گا اور نہ اپنا اور نیہا کا درست نام بتاؤں گا کیونکہ میری اور نیہا کی جان کے دشمن آج بھی اسی سرگرمی سے ہماری تلاش میں ہیں جتنے کہ آج سے پانچ سال پہلے تھے۔ میں آج بھی اپنے لیے ان کی خوں آشامی اسی طرح محسوس کرتا ہوں جیسے پانچ سال پہلے کرتا تھا۔ میں نے ملک سکندر کو دیکھ لیا تھا۔ یہ اتفاق تھا لیکن اسے دیکھ لینے کے بعد ہمارا وہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔

اس رات جب میں گاؤں سے چوری چھپے نکلا تو دو دن پہلے میرا گریجویشن کا رزلٹ آیا تھا اور میں نے فرسٹ کلاس پوزیشن لی تھی۔ مگر اس رات نے مجھے ایک عام سے نوجوان اور طالب علم سے قاتل اور مفرور بنادیا۔ میرا خاندان گاؤں ملک آباد کا ایک عام سا خاندان تھا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس گاؤں میں سارے ہی ملک رہتے تھے۔ ہماری ذات ایک تھی لیکن حیثیتوں میں فرق تھا۔ ملک سکندر گاؤں کا امیر ترین آدمی تھا اس لیے ایک طرح سے وہی گاؤں کا نمبردار تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی دولت مند گھرانے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی ملک سکندر کی حیثیت کا نہیں تھا۔ میرے والد کے پاس دس ایکڑ زمین تھی اور اسی میں ہماری گزر بسر ہوتی تھی۔ والد صاحب سہیل ملک پڑھے لکھے تھے۔ انہوں نے

www.paksociety.com

اپنی زمینوں کو بہت اچھی طرح استعمال کیا تھا اور اس کی آمدنی سے حاصل ہونے والی رقم کو اُڑانے کی بجائے صحیح سے استعمال کیا تھا۔ ہمارا مکان بڑا تو نہیں تھا لیکن ملک آباد کے چند خوب صورت مکانوں میں سے ایک تھا۔ اباجی اپنی آمدنی سے گاؤں میں ایک اسکول بھی چلا رہے تھے جہاں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اباجی اکیلے نہیں تھے، ان کے ساتھ چند اور مخیر حضرات بھی تھے لیکن سب سے زیادہ حصہ اباجی کا تھا۔ اس وجہ سے اباجی کی گاؤں میں عزت تھی اور لوگ اپنے تنازعات اور دوسرے مسائل لے کر اباجی کے پاس آتے تھے اور وہ انہیں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

میں ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ میرے علاوہ تین بہن بھائی اور ہوئے تھے لیکن وہ بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ میں واحد بچا تھا۔ مگر مجھے اکلوتی اولاد ہونے کا وہ فائدہ نہیں تھا جو عام طور سے اکلوتی اولاد حاصل کر لیتی ہیں۔ ماں جی اور اباجی مجھ سے پیار بہت کرتے تھے۔ لیکن میری تربیت کے معاملے میں سخت تھے۔ خاص طور سے اباجی ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے اور میری کسی غلطی پر مجھے سزا ضرور ملتی تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ماں جی میری حمایت کی کوشش کرتیں تو ان کو بھی ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ اباجی کا کہنا تھا کہ ماں باپ سختی کر لیں یہ زیادہ بہتر ہے کہ زمانہ سختی کرے۔ کیونکہ ماں باپ بچے کی بہتری چاہتے ہیں اس لیے سزا دے کر وہ پھر پیار بھی کرتے ہیں کہ لوگ سزا ضرور دیتے ہیں اور پھر دھتکار دیتے ہیں۔

مجھے پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا جب کہ گاؤں میں عام طور سے سات آٹھ سال کے بچوں کو اسکول میں داخل کرایا جاتا تھا۔ پانچویں تک میں نے گاؤں کے اسکول میں پڑھا اور اس کے بعد مجھے ایک نزدیکی مڈل اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جو بعد میں سیکنڈری ہو گیا تھا اور یہیں سے میں نے میٹرک کیا۔ کیونکہ آس پاس کہیں کالج نہیں تھا اس لیے مجھے نزدیکی شہر کے کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ میں ہاسٹل میں رہتا تھا اور چھٹیوں میں گھر واپس جاتا تھا۔ ان دنوں میں گریجویشن کے پہلے سال میں تھا جب گرمیوں کی چھٹی میں گاؤں آنے پر مجھے اپنے کزن شاہد سے پتا چلا کہ اباجی کا ملک سکندر سے کسی بات پر تنازعہ چل رہا ہے۔

میں جانتا تھا کہ ملک سکندر کی اباجی کی زمین پر نظر تھی اور وہ کئی بار اباجی کو پیشکش کر چکا تھا کہ وہ زمین اسے فروخت کر دیں لیکن اباجی نے ہر بار انکار کر دیا۔ یہ زمین کئی نسلوں سے ہمارے پاس چلی آ رہی تھی۔ اباجی نے اسے بہتر بنایا تھا اور اب گاؤں میں کسی کی زمین ہماری زمین سے زیادہ زرخیز نہیں تھی۔ شاید اسی لیے ملک سکندر کی اس پر نظر تھی۔ مگر اس کی نظر بھی وجہ تنازعہ نہیں بنی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے اور اباجی کے رشتے میں تلخی آئی تھی۔ ملک سکندر اباجی کے دور کے ماموں کا بیٹا تھا۔ اس کے پاس دو مربع سے زیادہ زمین تھی اور گاؤں میں سب سے بڑا مکان بھی اسی کا تھا۔ ملک سکندر خود بھی معمولی پڑھا لکھا تھا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی اسکول کی حد تک پڑھایا تھا۔ سات آٹھ جماعتیں پڑھ کر انہوں نے خود اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ زمینیں سنبھالتے تھے۔

میں نے اباجی سے نہیں پوچھا اور اپنے طور پر تحقیق کی۔ جلد مجھے علم ہو گیا کہ معاملہ ایک رشتے کا تھا۔ ملک سکندر نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے ایک مشترکہ رشتے دار کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ لوگ بھی کھاتے پیتے تھے اور ملک سکندر کے بیٹے کی آوارگی سے بہ خوبی واقف تھے اس لیے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ملک سکندر چراغ پا ہو گیا اور اس نے پنچائیت بلا لی۔ وہاں اتفاق رائے سے اباجی کو معاملہ سونپ دیا گیا اور انہوں نے لڑکی والوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انہوں نے کہا کیونکہ رشتہ دینا یا نہ دینا لڑکی والوں کا حق ہے اس لیے وہ اپنی مرضی کے مختار ہیں۔ ظاہر ہے ملک سکندر کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ یہ بات کچھ عرصے میں ختم ہو جائے گی۔ بے شک گاؤں میں خونریز دشمنیاں بھی ہوتی تھیں لیکن ان میں دونوں فریق ہی جاہل اور گرم مزاج ہوتے تھے۔ اباجی پڑھے لکھے اور نرم مزاج کے آدمی تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ کبھی نوبت اس حد تک نہیں آئے گی۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ دوسری طرف جہالت تھی، وہ کوئی بھی گل کھلا سکتی تھی۔ پہلے سال کے پرچے ہوئے اور میں گاؤں واپس آیا تو میں نے پہلی بار بابا کو پریشان دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا تو وہ ٹال گئے تھے۔ لیکن مجھے دوسروں سے سن گن مل گئی تھی کہ ملک سکندر اباجی کو تنگ کر رہا تھا۔ اس کی زمینیں ہماری زمینوں سے ملی ہوئی تھیں اور کبھی اس کے جانور ہماری زمینوں میں گھس آتے تھے اور کبھی اس کے آدمی ہمارا پانی کاٹ دیتے تھے۔ اباجی جھگڑا کرنے کے بجائے معاملہ پنچائیت میں لے جاتے تھے جہاں صلح صفائی کرا دی جاتی تھی۔ مگر کچھ دن بعد وہ دوبارہ کوئی نیا جھگڑا کھڑا کر دیتا تھا۔ اباجی نقصان بھی اُٹھا رہے تھے اور ان کا بہت سارا وقت ان فضول باتوں میں ضائع ہو جاتا تھا۔ وہ زمین پر خود کام کرتے تھے اس طرح اسکول میں بھی پڑھاتے تھے۔ ان کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا تھا۔ کم سے کم میں نے کبھی انہیں فارغ بیٹھے یا صرف آرام اور گپ شپ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس بارے میں اباجی سے بات کی تو وہ بولے۔ ”فراز پتر تو اس بارے میں نہ سوچ، ابھی ساری توجہ اپنی تعلیم پر دے۔ یہ تیرا گریجویشن کا آخری سال ہے۔ میری خواہش ہے تو بہت سارا پڑھے۔“

”پر اباجی آپ کی پریشانی میری بھی تو ہے۔“

”پتر جی ابھی میں دیکھ رہا ہوں، جب تمہاری ضرورت پڑے گی تو میں تمہیں کہہ دوں گا۔ ابھی اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“

اباجی کے حکم پر میں مجبوراً اس معاملے سے دور رہا۔ حالانکہ میرے کزن اور دوست اکسا رہے تھے کہ مجھے بھی دخل دینا چاہیے اور اگر کوئی جھگڑے والی بات ہوئی تو وہ میرا ساتھ دیں گے۔ میری چھٹیاں بھی اتنی نہیں تھیں۔ میں جلد گاؤں سے چلا گیا۔ اس زمانے میں موبائل فون عام نہیں ہوا تھا خاص طور سے گاؤں دیہات میں یہ سہولت نہیں پہنچی تھی۔ بلکہ ملک آباد میں تو لائن والے فون بھی بہت کم تھے اس لیے باہر خبریں کم پہنچتی تھیں۔ آخری سال جب میں گرمیوں کی طویل چھٹیوں میں گھر آیا تو اباجی نے بہانے سے مجھے سیر و تفریح کے لیے شمالی علاقے بھیج دیا۔ اس دوران میں جھگڑا شدت اختیار کر گیا تھا اور ملک سکندر اور اس کے بیٹوں نے اباجی کو دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں اور یہ دھمکیاں میرے حوالے سے تھیں۔ میں اباجی کی ایک ہی اولاد تھا اور وہ میرے معاملے میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے اس لیے گھر آنے کے چند دن بعد ہی انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا۔ اتفاق سے کالج کے دوستوں نے پروگرام بھی بنایا ہوا تھا کہ آخری امتحان سے پہلے ہم گھومنے پھرنے جائیں گے۔

میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا اور اس دوران میں ہم ملک کے کئی حصوں میں گئے۔ جب میں واپس گاؤں آیا تو کالج کھلنے میں چند دن رہ گئے تھے۔ اس لیے مجھے حالات کا زیادہ اندازہ نہیں ہوا پھر ماں جی اور اباجی مجھے گھر سے باہر نکلنے بھی نہیں دیتے تھے۔ میری غیر موجودگی اور لاعلمی میں جس چیز نے اباجی اور ملک سکندر کے درمیان اختلاف کو شدت دی تھی وہ میرا اور نیہا کے رشتے کی بات تھی۔ نیہا وہی لڑکی تھی جس سے شادی کے لیے ملک سکندر نے اپنے بڑے لڑکے اعظم کا رشتہ ڈالا تھا لیکن نیہا کے گھر والوں نے انکار کر دیا تھا۔ ماں جی کو نیہا پسند تھی اور انہوں نے اباجی سے کہا کہ وہ نیہا کا رشتہ میرے لیے مانگ لیں۔ اباجی راضی ہو گئے۔ ویسے بھی نیہا کے باپ ملک اللہ وسایا سے ان کی دوستی تھی۔ جن دنوں میں گریجویشن فائنل کے پیپرز دے رہا تھا۔ ماں جی اور اباجی نیہا کے گھر گئے اور میرا رشتہ ڈال آئے۔ میرے گھر آنے سے پہلے نیہا کے گھر سے اثبات میں جواب آ گیا اور طے پایا کہ میری واپسی کے بعد باقاعدہ رسم کی جائے گی۔ اسے منگنی تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس سے ملتی جلتی رسم کہہ لیں۔

مجھے اس بارے میں سرے سے علم نہیں تھا۔ میں جب پیپرز دے کر واپس آیا تو ماں جی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میرا اور نیہا کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے نیہا کو نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے ماں باپ نے میرے لیے بہترین لڑکی تلاش کی ہو گی۔ نیہا کو میں نے ایک دو بار سرسری سا دیکھا تھا لیکن مجھے یاد تھا وہ اچھے نقوش کی خوب صورت لڑکی تھی۔ میں خوش تھا کہ نیہا میری بیوی بنے گی۔ اباجی چاہتے تھے کہ میں آگے ماسٹر میں داخلہ لوں اور اس سے پہلے وہ یہاں میرا اور نیہا کا نکاح پڑھوا دیں۔ رخصتی بعد میں ہو گی۔ اتفاق سے نیہا بھی میری طرح اکلوتی تھی۔

میرے آنے کے بعد ماں جی اور اباجی نے باقاعدہ رسم کی اور نیہا اور میرے رشتے کا اعلان ہو گیا۔ اس اعلان نے جہاں بہت سے لوگوں کو خوش کیا وہیں ملک سکندر اور اس کے بیٹوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ خاص طور سے اعظم آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے سرِعام قسم کھائی کہ وہ نیہا کو کسی اور کی نہیں ہونے دے گا۔ یہ بات ہمارے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ اس پر اباجی نے ملک سکندر کو پیغام بھجوایا کہ نیہا اب ہماری عزت ہے اور وہ اپنے لڑکے کو منع کرے کہ وہ اس کے بارے میں بات نہ کرے۔ ملک سکندر نے اس پیغام کا جواب دیا کہ اب بات تو بڑھے گی۔ اباجی فکرمند ہو گئے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”پتر لگتا ہے یہ لوگ فساد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”اگر وہ فساد کرتے ہیں تو کرنے دیں، ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔“

”نہیں پتر وہ جاہل لوگ ہیں پر ہم تو پڑھے لکھے ہیں۔ لڑائی جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو ایسا کر اپنا نتیجہ آتے ہی شہر چلا جا اور آگے یونیورسٹی میں داخلہ لے لے۔ یہاں کے معاملات میں دیکھتا رہوں گا۔“

خود میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ رزلٹ آتے ہی میں

www.Paksociety.com

یونیورسٹی میں داخلے کے لیے شہر چلا جاؤں گا۔ کیونکہ تاخیر کی صورت میں داخلہ نکل سکتا تھا اور مجھے مزید چھ مہینے تک انتظار کرنا پڑتا۔ مگر میرے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ میرا رزلٹ آگیا اور میں نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اباجی اور ماں جی خوشی سے نہال تھے کیونکہ ہمارے گاؤں میں آج تک کسی نے اتنے اچھے گریڈ کے ساتھ گریجویشن نہیں کیا تھا۔ میری ساس اور سسر ملک اللہ وسایا مبارک باد دینے آئے۔ شام کو میرے دوست اور کزن چلے آئے اور وہ مجھے لے کر باہر نکل گئے۔ انہوں نے مجھے گاؤں میں گھمایا۔ کسی نے شرارت میں ایک ڈھول والے کا بھی بندوبست کرلیا تھا وہ ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے ڈھول بجا رہا تھا۔ جب یہ قافلہ ملک سکندر کی حویلی کے پاس سے گزرنے لگا تو اندر سے اس کے لڑکے اعظم اور معظم اپنے نوکروں کے ساتھ نکل آئے۔

"یہ کیا کنجر پن ہے۔" معظم نے بدتمیزی سے کہا۔

"وہی جو تم لوگ بھی اپنی خوشی پر کرتے ہو۔" میرے ایک کزن نے فوراً جواب دیا۔ اس پر جھگڑا ہو جاتا لیکن کچھ بڑے درمیان میں آگئے اور سمجھا بجھا کر نوجوان کو پیچھے ہونے پر مجبور کیا۔ سب بدمزگی کے ساتھ واپس آئے تھے۔ میں نے اباجی کو بتایا تو وہ پریشان ہوگئے انہوں نے غصے سے کہا۔

"تم لڑکوں میں عقل نہیں ہے کیا ضرورت تھی ان کے گھر کے سامنے جانے کی۔"

"اباجی ان کا گھر گاؤں میں ہے کوئی الگ تو نہیں ہے کہ اس کے سامنے بھی کوئی نہیں جاسکے۔"

"پتر یہ کمینے لوگ ہیں ان کے منہ لگنا ٹھیک نہیں ہے۔"

دو دن بعد اباجی نے میرے رزلٹ کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ دعوت دوپہر کی تھی۔ گاؤں میں عام طور سے تمام ہی دعوتیں دن میں ہوتی ہیں۔ خاص طور سے سردیوں کے دنوں میں دعوت دن میں ہی رکھی جاتی ہے۔ ان دنوں بھی موسم سرد ہی تھا۔ شام تک سب لوگوں کو کھانا کھلا کر فارغ کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں زمین پر گندم کی فصل خاصی اونچی ہوگئی تھی اور اباجی اکثر رات کو بھی زمین پر چلے جاتے تھے۔ میں تھک گیا تھا۔ اس لیے جلدی سونے چلا گیا لیکن اباجی تھکے ہونے کے باوجود زمین پر چلے گئے۔ آدھی رات کے قریب ماں جی نے مجھے اُٹھایا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھیں۔

"پتر دیکھ تیرے اباجی نہیں آئے ہیں اور زمینوں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔"

اباجی امن پسند آدمی تھے لیکن گاؤں کی روایت کے مطابق اسلحہ ہمارے گھر میں بھی تھا۔ ایک رائفل اور ایک پستول ہمارے پاس تھا اور دونوں کا لائسنس بھی تھا۔ میں نے دونوں ہتھیار اُٹھا لیے۔ ماں جی مزید گھبرا گئیں۔ "پتر بندوق کیوں لے جا رہا ہے؟"

"احتیاط کے لیے ماں جی۔" میں نے کہا۔ "آپ صغراں کو اُٹھا لیں میں باہر سے آتا ہوں۔"

صغراں ہماری پُرانی ملازمہ تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ تھی اور اس نے اباجی کو گودوں کھلایا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اس لیے وہ رہتی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ میں باہر نکلا۔ سردی اور نصف رات کی وجہ سے گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی زمین کے پاس پہنچا، وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ پورا چاند تھا اور دور تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فصل ابھی اتنی اونچی نہیں ہوئی تھی جس میں بندہ نظر نہ آتا۔ فائرنگ کی آواز ماں جی نے سنی تھی اور جب انہوں نے مجھے جگایا تو اس کے بعد سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ لیکن مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ ہماری زمینوں پر ایک چھوٹا سا ڈیرہ بنا ہوا تھا۔ فصل کے دنوں میں وہاں فصل ذخیرہ کی جاتی تھی ورنہ خالی پڑا رہتا تھا۔ اباجی نے وہاں چارپائیاں ڈلوا رکھی تھیں۔ جن پر زمینوں کی رکھوالی کرنے والے یا کام کرنے والے رات کو سو جاتے تھے۔

میں ڈیرے کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر وہاں مجھے تاریکی نظر آئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اباجی نہ سہی وہاں زمین کے رکھوالے کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ڈیرے کے دروازے پر جاکر رکھوالے کو آواز دی۔ "ظہیر.... کہاں ہو؟"

مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں اندر جانے لگا تو کسی سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ کوئی انسان تھا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا تو میرا ہاتھ چپچپا ہوگیا تھا۔ میں دہشت سے سن رہ گیا تھا کیونکہ بو بتا رہی تھی کہ یہ خون تھا۔ بڑی مشکل سے کانپتے ہوئے میں نے تلاش کر کے لالٹین جلائی اور جب روشنی ہوئی تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سامنے اباجی چت پڑے تھے میں ان سے ٹکرا کر گرا تھا۔ ان کے سینے میں سوراخ تھا اور اس سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ میں بے تاب ہو کر آگے آیا۔ اباجی کو ہلایا ان کو جھنجوڑ ڈالا لیکن ان کا جسم روح سے خالی رہ گیا تھا۔ وہ جواب کہاں سے دیتے۔ میں دھاڑیں مار کر رونے لگا تھا۔ میں اباجی کو رو رہا تھا کہ کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ آواز چارپائی کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ یہ ظہیر تھا اس وقت تک میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی شدید زخمی تھا۔ دو

گولیاں اس کے پیٹ اور گردن سے ذرا نیچے دائیں شانے پر لگی تھیں۔ وہ ہوش میں آکر کراہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے مٹکے سے پانی لا کر اس کے منہ میں ڈالا۔

"ظہیر ہوش میں آؤ۔"

"فراز بھائی۔" اس نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "وہ آئے.... مجھے اور ملک صاحب... کو گولی ماردی۔"

"کون ظہیر نام بتاؤ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"ملک سکندر.... اس کے لڑکے..... اور دو بندے اور تھے۔"

میرا خیال تھا کہ تعلیم اور شہر کے ماحول نے مجھے سرد مزاج اور امن پسند بنا دیا ہے لیکن اس وقت میری ایسی حالت تھی کہ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اُڑ کر اپنے اباجی کے قاتلوں تک پہنچ جاؤں اور اپنے دانتوں سے انہیں اُدھیڑ کر رکھ دوں۔ مجھے بتاتے بتاتے ظہیر کی حالت بھی خراب ہونے لگی اور پھر اس نے بھی دم توڑ دیا۔ لالٹین کی روشنی میں پتا چل رہا تھا کہ ملک سکندر اور اس کے بیٹے صرف اباجی کو قتل کرنے آئے تھے۔ انہوں نے یک دم خاصی فائرنگ کی تھی کیونکہ گولیوں کے نشانات دیواروں پر بھی تھے۔ اپنا کام کر کے وہ فوراً واپس چلے گئے تھے کہ اس سے پہلے کوئی انہیں دیکھتا اور ان کا نام آتا۔ میں بپھر کر ڈیرے سے نکلا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا گاؤں کی طرف جا رہا تھا کہ ایک بار پھر فائرنگ ہوئی اور اس بار یہ گاؤں کے دوسرے سرے کی طرف ہوئی تھی۔ پہلی فائرنگ کے جواب میں کوئی گھر سے نہیں نکلا تھا۔ حالانکہ سنی سب نے ہوگی لیکن کسی نے گھر سے نکلنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اچانک مجھے خطرہ محسوس ہوا اور میں نے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ اس بار جس طرف سے فائرنگ کی آواز آئی تھی۔ وہاں نیہا کا گھر تھا۔ ملک اللہ وسایا کا مکان دوسرے مکانوں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ میں گلیوں میں گھسنے کے بجائے باہر سے ہوتا ہوا نیہا کے گھر تک پہنچا۔ یہاں بھی مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہاں بھی کچھ ہو چکا ہے۔ شاید ملک سکندر اور اس کے بیٹوں نے اس گھر کے مکینوں کو بھی موت کی نیند سلا دیا۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر گھستے ہی میرے خدشے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ مکان کا پہلا کمرا کھلا ہوا تھا اور اس میں ملک اللہ وسایا اور چاچی کی لاشیں پڑی تھیں۔ نیہا مجھے دکھائی نہیں دی میں اسے آوازیں دیتا ہوا پورے گھر میں پھرتا رہا اور وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ گھر کے نوکر بھی غائب تھے۔ ملک اللہ وسایا ہمارے مقابلے میں زیادہ کھاتا پیتا زمیندار تھا اور اس کے گھر میں تین چار نوکر کام کرتے تھے۔ لیکن اب وہاں ایک فرد بھی نہیں تھا۔ لاشیں صرف ملک اللہ وسایا اور چاچی کی تھیں۔ یہ کام بھی ملک سکندر اور اس کے بیٹوں کا تھا۔ وہی نیہا کو لے گئے تھے۔ نیہا کو لے جا کر انہوں نے میری غیرت کو بھی للکارا تھا۔ میں ابھی مکان کے اندر ہی تھا کہ اچانک سامنے کی طرف سے شور بلند ہوا۔ باہر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ میں باہر آیا تو کوئی ایک درجن لوگ مکان کے سامنے جمع ہو چکے تھے۔ مجھے مسلح دیکھ کر وہ جھجکے پھر ایک معمر آدمی آگے آیا۔

"فراز پتر کی گل اے۔"

"کسی نے فائرنگ کر کے چاچا اور چاچی کو قتل کر دیا ہے۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا لیکن میری آواز بھرا گئی تھی۔ "یہ ملک سکندر اور اس کے بیٹوں کا کام ہے انہوں نے میرے اباجی کو بھی مار دیا ہے۔ ان کی لاش ڈیرے میں پڑی ہے۔"

یہ سنتے ہی وہاں سنسنی پھیل گئی تھی۔ "قتل... اوئے ایہہ کی ہویا۔"

"وہ میری منگیتر نیہا کو بھی اُٹھا کر لے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کوئی پولیس میں رپورٹ کرے جاکر۔"

میں گھر کی طرف روانہ ہوا۔ پہلے میں ماں جی کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں نیہا کے لیے ملک سکندر کے ٹھکانوں کا رُخ کرتا۔ اس کے دو ہی ٹھکانے تھے جہاں وہ نیہا کو لے جا سکتے تھے ایک ملک سکندر کی حویلی اور دوسرے زمینوں پر اس کا ڈیرہ۔ امکان یہی تھا کہ وہ نیہا کو ڈیرے پر لے گئے ہوں گے۔ یہ جگہ ویسے بھی ان باپ بیٹوں نے عیاشی کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ وہاں بدنام عورتیں آتی تھیں اور مجرے ہوتے تھے۔ گھر آتے آتے میں خود پر خاصی حد تک قابو پا چکا تھا لیکن جب ماں جی نے پوچھا۔

"فراز تیرے اباجی کہاں ہیں؟"

تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ماں جی میرے انداز سے سمجھ گئی تھیں۔ وہ لرزتی آواز میں بولیں۔ "پتر کی گل اے خیر تے ہے؟"

"ماں جی اباجی کو ملک سکندر اور اس کے بیٹوں نے قتل کر دیا ہے۔" میں نے روتے ہوئے کہا تو ماں جی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر وہ تیورا کر نیچے گری تھیں۔ میں نے جلدی سے انہیں اُٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ صغراں بھاگ کر پانی لائی۔ وہ بھی اباجی کے بارے میں سن کر دھاڑیں مارنے لگی تھی۔ میں نے ماں جی کے منہ پر پانی چھڑکا اور پھر انہیں پانی

بلانا چاہا تو پانی ان کے منہ میں جانے کے بجائے بہہ گیا تھا۔ ایک خدشے کے ساتھ میں نے ماں جی کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھنا چاہی لیکن دونوں ہی ساکت تھیں۔ یہ خبر سنتے ہی ماں جی کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا اور جسے میں بے ہوشی سمجھ رہا تھا وہ ان کی دائمی نیند تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا اس لیے میں بار بار ماں جی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں اور ابھی میری آنکھ کھلے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر یہ خواب نہیں سچ تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر میری دنیا اُجڑ گئی تھی۔ ماں باپ کے ساتھ میں اپنے ہونے والے رشتوں سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ملک اللہ دسایا اور چاچی مارے جا چکے تھے اور نیہا غائب تھی۔

لیکن یہ خواب نہیں تھا ایک تلخ اور بھیانک حقیقت تھی۔ میری دنیا اجڑ گئی تھی اور اسے اُجاڑنے کے ذمے دار ابھی اس دنیا میں موجود تھے۔ میں نے ماں جی کو پیار کیا اور ان کا سر نیچے رکھ کر کھڑا ہوا تو صغراں ہراساں ہو گئی۔ ”پتر تو کدھر جا رہا ہے؟“

”بوا جی، ماں جی اور ابا جی مر گئے ہیں۔ ملک چاچا اور چاچی کو بھی سکندر اور اس کے لڑکوں نے قتل کر دیا ہے۔ وہ نیہا کو اٹھا کر لے گئے، مجھے نیہا کو واپس لانا ہے اور ان لوگوں سے بدلہ لینا ہے۔“

”پر تو اکیلا ہے۔“

”بوا جی میرے اکیلے جینے کا کیا فائدہ، اگر میں اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو زندہ رہنے دوں اور اپنی عزت کو لٹتا دیکھتا رہوں۔“

صغراں سمجھ گئی تھی کہ میں نہیں رکوں گا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”پتر جا میں دعا کروں گی، اللہ تجھے کامیاب کرے۔ یہاں میں سب دیکھ لوں گی۔“

میں تیز قدموں سے گھر سے اور گاؤں سے نکلا۔ اب لوگ بھی باہر آنا شروع ہو گئے تھے اور ان میں سے کچھ میرے گھر کی طرف آرہے تھے۔ لیکن میں ابھی کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں سے کترا کر اور سنسان گلیوں سے گزرتا ہوا میں گاؤں سے باہر آیا۔ میرا رُخ ملک سکندر کے ڈیرے کی طرف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سکندر کے اوباش لڑکے نیہا کو وہیں لے گئے ہوں گے تاکہ اطمینان سے اپنی ہوس کا نشانہ بنا سکیں۔ میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے نیہا کی عزت کی حفاظت کی دعا مانگ رہا تھا۔ اگر وہ محفوظ نہ ہوتی تو میرے پاس زندہ رہنے کا واحد آسرا بھی باقی نہ رہتا۔ ملک سکندر کی زمینیں خاصی دور تھیں اور ان کے آس پاس کوئی گھر یا آبادی نہیں تھی۔ ان کے شیطانی کاموں کے لیے یہ بہت موزوں جگہ تھی۔

میں ڈیرے کے قریب پہنچا تو میری عقل نے مجھے بروقت روکا۔ سامنے سے جانے کی صورت میں ملک سکندر کے کتے منتظر ملتے اور وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیتے۔ جب کہ میں ان تینوں باپ بیٹوں کو جہنم رسید کرنے سے پہلے نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں نے سامنے سے جانے سے گریز کیا اور ڈیرے کے عقبی حصے کا رُخ کیا۔ یہاں کھیتوں میں گندم کی فصل کھڑی تھی اور میں اس میں بیٹھ کر چھپتا چھپاتا ہوا ڈیرے کی دیوار تک پہنچا۔ یہاں کوئی نہیں تھا لیکن انہوں نے اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑا تھا۔ جیسے ہی میں اندر کودا ایک کتا غراتا ہوا میری طرف آیا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور مجھے نیچے گرا دیا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنے جبڑے سے میری گردن دبوچتا میں نے نیچے سے فائر کرکے اسے مار دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ڈیرے کے اندر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ کسی کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ میں اُٹھ کر اندر کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی میں ایک دروازے کے پاس پہنچا وہ کھلا اور اندر سے اعظم نکلا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا میں نے اس کے سینے میں کئی گولیاں اُتار دیں۔ وہ پیچھے گرا اور بھیانک آوازیں نکالتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں اسے پھلانگ کر اندر گھس گیا۔ اعظم کے پیچھے اس کا ایک آدمی تھا اس وقت میرے سر پر خون سوار تھا اور میں نے بلا جھجک اسے بھی گولی مار دی۔ اس کی چلائی گولی نہ جانے کہاں گئی۔ دوسرے آدمی نے چیخ ماری تو اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید اب اندر زیادہ لوگ نہیں رہے تھے۔ میں کمروں میں جھانکتا پھر رہا تھا۔ مجھے نیہا کی تلاش تھی۔ ایک کمرے میں کھٹ پٹ کی آواز آئی تو میں اس میں گھسا۔ وہاں ملک سکندر کا دوسرا لڑکا معظم کھڑکی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جام تھی اور اس سے کھل نہیں رہی تھی۔ وہ چپکے سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ وہ شاید نہتا تھا اور اس نے پی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے ہاتھ اوپر کر لیے اور گھگیا کر بولا۔ ”فراز تیرے باپ کو میں نے نہیں مارا ہے۔“

”تم نے نہیں مارا ہو گا لیکن تم اس کے قتل میں برابر کے شریک ہو۔“ میں نے خون خوار لہجے میں کہا۔ ”تم لوگوں نے صرف میرے خاندان کو ختم نہیں کیا ہے میری عزت کو بھی اُٹھا کر لے آئے ہو۔“

”نیہا بالکل ٹھیک ہے اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ اس کی بات سے مجھے ذرا امید بندھی تھی لیکن میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

”کہاں ہے نیہا جب تک میں اسے خود نہیں دیکھ لوں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ میں نے پستول سے اشارہ کیا۔

”وہ سامنے والے کمرے میں ہے۔“ اس نے اشارے سے بتایا لیکن میرے مجبور کرنے پر وہ مجھے وہاں لے گیا۔ نیہا ایک چارپائی پر بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے مزاحمت پر تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور کپڑے بھی کہیں کہیں سے پھٹ گئے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ بہتر نظر آرہی تھی۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو وہ مجھے آواز بھی دے سکتی تھی۔ نیہا کو یوں عالم بے بسی میں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ خوف زدہ معظم نے میرے تاثرات سے جان لیا کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور میں نے اس کی پشت میں دو گولیاں اُتار دیں۔ وہ زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا تھا۔ میں نے جلدی سے نیہا کو کھولا تو وہ آزاد ہوتے ہی رونے لگی۔

”فراز، انہوں نے بابا اور اماں کو مار دیا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں وہاں گیا تھا لیکن اتنی دیر میں یہ لوگ اپنا کام کرکے جا چکے تھے۔ مگر تمہارے بابا کے آدمی کہاں چلے گئے؟“

”وہ سب بزدل نکلے۔“ نیہا نے آنسو نے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ہی ملک سکندر کے لڑکے اور ان کے آدمی ہمارے گھر میں داخل ہوئے وہ بھاگ گئے تھے۔“

”پہلے انہوں نے ڈیرے پر بابا اور ہمارے ملازم ظہیر کو قتل کیا اس کے بعد وہ تمہاری طرف آئے تھے۔“

”کیا؟“ نیہا کے منہ سے چیخ نکلی۔ ”انہوں نے چاچا جی کو بھی مار دیا۔“

میں رونے لگا۔ ”صرف بابا ہی نہیں... اس کی موت کی خبر سن کر ماں جی بھی صدمے سے....“ میری بات اُدھوری رہ گئی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے پیاروں کا ماتم کر رہے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا ہم دشمن کے ڈیرے پر تھے اور یہاں ان کے تین افراد کو بھی مار چکا تھا۔ ہمارا یہاں سے جلد از جلد نکل جانا ضروری تھا۔ میں نے نیہا کا ہاتھ تھاما۔

”سنو تم گھر جاؤ مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔“

وہ بے قرار ہو گئی۔ ”کہاں اور کیوں؟“

”نیہا، میں یہاں نہیں رک سکتا، میں نے ملک سکندر کے دونوں بیٹوں اور ایک ملازم کو قتل کیا ہے اگر اس کے آدمیوں کے ہاتھ سے بچ گیا تو پولیس مجھے پکڑ کر لے جائے گی۔“

”تو میں کہاں جاؤں؟“

”تم واپس اپنے گھر جاؤ تم نے تو کچھ نہیں کیا ہے جو پولیس تمہیں پکڑے گی۔“

”پولیس مجھے نہیں پکڑے گی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن کیا وہ لوگ مجھے چھوڑ دیں گے جنہوں نے گھر میں گھس کر میرے ماں باپ کو مار دیا اور مجھے اُٹھا کر لے گئے۔ اب تو ماں باپ بھی نہیں رہے ہیں مجھے ان سے کون بچائے گا؟“

نیہا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ملک سکندر اور اس کے حواری پاگل ہو رہے ہوں گے اور وہ نیہا کو نہیں چھوڑیں گے۔ ہم دونوں کا یہاں سے فرار ہونا ضروری تھا۔ ابھی ملک سکندر باقی تھا۔ میرے اور نیہا کے ماں باپ کی موت کا ذمے دار وہی تھا۔ وہ سانپ تھا اور مارے جانے والے اس کے سنپولے تھے۔ مگر موقع نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب میں نے دیر کی تو پھر میں یہاں سے نکل بھی نہیں سکوں گا۔ اگر نیہا کو بہ حفاظت گاؤں میں کسی کے گھر پہنچانے گیا تو وہاں سے میری واپسی نہیں ہو سکے گی۔ نیہا ٹھیک کہہ رہی تھی اسے یہاں سے لے جانا لازمی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اب میں ایک مفرور قاتل ہوں، کیا تم میرا ساتھ دے سکو گی؟“

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں ہر جگہ تمہارا ساتھ دوں گی، اب میں تم سے الگ نہیں رہوں گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور اس نے کوئی گرم چیز بھی نہیں پہنی تھی۔ وہیں ڈیرے سے کچھ زنانہ ملبوسات مل گئے۔ نیہا نے لباس تبدیل کیا سردی اور شناخت سے بچنے کے لیے اس نے ایک گرم شال بھی اُٹھالی تھی۔ میں نے وہاں سے پستول کی گولیاں لی تھیں۔ رائفل چھوڑ کر ایک پستول اور لے لیا کیونکہ رائفل ہر جگہ نمایاں ہو جاتی اور میں پکڑا جا سکتا تھا۔ ہم ڈیرے سے نکلے تو باہر سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہاں یہی تین افراد تھے۔ شاید اعظم اور معظم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یوں ان کی موت بن کر آجاؤں گا۔ دو گھنٹے کے اندر آٹھ افراد زندگی کی سرحد پار کر چکے تھے، محض ایک شخص کی ہوس کی وجہ سے۔ اب وہ شخص زندہ رہے گا اور ساری عمر اپنی بوئی فصل کاٹتا رہے گا۔ جوان بیٹوں کی جواں مرگی کا سوگ مناتا رہے گا اور ان کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔

میں نے نیہا کو لے کر بس اسٹاپ یا سڑک کا رُخ کرنے سے گریز کیا۔ مجھے معلوم تھا سب سے پہلے ہماری تلاش وہیں سے شروع کی جائے گی۔ پولیس بسوں کی تلاشی لے گی اور اگر ہم نے کسی بس میں سفر کیا تو پکڑے جائیں

گے۔ اس لیے میں نے مخالف سمت اختیار کی۔ نیہا کے پاس چپل یا جوتے بھی نہیں تھے۔ ڈیرے سے کسی کے بھاری مردانہ سینڈل ملے تھے وہ وہی پہنے ہوئے تھی۔ ایک گھنٹے بعد ہم گاؤں سے دور نکل آئے تھے۔ نیہا نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''پتا نہیں لیکن شاید ہم جنوب کی طرف جارہے ہیں۔ ممکن ہے آگے کوئی گاؤں مل جائے جہاں سے ہم کہیں جا سکیں۔''

''کہاں؟''

''کسی شہر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب ہم کسی شہر میں ہی محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اگر یہاں سے بچ نکلے تو کراچی چلے جائیں گے۔ وہ انسانوں کا جنگل ہے وہاں ہمیں تلاش کرنا آسان نہیں ہوگا۔''

''کراچی۔'' نیہا سہم گئی۔ ''وہ تو بہت بڑا شہر ہے اور بہت دور ہے۔''

''ہاں ہمیں ایسی جگہ کی ضرورت ہے جو بہت بڑی اور بہت دور ہو۔''

''میں تھک گئی ہوں۔'' اس نے فریاد کی۔ ''کہیں رک جاؤ۔''

''نیہا چلتی رہو پولیس کے ساتھ دشمن بھی ہماری تلاش میں ہوں گے۔ ان کے پاس گھوڑے اور گاڑیاں ہوں گی وہ اس طرف آئے تو کچھ دیر میں ہمیں آلیں گے۔''

نیہا سمجھ رہی تھی لیکن وہ نازک لڑکی تھی جب تک ہمت رہی چلتی رہی پھر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ''بس اب مجھ سے نہیں چلا جارہا ہے تم چلے جاؤ۔''

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تمہیں چھوڑ کر جانا ہوتا تو ساتھ ہی کیوں لاتا۔''

وہ رونے لگی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی اس کا دکھ مجھ سے بڑا تھا۔ میں مرد تھا اور غم سہنے کا حوصلہ رکھتا تھا لیکن وہ نازک اندام لڑکی تھی۔ جب وہ چپ ہوئی تو دل کے بوجھ کے ساتھ تھکن بھی کم ہوگئی تھی۔ ہم چلنے کے لیے اُٹھے تھے کہ اچانک ہمارے گاؤں کی سمت سے روشنیاں لہرائیں۔ یہ کوئی گاڑی تھی جو ہماری طرف آرہی تھی۔ میں نے نیہا کا ہاتھ پکڑا اور نزدیکی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ جھاڑیاں زیادہ بڑی نہیں تھیں اور زیادہ رقبے پر نہیں تھیں۔ یہ ہمیں چھپا سکتی تھیں لیکن کوئی تلاش کرنا چاہتا تو یہ بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی جگہ بھی نہیں تھی جہاں ہم چھپ سکتے۔ ہم جھاڑیوں میں دبک گئے۔ میں نے ایک

پستول نیہا کے حوالے کر دیا۔ ''نیہا اگر انہوں نے ہمیں تلاش کرلیا تو یاد رکھنا گولی چلاتے ہوئے ہچکچانا نہیں یہ ہمارے ماں باپ کے قاتل ہیں۔ اگر ہم نے انہیں نہ مارا تو یہ ہمیں بھی مار دیں گے۔''

''میں ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تمہیں پستول چلانا آتا ہے؟''

''بہت اچھی طرح بابا نے مجھے سکھایا تھا۔'' اس نے کہا۔

ہم دونوں الگ الگ جھاڑیوں میں چھپے تھے یہاں جھاڑیاں اتنی بڑی نہیں تھیں کہ ان میں بیک وقت دو افراد چھپ سکتے۔ بلکہ ایک آدمی بھی مشکل سے سما رہا تھا کوئی بالکل پاس آتا تو ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ آنے والی دو گاڑیاں ثابت ہوئی تھیں۔ پھر میں نے ملک سکندر کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ''دونوں یہیں کہیں ہوں گے ان جھاڑیوں میں دیکھو اور جہاں دیکھو وہیں ماردو۔ میں ان کی لاشیں کتوں کو کھلاؤں گا۔''

ملک سکندر کی آواز سن کر میرا خون کھولنے لگا تھا اور اس وقت میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا ورنہ میں جھاڑیوں سے نکل کر کم سے کم اسے مار دیتا اس کے بعد میرا جو بھی حشر ہوتا۔ مگر نیہا کے خیال نے مجھے روک دیا۔ ملک سکندر کی آواز بتا رہی تھی کہ اس کا غم سے بُرا حال ہے۔ یقیناً اس نے اپنے دونوں سپوتوں کی لاشیں دیکھ لی تھیں۔ دو گاڑیوں میں اس کے آدمی بھرے ہوئے تھے اس کے حکم پر وہ جھاڑیوں میں گھس آئے اور جھاڑیوں میں لاٹھیاں اور بلم مار مار کر دیکھنے لگے۔ میں مستعد ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا جس نے مجھے دریافت کیا میں سب سے پہلے اسے مار دوں گا مجھے یقین تھا نیہا بھی یہی کرے گی اور اس کے بعد جو سامنے آئے گا ہم اسے مار دیں گے اس کے بعد ہمارا جو بھی ہو۔ میں نے پستول پر گرفت سخت کر لی تھی۔ ملک سکندر کے آدمی جھاڑیوں کو کھنگالتے ہوئے اس طرف آرہے تھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک میری طرف آیا اس کے ہاتھ میں بلم تھا یہ ایک دیہاتی طرز کا ہتھیار ہوتا ہے لکڑی کے ڈنڈے پر لوہے کی اَنی چڑھی ہوتی ہے۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے کسی نیزے کی طرح۔ وہ شخص بلم کی نوک جھاڑیوں میں مار رہا تھا۔ اس نے پاس آتے ہی میری جھاڑی پر بھی مارا اور میں بال بال بچا فولادی اَنی میرے چہرے سے صرف چند انچ دور زمین میں لگی تھی۔ کیونکہ جھاڑی زیادہ بڑی نہیں تھی اس لیے اس نے دوبارہ بلم نہیں مارا اور آگے نکل گیا۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ کوئی دوسرا مجھے تلاش نہ کر پاتا۔ اگر میں نہ ملتا تو نیہا

کو تلاش کیا جاسکتا تھا ہم میں سے کسی ایک کے ملنے کا مطلب تھا۔ دوسرا بھی پکڑا جائے گا۔ میں منتظر تھا کہ ابھی نیہا کی چیخ یا فائر کی آواز آتی ہے اور اس کے بعد میں بھی حرکت میں آجاتا۔

مگر اس روز قدرت کو ہمیں بچانا تھا اس لیے اتنی سی جھاڑیوں کے درمیان درجن بھر خون کے پیاسے لوگ بھی ہم دونوں کو تلاش نہیں کر سکے تھے۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک ان جھاڑیوں میں پھرتے رہے اور اس کے بعد ناکام لوٹ گئے۔ میں نے کسی کو کہتے سنا۔ ''ملک جی وہ ادھر نہیں ہیں۔''

''تب وہ کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔'' ملک سکندر نے کہا۔ ''پیدل اتنی دیر میں وہ یہیں تک آسکتے تھے۔ چلو ان کو آج ہی تلاش کرنا ہے، اگر وہ پولیس کے ہاتھ آگئے تو میرا انتقام ادھورا رہ جائے گا۔''

وہ سب گاڑیوں میں سوار ہوئے اور گاڑیاں پلٹ کر واپس چلی گئیں۔ ان کے دور ہونے تک میں جھاڑی میں ہی رہا۔ پھر آہستہ سے نیہا کو آواز دی۔ وہ جھاڑی سے نکل آئی۔ سردی اور خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی اب پکڑے گئے۔''

تب میں نے چاندنی میں دیکھا اس کے کلائی سے خون رس رہا تھا میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ کیا ہوا؟''

''وہ جھاڑیوں میں کچھ مار کر دیکھ رہے تھے وہی میرے ہاتھ پر لگا میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔''

میں دیکھ رہا تھا زخم خاصا بڑا تھا اور اس نے اپنی چیخ روک کر واقعی کمال کر دیا تھا ورنہ ہماری کہانی اسی جگہ ختم ہوجاتی۔ ایک درجن مسلح افراد کا مقابلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تین چار افراد کو مار دیتے یا زخمی کر دیتے اور اس کے بعد وہ ہمیں مار دیتے۔ ملک سکندر کا حکم میں نے سن لیا تھا۔ مگر قدرت کو ہمیں بچانا منظور تھا۔ اس لیے ہم دشمن کی ناک تلے بھی زندہ رہے تھے۔ میں نے اپنا رومال نکال کر نیہا کی کلائی کے زخم پر باندھ دیا۔ اس وقت یہی کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''اب ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

ہم دونوں ہی کچھ دیر آرام کر کے بہتر پوزیشن میں آگئے تھے اور پھر خطرے کو سامنے دیکھ کر ہمارے اندر توانائی آگئی تھی اس لیے جب ہم روانہ ہوئے تو ہماری رفتار پہلے سے کہیں تیز تھی۔ صبح چار بجے تک ہم اپنے علاقے سے بہت دور نکل آئے تھے۔ ابھی تک ہمیں کئی آبادیاں نظر آئی تھیں لیکن ہم ان سے کترا کر گزرتے رہے۔ اس وقت کہیں رکنا

بھی خطرناک ہو سکتا تھا ایک نوجوان جوڑے کو دیکھ کر لوگ جو سوال پوچھتے ان میں سے کسی کا جواب ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہمارا حلیہ مشکوک تھا ممکن ہے لوگ ہمیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیتے۔ ہم جہاں آبادی دیکھتے تھے وہاں سے راستہ بدل دیتے تھے۔ صبح تک ہم دونوں ہی تھکن اور بھوک سے بے حال ہو گئے تھے۔ پانی ہمیں راستے میں جگہ جگہ مل رہا تھا مگر کھانے کو کچھ نہیں تھا اور آرام کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

صبح کے قریب جب روشنی نمودار ہو رہی تھی تو ہم ایک سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ بڑی اور پکی سڑک تھی اس پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ میرے پاس زیادہ رقم نہیں تھی۔ یہ شاید پندرہ سو روپے تھے جو ایک وقت کے کھانے اور کہیں شہر تک جانے کے کرائے میں خرچ ہوجاتے۔ نیہا بھی یہی سوچ رہی تھی اس نے کہا۔ ''ہمارے پاس کچھ نہیں ہے گزارا کیسے ہوگا؟''

''کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' میں نے تسلی دی۔ ''اگر کسی شہر تک پہنچ گئے تو میں محنت مزدوری بھی کرلوں گا۔''

''میرے پاس یہ کچھ زیور ہے۔'' اس نے کلائی کی چار چوڑیاں اور کانوں کی بالیاں دکھائیں۔ ''میرا خیال ہے پانچ چھ تولے سونا ہوگا۔''

مجھے امید ہوئی، اس وقت سونا شاید بیس بائیس ہزار روپے تولہ تھا۔ ''ہاں اس سے کام بن جائے گا۔'' میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''لیکن نیہا مجھے اچھا نہیں لگ رہا... کہ میں تمہارا زیور استعمال کروں۔''

''اب میں اور آپ الگ الگ نہیں ہیں۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان رشتہ ہمارے بڑوں نے پہلے ہی طے کر دیا تھا۔ اب آپ اور میں اسے قائم رکھیں گے۔''

''ہاں جب میں تمہیں لے کر وہاں سے نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہی بات تھی پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔''

''فراز اس وقت ہم مشکل میں ہیں اور مشکل میں ایسی باتیں نہیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں ملایا تو....'' وہ کہتے ہوئے جھجکی۔ ''مجھے یقین ہے آپ ہر ممکن نعمت مجھے دیں گے۔ یہ زیور تو بے کام چیز ہے۔ جب آپ میرے ساتھ ہوں گے تو مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب انکار مت کیجیے گا۔''

میں انکار کر بھی نہیں سکتا تھا اس مشکل وقت میں جب جان کے دشمن تو پیچھے لگے ہی تھے پولیس بھی ہمیں تلاش کر رہی تھی۔ ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی اور

محفوظ ٹھکانا صرف رقم سے مل سکتا تھا۔ ہم دونوں ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پیچھے ہمارے گھروں میں لاکھوں کی رقم اور قیمتی سامان موجود تھا۔ اس سے کہیں زیادہ مالیت کی زمینیں اور مکان تھے لیکن ہم اس میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے کیونکہ واپس جانے کا مطلب ہمارے لیے موت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم اپنی کشتیاں جلا کر نکلے تھے واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

ہم سڑک کے ساتھ چل رہے تھے کہ ایک بس عقب سے نمودار ہوئی۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا بس رک گئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔ کسی نے خاص طور سے توجہ نہیں دی کیونکہ بس میں ہم جیسے دیہاتی ہی سوار تھے۔ نیہا نے شال سے اپنا منہ چھپا لیا اور میں نے بھی اپنی چادر اس طرح اوڑھ لی جیسے سردی سے بچنا چاہ رہا ہوں۔ اس طرح میری شکل بھی چھپ گئی تھی۔ کنڈیکٹر آیا تو میں نے پوچھا یہ بس کہاں جا رہی ہے۔ اس نے فراٹے سے ان مقامات کے نام لیے جہاں سے بس گزرتی۔ میں نے ایک چھوٹے شہر کے دو ٹکٹ لے لیے۔ یہاں سے ہم کراچی جانے والی بس یا ٹرین پکڑ سکتے تھے۔ یہ شہر ریلوے ٹریک پر بھی آتا تھا۔

دو گھنٹے بعد ہم شہر میں اُترے اور میں نے سیدھا ایک ہوٹل کا رُخ کیا۔ جہاں ہم نے پیٹ بھرا۔ ساری رات بھوکے سفر کرنے کے باوجود ہماری بھوک مری ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے نیہا کو لے کر بازار کا رُخ کیا جہاں سناروں کی دکانیں تھیں۔ ہوٹل میں ہی ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کر کے اپنا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا اس لیے سناروں نے شک نہیں کیا۔ دو تین سے پوچھنے کے بعد ہم نے سارا زیور ایک لاکھ دس ہزار روپے میں فروخت کر دیا۔ اس دوران میں میں پوری طرح چوکنا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ پولیس کا تھا اگرچہ ہماری تصویریں ابھی یہاں کی پولیس کی پاس نہیں آئی ہوں گی لیکن حلیے کے ساتھ ایک قتل کی واردات میں ملوث ایک جوڑے کے بارے میں یہاں کی پولیس کو لازمی خبردار کر دیا گیا ہوگا۔

میں نے اپنے اور نیہا کے لیے کچھ جوڑے لیے ایک چھوٹا سوٹ کیس اور ایک بیگ خریدا۔ نیہا کے لیے سینڈلز، چپل اور ہینڈ بیگ وغیرہ لیے۔ ریل اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ہم نے لباس بدلے اور خاصی حد تک بہتر حلیے میں آ گئے تھے۔ میں نے کراچی جانے والی ٹرین میں ایک دو برتھوں والا سیلون بک کرایا تھا۔ اس میں ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر سفر کر سکتے تھے۔ مگر ٹرین کے آنے میں ابھی دو گھنٹے کا وقت تھا۔ ٹکٹ کی وجہ سے یہ وقت ہم نے ویٹنگ روم میں گزارا اور نہ وہاں کوئی گھسنے بھی نہ دیتا۔ تھکن اور آرام کرنے کی شدید خواہش کے بعد ہم کشیدہ اعصاب کے ساتھ ٹرین کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک بار دو پولیس والے آئے اور انہوں نے ویٹنگ روم بھی جھانکا تھا۔ ہم فکر مند ہو گئے تھے لیکن وہ معمول کی چیکنگ پر آئے تھے۔ انہوں نے سرسری نظروں سے ہمیں دیکھا اور چلے گئے۔ نیہا سہم کر میرے پاس آ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا۔

''شکر ہے ورنہ میں تو ڈر گئی تھی۔''

''ڈرو مت اللہ نے چاہا تو ہم خیریت سے کراچی پہنچ جائیں گے۔''

آج میں سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت میں صرف بائیس برس کا ناتجربے کار نوجوان تھا۔ میں نے ایک چھوٹے سے شہر کے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور مجھے دنیا کے بارے میں زیادہ نہیں پتا تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ مسئلوں سے کیسے نمٹتے ہیں۔ نیہا تو تھی ہی گاؤں کی پلی بڑھی۔ اس نے میٹرک کیا تھا لیکن اس کے بعد نہیں پڑھ سکی تھی۔ عمر بھی بیس برس نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اور نیہا انتہائی خطرات سے گزرنے میں کامیاب رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ راستے میں ہمیں ایسا ظاہر کرنا ہے جیسے ہم نو بیاہتا میاں بیوی ہیں۔ میں کچھ عرصے پہلے کراچی گیا تھا اور وہاں میری جاب ہے اب میں شادی کے بعد اسے بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ شادی کی بات پر وہ شرمائی تھی۔ اس نے کپڑے ذرا شوخ پہن رکھے تھے جو ہم نے بازار سے لیے تھے۔ نہ میک اپ تھا اور نہ نئی دلہنوں والی بات تھی۔

دو گھنٹے بعد ٹرین آئی اور ہم اپنے ڈبے میں آ گئے۔ سیلون لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے اس لیے دوسروں کے سوال جواب سے بچے ہوئے تھے۔ میرے پاس میرا شناختی کارڈ تھا لیکن نیہا کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اگر راستے میں پولیس چیک کرنے آ جاتی تو ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ مگر ہم ڈبے میں آتے ہی جو سامان رکھ کر دروازہ اندر سے بند کر کے سوئے تو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ٹی ٹی دروازہ بجا کر چلا گیا۔ اسی طرح دوسرے چائے بوتل والے بھی آتے جاتے رہے اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ میری آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی اور ٹرین سندھ میں کہیں سفر کر رہی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن ابھی کھانے کا کوئی آسرا نہیں تھا اس لیے میں نے نیہا کو سونے دیا۔ پھر گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر رکی اور چائے کھانے والے آ گئے۔ میں نے کھانے کے لیے دال چاول لیے جو مجھے سب سے مناسب ڈش نظر آ رہی تھی لیکن یہ بھی ایسے تھے کہ بہ مشکل ہمارے حلق سے اُترے تھے۔ بھوک کی وجہ سے ہم نے زہر مار کر لیے تھے۔

آرام کر لیا تھا اور پیٹ بھی بھر گیا تھا۔ ماضی کو آنسوؤں سے یاد کر کے ہمیں اب مستقبل کی فکر ستانے لگی تھی۔ نیہا نے کہا۔ ''کراچی میں ہم کہاں جائیں گے؟''

یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں کرائے پر مکان لینا پڑے گا۔''

''کرائے پر ہمیں کون دے گا؟''

''یہ تو وہاں پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔''

''یہ کون سا اسٹیشن تھا؟''

''یہ رانی پور ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''ابھی کراچی بہت دور ہے۔''

نیہا نے اگلا سوال شرماتے ہوئے کیا۔ ''آپ نے ہمارے بارے میں سوچا کہ ہم ایسے ہی ساتھ کس طرح رہیں گے؟''

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ ''نیہا اگر تم راضی ہو تو ہم کراچی پہنچتے ہی نکاح کر لیتے ہیں۔''

وہ شرما گئی۔ ''میں نے... اپنے تمام معاملات آپ پر چھوڑ دیے ہیں۔''

صبح کے قریب ٹرین حیدر آباد میں تھی اور دو گھنٹے بعد ہم کراچی میں تھے۔ اُس وقت ٹرینوں کا نظام آج کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا اور سہولتوں کے ساتھ ٹرینوں کی آمد و رفت بھی وقت پر ہوتی تھی۔ اسٹیشن سے نکل کر میں نے ایک قلی سے کسی اچھے ہوٹل کا پوچھا اور اس نے مجھے نزدیک ہی ایک ہوٹل کا بتا دیا۔ ہم نے وہاں ایک کمرا لے لیا۔ کلرک نے صرف میرا شناختی کارڈ دیکھا اور کمرا دے دیا۔ آنے والے دو دنوں میں ہم نے کرنے والے تمام ہی کام نمٹا لیے تھے۔ گلستان جوہر میں دو کمروں کا چھوٹا فلیٹ کرائے پر مل گیا۔ ہم نے نکاح کر لیا تھا اور اب میاں بیوی تھے۔ گھر میں معمولی سامان اور فرنیچر ڈلوا کر میں روزگار کی فکر میں لگ گیا تھا۔

کراچی میں پُرانے اخبارات دیکھنے سے پتا چلا کہ گاؤں والوں نے ملک سکندر اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ایف آئی آر لکھوا دی تھی۔ میرے اور نیہا کے ماں باپ کے قتل میں اسے ملزم نامزد کیا تھا اور وہ مفرور تھا۔ دوسری طرف پولیس نے ملک سکندر کے ڈیرے پر ہونے والی واردات میں مجھے ملزم نامزد کر دیا تھا۔ میں وہاں اپنی رائفل چھوڑ آیا تھا جو میرے خلاف ثبوت بن گئی تھی ورنہ شاید ایف آئی آر میں میرا نام بھی نہ آتا۔ یعنی میں بھی مفرور تھا لیکن میرے لیے یہ بھی اطمینان کی بات تھی کہ ہمارے گھرانوں کی بربادی کا ذمے دار بھی مفرور تھا اور ہماری ہی طرح پولیس سے چھپتا پھر رہا تھا۔

ابتدائی مشکلات کے بعد قسمت بھی مہربان ہوئی تھی۔ مجھے ایک اسٹیٹ ایجنسی میں ملازمت مل گئی۔ وہاں میں دفتر کی دیکھ بھال کرتا تھا اور آنے والے گاہکوں کو نمٹا لے کے ساتھ ریکارڈ بھی لکھتا تھا۔ پہلے صرف تنخواہ ہوتی تھی پھر سودوں میں کمیشن بھی ملنے لگا۔ مگر سال کے اندر ہی کاروبار بیٹھنے لگا۔ اس دوران میں میں نے اپنا کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈ بنوا لیا اور پھر نیہا کا بھی بنوا لیا۔ پتا میں نے دونوں پر کراچی کا دیا تھا۔ آمدنی بڑھی تو میں نے گھر بھی کسی حد تک سیٹ کر لیا تھا لیکن زیادہ خرچ نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ کبھی ہمارا راز کھل سکتا ہے، پولیس یا دشمن ہمیں تلاش کر سکتے ہیں اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے تو ہمارے پاس رقم ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم رقم جمع کر رہے تھے۔

شادی کے بعد ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک ہم خطرے والی زندگی سے باہر نہیں نکل جاتے ہمارے بچے نہیں ہونے چاہئیں۔ ورنہ بچوں کے ساتھ دربدری بہت مشکل کام تھی اور اگر پولیس پکڑ لیتی تو ہمارے بچے دربدر ہو جاتے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ ہم اکیلے رہیں۔ جب کاروبار کم ہوا تو اسٹیٹ ایجنسی کا مالک چودھری اکرم ایجنسی میرے سپرد کر کے خود آسٹریلیا چلا گیا۔ اس نے اچھے دنوں میں خوب کمایا تھا اور اپنی کمائی کو آسٹریلیا میں کہیں لگایا تھا۔ اس لیے اب وہ وہاں چلا گیا تھا پھر اس نے فیملی بھی بلوا لی اور اسٹیٹ ایجنسی مکمل طور پر میرے سپرد کر گیا تھا۔ میں نے اسے بھی کبھی اپنی حقیقت نہیں بتائی تھی بس اتنا بتایا تھا کہ نیہا سے پسند کی شادی کی وجہ سے خاندان میں دشمنی ہو گئی تھی اور اب میں کسی رشتے دار سے نہیں مل سکتا تھا اور نہ ہی واپس جا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی مجھ سے ملنے آتا تھا۔ یہ کہانی ہم نے یہاں سب لوگوں کو سنائی تھی۔

اب میں اسٹیٹ ایجنسی کا مالک تھا۔ اگرچہ کاروبار پہلے جیسا نہیں تھا لیکن پھر بھی اچھی آمدنی ہو جاتی تھی جو میرے اور نیہا کے لیے گزارے سے کہیں زیادہ تھی۔ ہم اس میں اچھی خاصی بچت بھی کر لیتے تھے۔ جائداد کی خرید و فروخت کم ہوتی تھی لیکن کرائے پر دینے کے کام میں تیزی آئی تھی اور مہینے پانچ میں دس سودے ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنی کوشش سے ایک ساکھ بنائی تھی اور اچھے علاقے میں صاف ستھرا کام کرتا تھا اسی لیے صاف کام کرانے والے

میرے پاس آتے تھے۔ دو سال بعد چودھری اکرم پاکستان آیا تو مجھے کامیابی سے اسٹیٹ چلاتے دیکھ کر خوش ہوا لیکن اس نے مشورہ دیا۔

"فراز پتر! ادھر حالات ٹھیک ہوتے نہیں لگ رہے ہیں اس لیے میری مان تو میرے ساتھ آسٹریلیا چل، میں نے وہاں اپنا فارم بنا لیا ہے، ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین ہے۔ مجھے بندوں کی ضرورت ہے تجھے اور تیری بیوی کو ویزا دلوا دوں گا ایک بار وہاں آگئے تو چند سال میں شہریت بھی مل جائے گی۔"

مجھے اس کی پیش کش اچھی لگی تھی میں نے اس سے کہا۔ "چودھری صاحب میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے یار۔ آرام سے اچھی طرح سوچ کر جواب دے۔ پر اپنے پاسپورٹ ابھی بنوا لو اگر ضرورت پڑے تو ویزا لگنے میں دو ہفتے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔"

میں نے نیہا سے بات کی تو خلافِ توقع اس نے مخالفت کی تھی۔ "یہاں ٹھیک تو ہیں اپنے ملک سے اتنے دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب بھی تو ہم اپنے رشتوں سے دور ہیں۔"

"پر اپنے ملک میں اور اپنے لوگوں کے درمیان میں تو ہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے کئی بار نیہا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم یہاں کتنے ہی عرصے رہیں مستقل پریشانی میں رہیں گے کیونکہ ہمارے سروں پر دشمن اور پولیس کے خطرے کی تلوار ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔ مجھے چودھری اکرم کی پیش کش اچھی لگ رہی تھی جب نیہا نہیں مانی تو میں خاموش ہو گیا لیکن میں نے یہ کیا کہ اپنے اور نیہا کے پاسپورٹ بنوا لیے۔ اس طرح کوشش کر کے اپنی گریجویشن کی ڈگری اور نیہا کی میٹرک کی ڈگری نکلوا لی تھی۔ بعد میں نیہا نے پرائیویٹ پڑھ کر انٹر کر لیا تھا لیکن اس سے آگے پڑھنے میں اس نے دلچسپی نہیں لی تھی۔ میں نے بھی زور نہیں دیا تھا۔

نہ جانے کیوں کراچی آنے اور یہاں اتنے سال سکون سے رہنے کے باوجود میرے ذہن میں کہیں تھا کہ کبھی نہ کبھی خطرہ ہمارے سامنے آئے گا اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ اسی لیے میں کوئی ایسی چیز لینے یا بنانے سے گریز کر رہا تھا جسے چھوڑ کر جانا پڑے یا وہ مشکل سے فروخت ہو۔ میں نے نیہا کو زیور بنا کر دیا تھا اور باقی بچت سے میں ڈالرز خرید کر رکھ رہا تھا۔ میں نے کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں کھولا تھا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اس کی مدد سے میرا سراغ نہ لگا لیا جائے۔ پولیس بینک ریکارڈ حاصل کر سکتی تھی۔ ڈالر کی قیمت بھی بڑھتی رہتی اور جب بعد میں اسے فروخت کرتے تو زیادہ رقم مل سکتی تھی۔ یہ سب میں نہیں کر رہا تھا میرا لاشعور کروا رہا تھا جس میں یہ خوف دبا ہوا تھا کہ ایک دن دشمن مجھ تک پہنچ جائے گا اور پھر وہ دن آگیا۔ یہ چودھری اکرم کی پیش کش کے کوئی آٹھ مہینے بعد کی بات تھی، میں کسی کام سے طارق روڈ گیا تھا۔ وہاں میں دکان سے نکلا تو میں نے ایک کار سے ملک سکندر کو اُترتے دیکھا۔ کار شاندار قسم کی تھی اور ملک سکندر کے حلیے سے لگ رہا تھا وہ بھی عیش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ گزشتہ پانچ سال سے مجھے اس کے بارے میں علم نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ اب بھی مفرور ہوگا لیکن اسے اس طرح دیکھ کر مجھے اپنا یقین غلط ہوتا محسوس ہوا تھا۔ ملک سکندر پیسے والا اور عیار آدمی تھا۔ سرکاری حکام میں اس کی پہنچ تھی۔ اس نے شاید چکر چلا کر اپنے خلاف مقدمات ختم کرا دیے تھے اور اب آزادی سے گھوم رہا تھا۔ اسے کراچی میں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کتنے بڑے خطرے سے بے نیازیوں بے فکری سے یہاں رہ رہا ہوں۔ اگر ملک سکندر مجھے دیکھ لیتا تو یہ اس دنیا میں میرا آخری دن ورنہ آزادی کا آخری دن تو ہوتا۔

میں نے گھر آ کر نیہا کو بتایا تو وہ بھی فکر مند ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"نیہا ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اب یہاں رہنا حماقت ہوگی ہم کسی وقت بھی پکڑے جا سکتے ہیں یا ملک سکندر اور اس کے آدمی ہمارا خاتمہ کر سکتے ہیں۔"

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"آسٹریلیا۔" میں نے جواب دیا اور اس بار نیہا نے مخالفت نہیں کی تھی۔ چودھری اکرم سے میرا رابطہ تھا میں نے اسے کہا کہ میں آسٹریلیا آنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے اور نیہا کے ویزے کا بندوبست کرے۔ اس کے بعد ویزے کا بندوبست کیسے ہوا یہ الگ داستان ہے کیونکہ امریکا کی طرح آسٹریلیا کا ویزا بھی مشکل سے ملتا ہے لیکن چودھری اکرم کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی۔ میں نے جو سامان تھا وہ فروخت کیا۔ اسٹیٹ ایجنسی اچھی چل رہی تھی اس لیے اس کی قیمت بھی لگ گئی۔ میں نے اسے فروخت کیا اور اپنی تمام جمع پونجی ڈالرز میں بدلوا لی۔ اب سے چند دن بعد میں اور نیہا ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہے ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہی ہم قانون اور دشمن کے ہاتھوں سے محفوظ ہو سکیں گے۔

ہتھیلی پر انگارہ

[redacted]

جناب ایڈیٹر صاحب!

السلام علیکم!

ایک کہانی 'ہتھیلی پر انگارہ' آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ یہ ایک سچی کہانی ہے۔ میرے ہی شہر سے اس کا تعلق ہے۔ اس کے سارے کردار اس وقت بھی موجود ہیں۔ میں نے محض کسی فساد کے اندیشے کو پیش نظر رکھ کر نام اور مقام تبدیل کر دیے ہیں۔ میں چونکہ کہانیاں لکھتا رہا ہوں اس لیے میں نے اس سوفی صد سچی کہانی کو بھی دلچسپ پیرائے میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ پتا نہیں اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ البتہ یہ یقین ہے کہ آپ کو اور قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

انور فرہاد

(کراچی)

ایک صاحب نے دکان کے سامنے کھڑے ہو کر یوں ہمیں دیکھا جیسے وہ فیصلہ کر رہے ہوں کہ کس سے بات کریں۔ دکان کے اندر ہم کئی لوگ موجود تھے۔ جن میں بلیغ الرحمن جو دکان کے مالک تھے، کے علاوہ ہم جیسے ان کے دوست جاوید منہاس اور دکان دار کے صاحبزادے بھی تھے۔ ہم جس شخص کو گاہک سمجھ رہے تھے، اس نے اپنی سانسیں درست کر لیں تو بلیغ الرحمن نے اس سے پوچھا۔

"جی! فرمایئے کیا چاہیے؟"

وہ صاحب جن سے سوال کیا گیا تھا، انہوں نے کہا "وہ صاحب جو ذرا دیر پہلے یہاں سے گئے ہیں، ان کے بارے میں آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

عجیب سوال تھا۔ دکان پر تو ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ صاحب کس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بلیغ الرحمن کے ساتھ ہم بھی کچھ نہ سمجھے۔

"ارے صاحب!" بلیغ الرحمن کی بجائے منہاس

صاحب بول پڑے ''یہاں تو ہر لمحہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟''

ان صاحب نے ایک لمحہ سوچا، پھر بولے ''وہ...... جو ذرا سا لنگڑا کر چلتے ہیں، جن کے ہاتھ میں ایک تھیلا سا تھا......''

ہم سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس کا مطلب تھا، یہ شاید وسیم احمد کو پوچھ رہا ہے۔ بلیغ کا بیٹا شاید کچھ کہنے والا تھا کہ منہاس صاحب نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اس شخص سے پوچھا ''اگر وہ آپ کو مطلوب تھے تو آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں؟''

وہ ہنس دیا، پھر بولا ''بات دراصل یہ ہے کہ وہ اس دکان سے نکل کر روڈ کراس کر رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے بھاگا۔ وہ تو سڑک پار کر چکے تھے، میں گاڑیوں کی لمبی قطار کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔ جب مجھے سڑک پار کرنے کا موقع ملا تو وہ جانے کہاں گم ہو چکے تھے؟''

''آپ کو ان سے کوئی کام تھا؟''

''دراصل وہ میرے بڑے پرانے ساتھی ہیں، انہیں ایک عرصے کے بعد دیکھا ہے اور ان کا نام وسیم احمد ہے۔ ایسے پیارے شخص کو ایک مدت کے بعد دیکھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ یہ شخص وسیم احمد ہی کو پوچھ رہا ہے۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کہا ''اگر آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہوں تو میں وسیم صاحب کے بارے میں بتاؤں کہ میرے ان سے کیسے تعلقات تھے؟''

''جی جی، ضرور بتایئے، ہم ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔'' بلیغ الرحمٰن جھٹ بول پڑے ''آیئے! ہمارے پاس اندر چلے آیئے۔'' اور وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا اور اس وقت گاہکوں کی آمد و رفت بہت کم ہوتی ہے۔ اس نے بیٹھ کر اطمینان کا سانس لیا پھر بولا۔

''میں نے وسیم صاحب کے ساتھ مسلسل کئی برسوں تک کام کیا ہے۔ وہ حیدر آباد میں ایک فارماسوٹیکل کمپنی کے زونل منیجر تھے۔ وہ بہت اچھے آفیسر تھے۔ اچھے ان معنوں میں کہ انہوں نے ہمیشہ کمپنی کے مفاد میں بہتر کام کیا۔ ایک پیسے کا ہیر پھیر نہ خود کرتے تھے، نہ ہی کسی کو کرنے دیتے تھے۔ اپنے اصولوں کے بڑے پابند، دفتر کے چپراسی تک سے بڑی محبت، شفقت اور اپنائیت سے ملتے تھے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے مگر ہر ایک سے کام لینے کے معاملے میں بے حد چوکس تھے۔ ان کے آنے سے پہلے، ان کی جگہ جو منیجر تھے وہ خود بھی کھل کھیلتے تھے اور ان کا پورا اسٹاف بھی کمپنی کو چونا لگانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ وسیم صاحب کے آنے کے بعد وہاں کا باوا آدم ہی تبدیل ہو گیا، جس کا احساس جلد ہی کمپنی کے ارباب بست و کشاد کو ہو گیا۔ جبکہ اسٹاف کے کچھ لوگ ان کے دشمن بھی بن گئے۔ انہوں نے ان کے خلاف کچھ سازشیں بھی کیں مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ دوسری طرف وسیم صاحب اپنے درپردہ دشمنوں کے خلاف بھی کوئی انتقامانہ کارروائی نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا جائز طور طریقے سے ان کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھ ہی دیتے تھے۔''

اتنا کہہ کر وہ صاحب رکے پھر ذرا توقف کے بعد بولے ''میری ان باتوں سے آپ لوگوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وسیم صاحب ایک نیک، دیانت دار اور اصول پرست شخص تھے۔ اگر اب آپ لوگوں سے ان کے مراسم ہیں تو آپ لوگ یقیناً میری ان باتوں کو درست تسلیم کریں گے۔''

''جی ہاں۔'' بلیغ الرحمٰن جھٹ بول پڑے ''وہ اب بھی ایسے ہی شخص ہیں۔''

''وسیم صاحب کی یہ ملازمت تھی تو حیدر آباد میں مگر ان کا گھر اور بیوی بچے کراچی میں رہتے تھے، وہ ویک اینڈ پر گھر آتے اور چھٹی گزار کر واپس چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے کئی بار ان سے کہا کہ ہم آپ کو مکان فراہم کر دیں گے، آپ یہیں اپنی فیملی کو بلا لیں۔ یہ ہر ہفتہ آنے جانے کی مشقت سے تو بچ جائیں گے مگر وہ رضامند نہیں ہوئے اور کہا کہ میرے بیوی بچے کراچی کے علاوہ کہیں اور رہنا نہیں چاہتے۔ کبھی کبھی ہم جیسے ان کے بہی خواہوں کو اس بات پر تعجب بھی ہوتا تھا کہ وہ شخص جو دفتری معاملات میں اس قدر سخت گیر واقع ہوا ہے، بیوی بچوں سے اپنی بات منوا نہیں سکتا۔ مگر اس معاملے میں ہم نے کبھی ان سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دفتر کے قریب ہی ایک نہایت مختصر سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور اس کے قریب ہی مسجد میں نمازیں پڑھتے تھے۔ اس مسجد سے منسلک ایک مدرسہ بھی تھا جس میں کلام پاک کی تعلیم کے علاوہ خواہش مند طلبا کو قرآن کریم حفظ بھی کرایا جاتا تھا۔ ہمیں ایک عرصہ کے بعد، جب وسیم صاحب اس ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے کر جا چکے تھے معلوم ہوا کہ انہوں نے ساٹھ حفاظ کو حفظ کرانے میں مدرسے کے سارے اخراجات اس خاموشی سے برداشت کیے کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد جب مدرسہ والوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے بڑا افسوس کیا۔

دکان میں آہستہ آہستہ گاہکوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ جس کے لیے بلیغ الرحمٰن یا ان کے صاحب زادے کو گاہکوں سے رجوع ہونا پڑتا تھا۔ لہٰذا جاوید منہاس صاحب نے کہا ''باقی روداد اب کل پر چھوڑیں۔ اب آپ سے سکون کے ساتھ بات نہیں ہو سکے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں کل ظہر کی نماز کے بعد آؤں گا۔''

ان کے جانے کے بعد بلیغ الرحمٰن نے کہا ''اس نے تو جو باتیں بتائی ہیں، اس کا تو کم و بیش ہمیں بھی معلوم ہے۔ یہ شخص یقیناً اس دور میں وسیم صاحب کا ساتھی رہا ہو گا۔''

اگلے روز وہ حسب وعدہ دکان پر آ گئے۔ ذرا دیر تک موجودہ سیاسی حالات پر بات چیت کرنے کے بعد اصل گفتگو کی طرف آتے ہوئے بولے ''آپ لوگوں کو وسیم احمد صاحب کی اچانک ریٹائرمنٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

منہاس صاحب نے اس شخص کی بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''آپ نے وسیم صاحب کے بارے میں تو اتنا کچھ بتایا، مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس اتنا ہی کہا کہ آپ ان کے ساتھ ان کی کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔''

''اپنے بارے میں اور کیا بتاؤں؟'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا پھر ذرا سوچ کر بولا ''میرا نام امین الدین ہے، میں اس کمپنی میں ایک ذمے دار عہدے پر فائز تھا اور ان کے اصولوں پر کاربند تھا کہ اپنا کام نہایت دیانت داری سے کرنا چاہیے اور حق حلال کی روزی کمانی چاہیے۔ وسیم صاحب کے جانے کے بعد ان کی جگہ جو صاحب آئے ان کی پالیسی بھی ہیر پھیر کی تھی۔ وہ ہم لوگوں سے بھی اپنے مطلب کا کام کروانا چاہتے تھے مگر اب میں حرام کی کمائی کا قائل نہیں رہا تھا۔ اللہ نے میرے حال پر بڑا کرم کیا کہ مجھے اس سے کہیں بہتر ملازمت دلوا دی اور میں بیرونِ ملک چلا گیا۔ سال دو سال بعد یہاں آتا ہوں مگر کبھی وسیم صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم نے کبھی ان کے گھر کا اتا پتا بھی معلوم نہیں کیا تھا۔ کل کوئی بارہ برس سے زیادہ کا عرصہ گزارنے کے بعد ان پر نظر پڑی تو بے ساختہ ان کی طرف لپکا تھا۔

بلیغ الرحمٰن نے ہم سب کے لیے چائے منگوائی تھی جس کی چسکی لیتے ہوئے منہاس صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وسیم احمد صاحب سے ہماری ملاقات بہت پرانی نہیں، تھوڑے ہی دن ہوئے ان سے شناسائی ہوئی ہے مگر ان کی محبت، ان کے خلوص اور ان کی اچھی طبیعت کی وجہ سے وہ ہمارے دوست بن گئے ہیں۔''

''اس کے علاوہ وہ بڑے دکھی شخص ہیں۔'' بلیغ الرحمٰن چٹ سے بول پڑے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!'' امین الدین نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ''میرا خیال ہے کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اچھی خاصی رقم لے کر آئے تھے۔ بارہ پندرہ لاکھ سے کم نہیں ہو گی۔ وہ نہ فضول خرچ تھے نہ ہی انہیں کسی خاص بات کی لت تھی۔ ایسا محتاط آدمی ان بارہ چودہ برسوں میں کیسے قلاش ہو گیا؟ کیا وہ ساری دولت ختم ہو گئی کہ آپ انہیں دکھی بتا رہے ہیں؟ دکھی تو ایسا ہی شخص ہوتا ہے نا جو زندگی کی آسائشوں اور آرام سے محروم ہو؟''

''جی ہاں، آپ کا سوال بالکل بجا ہے۔'' منہاس صاحب نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ''آج انہیں، اس عمر میں، جب وہ بڑھاپے کی سرحد پر پہنچ چکے ہیں اور انہیں آرام اور آسائش کی سہولتوں کی سخت ضرورت ہے، وہ ان سب باتوں سے محروم ہیں۔''

امین الدین نے حیرت سے جاوید منہاس کو دیکھا ''اور وہ بارہ پندرہ لاکھ روپے...... کیا کوئی چرا کر لے گیا؟''

ہم سب کے منہ سے آہ نکلی تھی ''بڑا بد نصیب شخص ہے یہ۔''

''آپ نے ڈکیتی کی طرف اشارہ کیا ہے نا؟'' جاوید منہاس بولے۔ ''تو یہ سمجھئے، ان کی برسہابرس کی کمائی پر ڈاکا پڑ گیا اور وہ بالکل کنگال ہو گئے۔''

امین الدین نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی پھر بولے ''اس شہر کا المیہ یہ ہے کہ اس کے شہریوں کو کوئی تحفظ، کوئی امان حاصل نہیں۔'' اور پھر اس کے بعد یہاں کے سیاسی حالات پر ایک تقریر کر ڈالی۔ جب وہ خاموش ہوا تو بلیغ الرحمٰن نے کہا۔

''آپ نے درست فرمایا کہ یہاں لوگوں کو کوئی تحفظ نصیب نہیں، چور اچکے گھر سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں تو لوٹتے ہی ہیں، گھر کے اندر بھی کوئی محفوظ نہیں۔ گھر کا چراغ بھی گھر پھونک دیتا ہے، وسیم صاحب کو بھی ان کے گھر کے لٹیروں نے لوٹ لیا...... اور وہ......''

امین الدین کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ''یہ...... یہ کیا فرما رہے ہیں آپ؟ گھر کے لٹیروں سے کیا مراد ہے آپ کی؟''

''مراد یہ ہے کہ......'' بلیغ الرحمٰن کی بجائے منہاس صاحب بولے ''برائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ باہر کی گندگھروں میں بھی پہنچ گئی ہے۔ وسیم صاحب کو لوٹنے والا کوئی اور نہیں، ان کے اپنے بال بچے ہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسے نیک سیرت اور اعلیٰ کردار شخص کے بال بچے ایسے کیسے ہو سکتے ہیں؟''

بلیغ الرحمٰن کا بیٹا جو اب تک خاموش تھا، سب کی باتیں

خاموشی سے سن رہا تھا، ایک دم بول پڑا" انسان کو اتنا شریف بھی نہیں ہونا چاہیے کہ......"

"ہاں۔" میں نے اس لڑکے کی تائید کرتے ہوئے کہا "وسیم صاحب کو ان کی فطری شرافت نے اتنا کمزور کردیا ہے کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتے۔" امین الدین کے چہرے پر اس کے دکھی احساسات کی پرچھائیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس بات کی گواہی تو میں بھی دوں گا کہ وہ دشمنوں کو بھی کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتے تھے، کمپنی میں جن لوگوں نے ان کے خلاف سازش کی ان کے لیے بھی انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔" اتنا کہہ کر امین الدین ذرا رکا پھر ہم سب کو مخاطب کرکے بولا" اور یہ بات بھی میں نے محسوس کی تھی کہ بیوی بچوں کے معاملے میں وہ قدرے دبتے تھے۔ اپنے اصولوں پر اس قدر سخت گیر ہونے کے باوجود بیوی کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔"

"مثلاً......؟" میں نے سوال کیا۔

"مثلاً...... ہر ویک اینڈ پر گھر آنے جانے کی مشقت سے نجات کے لیے جب کمپنی نے انہیں حیدرآباد ہی میں رہائش کی سہولت آفر کی تو انہوں نے بیوی بچوں کے انکار پر یہ سنہری پیش کش قبول نہیں کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے بیوی کے اصرار پر کراچی میں ایک بینک اکاؤنٹ کھولا، جس میں ان کے اور ان کی بیگم کے مشترکہ دستخط سے کیش کروانے کا طریقہ وضع کیا گیا۔ یہ بات جب ہمیں معلوم ہوئی تو ہمیں کچھ اچھا نہیں لگا۔ مگر ہم نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ ان کے ایک منہ چڑھے چپراسی نے ایک دن کہہ دیا "صاحب جی، بیوی بے شک گاڑی کا دوسرا پہیہ ہوتی ہے مگر اس پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ وہ کسی وقت بھی پہلے پہیے کا ساتھ چھوڑ سکتی ہے، دغا دے سکتی ہے۔" بلیغ الرحمٰن بولے۔

"اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔" بلیغ الرحمٰن.... کے بیٹے نے کہا" وسیم انکل، آنٹی کو سچ مچ اپنی زندگی کی سائیکل کا دوسرا پہیا تصور کرتے تھے جس نے ان کی ساری تھیوری کو دغا دے کر غلط ثابت کردیا۔"

"اگر یہ بینک اکاؤنٹ نہ ہوتا تو وہ دن دیہاڑے اتنی آسانی سے نہ لٹتے۔"

"آخر ایسے کسی اکاؤنٹ کی ضرورت کیا تھی؟"

امین الدین کے اس سوال پر بلیغ الرحمٰن نے جواب دیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وسیم صاحب تنخواہ ملنے کے بعد گھر کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم بیوی کے ہاتھ میں دیا کرتے تھے۔ جو وہ فضول خرچی میں بیس تاریخ یا کبھی اس سے بھی پہلے خرچ کردیا کرتی تھی اور پھر مزید پیسوں کا تقاضا شروع ہوجاتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ انہیں ہر ہفتہ، ہفتے بھر کے اخراجات کے پیسے دیے جائیں جو بذریعہ چیک دیں اور وہ ان کے اور بیوی کے مشترکہ دستخط سے نکالے جاسکیں۔ یہ ترکیب قدرے کامیاب ہوئی مگر کبھی کبھی کوئی ایمرجنسی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ لہٰذا بیگم نے مشورہ دیا کہ ایک آدھ چیک اپنے دستخط شدہ، میرے پاس رہنے دیں۔ کئی بار بچوں کی بیماری یا کسی ناگہانی افتاد پر ایسے چیک کی وجہ سے پریشانی سے بچ جائیں گے۔ مگر ایسے ہی ایک چیک نے ان کی ساری خوش گمانی کو خاک میں ملادیا۔

"ہاں امین الدین صاحب!" میں نے اس کی تائید کی. ہر شریف آدمی کی طرح وہ بھی نہ صرف بیگم سے بڑی محبت کرتے تھے بلکہ ان سے دبتے بھی تھے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہونے کے بعد ان کے ترکے کا حصہ انہیں ملا تو انہوں نے اس پیسے سے بیوی کے نام پر ایک گھر خرید لیا۔ ان کی والدہ نے اس بات پر اعتراض بھی کیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ مکان تمہیں اپنے نام رجسٹرڈ کروانا چاہیے تھا۔ جس پر وہ بولے تھے۔

"اماں! بیوی تو شریکِ حیات ہوتی ہے۔ میرے نام مکان ہوتا جب بھی وہ اس کی مالک ہوتی، اس کے نام سے ہے تب بھی میں اس کا مالک ہوں۔"

"ان کی والدہ بیٹے کی سادہ لوحی پر خاموش ہوگئی تھیں۔ مگر انہیں اس بات پر افسوس ضرور ہوا تھا کہ ان کا بیٹا اتنا بڑا ہوگیا ہے، کئی بچوں کا باپ بن گیا ہے مگر ابھی تک اسے دنیاداری کا ڈھنگ نہیں آیا ہے۔"

"امین صاحب! اب انہیں ماں کی بات یاد آتی ہے تو وہ کفِ افسوس ملتے ہیں۔ سوچتے ہیں کاش میں نے مکان خریدتے وقت ماں سے مشورہ کرلیا ہوتا۔ ان کی بات پر عمل کیا ہوتا تو اس حال کو نہ پہنچتا کہ اس مکان کا ایک کودام نما کمرا میرے نصیب میں ہوتا۔"

"کیا...... کیا؟" امین الدین نے بہ دقت تمام اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ انہیں ان کی بیگم نے اس حال کو پہنچادیا؟ ان کے بچوں نے بھی اس بات پر اپنی ماں کو نہیں روکا؟ ان کے بچے تو اب جوان ہوگئے ہوں گے؟"

"نہیں......" منہاس صاحب نے آہ بھر کر کہا "بچوں نے بھی ماں کو زیادتی سے نہیں روکا۔ وہ بچے جن کو وسیم صاحب نے لکھایا پڑھایا اور جب وہ فارغ ہوئے تو انہیں کاروبار پر لگایا۔ آج وہ کامیاب دکان داری کررہے ہیں۔

بچوں پر ماں کا اثر ابتدا ہی سے تھا۔ بینک کا پیسا لوٹنے میں بھی انہوں نے ماں کا ساتھ دیا اور گھر سے بے گھر کرنے پر بھی انہوں نے ماں کو روکا ٹوکا نہیں۔ گھر کی اوپری منزل پر جہاں وہ ماں کے ساتھ رہتے ہیں، سہولت اور آسائش کا تمام سامان موجود ہے۔ گھر کے نچلے حصے میں ایک کمرا جو اسٹور روم کی طرح ہے، وہ ان کے لیے مختص ہے۔ اپنی کسی ضرورت کے تحت وہ اوپری حصے میں نہیں آجاسکتے۔ کھانا اوپر سے کوئی پہنچادیتا ہے۔ جیسے وہ گھر کے فرد نہیں، کوئی مسافر ہیں۔"

منہاس صاحب ذرا رکے تو امین بول پڑا۔

"یہ...... یہ تو صریحاً ظلم ہے۔" کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اپنی بات آگے بڑھائی "مگر تعجب تو اس بات پر ہے کہ وسیم صاحب یہ سب کچھ خاموشی سے کیوں برداشت کررہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے کہا "حیرانی تو ہمیں بھی ہے بلکہ کبھی کبھی غصہ بھی آتا ہے کہ یہ سب کچھ یہ شخص کیوں برداشت کررہا ہے، حیدرآباد سے جب ریٹائرمنٹ لے کر واپس آئے تو ان کی بیگم نے بچوں کے ساتھ مل کر بینک سے سارا اندوختہ نکلوالیا۔ اس موقعے پر تو انہیں آسمان سر پر اٹھالینا چاہیے تھا مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"شاید بیگم سے اس بارے میں پوچھا تھا۔" بلیغ الرحمٰن نے کہا" جس پر بیگم نے ان کی خوب اچھی طرح کلاس لی اور کہا" تم نے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ محض آرام کرنے کے خیال سے لی ہے تو تم اب آرام کرو۔ اللہ اللہ کرو، تمہیں اب پیسوں کی کیا ضرورت؟ بچے ہیں وہ کاروبار کرکے پیسے کو دوگنا کریں گے۔"

"اور انہیں اسٹور روم میں مقید کیوں کردیا؟" امین الدین نے کہا" یہ انہوں نے نہیں پوچھا؟"

"انہوں نے تو نہیں پوچھا۔ البتہ ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے یہ سوال بیوی سے کیوں نہیں کیا؟ تو وہ بولے تھے" اب پوچھ کر بھی کیا فائدہ۔ بات بڑھے گی اور وہ اس کمرے سے بھی بے دخل کرکے مجھے گھر سے باہر نکال دیں گے۔"

"شرافت اپنی جگہ مگر اتنی بھی شرافت نہیں ہونی چاہیے کہ آپ کو کوئی اس حال تک پہنچادے اور آپ کچھ نہ کہیں۔" امین الدین اتنا کہہ کر ذرا رکا پھر قدرے توقف کے بعد یوں گویا ہوا۔

"یہ بھی درست کہ شریف لوگ بیوی سے ڈرتے ہیں مگر اتنا بھی کیا ڈرنا۔ آخر اس ڈر کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ یہ کیسے شخص ہیں کہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ شاید اس حادثے کے بعد ان کا مکمل علاج نہ ہوسکا ہوگا۔"

"جی ہاں، آفر دہ خود کس کس بیماری کا علاج کرائیں۔ انہیں ایک نہیں کئی بیماریاں لاحق ہیں مگر ان کے بیوی بچوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

عصر کی اذان کے بعد گاہکوں کا آنا جانا پھر شروع ہوگیا تھا لہٰذا آج امین الدین نے خود ہی کہا" اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ باقی باتیں اگر آپ لوگ اجازت دیں تو کل آکر کروں، شاید موصوف کل تشریف لے آئیں؟"

اور اگلے روز وسیم صاحب امین الدین سے پہلے آگئے تھے" یار! یہاں سے پرسوں شام جانے کے بعد ایک دم طبیعت بگڑ گئی تھی اس لیے کل آنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔" انہوں نے بتایا۔

اتنے میں امین الدین آگئے اور وسیم صاحب کو دیکھ کر درانہ دکان کے اندر داخل ہوئے اور ان سے لپٹ گئے۔

"مجھے پہچانا؟" اس سوال پر وسیم صاحب بولے۔

"بھئی، ہم نے تو آپ کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں پھر پہچانیں گے کیسے؟"

وہ ان سے علیحدہ ہوکر بولے" لیجیے، پہچانیے۔"

وسیم صاحب نے انہیں غور سے دیکھا...... اور پھر ان کو لپٹالیا" ارے یار، امین الدین آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟ کہاں ہو؟ کیا کررہے ہو؟ اتنے دن کہاں رہے؟"

"دیکھیے، ہم نے تو آخر آپ کو ڈھونڈ ہی نکالا۔"

دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر پُراشتیاق نظروں سے گھورنے لگے۔ پھر امین الدین نے اپنے بارے میں بتایا" آپ کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد میں نے بھی کمپنی چھوڑ دی۔" پھر اس کی وجہ بتائی اور بیرونِ ملک اپنی ملازمت کے بارے میں بھی بتایا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے سوالوں کے جواب دیتے رہے پھر امین الدین نے وسیم صاحب سے اچانک سوال کردیا۔

"سر جی! آپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب تک میں کمپنی میں رہا، وہاں بس ایک ہی مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ آخر آپ نے ایسی اچھی نوکری کیوں چھوڑی؟ وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ کیوں لی اور اب بھی میں اس بات پر حیران ہوں، آپ کے ان دوستوں سے بھی پوچھا مگر ان کو معلوم نہیں۔"

وسیم احمد نے فوراً ہی جواب نہیں دیا، چند لمحوں تک دکان سے باہر دور واقع مسجد کے گنبد کو گھورتے رہے پھر یوں بولے جیسے بہت دور سے بول رہے ہوں" اگر میں اس وقت ریٹائرمنٹ نہیں لیتا تو شاید اپنے اصول اور آدرش کا خون

کرنے پر مجبور ہوجاتا۔"

ہم تمام بہ شمول امین الدین نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ہر ایک چہرہ اس وقت سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ مگر ہم میں سے کسی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ہمیں خاموش دیکھ کر انہوں نے ہی اپنی بات آگے بڑھائی "میری بیگم کی فرمائشوں اور ڈیمانڈز میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اپنی فضول خرچیوں کے لیے انہیں اکثر بڑی رقم کی ضرورت پڑتی تھی۔ کبھی کسی عزیز کے گھر شادی کی تقریب کے لیے، کبھی بچوں کی سالگرہ کے لیے، کبھی اپنے زیورات کے لیے، کبھی کسی فضول بات کے لیے یا کبھی کسی اور بات کے لیے وہ بڑی بڑی رقمیں طلب کرتیں۔ کبھی چالیس ہزار، کبھی پچاس ہزار اور کبھی ایک لاکھ روپے۔ میں ان سے کہتا، نیک بخت میں اتنی بڑی بڑی رقوم کہاں سے لاؤں؟ اپنی تنخواہ میں سے میں تمہیں معقول رقم دیتا ہوں۔ پھر ایمرجنسی اخراجات پر بھی خرچ پورے کرتا ہوں۔ وہ میری بات کو رَد کرتے ہوئے کہتیں۔ میں یہ سب کچھ نہیں جانتی۔ آپ جہاں سے بھی ہو اور جیسے بھی ہو میری ضرورت پوری کیجیے۔ میں آخر تمہاری بیوی ہوں، میں تمہارے علاوہ اپنی ضرورت کے پیسے اور کس سے مانگوں؟" وہ کچھ پڑوسیوں اور کچھ جاننے والوں کی مثال دیتیں۔ "آخر وہ لوگ بھی تو اپنی بیویوں کی خواہشوں کا احترام کرتے ہیں۔" میں ان سے کہتا، یہ لوگ سرکاری ملازم ہیں، ان کے ہاں رشوت کا لین دین ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی تو میں ایسے پیسوں پر لعنت بھیجتا۔"

"تمہارے ہاں رشوت کا نہ سہی، ہیر پھیر کا کام تو ہوسکتا ہے۔ تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ تم سے پہلے جو منیجر تھا، وہ کمپنی کو خوب چونا لگاتا تھا۔ تم اسی طرح تو اپنی آمدنی میں اضافہ کرسکتے ہو۔"

"نہیں، میں ایسی آمدنی پر بھی لعنت بھیجتا ہوں۔ جب میں حلال رزق حاصل کرسکتا ہوں تو غلط پیسوں کی طرف کیوں ہاتھ بڑھاؤں؟ تم اپنے غیر ضروری اور فضول اخراجات پر کنٹرول کرو۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ وہ ہمیں بہتوں سے بہتر اچھا کھلاتا پلاتا ہے۔"

مگر پتا نہیں وہ کس قماش کی خاتون ہے کہ اس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ جب ویک اینڈ پر گھر گیا تو یہی مسئلہ اُٹھائے کھڑا تھا اور گھر جانے کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ تنگ آکر آخر ایک دن میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔"

ہم سب نے یوں اطمینان کا سانس لیا جیسے ہمارے گلے میں جو بڑی پھنسی ہوئی تھی وہ نکل گئی ہے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو شاید ہم بھی یہی کرتے۔

بلیغ الرحمٰن کا بیٹا جو چائے لایا تھا، وہ ہماری طرف بڑھائی۔ گرم گرم چائے نے ہمیں مزید سکون پہنچایا تھا۔ ذرا دیر بعد امین الدین نے وسیم صاحب سے پوچھا۔ "کبھی آپ نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آپ کی وائف کا سلوک آپ کے ساتھ ایسا کیوں ہے جبکہ ہمیں تو یہ علم تھا کہ آپ ان سے اور ان کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی ہر جائز خواہش پوری کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتے تھے۔"

"ہاں۔" کہہ کر وہ ذرا دیر تک خاموش رہے۔ ان کے چہرے پر ان کے اندر کا کرب نظر آنے لگا۔ "میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ یہ تو ایک فطری بات تھی۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا، کیا جواب دیا؟"

انہوں نے کہا "میرے لیے تمہاری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کسی کی ہتھیلی پر کوئی انگارہ رکھ دے۔ اب تم خود سوچ سکتے ہو کہ میں تمہیں کس طرح برداشت کررہی ہوں۔"

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ جاوید منہاس نے ان کے ہاتھ پر اپنا محبت بھرا ہاتھ رکھ کر گویا انہیں دلاسا دیا۔ بلیغ الرحمٰن بولے۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سراسر انتقامی کارروائیوں پر کمر بستہ ہیں۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس بات کا انتقام لے رہی ہیں؟" یہ امین الدین کا سوال تھا۔

"ہتھیلی پر انگارے کی مثال سے کیا اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ وہ انہیں زبردستی برداشت کررہی ہیں۔" منہاس صاحب نے کہا "ان کے والدین نے زبردستی ان کے ساتھ شادی کردی ہوگی۔ ان کا دل کہیں اور اٹکا ہوا ہوگا۔"

"جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" وسیم صاحب بولے۔ "انہوں نے اس راز سے پردہ اُٹھایا کہ تمہارا رشتہ آیا تو میرے ماں باپ نے میری پسند کے رشتے کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ یہ رشتہ ہر صورت میں بہت مناسب ہے۔ لڑکا نہ صرف خاصا پڑھا لکھا ہے بلکہ اچھی ملازمت بھی کرتا ہے اور نیک طینت اور خوش اطوار بھی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند بھی ہے۔"

میں نے ان کی زبانی یہ بات سنی تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے ان سے کہا "یہ بات تم اب بتارہی ہو، اللہ کی بندی شادی سے پہلے نہیں تو شادی کے فوراً بعد بتا دیتیں۔ بخدا میں نہ صرف تمہیں آزاد کردیتا بلکہ تمہارے پسندیدہ شخص سے تمہاری شادی بھی کرادیتا۔"

بانجھ

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
کافی عرصے بعد ایک تحریر ارسال کررہا ہوں. گوکہ یہ جگ بیتی ہے لیکن نفسیاتی گتھیوں کی وجہ سے بہت دلچسپ ہے۔ کچھ حادثات واقعات انسانی زندگی پر کیسے اثرانداز ہوتی ہیں،اسی کا خلاصہ ہے یہ. گھریلو رنجشوں نے ایک حادثے کو جنم دیا اور اس حادثے نے کس طرح ایک طویل عرصے بعد بیوی کو قتل اور شوہر کو جیل پہنچادیا. سبق کے لیے ہی سہی اس سچ بیانی کو ضرور جگہ دیں

نوشاد عادل
(کراچی)

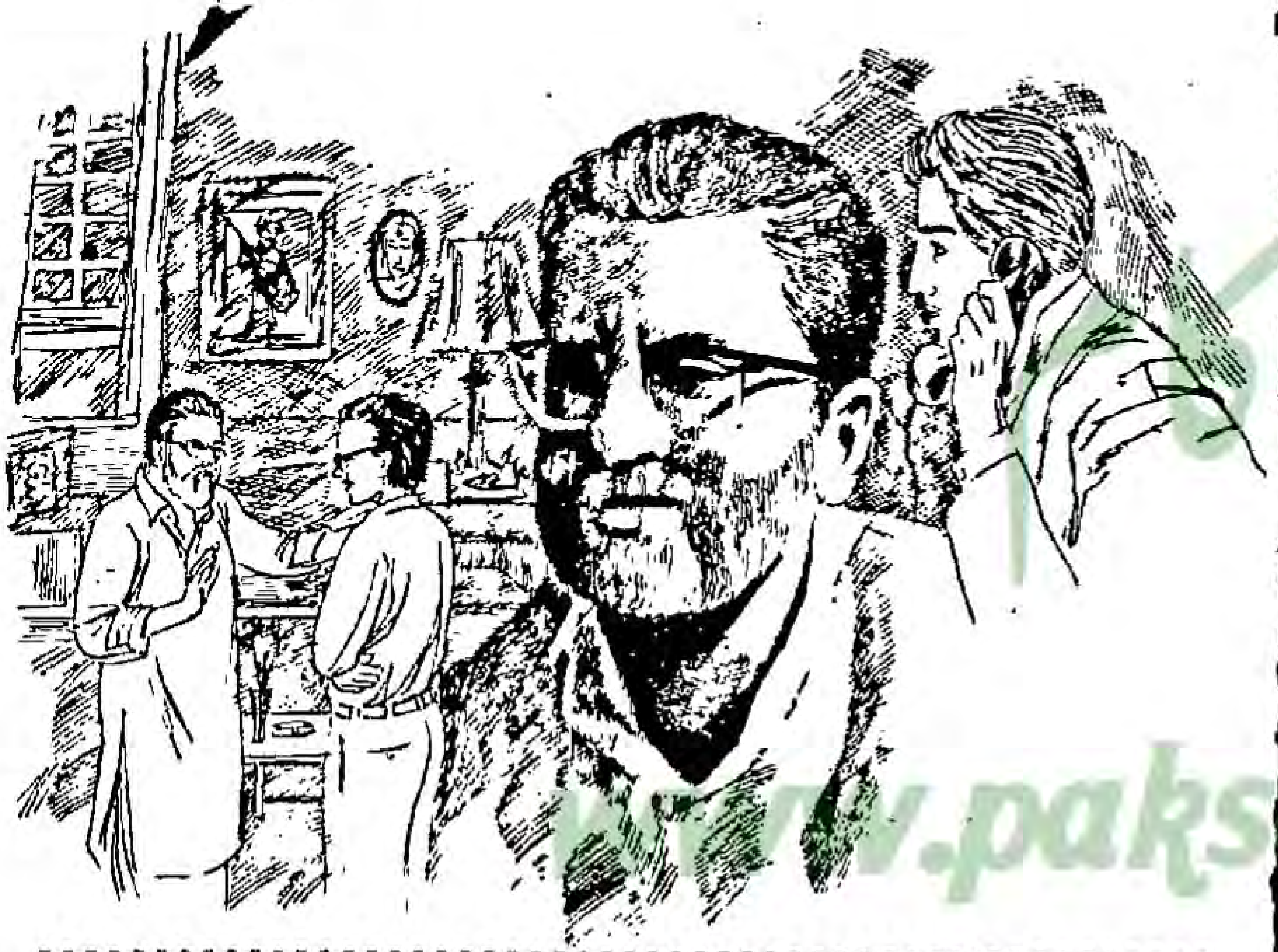

میں نے زینے کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ ٹھٹک گیا۔

زینے پر مرغیوں کی کٹی ہوئی گردنیں پڑی تھیں۔ میں حیرت زدہ سا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ نہ جانے کس نے مرغیوں کی کھوپڑیاں یہاں ڈال دی تھیں۔ بعض کھوپڑیوں پر جما ہوا خون بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ ان کھوپڑیوں کی بے نور اور زندگی کی چمک سے محروم آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا تھا لیکن پھر میں نے سر جھٹک دیا اور زینے پر چڑھتا چلا گیا۔ ویسے بھی دفتر سے واپسی پر تھکن کے مارے بُرا حال ہوجاتا ہے۔ اپنے فلیٹ کے دروازے کے آگے پہنچ کر میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

تھوڑی سی دیر میں دروازہ کھلا اور شازیہ کی شکل نظر آئی۔

میں اندر آیا تو اس نے پوچھا ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا...... چہرہ اُترا اُترا سا لگ رہا ہے؟“

”طبیعت تو ٹھیک ہے بس تھکن آج زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے بیگ کارپٹ پر رکھتے ہوئے شازیہ کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر کہا ”چائے مل جائے گی؟“

وہ مسکرادی ”بالکل مل جائے گی...... تیار رکھی ہے۔“

میں نے سر ہلایا اور وہ کچن کی طرف چل دی۔ میں صوفے پر آنکھیں بند کیے نیم دراز پڑا رہا۔ واقعی جسم تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ آدھے گھنٹے کا راستہ سوا گھنٹے یا ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ پورا دن آفس میں دماغ سوزی کے بعد ٹریفک کے اژدہام میں رہی سہی توانائیاں زائل ہو جاتی تھیں۔ بلکہ آفس میں بھی اتنی تھکن نہیں ہوتی تھی جتنا ٹریفک میں پھنس کر ہو جاتی تھی۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ ہم لوگ آفس میں کام کرنے کی نہیں بلکہ ٹریفک کے سیلاب میں پھنسنے کی تنخواہ پا رہے ہیں۔ اتنے میں شازیہ چائے لے آئی۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مجھے زینے پر پڑی مرغیوں کی کھوپڑیوں کا خیال آیا ”شازی! ابھی میں اوپر آرہا تھا تو میں نے زینے پر مرغیوں کی کٹی ہوئی گردنیں دیکھی تھیں...... پتا نہیں کس نے ڈالی ہیں...... تم نے دیکھیں؟“

”ہاں، دیکھ چکی ہوں۔“ شازیہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا ”یہ جو ہمارے اوپر والا فلیٹ ہے نا...... مقصود صاحب کا...... وہی ڈالتے ہیں۔“

”مقصود صاحب!“ مجھے خاصا تعجب ہوا ”تمہیں کس نے بتایا؟“

”ناہید باجی نے... وہ تو بتا رہی تھیں کہ چار سال سے وہ یہ تماشا دیکھ رہی ہیں۔“

”بڑی حیرت کی بات ہے۔“ میں نے ہونٹوں کو سکیڑ کر کہا۔

ہمیں اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے ابھی محض پانچواں روز تھا۔ مقصود صاحب سے آتے جاتے، ایک دو بار میری سلام دعا اور مختصر سی رسمی گفتگو ہوئی تھی۔ خاصی اچھی پرسنالٹی تھی ان کی۔ پڑھے لکھے تھے اور کسی بڑی پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے۔ ان جیسی شخصیت سے ایسی حرکت کا منسوب ہونا تعجب خیز ہی تھا۔

میری اور شازیہ کی لو میرج تھی۔ ہماری شادی کو دوسرا مہینا تھا۔ میرے بڑے بھائی میری لو میرج سے خوش نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری شادی اپنی میٹرک پاس سالی سے کرنا چاہتے تھے اور انہیں اس بات پر اُکسانے والی ان کی بیوی یعنی بڑی بھابی صاحبہ ہی تھیں۔ میں خوش شکل تھا، کوالی فائیڈ اور اچھی جاب کرتا تھا۔ بھابی نے یقیناً شروع سے ہی مجھ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے ایما پر اکثر ان کی چھوٹی بہن بشریٰ ہمارے گھر کئی کئی دنوں کے طعام و قیام کے لیے آدھمکتی تھی۔ مقصد میری خصوصی توجہ کا حصول تھا۔ بھابی اور محترمہ بشریٰ کے خطرناک عزائم بھانپ کر میں نے حفاظتی اقدامات کر لیے تھے اور بشریٰ کی موجودی میں گھر سے اکثر باہر ہی رہتا تھا اور راتوں کو دیر سے گھر میں آتا تھا۔ ایسے میں بھابی اور بشریٰ تملا کر رہ جاتی تھیں اور مجھے اوور ایکٹنگ کے پُرلطف مظاہرے دیکھنے اور محظوظ ہونے کے متعدد مواقع میسر آتے تھے۔

شکلاً بشریٰ اچھی تھی مگر بہت تیز طبیعت کی تھی۔ مگر میری اس پر توجہ نہ دینے کی سب سے بڑی وجہ شازیہ تھی۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ہی ہوتی تھی اور ہماری دوستی بڑھتے بڑھتے محبت میں ڈھل گئی تھی۔ وہ بالکل ایسی ہی تھی جیسی لڑکی میرے تصور میں تھی۔ اس کے گھر والے بھی مجھے پسند کرتے تھے۔ ان کی طرف سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میرے گھر میں بڑے بھائی اور بھابی کا مسئلہ تھا۔ بڑے بھائی اکثر اشاروں کنایوں میں مجھے کہہ چکے تھے کہ انہیں میرے لیے بشریٰ پسند ہے مگر ہمیشہ میں نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے میں نے ان کی بات سمجھی ہی نہیں۔ آخر کئی مراحل سے گزر کر شازیہ اور میری شادی ہو گئی۔ بہ ظاہر بڑے بھائی اور بھابی نے شرکت تو کی تھی لیکن انہیں اندر سے معمولی سی خوشی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری شادی ہوتے ہی بشریٰ پردۂ اسکرین سے غائب ہو گئی۔ اب اس کے ہمارے ہاں آنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا۔ شازیہ بہت اچھی بیوی اور بہو ثابت ہوئی۔ اس نے چند ہی دنوں میں گھر بھر کا دل جیت لیا۔ امی ابو شازیہ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی عدنان تو اپنی بھابی کا دیوانہ تھا۔ یہ سب بڑی بھابی کی برداشت سے باہر ہو گیا تو انہوں نے شازیہ سے بات بے بات لڑائی کے بہانے ڈھونڈنا شروع

کردیے۔ میرے والدین سیدھے سادے تھے، لڑائی جھگڑوں سے بہت گھبراتے تھے۔ بڑی بہو کی تند مزاجی سے وہ اچھی طرح واقف تھے لہٰذا اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا سیدھا سادہ حل میں نے یہ نکالا کہ گھر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو جاؤں۔ میں نے اس سلسلے میں ابو اور امی سے بات کی۔ ”اب آپ ہی بتائیں کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ درست ہے یا نہیں؟“

”بیٹا، ہماری تو ہمیشہ یہی خواہش اور کوشش رہی کہ ہم سب ایک ساتھ ہی رہیں، ہماری اولادیں ہماری نظروں سے دور نہ ہوں لیکن حالات کے تحت تمہاری تائید کرنا پڑ رہی ہے ورنہ...... حالات مزید کیسا رُخ اختیار کر لیں۔“ ابو نے دکھی لہجے میں کہا تھا۔ ان کے چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیں لہرا رہی تھی۔

”میں نے بھی یہ فیصلہ اسی لیے کیا ہے...... میں نہیں چاہتا کہ گھر میں کشیدگی دیکھ کر آپ کو دکھ پہنچے۔ ابھی معاملہ کم نوعیت کا ہے مگر تلخیاں بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ میں وہ وقت آنے سے پہلے ہی یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے ابو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

امی بہ دستور خاموش تھیں مگر ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ اندر دکھ کا سمندر موجزن ہے۔ میں ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا اور آہستگی سے بولا ”امی! آپ فکر نہ کریں، میں اور شازیہ کہیں بہت دور نہیں جائیں گے۔ آتے جاتے رہا کریں گے...... بس آپ دونوں ہمارے لیے دعائیں کرتے رہیں۔“

”وہ تو میں ہمیشہ کرتی ہوں...... سب کے لیے۔ تم سب میری اولاد ہو۔“ امی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ نکلی تھیں۔

اس طرح میں شازیہ کو لے کر اس فلیٹ میں شفٹ ہو گیا تھا۔ دو کمروں کا مختصر سا فلیٹ بڑا صاف ستھرا تھا۔ پہلے یہاں مالک اپنی فیملی کے ساتھ خود رہا کرتا تھا۔ پھر وہ کسی پوش علاقے میں چلا گیا اور یہ فلیٹ ہمیں کرائے پر دے گیا۔ کرایہ تو زیادہ تھا مگر ہمیں اس علاقے میں اور کہیں فلیٹ نہیں مل رہا تھا۔ یہاں فلیٹ لینا بھی ضروری تھا کیونکہ یہاں سے میرا گھر نزدیک تھا اور شازیہ کا بھی۔ گویا میں اپنے گھر اور سسرال کے درمیان میں رہ رہا تھا۔ میں سارا دن آفس میں ہوتا تھا لہٰذا شازیہ کو سودا سلف کے لیے پریشانی ہوتی تھی۔ لیکن عدنان

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور بیرونِ ملک شہر میں

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

... کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

... کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

... کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 35895313 فیکس 35802551

www.Paksociety.com

نے یہ مسئلہ بھی حل کردیا تھا۔ وہ روز صبح شام چکر لگاتا تھا۔ اس کے پاس بائیک تھی اس لیے اسے ایک روز میں دو بار آنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوتی تھی۔ وہ سودا سلف لا دیتا تھا۔ اس طرح ہمارا یہ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

اگلے روز چھٹی تھی، میں کسی کام سے نیچے اُتر رہا تھا تو آخری زینے پر مقصود صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دے کر بولے ''نعمان صاحب! اب تو آپ باقاعدہ ہمارے پڑوسی ہوگئے ہیں۔ کسی روز ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں نا۔''

''ضرور مقصود صاحب...... ضرور......'' میں نے کہا۔

اس کے بعد کافی دیر تک وہ میرا انٹرویو لیتے رہے اور اپنے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے۔ پھر موضوع کا رُخ ملکی حالات و سسٹم کی طرف مڑ گیا۔ سیاست اور ملکی سسٹم سے وہ بہت ہی زیادہ نالاں و شاکی تھے۔ بہت دیر تک وہ بولتے رہے اور میں بے چارگی کے عالم میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ جان اس وقت چھوٹی جب ان کی بیگم صاحبہ نے آواز لگائی، غالباً انہوں نے مقصود صاحب کی آواز سن لی تھی۔

مقصود صاحب مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے عجلت آمیز لہجے میں بولے ''اچھا بھئی، پھر کبھی اسی موضوع پر بات ہوگی۔ ابھی تو بات اُدھوری رہ گئی ہے۔ ہماری بیگم سودے کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔''

وہ اوپر چلے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اچھا خاصا دماغ پی لیا تھا انہوں نے۔

شام کی چائے پر میں اور شازیہ گیلری میں کھڑے تھے۔ نیچے چھوٹے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان دنوں ورلڈ کپ کا بھی غلغلہ تھا۔ ہر شخص کرکٹ کی باتیں کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ بچے اور بڑے بھی روز شام بیٹ بال سے کھیلتے نظر آتے تھے۔ اتنے میں ہماری نظر مقصود صاحب پر پڑی۔ وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک بچے نے شاٹ کھیلا، بال تیزی سے مقصود صاحب کی طرف لپکی اور ان کے پیروں سے ٹکرائی۔ بچوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

مقصود صاحب ٹھٹک گئے اور خونی نظروں سے بچوں کو دیکھنے لگے۔ پھر وہ قدرے ترش اور بلند آواز میں بولے ''نظر نہیں آتا تم لوگوں کو...... دیکھ کر نہیں کھیل سکتے...... کرکٹ نہیں ہوئی مصیبت ہوگئی...... ہر وقت کھیلتے رہتے ہو۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں میں......''

بچے خاموش رہے۔ مقصود صاحب تھوڑی دیر تک بڑبڑاتے رہے پھر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی کرکٹ دوبارہ شروع ہوگئی۔

''حیرت ہے۔ چھوٹی سی بات پر انہوں نے بچوں کو اس بُری طرح جھڑک دیا۔'' میں نے شازیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مقصود صاحب جیسے باشعور اور پڑھے لکھے انسان کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کون سا بچوں نے جان بوجھ کر بال ماری تھی۔''

''اس لیے کہ ان کے اپنے بچے نہیں ہیں۔'' شازیہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، اس کی نظریں گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب؟ مقصود صاحب کے بچے نہیں ہیں؟'' مجھے سخت تعجب ہوا تھا۔ کیونکہ مقصود صاحب خاصے پختہ عمر کے آدمی تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ کو بھی میں نے دیکھا تھا۔ ان کی جوانی بھی تقریباً ڈھل چکی تھی۔ میرا تو یہ خیال تھا، ان کے بچے پندرہ سولہ سال کے تو ہوں گے مگر میں نے اس بات پر اب غور کیا کہ ان کے بچوں کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔

''ہاں یہ بات درست ہے۔ حیرت تو مجھے بھی ہوئی تھی کہ مقصود صاحب بے اولاد ہیں۔''

''ہوسکتا ہے کہ ان کی شادی لیٹ ہوئی ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ شادی تو ان کی وقت پر ہوگئی تھی۔''

''یہ بات تمہیں ناہید باجی نے بتائی ہوگی؟'' میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

''ظاہری بات ہے...... وہی اس جگہ کی نمائندہ ہیں۔'' شازیہ نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

پھر جب تک ہم دونوں گیلری میں کھڑے رہے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

رات شازیہ تو جلد سوگئی۔ مجھے آفس کا کچھ کام کرنا تھا۔ اس لیے میں ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا اور پہلے تھوڑی دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا۔ بارہ بجے میں نے ٹی وی بند کیا اور آفس کے کام میں مصروف ہوگیا۔ گیلری کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ دفعتاً مجھے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک گیا۔ پہلے تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید کسی فلیٹ میں ٹی وی آن ہے اور میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے اپنے خیال کو رَد کرنا پڑا، یہ آواز گیلری کی جانب سے آرہی تھی۔ میں اُٹھ کر آہستگی کے ساتھ گیلری کی جانب بڑھا۔ آواز واقعی وہیں سے آرہی

تھی۔ غور کیا تو ایسا لگا جیسے کوئی شخص کسی سے کچھ بول رہا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر گیلری سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہاں چند موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں اور بہت کم روشنی تھی۔ میں نے بہ غور دیکھا تو ایک ہیولا سا مجھے دیوار کے ساتھ بیٹھا دکھائی دیا۔ وہی کچھ بول رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہاں وہ اکیلا ہی تھا۔ پھر وہ کس کے ساتھ باتیں کررہا ہے؟ تب میں نے محسوس کیا کہ اس نے گود میں کسی بلی کو لیا ہوا تھا اور وہ اسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی آواز سننی شروع کردی تو اس کی بھنبھناہٹ آمیز آواز کا مفہوم میری سمجھ میں آنے لگا۔

''بیٹا...... میں نے منع کیا تھا ناں کہ یہاں سے کہیں دور مت جایا کرو۔ یہاں کے بچے بڑے ذلیل ہیں...... بلاوجہ تمہیں پتھر مارتے ہیں۔ آئندہ کہیں مت جانا، چلو اب یہ کھانا کھالو۔''

وہ اس کے سر اور پشت پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آواز سے میں نے پہچانا کہ وہ مقصود صاحب تھے۔ مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ رات کے اس وقت یہاں اندھیرے میں بیٹھے ایک بلی سے باتیں کررہے تھے۔ بلی ان کی گود میں لوٹ پوٹ ہورہی تھی۔ وہ بھی ان سے بہت مانوس لگ رہی تھی۔ مقصود صاحب کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بلی نہیں بلکہ ان کی اولاد ہو۔ میں خاصی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ تب میرے عقب میں آہٹیں اُبھریں تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

شازیہ شب خوابی کے لباس میں کھڑی حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آگئی۔

''کیا ہوا ہے؟'' شازیہ نے تجسس آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔ اس کے ماتھے پر فکرمندی کی لکیریں نمودار ہوگئی تھیں۔

''گیلری سے نیچے دیکھو مگر بہت احتیاط اور خاموشی سے...... بولنا نہیں۔'' میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

شازیہ آگے بڑھی اور نیچے جھانکنے لگی۔ پھر مڑ کر بولی ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

میں نے تیزی سے بڑھ کر دیکھا۔ مقصود صاحب جاچکے تھے۔ ''اوہ...... وہ چلے گئے۔''

''کون چلے گئے؟ کون تھا نیچے؟'' شازیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی بھی نیند بھری ہوئی تھی اور شاید دماغ بھی پوری طرح سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ ''کیا نیچے چور تھے؟''

''ارے نہیں بھئی......'' میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی ''مقصود صاحب تھے...... میں آفس کا کام کررہا تھا تو کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے جاکر دیکھا تو مقصود صاحب بیٹھے نظر آئے، وہ ایک بلی کے ساتھ باتیں کررہے تھے...... اور پتا ہے...... ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے بچے سے باتیں کررہے ہوں، اسے سمجھا رہے ہوں، پتا نہیں کیا چکر ہے؟''

''مجھے تو ان سے ڈر لگتا ہے...... کچھ پُراسرار سے لگتے ہیں۔ وہ بھی اور ان کی بیگم بھی۔'' شازیہ نے خوف زدہ آواز میں کہا اور میں اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑا۔ شازیہ میرے ہنسنے پر بُرا مان گئی۔ ''اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے...... میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ یہاں تقریباً سب ہی عورتیں یہی بات کہتی ہیں۔ باقی تو سب عورتیں ایک دوسرے سے میل جول رکھتی ہیں، ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی ہیں مگر واحد مقصود صاحب کی بیگم ہیں جو کسی سے تعلق نہیں رکھتیں۔ تعلق تو دور کی بات، کسی سے بات بھی نہیں کرتیں۔''

''میں ہنس اس لیے رہا تھا کہ کہیں تم انہیں جادوگر تو نہیں سمجھ رہی ہو۔ خیر، اب تم جاکر سو جاؤ...... میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس پندرہ بیس منٹ میں نمٹا لوں گا۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ سر ہلا کر اُٹھ گئی۔

اگلے روز جب میں آفس سے گھر آیا تو ہم نے آج باہر کھانے کا پروگرام بنایا۔ یوں بھی گرمیوں کے دن تھے۔ جب ہم نکلنے لگے تو عدنان بھی آپہنچا۔ اس نے ہمیں تیار دیکھ کر چھوٹتے ہی پوچھا۔

''اوہو...... کہاں جارہی ہے سواری...... شاید میں نے غلط موقعے پر انٹری دی ہے؟'' اس کا لہجہ شوخ تھا۔

''غلط نہیں، بالکل درست وقت چھاپا مارا ہے...... آج ہم باہر کھانا کھانے جارہے ہیں۔'' شازیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''واہ...... مزے آگئے...... چلیں پھر؟''

''مزے تو ہمارے آگئے...... آخر ساتھ میں ہنسنے ہنسانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔'' شازیہ نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

کھانا ہم تینوں نے باہر ہی کھایا تھا۔ پھر ٹہلتے ہوئے اس چھوٹے سے پارک میں آگئے جو ہمارے اپارٹمنٹس کے سامنے ہی تھا۔ گرمیوں کی راتوں کو اکثر فیملیز کھانے وغیرہ کے بعد اِدھر ہی آجاتی تھیں۔ بچوں کے تو مزے ہی آجاتے

PAKSOCIETY.COM

تھے۔ وہ پورے پارک میں بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ بڑے یا تو بیٹھ کر باتوں میں مگن رہتے یا ٹہلتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔ ہم تینوں بھی ایک بینچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ عدنان ہم دونوں کو مسلسل ہنسا رہا تھا پھر وہ آئس کریم لینے کے لیے چلا گیا۔

اتنے میں شازیہ نے میرے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا اور سامنے کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مقصود صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ہماری جانب ہی آ رہے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ مقصود صاحب نے اپنی گود میں ایک بلی لی ہوئی تھی۔ وہ بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور دھیرے دھیرے اس سے کچھ کہتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ پارک میں کھیلتے کودتے بچوں کو نفرت انگیز نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ وہ دونوں ہم سے خاصے فاصلے پر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

اسی لمحے عدنان آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں یقیناً آئس کریم تھی۔ میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

''عدنان آ رہا ہے، تم اس کے ساتھ بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔''

شازیہ نے حیرت سے پوچھا ''مگر آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''کہیں نہیں جا رہا...... اِدھر ہی ہوں...... بس پانچ منٹ میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ شازیہ مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میرا رُخ مقصود صاحب کی جانب تھا۔ عدنان نے بھی مجھے اُٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے شازیہ کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ میں ٹہلنے کے انداز میں مقصود صاحب کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے مجھے دیکھ لیا اور والہانہ انداز میں بولے۔

''ارے بھئی، کہاں جا رہے ہیں...... ہم اِدھر بیٹھے ہیں۔''

میں نے چونک کر انہیں یوں دیکھا جیسے وہاں سے گزرتے ہوئے میری ان پر نظر نہیں پڑی تھی ''ارے مقصود صاحب، آپ...... سوری، میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔''

انہوں نے اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر کہا ''بھئی، آپ اِدھر ہی بیٹھیں، ہم ذرا گپ شپ کر لیں ان سے...... ابھی ٹہل کر آتے ہیں۔''

ان کی بیگم نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی نظریں مسلسل وہاں کھیلتے کودتے بچوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ بہ ظاہر مقصود صاحب تو عام سے شخص دکھائی دیتے تھے، ان کا انداز بھی بے تکلفانہ تھا لیکن ان کی بیگم صاحبہ واقعی کچھ پُراسرار سی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم دونوں وہاں سے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ گئے۔ مقصود صاحب کی گود میں اب تک بلی موجود تھی۔

''لگتا ہے یہ بلی آپ کی بڑی چہیتی ہے اس لیے آپ اسے بھی ساتھ لے آئے ہیں۔'' میں نے بلی کی طرف اشارہ کیا۔

''بلی......؟'' مقصود صاحب تھوڑا سا ٹھٹکے ''نہیں بھئی...... یہ بلی نہیں بلکہ میرا بیٹا ہے...... میری اولاد ہے یہ...... مہربانی کر کے آیندہ اسے بلی مت کہیے گا...... مجھے تکلیف ہوتی ہے...... میں نے ہر کسی سے یہی کہا ہوا ہے کہ یہ میری اولاد ہے۔ دو دن کا تھا یہ...... جب سے میں نے اس کی پرورش کی ہے۔''

''اوہ...... سوری، مجھے علم نہیں تھا، آیندہ خیال رکھوں گا۔'' میں نے معذرت کی۔ ان کا چہرہ کھل اُٹھا۔

''کوئی بات نہیں...... آپ کو پتا نہیں تھا مگر اب تو پتا چل گیا ہے......''

پھر وہ کرکٹ پر باتیں کرنے لگے۔ مجھے کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور جب سے قومی ٹیم مسلسل ناقص کارکردگی دکھا رہی تھی تو میں مزید بددل ہو گیا تھا۔ مگر وہ مسلسل ٹیم کی حمایت میں زور و شور سے بولے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے بہانہ کر کے ان سے جان چھڑائی تھی۔

دو تین دن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔ چوتھے روز شازیہ نے مجھے بتایا کہ آج مقصود صاحب کی بیگم صاحبہ نے ایک عجیب حرکت کی ہے۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا۔

''اپنے بلاک کے کچھ بچے سیڑھیوں پر اوپر نیچے بھاگتے پھر رہے تھے اور شور بھی کر رہے تھے۔ مقصود صاحب کی بیگم صاحبہ نے اپنے فلیٹ سے باہر نکل کر ایک بچے کو جھپٹ کر پکڑ لیا اور اس کے منہ پر دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ حالانکہ وہ بچوں کو ڈانٹ بھی سکتی تھیں، انہیں پیار سے سمجھا سکتی تھیں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا انہیں اچانک؟ مجھے تو وہ عورت دماغی مریضہ لگتی ہے۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خود کے بچے نہیں ہیں......'' میں نے پُرخیال انداز میں قیاس آرائی کی۔

''میرے دماغ میں بھی یہی بات آئی تھی...... ناہید

www.paksociety.com

باجی نے بھی کہا تھا کہ وہ عورت بچوں سے نفرت کرتی ہے اور بچوں سے نفرت کی وجہ سے لوگوں سے تعلق نہیں رکھتی۔ ''مقصود صاحب نے بھی اس روز کرکٹ کھیلتے ہوئے بچوں کو معمولی سی بات پر ڈانٹ دیا تھا۔''

''ویسے مقصود صاحب کوئی بوڑھے آدمی تو نہیں ہیں...... چاہیں تو اولاد کے لیے...... دوسری شادی کر سکتے ہیں۔'' شازیہ نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے مسکرا کر کہا ''چلو ٹھیک ہے...... اگر کہو تو تمہارا یہ مشورہ مقصود صاحب تک پہنچا دوں؟''

''ہاں پہنچا دیں بلکہ لڑکی ڈھونڈ کر شادی بھی کرا دیں۔'' وہ چڑ کر بولی اور میرے منہ سے قہقہہ نکل گیا۔

بہرحال میں ابھی تک مقصود صاحب سے ایسا بے تکلف نہیں تھا کہ ان سے یہ بات کہتا۔

مقصود صاحب اپنی بلی کو واقعی بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ وہ اس کے کھانے کے لیے مرغی والے کی دکان سے مرغیوں کی کھوپڑیاں لے آتے تھے۔ زینے پر اکثر مرغیوں کی کھوپڑیاں پڑی ملتی تھیں جو ان کی بلی چھوڑ دیتی تھی۔ پھر شازیہ کے ذریعے یہ بات بھی علم میں آئی کہ انہوں نے اپنی پسند کی شادی اپنے گھر والوں کی مخالفت مول لے کر کی تھی۔ بڑے جھگڑے بھی ہوئے تھے مگر وہ مستحکم رہے اور گھر والوں نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس بات کی بھی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ پھر وقت اتنا گزر گیا مگر ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ مقصود صاحب عجیب آدمی تھے، انہوں نے اس مسئلے کو بھی ہمیشہ ہنس کر ٹالا تھا مگر اندر سے وہ بہت اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس کا حل یوں نکالا کہ ایک بلی پال لی اور اس کی پرورش اولاد کی طرح کرنے لگے۔

بات صرف ایک بلی کی نہیں تھی۔ مقصود صاحب کی بلیوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ہمارے اپارٹمنٹس کی تمام بلیاں ان کے فلیٹ کے آگے اور زینوں پر منڈلاتی رہتی تھیں۔ اس امید سے کہ انہیں کھانے کو مرغیوں کی کھوپڑیاں مل جائیں گی۔ وہ اپارٹمنٹس میں ''بلیوں والے انکل'' کے نام سے مشہور تھے۔ بچہ بچہ انہیں اسی لقب سے پکارتا تھا۔ مقصود صاحب کا اس پر کوئی ردِعمل نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ یہ سن کر سنی اَن سنی کر دیتے تھے، کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اچھا لگتا ہے یا بُرا۔

جب شازیہ امید سے ہوئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ امی اور ابو بھی بہت خوش تھے۔ خوش تو بڑے بھائی بھی تھے مگر بھابی کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں اپنی خوشی میں مگن تھا۔ اب شازیہ کو احتیاط کی ضرورت تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ ناہید باجی آ جاتی تھیں، ان کی وجہ سے میں خاصی حد تک بے فکر ہو گیا تھا۔

ایک روز شازیہ نے مجھے ایک عجیب بات بتائی ''آج میں کمرے میں لیٹی ہوئی تھی تو ناہید باجی کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ مجھے آواز دے رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ناہید باجی کے فلیٹ کے دروازے کی کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ میں باہر نکل کر وہ کھولنے کے لیے بڑھی تو مقصود صاحب کی بیگم صاحبہ پر نظر پڑی۔ وہ عجیب نفرت بھرے انداز سے مجھے دیکھ رہی تھیں......'' شازیہ نے اپنے پیٹ کی جانب اشارہ کر کے قدرے شرما کر کہا۔

''وہ ایک نفسیاتی عورت ہے۔ اگر دیکھتی ہے تو دیکھنے دو...... ہمارا کیا جاتا ہے۔ تم بلاوجہ وہم مت کرو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے جان بوجھ اسے یہ تاثر دیا کہ اس میں کوئی تشویش کی یا فکر کی بات نہیں ہے۔ عورت چاہے کتنی پڑھی لکھی ہی کیوں نہ ہو، وہمی ضرور ہوتی ہے۔ چھوٹی موٹی باتوں سے شگون لے لیتی ہے، اس حد تک کہ نہ ہونے والی بات بھی ہو جاتی ہے۔

شازیہ کو میں کچھ دنوں کے لیے اس کے گھر چھوڑ آیا۔ اس کی والدہ بہت اصرار بھی کر رہی تھیں۔ آفس میں بھی کام زیادہ تھا۔ میں کافی دنوں تک بہت معروف رہا تھا۔ گھر بھی دیر سے آنا ہوتا تھا۔ اکثر پہلے شازیہ کے والدین کے گھر جاتا تھا اور پھر وہاں سے اپنے فلیٹ میں واپسی ہوتی تھی۔ ایک رات کو میں جب اپنے فلیٹ میں آ رہا تھا تو مقصود صاحب کو زینے پر کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ میری طرف پشت کیے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی ''مقصود صاحب...... خیر تو ہے نا؟''

لیکن ان کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں متجسس ہو کر آگے بڑھا اور اگلے ہی لمحے مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ مقصود صاحب سے تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی چہیتی بلی مری پڑی تھی۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا۔ خون اس کی گردن اور جسم کے بالوں پر جم کر رہ گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو گئی ہے اور کسی نے اس کے سر پر کسی بھاری چیز کی زوردار ضرب لگائی تھی۔ مقصود صاحب پتھرائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔

''یہ...... یہ کیا ہو گیا۔ کس نے مارا اسے؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

مقصود صاحب نے میکانیکی انداز میں گردن گھما کر مجھے

ایک نظر دیکھا اور پھر دوبارہ بلی کی جانب تکنے لگے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ اتنے میں مجھے کسی نے دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ میں نے دیکھا، اوپر ناہید باجی کھڑی مجھے اشارے سے بلا رہی تھیں۔ میں گہری سانس لے کر اوپر آ گیا۔ ناہید باجی اور ان کے شوہر وہاں موجود تھے۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ میں لے آئے۔

''یہ کیا قصہ ہے...... کیا ہو گیا ہے...... ان کی بلی کو؟'' میں نے اندر آتے ہوئے پوچھنا چاہا۔

''ان کی بیگم صاحبہ نے ہی مارا ہے......'' ناہید باجی نے میری بات کاٹتے ہوئے بتایا ''بلی کے سر پر ڈنڈا مارا تھا۔ تڑپ تڑپ کر جان دی ہے اس نے...... خدا غارت کرے اس بے رحم عورت کو...... اور پتا ہے کیوں مارا ہے اس نے بلی کو؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''بلی بچے دینے والی تھی...... اس لیے......'' ناہید باجی کے شوہر شاکر بھائی نے کہا۔

اور معاملہ میرے سامنے واضح ہو گیا، میں نے سر پکڑ لیا ''اُف خدایا۔ وہ اتنی خطرناک عورت ہے۔''

''خود اندازہ کر لو۔ قسمت نے اولاد سے محروم رکھا ہے تو وہ کسی اور کے ہاں بھی اولاد دیکھ نہیں سکتی حتیٰ کہ ایک جانور کی اولاد بھی نہیں......'' ناہید باجی نے کہا۔

''اس لیے وہ اور مقصود صاحب بچوں کو ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں، لیکن مقصود صاحب کو تو وہ بلی اپنی اولاد کی طرح عزیز تھی۔ انہوں نے اپنی بیگم کو کچھ نہیں کہا؟''

''انہیں علم ہی نہیں ہے کہ بلی کو کس نے مارا ہے...... بلکہ آس پڑوس میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ تو میں نے کچن کی جالیوں سے دیکھ لیا تھا۔'' ناہید باجی نے بتایا۔

میں اُلجھن آمیز انداز میں سوچتا رہ گیا کہ یقیناً وہ عورت اگر پاگل نہیں تو نفسیاتی مریضہ ضرور ہے۔ اولاد کی محرومی نے اسے نیم پاگل کر دیا ہے۔

پھر آفس کے کاموں میں اُلجھ کر میں نے یہ واقعہ بھلا دیا۔ شازیہ بھی گھر آ گئی۔ ڈاکٹر نے تاریخ دے دی تھی۔ ہم نے بھی آنے والے بچے کے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اب صرف اس کی آمد کا انتظار تھا۔ میں نے گھر کے کاموں کے لیے وقتی طور پر ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ شازیہ کو مکمل آرام کا کہہ دیا تھا۔ ملازمہ شام سے پہلے ہی تمام کام مکمل کر کے چلی جاتی تھی۔ ایک روز آفس میں کام کرتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہ ظاہر میری طبیعت ٹھیک ٹھاک تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بار بار شازیہ کی جانب دھیان جا رہا تھا۔ ملازمہ کے جانے کے بعد تو وہ اکیلی ہوتی تھی جب تک میں گھر نہیں پہنچ جاتا تھا۔ میں نے اپنے باس سے جلد چھٹی لے لی اور گھر روانہ ہو گیا۔ جب میں فلیٹ پر پہنچا تو مغرب ہو رہی تھی۔ شازیہ نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کا مسکراہٹ بھرا چہرہ دیکھ کر میری تمام گھبراہٹ اور ٹینشن دور ہو گئی۔

''کیا ہوا، آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں اور آج جلدی بھی آ گئے؟''

''ہاں، بس طبیعت ایسی ہو رہی تھی اور تو کوئی خاص بات نہیں......'' میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''آپ نہا لیں...... چائے تیار ہے، میں گرم کر کے لا دیتی ہوں۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

میں کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی نہانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں تیزی سے اُٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا لیکن مجھ سے پہلے شازیہ دروازے تک پہنچ چکی تھی، اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے وقت شازیہ تھوڑا دروازے کی آڑ میں ہو گئی تھی۔

شازیہ کے عقب سے میں نے مقصود صاحب کی بیگم کو دیکھا۔ ان کا چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور ...... اور ان کے ایک ہاتھ میں چھری بھی تھی۔ شازیہ کو دیکھتے ہی وہ خوفناک انداز میں چیخ کر اس کی جانب چھری اٹھا کر لپکیں۔

اُف خدایا...... وہ بہت ہولناک لمحات تھے۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ چھری سے شازیہ کا پیٹ چاک کر دینا چاہتی تھیں۔ ایسے میں دروازے کی آڑ نے بچا لیا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شازیہ کو اور میرے ہونے والے بچے کو بچا لیا۔ بس اگلے ہی لمحے میں، میں نے پوری قوت سے چلاتے ہوئے بجلی کی طرح لپک کر اس پاگل اور جنونی عورت کا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا۔ شازیہ مسلسل چلائے جا رہی تھی۔ میں نے چلا کر اسے اندر کمرے میں جانے کا کہا۔ وہ جنونی عورت مجھ سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ جنونی کیفیت میں بگڑ کر بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس کے ہاتھ سے چھری چھین لوں۔ مگر نہ جانے اس عورت کے جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ شازیہ کو دیکھ کر وہ وحشی درندے کی طرح غرا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی جان توڑ کوشش کر رہی تھی۔ بالآخر

میں اس کے ہاتھ سے چھری گرانے میں کامیاب ہوگیا اور اسی لمحے شور وغل کی آوازیں سن کر بہت سے افراد وہاں آگئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لہٰذا سب نے ہی یہ تماشا دیکھ لیا۔ ناہید باجی اور پڑوس کی دو عورتیں شازیہ کو وہاں سے لے گئیں۔ کئی عورتوں نے پاگل عورت کو جکڑ لیا تھا۔ اب اس کی مزاحمت ختم ہوگئی تھی۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہرگز نہیں ہوسکتی۔

"یہ...... یہ پاگل ہے...... اسے پاگل خانے میں داخل کروادینا چاہیے...... یہ چھری لے کر آئی تھی اور شازیہ کو قتل کرنا چاہتی تھی...... اس کے پیٹ پر چھری مارنا چاہتی تھی......" میں نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

"اسے تو سیدھا سیدھا پولیس کے حوالے کردینا چاہیے۔" کسی نے صلاح دی۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ یہ تو اقدامِ قتل کا کیس ہے۔"

"ہم تو پہلے ہی کہتے تھے یہ عورت پاگل ہے...... ہزار بار سب نے دیکھا ہے کہ کس طرح رویہ رکھتی ہے، یہ بچوں کی تو دشمن ہے۔"

"اچھا ہی کیا اسے اللہ نے اولاد سے محروم رکھا ہے...... یہ اس قابل نہیں ہے۔"

جتنے منہ اس سے زیادہ باتیں ہورہی تھیں۔ اپارٹمنٹس کے یونین والے آگئے۔ ایک خلقت نیچے جمع ہوگئی۔ چیخ پکار کا عجب عالم تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے دے رہا تھا۔ مقصود صاحب بھی آگئے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے الفاظ نہیں تھے، وہ خاموشی سے کھڑے ایک ایک کی صورت تک رہے تھے اور انتظار کررہے تھے کہ کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ تب تک میں اپنے حواس پر قابو پاچکا تھا۔ مجھے ان کی شکل دیکھ کر رحم آگیا۔ میں نے یونین والوں سے کہا کہ میں مقصود صاحب کی بیگم صاحبہ کو معاف کرتا ہوں، آپ لوگ بھی اس قصے کو یہیں ختم کردیں۔ مگر یونین والے اور دیگر لوگ مان نہیں رہے تھے۔ بالآخر بات یہاں ختم ہوئی کہ مقصود صاحب فی الفور اپنا فلیٹ خالی کرکے کہیں اور چلے جائیں۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی بھیڑ چھٹ گئی اور لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ناہید باجی بہت دیر تک شازیہ کے پاس رہیں۔ وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ میں بھی اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ مسلسل رونے اور ذہن پر ٹینشن لینے سے شازیہ کی طبیعت بگڑنے کا خدشہ تھا۔ ناہید باجی کے جانے کے بعد میں اس وقت تک جاگتا رہا جب تک شازیہ سو نہیں گئی۔

اگلی صبح پچھلی رات سے زیادہ بھیانک اور لرزہ دینے والی تھی۔

مقصود صاحب نے رات، کو کسی وقت اپنی بیگم صاحبہ کو ڈنڈا مار کر ہلاک کردیا تھا اور انہوں نے اسی ڈنڈے سے اپنی بیگم کا سر پھاڑا تھا جس سے انہوں نے بلی کو مارا تھا۔ کسی طرح انہیں بھی علم ہوگیا تھا کہ ان کی چہیتی بلی کو مارنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ان کی بیگم ہیں۔ اس کی وجہ بھی انہیں معلوم ہوگئی تھی کہ ان کی بیگم کو بلی کا ماں بننا گوارا نہیں تھا اور پھر انہوں نے اسی جنونی جذبے کے تحت میری بیوی یعنی شازیہ کو بھی قتل کرنا چاہا تھا کیونکہ وہ بھی ماں بننے والی تھی۔ مقصود صاحب نے موٹے ڈنڈے کی ضرب ایسی طاقت سے لگائی تھی کہ ان کی بیگم کی کھوپڑی کئی حصوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ ان کی سر پھٹی لاش کسی سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ انہوں نے لوگوں اور پولیس کے سامنے اعترافِ جرم کرلیا تھا۔

مقصود صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنی بیگم کو اس لیے ہلاک نہیں کیا کہ انہوں نے ان کی چہیتی بلی کو مارا یا پڑوسی خاتون پر قاتلانہ حملہ کیا بلکہ اس لیے ہلاک کیا کہ انہیں اپنی بیگم سے شدید محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ کہیں اور جاکر بھی ان کی بیگم پھر کوئی ایسی حرکت کریں اور لوگ انہیں پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھجوادیں۔ وہ یہ بات قطعاً برداشت نہیں کرسکیں گے۔

جب انہیں پولیس لے جارہی تھی تو ان کے دو عزیز بھی آگئے تھے، کارروائی کے بعد میں انہیں اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ وہ دونوں ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی کی گرفتاری پر مغموم تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا "اگر آپ کی بھابی بانجھ تھیں تو بھائی کی دوسری شادی کیوں نہیں کرائی؟"

"وہ بانجھ نہیں تھی۔" ان میں سے ایک نے کہا "یہ ایک حادثے کا نتیجہ ہے۔ بھائی نے پسند کی شادی کی تھی۔ میری امی تیز مزاج کی تھیں۔ انہیں یہ بات ازحد بُری لگی۔ ہر وقت گھر میں محاذِ جنگ کا سماں رہتا۔ ایک دن بات بڑھ گئی۔ پھر پتا نہیں کیسے بھابی سیڑھیوں سے نیچے گر گئیں۔ اماں اوپر سے چلّائیں تب ہمیں پتا چلا۔ بھابی کو اسپتال لے گئے۔ حمل ضائع ہوگیا، ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ اب یہ ماں نہیں بن سکیں گی، تب سے بھابی کو ذہنی عارضہ لاحق ہوگیا۔"

دبے لفظوں میں کہی باتوں نے سب کچھ سمجھا دیا کہ ان کے ساتھ جو ہوا وہی وہ دنیا کو لوٹا رہی تھیں۔

کاش

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
اللہ کے بھید اللہ ہی جانے اس دنیا میں ہر روز عجیب عجیب سے واقعات جنم لیتے ہیں. ایسی ایسی باتیں ظہور میں آتی ہیں جن کی عقلی توجیہ بھی ممکن نہیں مگر انہیں رد بھی نہیں کیا جاسکتا. اب اسی واقعے کو لے لیں، یہ سب کچھ اگر میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں بھی اسے سن کر ہنسنے لگتا. اگر پسند آجائے تو شامل اشاعت کرلیں۔
عرفان رضا
(حال مقیم العین، یو اے ای)

میں اُس رات بہت بُری طرح پھنس گیا تھا۔

بے پناہ بارش تھی اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟

میرے پاس جو گاڑی تھی۔ اس کے سائلنسر میں پانی چلا گیا تھا۔ وہ اچانک خراب ہوگئی تھی اور میں اتنی رات گئے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں ابھی ہائی وے پر تھا۔ شہر سے پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر۔

میں دوسرے شہر میں کسی سے ملنے گیا تھا۔ بادل تو شام ہی سے گھر کر آرہے تھے لیکن اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح اچانک بارش شروع ہوجائے گی اور وہ بھی ایسی کہ پناہ بھی نہیں مل سکے گی۔

میں نے گاڑی کو دھکا دے کر ایک سائڈ میں کردیا اور یوں ہی اس ہائی وے پر چلنا شروع کردیا۔ میرے پاس

www.Paksociety.com

موبائل تو تھا لیکن وہاں سگنل موصول نہیں ہو رہے تھے اور اس کی بیٹری بھی ڈاؤن ہو گئی تھی۔

کچھ دور تک تو میں یوں ہی چلتا رہا۔

اس ویرانے میں بے پناہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ بُرا وقت بول کر نہیں آتا۔ نہ جانے کیا ہو جائے۔ پُراسرار قسم کی کہانیاں ایسی ہی راتوں میں جنم لیتی ہیں۔

اچانک اندھیرے میں ہلکی سی روشنی دکھائی دے گئی۔ یہ روشنی سڑک پر نہیں تھی بلکہ دائیں طرف میدان میں کافی فاصلے پر تھی۔ بارش کے تار سے وہ روشنی کبھی واضح ہوتی کبھی مدھم ہو جاتی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گھر کی روشنی ہے۔

حالانکہ اس بات پر حیرت ہونی چاہیے تھی کہ اس ویرانے میں گھر کہاں سے آ گیا لیکن یہ وقت ایسی باتوں پر دھیان دینے کا نہیں تھا بس اس روشنی کی طرف چلتے رہنے کا تھا۔ اور میں اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

سڑک سے اتر کر چلنے میں اور بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ایک تو کچا راستہ۔ پھر ہر طرف پانی بھرا ہوا۔ میں چھپ چھپ کرتا ہوا چلتا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے وہ روشنی غائب ہو گئی ہو پھر پوری طرح واضح ہو جاتی۔ آنکھیں پوری طرح ٹھہر نہیں پا رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ روشنی واضح ہوتی چلی گئی۔ اس ویرانے اور اندھیرے میں کسی مکان کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔

وہ روشنی اس مکان کی ایک کھڑکی سے باہر آ رہی تھی۔ وہاں بجلی کے کھمبے وغیرہ تو نہیں تھے۔ نہ جانے اس گھر کے مکین نے روشنی کا بندوبست کیسے کیا ہوگا۔

کچھ دیر کے بعد میں اس مکان کے بند دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی۔ میں اسے لڑکی نہیں کہوں گا۔ وہ ایک عورت تھی۔

میرے اندازے کے مطابق چالیس اور پچاس کے درمیان۔ جسم پر سلیقے کا لباس۔ اس نے میری طرف دیکھ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آخر تم آ گئے نا۔ میں جانتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“

”دیکھیں محترمہ۔ میں۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ مجھے اندر لے آئی۔

میں بھی اندر آ کر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بہت بھیگ گئے ہو نا۔“ اس عورت نے کہا۔ ”کتنی دور کا سفر کیا ہوگا میرے لیے۔“

”محترمہ۔ آپ مجھے کوئی اور سمجھ رہی ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں اپنی گاڑی میں جا رہا تھا کہ گاڑی خراب ہو گئی اور مجھے یہاں آپ کے پاس آنا پڑا۔“

”سب یہی کہتے ہیں۔ سب کی گاڑیاں خراب ہو جاتی ہیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”خیر۔ تم بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کپڑے لے کر آتی ہوں۔ سردی لگ جائے گی۔ بیمار پڑ جاؤ گے۔“

وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

کئی سوالیہ نشانات سامنے آ گئے تھے۔ ایک تو اس ویرانے میں اس مکان کا ہونا۔ پھر اس کا میرے ساتھ رویہ۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہو اور میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ اس کی باتوں میں بھی شائستگی تھی۔ وہ کوئی ابنارمل بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کپڑے لے کر آ گئی۔ استری کیے ہوئے کرتا اور شلوار۔ ساتھ ہی ایک صاف تولیہ بھی لیتی آئی تھی۔ ”یہ لو۔“ اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کمرے میں جا کر لباس بدل لو۔“

میں اس کے بتائے ہوئے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا شاید خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ یہاں ایک مسہری تھی اور دیوار کے ساتھ ایک الماری کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ بھیگے ہوئے کپڑے ایک طرف رکھے اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ میز پر بسکٹ اور گرما گرم چائے رکھی تھی۔ ”یہ لو بسکٹ کھا کر چائے پی لو۔ بدن میں گرمی آ جائے گی۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چائے پینی شروع کر دی۔ اس وقت چائے کی شدید ضرورت تھی۔ وہ کچھ دیر تک گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ۔ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟“

”دیکھیں۔ آپ کو شاید غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام عرفان رضا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو جس کا انتظار ہو۔ وہ میری ہی صورت شکل کا کوئی اور ہو۔“

”عرفان رضا۔“ وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ ”اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم عرفان رضا نہیں ہو۔ امانت علی ہو۔ میرے امانت علی۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“

اس دوران ایک لڑکی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے اس ماحول کے برعکس بہت ماڈرن ڈریس پہن رکھا تھا۔ ”آپا! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں، اندر جائیں۔“

”میں امانت سے بات کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ ابھی بیٹھے ہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”آپ اندر جائیں۔“

عورت نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی نے کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ میری آپا ہیں۔ ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں امانت علی نام کا ایک آدمی آیا تھا لیکن اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے آپا کو اس کا انتظار ہے۔“

”افسوس ہوا یہ سن کر۔“ میں نے کہا۔

”ویسے آپ کون ہیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔

میں نے اپنے بارے میں بتا دیا کہ میں کون ہوں اور یہاں کس طرح پہنچا ہوں۔ پھر میں نے اس لڑکی سے سوال کیا۔ ”ویسے اس ویرانے میں ایسے مکان کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔“

”دراصل یہ ہمارا فارم ہاؤس ہے۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”آپ سامنے کی طرف سے آئے ہیں۔ اس لیے آپ دیکھ نہیں سکے۔ پیچھے کی طرف بہت بڑا فارم ہے۔ ہم نے یہاں جنریٹر کا بندوبست بھی کر رکھا ہے۔ اسی لیے آپ یہاں روشنی دیکھ رہے ہیں۔“

”تو آپ دونوں کیا یہیں رہتی ہیں۔“

”نہیں۔ ہم شہر میں رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ویک اینڈ پر یہاں آیا کرتے ہیں، اپنے ایک ملازم کے ساتھ۔ وہ اس وقت اندر سویا ہوا ہے۔“

”بارش ابھی تک نہیں رکی۔“ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری گاڑی بھی خراب ہو گئی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ رات یہاں گزار سکتے ہیں۔ یہاں کئی کمرے ہیں۔ صبح بارش رک جائے تو چلے جائیے گا۔“

”آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔“

اس وقت وہ عورت پھر اندر آ گئی۔ وہی جسے اس لڑکی نے آپا کہا تھا۔ اب اس کی کیفیت کچھ اور ہو رہی تھی۔ ”نائلہ“ اس نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ان صاحب کو سب کچھ بتا دو۔ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ لڑکی جلدی سے بول پڑی۔ ”آپا۔ آپ اندر جائیں۔“

”نہیں لازی چیز مجھے بتانے دو۔ ورنہ میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔“

”دیکھیں۔ میں نہیں جانتی کہ آپ لوگ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”اور مجھے آپ کے معاملات سے دلچسپی بھی نہیں ہے۔ میں تو صرف پناہ کے لیے آیا ہوں۔ آپ کے کسی راز میں شریک ہونے نہیں آیا ہوں۔“

”اب تم آ گئے ہو تو تمہیں سننا ہوگا۔“ اس عورت نے کہا۔ ”سنو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

”چلیں بتا دیں۔“ وہ لڑکی جھلا اٹھی۔ ”بتا دیں کہ آپ نے امانت علی کا مرڈر کر دیا ہے۔ اس کی لاش اندر کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔“

میں ان دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔ پتا نہیں کیسا بھید تھا۔ یا تو یہ دونوں پاگل تھیں۔ یا پھر شاید سچ ہی کہہ رہی تھیں۔

”دیکھیں۔“ میں نے دونوں کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے چاہے کچھ بھی کیا ہو۔ میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”جناب۔ آپ نے یہاں تک سن ہی لیا ہے تو آگے بھی سن لیں۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگر انہوں نے نہیں بتایا تو شاید یہ پاگل ہو جائیں۔“

”وہ بے وفا تھا۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میرا شوہر۔ امانت علی۔ جس سے میں نے محبت کی تھی۔ جس پر اتنا بھروسا کرتی تھی کہ یہ فارم ہاؤس اس کے حوالے کر دیا تھا۔“

”یہ فارم ہاؤس آپا ہی کا ہے۔“ اب اس لڑکی نے کہا۔ ”امانت بھائی ہر ہفتے یہاں آیا کرتے تھے۔ یہ قصہ سننے میں تو کئی مہینوں سے آ رہا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لاتے ہیں لیکن ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج اتفاق سے آپا کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر یہاں پہنچ گئیں۔“

”اور یہاں میں نے اپنے اس وفادار شوہر کو کسی اور کے پہلو میں دیکھ لیا۔“ اس عورت نے بتایا۔ ”نہ جانے مجھ پر کیسا جنون سوار ہوا کہ میں نے اپنے شوہر کو ختم کر دیا۔ کلہاڑی مار مار کر ٹکڑے کر دیے اس کے۔ اور اس لڑکی کو بھاگنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ قصوروار امانت تھا۔ اس لڑکی کو مارنے سے کیا ہوتا۔ کچھ بھی نہیں۔“

”اور اب مسئلہ امانت بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں آپ آ گئے۔ آپا پر تو جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ امانت بھائی واپس آ گئے ہیں۔“

www.Paksociety.com

میں یہ کہانی سن کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ "ک۔ک...... کیا چاہتی ہیں آپ دونوں میں...... میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہماری مدد۔" اس لڑکی نے کہا۔ "امانت بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں ہماری مدد کریں۔"

"کیا؟" میں اُچھل پڑا۔ "یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ یہ مسئلہ تم دونوں کا ہے۔ تم ہی نمٹاؤ۔"

میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا لیکن اس عورت نے مجھے کمر سے پکڑ لیا۔ وہ لڑکی بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے مجھ سے لپٹ پڑی تھی۔

خدا کی پناہ۔ ایسی سچویشن سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہو گا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں تو کسی بلا کی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھیں۔

میں انہیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ اسی دوران اچانک دروازہ کھلا اور کچھ لوگ ہنستے اور تالیاں بجاتے ہوئے اندر آ گئے۔

وہ دونوں مجھے چھوڑ کر الگ ہٹ گئی تھیں اور اب زور زور سے ہنسے جا رہی تھیں اور میں احمقوں کی طرح سب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"بھائی جان۔" آنے والوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ "اب تک جو کچھ ہوا۔ وہ ایک مذاق تھا۔"

"یہ کیسا مذاق ہے؟"

"بات یہ ہے بھائی کہ ہم ایک ڈراما یونٹ کے افراد ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ہم یہاں ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے آئے ہیں۔ یہ دونوں ہماری نئی آرٹسٹ ہیں۔ ہمیں ان کی صلاحیتوں پر شبہ تھا۔ یہ ان دونوں کی پلاننگ تھی کہ اگر اس طرف کوئی بھولا بھٹکا مسافر آ گیا تو یہ دونوں اسے بے وقوف بنا کر اپنی صلاحیتیں دکھائیں گی۔"

"اوہ۔ تو یہ بات تھی۔" میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

"جی جناب۔" اس لڑکی نے کہا۔ "اب بتائیں۔ ہم دونوں آرٹسٹ ہیں یا نہیں۔"

"ایسی ویسی۔ شاید ڈراموں کی تاریخ میں تم دونوں کا جواب نہیں ہو گا۔"

"دیکھا ڈائریکٹر صاحب۔" اس عورت نے ڈائریکٹر کو مخاطب کیا۔ "اب آپ کیا کہتے ہیں۔"

"اب کیا کہوں۔ ثبوت تو دے دیا ہے تم دونوں نے۔"

اس کے بعد ہم ساری رات اس کمرے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ لڑکی مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی۔ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔

اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دے دیا تھا۔ "آپ مجھ سے ضرور رابطہ رکھیں گے۔" اس نے کہا۔ "یہ میری درخواست ہے۔"

"کیوں بھئی۔ اس میں درخواست کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت یہ ہے کہ آپ مجھے اچھے لگے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ بات کچھ عجیب محسوس ہوئی ہو۔ لیکن میں صاف ذہن اور صاف دل کی لڑکی ہوں۔ اس لیے آپ سے یہ بات اتنی بے تکلفی سے کہہ دی ہے۔"

"مجھے اچھا لگا ہے امبر۔" میں بھی اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ "مجھے بھی تم ہی جیسی صاف گو لڑکیاں پسند ہیں۔"

"شکریہ۔"

پھر ہمارے درمیان اور باتیں بھی ہوئیں اور اس پہلی ملاقات ہی میں ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ باتوں کے درمیان وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔

پھر اس لڑکی کو نیند آنے لگی۔ وہ مجھ سے اجازت لے کر چلی گئی اور میں وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ نہ جانے کب تک سویا رہا تھا۔

بہرحال جب آنکھ کھلی تو اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ کھڑکی کے راستے تیز دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

کمرا خالی تھا۔

میں نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ آثار ایسے تھے جیسے یہاں کوئی رات کو آیا ہی نہ ہو۔

کوئی نشان بھی ایسا نہیں تھا۔

میں بوکھلا کر اس مکان کے پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دور دور تک ریت اُڑاتا ہوا میدان۔ وہاں کسی قسم کا کوئی فارم ہاؤس نہیں تھا۔

میں پاگلوں کی طرح اس گھر سے دوڑتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ حیرت اور خوف نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے۔ میرے خدا۔ میں نے آخر کن لوگوں کے درمیان رات گزاری تھی۔ کون لوگ تھے وہ!

روحیں۔ یا کوئی اور......

میری گاڑی وہیں کھڑی ہوئی تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ اب چونکہ دن کا وقت تھا۔ بارش بھی تھم گئی تھی۔ اس لیے اس روڈ پر گاڑیوں کی آمد و رفت ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک سوزوکی والا مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر گاڑی کو کھینچتا ہوا شہر لے آیا تھا۔

اس لڑکی نے مجھے اپنا ایڈریس بھی بتایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب میں وہاں پہنچوں گا تو کوئی ایسی کہانی سننے کو ملے گی جو مجھے زیادہ حیران نہیں کرے گی۔

جیسے امبر نام کی کوئی لڑکی اس گھر میں نہیں رہتی۔ ہم کسی امبر کو نہیں جانتے۔ یا امبر کا تو دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایڈریس ہی غلط ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ تو وہ ایڈریس غلط تھا اور نہ کسی نے یہ بتایا کہ امبر نام کی کسی لڑکی کا وجود نہیں ہے بلکہ خود امبر ہی سے ملاقات ہو گئی تھی۔

اس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔

"امبر۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ سب کیا ہے۔ تم لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"مجھے اندازہ تھا کہ آپ میری تلاش میں یہاں تک ضرور آئیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئیں اندر آ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔"

میں اس کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "تم لوگوں کے رویے اتنے پُراسرار کیوں ہیں۔"

"عرفان صاحب۔ میں آپ کو یہاں بلانا چاہتی تھی۔" اس نے کہا۔ "اس لیے آپ کو اس گھر کا پتا بتایا تھا۔ آپ کی نگاہوں کے سامنے صرف دھوکے ہیں۔ وہاں بھی اور یہاں بھی۔ آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ بھی کہوں گی۔ اسے سن کر آپ پریشان یا خوفزدہ نہیں ہوں گے۔"

"اب تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں پریشان یا خوفزدہ ہو جاؤں۔"

"تو پھر یہ سن لیں کہ میں مر چکی ہوں۔" اس نے بتایا۔

"یعنی اب تم مجھے مزید بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں۔ بے وقوف نہیں بنا رہی۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا نام امبر ہی تھا اور آپ جس گھر میں ہیں۔ میں اسی گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔"

"یہ سب تو خیر ٹھیک ہو گا۔ لیکن تم جو کچھ کہہ رہی ہو۔ میں اس پر کیسے یقین کر لوں۔"

"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی اصلیت دکھاتی ہوں۔" اس نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کمرے میں جاؤ۔ تمہیں بہت کچھ دیکھنے کو مل جائے گا۔"

"امبر۔ پلیز۔ ایسی باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو کچھ بتانا چاہتی ہو بتا دو۔ میں خوف کھانے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

"اب سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ "کچھ لوگ میرے پاس آئے۔ وہ کسی ڈرامے پروڈکشن ہاؤس سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے میرے والدین کو مجبور کر دیا کہ وہ مجھے کام کرنے کی اجازت دے دیں چونکہ ان کے ساتھ زرینہ بھی آئی تھی۔ اسی لیے والدین نے اجازت دے دی۔"

"اور یہ زرینہ کون ہے؟"

"وہی عورت جس سے تم اس ویرانے میں ملے تھے۔" اس نے بتایا۔ "وہ ہمارے ہی محلے میں رہتی تھی اور اس کے کہنے پر مجھے کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں مجھے ایک اہم کردار ملا تھا اور تم نے اس دن جو کچھ وہاں دیکھا تھا۔ وہ اس ڈرامے کا ایک سین تھا۔"

"خوب۔" میں مسکرا دیا۔ "یعنی کسی اجنبی کا آنا۔ اس عورت کا اسے امانت علی سمجھنا۔ وغیرہ۔"

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ "پھر یہ ہوا کہ ڈرامے کی شوٹنگ اس فارم ہاؤس میں رکھی گئی تھی جہاں تم گئے تھے اور وہاں میرے۔ میرے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوا تھا۔ اس سازش میں خود زرینہ بھی شامل تھی۔ ان لوگوں کا تعلق کسی پروڈکشن ہاؤس وغیرہ سے نہیں تھا۔ وہ سب عیاش اور بدمعاش قسم کے لوگ تھے۔ وہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے اسی سین کی ریہرسل کراتے رہے تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ واقعی ڈراما ہی ہو رہا ہے۔"

"پھر انہوں نے اس زرینہ کی مدد سے مجھے بے آبرو کر دیا۔" امبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "بے آبرو کر دیا مجھے۔ پورے ایک ہفتے تک وہ سب کے سب مجھے برباد کرتے رہے اور جب معاملہ میری برداشت سے باہر ہوا تو میں نے ایک رات ان سبھوں کو مار دیا۔"

"واہ۔ یہ اچھی کہانی ہے۔"

"ہاں۔ ابھی تو تم اسے کہانی ہی سمجھو گے۔" اس نے کہا۔ "تو میں یہ بتا رہی تھی کہ میں نے ایک رات ان سبھوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ سب لوگ دو کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکا اور سب چیخ چیخ کر مر گئے۔ اس ویرانے میں ان کی آوازیں سننے والا کوئی

www.Paksociety.com

بھی نہیں تھا۔"

"بہت خوب۔" میں مسکرا دیا۔ "تو اس طرح تم نے سب کو مار دیا۔"

"ہاں۔ پورے یونٹ کو مار دیا میں نے۔ اور اس کے بعد خود مر گئی۔"

"اور خود کس طرح مریں۔"

"میں نے خودکشی کر لی تھی۔" اس نے دھیرے سے بتایا۔

"واہ۔ کیا کہانی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے خودکشی کر لی۔ اور اب میں یہ چاہتی ہوں کہ تم میری لاش کو دفن کروا دو۔ وہ اسی فارم ہاؤس کے ایک سوکھے ہوئے کنویں کے پاس پڑی ہوئی ہے۔"

"شاید تم اس دور کی سب سے بڑی کہانی نویس ہو۔" میں نے کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم یقین نہیں کرو گے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "خیر۔ میں سامنے والے کمرے میں جا رہی ہوں تم میرے پیچھے آ جانا۔"

وہ اس بند دروازے کے پیچھے چلی گئی۔ میں اس کے جانے کے بعد اسے یہ بتانے کے لیے اس کمرے میں پہنچ گیا کہ میں بے وقوف نہیں بن سکا ہوں۔

لیکن شاید میں بے وقوف ہی بن گیا تھا۔

اس کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ایک خالی کمرا تھا، بالکل خالی۔ اس کا ایک دروازہ تھا جس سے میں داخل ہوا تھا۔ کمرے میں کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا اور کمرے کا فرش گرد سے بھرا ہوا تھا۔ اس پر کسی کے قدموں کے نشان تک نہیں تھے۔

میں بوکھلا کر اس کمرے سے باہر آ گیا۔

پھر اس مکان سے بھی باہر آ گیا اور اسی وقت کسی نے مجھے آواز دی۔ وہ ایک بوڑھا انسان تھا۔ لمبی داڑھی اور انتہائی نورانی چہرہ۔ وہ اس مکان کے برابر والے مکان کے گیٹ سے باہر نکلا۔ "صاحب زادے یہاں آؤ۔" اس نے مجھ سے کہا۔

میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ "جی جناب۔"

"تم اس مکان میں کیا لینے گئے تھے۔"

"جناب۔ ایک عجیب کہانی ہے۔" میں نے کہا۔

"بتاؤ مجھے تاکہ میں تمہیں کوئی مشورہ دے سکوں۔"

میں نے اب تک کی ساری کہانی بتا دی۔

"وہ لڑکی ٹھیک کہتی تھی۔" بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ "تم نے جو کچھ دیکھا۔ وہ فریب نظر نہیں تھا بلکہ اس لڑکی کے ساتھ یہی سب ہوا ہے۔"

"جی!" میں حیران رہ گیا تھا۔

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "خدا کا شکر ہے کہ اس لڑکی نے تمہارے ذریعے اپنی لاش کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس کی روح بھٹک رہی ہے بیٹے۔ اس فارم ہاؤس میں بار بار یہی کہانی دُہرائی جاتی ہے۔ ڈرامے کا وہی سین جو تم دیکھ چکے ہو۔ اس کی تصدیق کئی لوگوں نے کی ہے۔"

"آپ کیا اس لڑکی سے واقف ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔ بہت اچھی طرح۔ وہ سب میرے پڑوسی تھے۔ اس لڑکی کی موت کے بعد اس کے والدین گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ گھر ویران پڑا ہوا ہے۔"

"میں تو حیران ہو کر رہ گیا ہوں۔"

"نہیں۔ اس میں حیرانی کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جو موت غیر فطری انداز میں ہو۔ وہ ماحول پر بُرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ مرنے والے کی روح بھٹکتی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ بظاہر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن یہ سچائی ہے۔ تم اس لڑکی کی لاش کو دفن کروا دو۔ یہ سمجھو کہ خدا تم سے نیکی کا ایک کام لے رہا ہے۔"

"اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"میرے ساتھ چلو۔ ہمیں پولیس آفس جانا ہوگا۔ ایمبولینس لے جانی ہوگی۔ چلو۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ یہ نیکی جتنی جلدی ہو جائے اتنا اچھا ہے۔"

اس کے بعد کی کہانی کچھ یوں ہے کہ واقعی اس لڑکی کا ڈھانچا خشک کنویں کے پاس سے مل گیا تھا۔ جسے اسی جگہ دفن کر دیا گیا۔

میری اس داستان نے بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا لیکن لاش ملنے کے بعد سب کو قائل ہونا پڑا تھا کہ اس کائنات میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے بھید ہوں گے۔

لڑکی کے والدین کو بھی خبر مل گئی تھی۔ وہ بھی آ گئے۔ مہینوں کے بعد ان کے دکھ تازہ ہو گئے تھے۔ ہم سبھوں نے اس لڑکی کے لیے مغفرت کی دعا کی اور واپس آ گئے۔

لیکن کیا کہانی ختم ہو گئی ہے؟

"نہیں۔ امبر مجھے ابھی بھی یاد آتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کسی بارش والی طوفانی رات کو پھر وہیں چلا جاؤں اور پھر سے وہی سب کچھ ہو۔ لیکن شاید اب یہ سب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی روح کو تو اب قرار مل گیا ہے۔

جدائی

محترم معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس بار اس میں شمولیت کے لیے میں نے بھی کوشش کی ہے۔ گوکہ آپ کے ہاں آپ بیتیوں کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی جگ بیتی بھی چھپتی ہے۔ اس خیال سے میں نے بھی ایک جگ بیتی لکھی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔ زیبا اور کامران دونوں ہی میرے رشتے دار ہیں۔ ان کے بچھڑنے کا قلق آج بھی مجھے تڑپاتا ہے۔ اسی تڑپ کو میں نے لفظوں کا پیرہن دیا ہے۔

اختر قزلباش
(لندن، یوکے)

"کامران آ رہا ہے" زیبا، یونیورسٹی سے تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تو امی نے اسے بتایا۔

"کامران..... کون کامران؟" اس کی سوالیہ نگاہیں ماں کے چہرے پر ٹک گئیں جہاں مسرت کے سائے رقص کر رہے تھے۔

"ارے اپنا کامی!" انہوں نے اور خوش ہو کر کہا "بڑے بھائی جان کا لڑکا اور کون؟"

"اچھا اچھا، ماموں جان کے صاحبزادے" اس نے سمجھ کر کہا پھر بولی "امی! صرف کامران آ رہا ہے یا ماموں جان اور ممانی جان بھی..... میں نے تو کبھی کامران کو اور ممانی جان کو دیکھا نہیں۔"

"اے لڑکی، دیوانی ہوئی ہے کیا؟ آ رہا ہے کیوں کہہ

رہی ہے؟ کامران تجھ سے پورے تین سال بڑا ہے" انہوں نے تین انگلیاں اٹھا کر کہا" کتنے عرصے بعد دیکھوں گی بھائی بھاوج اور کامران کو" وہ آپ ہی آپ بولیں۔

"آپ نے تو ایسے کہا، میں سمجھی صرف کامران آ رہا ...... آ رہے ہیں" وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔

"تم نہیں جانتیں، کامران مجھے بے حد عزیز ہے اس لیے اس کی خوشی سب پر حاوی ہے" انہوں نے کہا۔

مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہو رہے تھے۔ جن لوگوں کے پاس وسائل تھے وہ وہاں سے مغربی پاکستان منتقل ہو رہے تھے۔ انتخابات کے بعد سے ہی وہاں صورت حال بگڑ چکی تھی۔ اور غیر بنگالی اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ انہی حالات سے پریشان ہو کر شاید زیبا کے ماموں بھی یہاں منتقل ہو جانا چاہتے تھے۔ اس کے ماموں تو ابھی کچھ سال قبل آئے تھے۔ ممانی کو جب وہ چھوٹی سی تھی، تب دیکھا تھا۔ ان کا دھندلا دھندلا خاکہ اس کے ذہن میں تھا اور کامران کو تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ اس کی امی البتہ دو سال قبل ہو آئی تھیں۔

زیبا کے باپ کا دو سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اب دنیا میں اس کا واحد سہارا اس کی ماں اور چھوٹا بھائی ریاض تھا۔ زیبا کو اپنے باپ سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ وہ بے حد اصولی انسان تھا۔ ملک و قوم سے محبت کرنے والا۔ ملک کے لیے جان دے دینے والا۔ اپنی آن اور اپنی خودی پر مر مٹنے والا۔ اور یہی جراثیم زیبا میں بھی منتقل ہو گئے تھے۔ اس کی سوچ کا انداز عام لڑکیوں سے مختلف تھا۔ اس کے ہر کام میں شعور کو دخل ہوتا، وہ کوئی بھی کام خواہ مخواہ نہیں کرتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اس کے لیے زندگی محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل مرتب کیا تھا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرح کبھی عشق نہیں کیا تھا۔ وہ ان گنی چنی لڑکیوں میں سے تھی جنہیں زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور اس میں آزادانہ طور پر رہنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی اور وہ اپنے مرحوم باپ اور ماں کے اعتماد کا صحیح استعمال کرتی تھی۔ وہ سنجیدہ طبیعت کے سلجھے ہوئے خیالات کی لڑکی تھی۔ وہ موجودہ زمانے کے فیشن یعنی آئیڈیل وغیرہ کو خرافات سمجھتی تھی۔ ماں باپ جسے پسند کریں، بس اسی کو آئیڈیل مان لینا چاہیے، یہ تھے اس کے خیالات۔

رات دھیرے دھیرے رخصت ہوئی، صبح امی نے سب کو جگانا شروع کیا۔

"کامران آ رہا ہے، بڑا غصیلا ہے۔ ٹھونک ٹھانک کے سیدھا کر دے گا۔ بیکار لوٹنے پوٹنے سے چڑتا ہے" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ خوش قسمتی سے آج اتوار تھا، وہ بھی ان لوگوں کو ریسیو کرنے جا سکتی تھی۔

ایک زوردار گھڑگھڑاہٹ نے جہاز کی آمد کی خبر دی۔ تھوڑی دیر بعد ماموں جان مسکراتے ہوئے اترے، ان کے پیچھے ممانی جان اور پھر کامران۔ سب ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ آنکھوں میں مسرت کے اشک جھلملانے لگے۔ کامران نے اپنی جناح کیپ ریاض کے سر پر رکھ دی۔

"تم یقیناً ریاض ہو۔"

"صحیح سمجھے آپ" ریاض نے معصومانہ انداز سے ہنس کر کہا۔ پھر کامران نے زیبا کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کی تعریف ......؟"

"ارے اپنی زیبی بٹی ہے" ماموں نے شفقت سے زیبا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"لیجیے پاپا، آپ نے جوڑا خراب کر دیا ان کا" کامران بے ساختہ بولا۔ سب ہنسنے لگے اور زیبا جھینپ گئی۔ تب وہ بولا "اچھا تو یہ، زیبا ہیں؟"

"اور کیا، یہی تو ہے اپنی زیبو بٹی، جس کو میں بہت یاد کرتی تھی" ممانی نے پیار سے کہا۔

"آپ اپنے نام کا اس بری طرح سے پوسٹ مارٹم ہوتے دیکھ کر احتجاج نہیں کرتیں" کامران اب براہ راست زیبا سے مخاطب تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرا دی اور بس!

سب گھر پہنچ گئے۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں، سب سے زیادہ کامران بول رہا تھا مگر زیبا خاموش تھی۔ شاید خاموشی سے سب کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی۔ گھر پہنچ کر امی نے کہا۔

"بھائی جان، ہمارا گھر چھوٹا سا تو ہے مگر آپ کو تکلیف نہیں ہو گی...... زیبی بٹی! ریاض کا کمرا تو بھائی جان و بھابی جان کے لیے ٹھیک کر دو اور تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔ اپنا کمرا کامران کے لیے ٹھیک کر دو" پھر ایک دم کچھ یاد کر کے بولیں "مگر ہاں، کمرے تو شاید تم صبح ہی درست کر چکی تھیں؟" زیبا نے اثبات میں سر ہلا دیا "اچھا تو جاؤ سب کو ان کے کمرے دکھا دو" جب وہ کامران کو اپنے کمرے میں لے کر گئی تو بولی۔

"یہ رہا آپ کا کمرا ...... ویسے تو میں نے یاد کر کے ضرورت کی سب چیزیں رکھ دی ہیں پھر بھی اگر کچھ بھول گئی ہوں تو بلا تکلف بتا دیجیے گا۔"

اس کی مترنم آوازیوں آ رہی تھی جیسے پہاڑیوں پر بہتا ہوا جھرنا۔ کامران کھوسا گیا پھر بولا۔

"آپ کو بولنا بھی آتا ہے؟"

"جی ......!"

"میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ بات چیت کر سکتی ہیں؟" وہ بے تکلف ہونے کے موڈ میں تھا۔

جواباً وہ صرف مسکرا دی اور نپے تلے قدموں سے باہر نکل گئی۔

کامران بڑی باغ و بہار شخصیت کا مالک تھا۔ چند ہی روز میں وہ سارے گھر پر چھا کر رہ گیا۔ اس کی وجہ سے سارا گھر قہقہوں میں ڈوب گیا۔ بڑوں کا دوست، لڑکیوں کی سہیلی اور بچوں کا ساتھی۔ اس سے سب خوش رہتے۔

"زیبا ...... اے زیبی ...... اچھا بھئی زیبو" کامران چیخ رہا تھا۔

"آ تو رہی ہوں کامران ...... تم نے تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا" زیبا جھنجلا کر بولی مگر جب وہ کامران کے کمرے میں پہنچی تو وہ گال پھلائے کھڑا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" زیبا بولی۔ وہ پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ زیبا گھوم کر سامنے جا پہنچی۔

"ناراض ہو گئے؟" اس نے مہمان سمجھ کر دل داری کے انداز میں کہا۔

"ایک تو گھنٹہ بھر سے آوازیں دے رہا ہوں ...... سنتی نہیں اور پھر محترمہ تشریف لائیں تو ڈانتی ہوئی" وہ بچوں کی طرح خفگی سے بولا۔

"میں نے تو اس لیے کہا کہ اس طرح زور زور سے پکارتے ہو ماموں جان وغیرہ کیا سوچیں گے۔" وہ دھیمے سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"ماموں جان ...... ممانی جان ...... امی جان ...... ان تینوں جانوں کی وجہ سے تو بات کرنی ہی مشکل ہو گئی ہے" وہ پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

"تم بہت جلد باز ہو۔ چھوڑو بتاؤ کیا کام تھا" زیبا نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ کیا میں کوٹ نکال کر خود نہیں پہن سکتا" وہ الماری کی طرف بڑھا مگر زیبا اس سے قبل ہی پہنچ گئی ...... اور ہینگر سے کوٹ اتار کر اسے تھما دیا۔

"لیجیے جناب، اس کے لیے اتنی آفت اٹھائی تھی آپ نے" اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں، آپ جانتی ہیں نا کہ میں کوئی کام خود نہیں کر سکتا، بس حکم کرتا ہوں" پھر رک کر بولا "ایک تو آپ نے میرے کام کا بیڑہ اٹھایا ہی کیوں ہے؟ اچھا خاصا امی کیا کرتی تھیں۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میرے ہوتے ہوئے بزرگ کام کریں" وہ متانت سے بولی۔

"نہیں اچھا لگتا نا؟ تو پھر ذرا وہ جوتے اور موزے بھی اٹھا دو" وہ شرارت سے بولا زیبا نے جھک کر الماری کے نیچے سے جوتے نکالے اور اسے تھما دیے "اور کوئی حکم؟" اس نے مودبانہ کہا۔

"اب آپ چلی جائیں گی۔ آپ کو تو بس سارا دن کام ہی کرنا رہتا ہے...... ہمارا تو کسی کو خیال ہی نہیں خیر جایئے صاحب ...... جایئے" اس نے شکریہ کہا اور باہر چلی گئی۔

ماں کی دور اندیش نظریں جلد ہی بیٹے کا رجحان بھانپ گئیں، انہوں نے کامران سے تصدیق چاہی تو وہ تو کھل کر پھول بن گیا۔ پھر انہوں نے شوہر سے بات کی اور سب کی مرضی پا کر ان کو بھی اطمینان ہو گیا۔ مگر انہوں نے کامران کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ جلد بازی نہ کرے ابھی صرف بات پکی ہو گی، شادی بعد میں۔

ایک روز موسم بھی خوشگوار تھا، سب کے موڈ بھی اچھے تھے تب انہوں نے اپنے دل کی بات نند سے کہی، زیبا کی ماں دل میں تو بے حد خوش ہوئیں مگر حسب روایت انہوں نے کہا۔

"بھائی جان! ابھی تو زیبا زیر تعلیم ہے۔"

"ارے بیوی! تو میں یہ کب کہتی ہوں کہ ابھی نکاح پڑھا دو۔ منگنی کر دو، شادی بعد میں کرنا۔ ہم خود جلدی نہیں چاہتے ان کا کام کہیں جم جائے اور کامران بھی نوکر ہو جائے، تب اطمینان سے لاؤں گی بہو کو...... بات پکی کرنے کو تو اس لیے

شمارہ مارچ 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش ← آپ کا انتخاب →

☆ اول: رقص زندگی ...... عارفہ (واہ کینٹ)

☆ دوم: کاری ...... افشاں (لاڑکانہ)

☆ سوم: مار آستین ...... نعیم الحسن (دبئی)

[illegible]

www.Paksociety.com

کہتی ہوں کہ کہیں میری زیبی کے لیے تم اور کہیں ہاں نہ کر بیٹھو" انہوں نے کہا۔

"ہاں ہاں، مجھے بھی یہ رشتہ بہت پسند ہے......اور پھر میرا خیال ہے کہ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پھر کیا دشواری ہے؟" بھائی نے بھی سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"نہیں بھائی جان! میں کب اس رشتے سے انکار کرتی ہوں۔ ایک ذرا زیبا سے بھی پوچھ لوں پھر بتاؤں گی" نند نے بھی اب زیادہ نخرے کرنا خطرناک سمجھا۔ ماں نے جب زیبا سے رائے مانگی تو اس نے فرمانبرداری سے کہا۔

"امی میں تو ہمیشہ یہی کہتی رہی ہوں اور ابو سے بھی یہی کہا کرتی تھی کہ جہاں آپ لوگ پسند کریں گے وہی میری پسند ہوگی۔"

اس کے تیسرے ہی روز زیبا کے ہاتھ میں ایک ننھی سی سرخ نگ کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اب وہ کامران سے جھجک رہی تھی۔ مگر کامران تو انگوٹھی پہنا کر یہ سمجھ رہا تھا کہ گویا درمیان کی تمام دیواریں ڈھے گئیں۔ وہ دن بھر کامران سے کئی کئی ادھر ادھر چھپتی پھر دونوں وقت مل رہے تھے، وہ اسٹڈی کی تیاری کر رہی تھی کہ ....

"مبارک ہو" کامران کھڑا تھا۔ آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ وہ اسے اچانک دیکھ کر شپٹا گئی پھر ایک دم ہی شرما کر رہ گئی۔

"زیبی، سنا نہیں کیا" زیبا نے اس پکار میں آج نئی ہی لذت محسوس کی۔

"جی!" اس نے حیابار نگاہیں اٹھائیں۔

"میں نے کہا بہت تمیز دار ہوگئی ہو جو جی کر کے بات کر رہی ہو۔ اب تو میں تمہیں زور زور سے پکار سکتا ہوں نا؟" وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔

"جی!.... جی ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر اب تو مجھے بزرگوں کا کچھ زیادہ ہی خیال آ رہا ہے" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ سخت حیران تھا "یعنی اس لیے تو میں نے یہ سب چکر چلایا کہ اب میں آزادی سے تم سے بات چیت کر سکوں گا تو تم یہ بہانہ لے بیٹھی ہو" وہ پھر ناراض نظر آ رہا تھا۔

"یہ تم ذرا ذرا سی بات پر روٹھ کیوں جاتے ہو۔ بھئی امی سے اور ممانی جان و ماموں جان سے اجازت لے لو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا" زیبا نے گویا فرار کی بہترین راہ سوچی۔

"اوہ، یہ بھی کوئی بات ہوئی......اسے تو میں "یوں" حل کر لوں گا" اس نے چٹکی بجائی اور واقعی یہی ہوا۔ نہ جانے اس نے کیا پٹی پڑھائی کہ بزرگوں نے نہ صرف بات چیت کرنے بلکہ گھومنے پھرنے کی بھی اجازت دے دی۔ زیبا کی ماں کو اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا۔

دوسرے روز صبح زیبا جب چائے لے کر آئی تو وہ بولا "آج سمندر کی سیر کو چلیں گے" وہ بہت خوش تھا۔

"کیا! سمندر کی سیر کو......مگر کون کون؟" وہ کچھ جز بز ہو۔

"صرف ہم دونوں اور کون؟" وہ شانِ استغنا سے بولا۔

"کم از کم ریاض کو تو لے لو، مجھے شرم سی آتی ہے" زیبا نے کہا۔

"چھن........" ایک زوردار آواز آئی اور پیالی چکنا چور ہوگئی۔ زیبا سہم گئی۔

"شرم......شرم......شرم! آخر اس بے جا شرم کا اب کوئی جواز بھی ہے؟ صاف کیوں نہیں کہتیں، تمہیں میرا ساتھ ہی پسند نہیں" وہ جلے دل سے بولا۔

"تم تو بہت جلد ناراض ہو جاتے ہو کامی! بھلا میں تمہارے ساتھ جانا کیوں نہ پسند کروں گی" پھر مسکرا کر بولی "کتنے بجے چلنا ہے؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ محترمہ آپ اپنی شرم کو لیے بیٹھی رہیں۔ آپ کو کسی کی کیا پرواہ" وہ بدستور خفا تھا۔

"کہتی تو ہوں کہ چلوں گی پھر اب کس بات کی ناراضگی؟" آخر زیبا نے اسے منا ہی لیا۔

☆☆☆

سمندر کے کنارے بہت سے لوگ تھے۔ ہر عمر، ہر قوم، ہر دیس کے لوگ۔ ان میں بہت سے تاحد نظر پھیلے ہوئے سمندر کے بیکراں سینے کو مسرت سے دیکھ رہے تھے۔ چند لوگ بظاہر تو سمندر کی سیر کو آئے تھے مگر نگاہیں ہجوم پر جمائے تھے اور کچھ بچے گیلی ریت سے گھروندے بنا رہے تھے۔ زیبا کے خیالات میں بھی لہروں جیسا اتار چڑھاؤ تھا۔ وہ خیالوں میں گم تھی، سوچ رہی تھی، کامران کا جلد جلد ناراض ہو جانا، کیا آئندہ ازدواجی زندگی پر برا اثر نہیں ڈالے گا؟ کامران صرف اپنی بات منوانا جانتا ہے۔ دوسرے کے دل میں وہ جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کرتا۔ اسے کامران کچھ کچھ خودغرض سا لگا لیکن اب تو جب سے ماں نے اسے مجازی خدا کا درجہ دیا تھا، وہ کامران کو اپنا دل بھی دے بیٹھی تھی۔ اب وہی اس کے من مندر کا دیوتا تھا۔ پھر دیوتا سے شکوہ کیسا! اس کی تو صرف پوجا

کی جاتی ہے اور بس!

"کیا سوچ رہی ہو؟" کامران جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد مسرور تھا۔

"وہ......کچھ بھی تو نہیں" وہ بھی مسکرا کر بشاشت سے بولی۔ وہ اس وقت کامران سے کچھ کہہ کر اس کے موڈ کو خراب نہ کرنا چاہتی تھی۔

"اپنی بے جا شرم کی بڑی سی گٹھری بناؤ اور ان موجوں میں بہا دو" اس نے کہا۔ وہ حسب عادت دھیمے سے مسکرا دی۔ پھر کامران نے اس کا ہاتھ تھاما اور دائیں طرف کے باغ میں ایک کنج کی طرف زیبا کو لے جا کر بٹھا دیا......آج اس نے کھل کر زیبا پر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس سے دل کی باتیں کیں۔ زیبا یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہو رہی تھی کہ کامران اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ وہ اس کے بنا جی بھی نہیں سکتا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے پن کا شگفتہ سا احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے۔ مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔ یہی سوچ کر زیبا بھی پیار بھری باتوں میں کھو گئی۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرنے کے بعد واپس گھر آ گئے۔

دو چار روز سے زیبا کی طبیعت گری گری سی تھی۔ پھر بھی وہ گھر کے کام کاج میں برابر ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ ماں اور ممانی نے اسے ست دیکھا تو ڈانٹ کر آرام کرنے کی تاکید کی۔ آج اتوار تھا، وہ نہانا بھی چاہتی تھی پھر وقت نہیں ملتا۔ مگر اسے بخار سا محسوس ہوا تو بستر پر جا لیٹی۔

"زیبا......زیبی......!" کامران چیخ رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکی۔ وہ کمرے میں آیا، اسے لیٹا دیکھ کر بولا "شاید تم پہلے ہی جان گئی تھیں کہ میں آج تم سے پکچر کے لیے کہوں گا۔ جبھی منہ ڈھانک کر پڑ گئیں...... جب کہ میں پہلے روز ہی کہہ چکا ہوں، مجھے لوٹنے پوٹنے سے چڑ ہے۔"

"لو بھلا مجھے علم غیب ہوگا کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟" زیبا ہنس کر بولی "تو آج تم پکچر کے موڈ میں ہو کامی!"

"ہاں زیبا، میں نے صبح ہی طے کر لیا تھا کہ آج ہم تم فرسٹ شو دیکھیں گے" اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"کیا پھر کسی اور روز چل سکتے ہو؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ (پیالی ٹوٹنے کا منظر ابھی وہ بھولی نہ تھی)

"نہیں۔ آج ہی" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"کامی! دراصل آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے" لہجہ اب بھی سہما ہوا تھا۔

"تھوڑی سی خراب ہے نا، تو کوئی بات نہیں......یونہی ست ہو رہی ہو، گھومو پھرو گی تو بشاش ہو جاؤ گی" کامران بولا۔

"اچھا کل!" وہ اسے بخار کا بتانا نہ چاہتی تھی، مبادا پریشان ہو جائے۔

"نہیں، آج ہی" اس نے پاؤں پٹخے۔

"صرف ایک روز ٹھہر جاؤ کامی! کل ضرور چلوں گی" وہ منانے والے انداز میں بولی۔

کامران نے اس پر ایک خفگی بھری نگاہ ڈالی اور کچھ کہے بنا چلا گیا۔ وہ خفا ہو چکا تھا۔ یہ طے شدہ بات تھی، زیبا سکتے میں آ گئی۔ کامران کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ صرف اپنی ذات سے پیار کرتا ہے اور بس۔ بالکل متضاد طبیعتیں ہیں، کیسے گزر ہوگی؟ یہی سب سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف سا ہونے لگا۔

شام کو پانچ بجے وہ ہمت کر کے اٹھی۔ سب صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے شاید، وہ غسل خانے میں گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئی۔ وہ بہرحال کامران کو ناراض کرنا نہ چاہتی تھی کیونکہ وہ اس کا پیار تھا۔ مجازی خدا تھا۔ جب وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو سب ہی اسے دیکھنے لگے۔ کامران نے اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ ماں نے حیران ہو کر کہا۔

"کہیں جا رہی ہو کیا، طبیعت کیسی ہے؟"

"جی ہاں، کامران کے ساتھ پکچر جا رہی ہوں۔ طبیعت بالکل ٹھیک ہے" اس نے دونوں باتوں کا سلسلہ وار جواب دیا اور کامران کی طرف دیکھا۔ وہ زیرلب مسکرا رہا تھا۔ غالباً اپنی فتح پر خوش تھا پھر وہ اٹھا، شاید تیار ہونے چلا گیا۔

"بنی، طبیعت ٹھیک نہیں اور پکچر جا رہی ہو۔ تم تو فلم کی کبھی ایسی شوقین نہ تھیں" ماں کو آج بیٹی کی باتیں نئی محسوس ہو رہی تھیں "پھر بخار لگ رہا ہے" ماں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ چھونا چاہا مگر اس سے قبل ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں امی، اب ٹھیک ہوں اور پھر یہ بھی ہے کہ کامران نے بکنگ کروالی ہے" وہ اپنے صاف جھوٹ پر خود بھی حیران رہ گئی۔

"بہت بہت شکریہ!" وہ ٹیکسی میں شوخی سے بولا۔

"کس بات کا؟" وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

"آپ کی عنایت کا ......ورنہ میں تو سمجھا تھا تم جاؤ گی نہیں۔"

"کامی! یہ حقیقت ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، صرف تمہاری خفگی کے خیال سے آ گئی ہوں تم جلد جلد

www.Paksociety.com

روٹھ جو جاتے ہو...... ایک بات یاد رکھو کامی! میں بہت کم روٹھتی ہوں مگر اگر ایک بار بھی روٹھ گئی تو پھر کبھی نہ منوں گی" اس کے لہجے میں پہلی بار شکوے کی کیفیت تھی۔

"ارے چھوڑو یہ بیکار کی باتیں" وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں گم رہنا چاہتا تھا۔ محبوبہ کا ساتھ ہو اور محبوبہ بھی وہ جو جلد بیوی بننے والی ہو۔ تنہائی ہو تو پھر ادھر ادھر کی باتیں سوچ کر دماغ پراگندہ کرنے سے فائدہ!

"ملک پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں کامی!" تھوڑی دیر بعد زیبا ہی بولی۔

"اور دل پر تمہاری محبت کے بادل چھا رہے ہیں" وہ مسکرایا۔

"کبھی تو اپنی ذات کے خول سے باہر آجایا کرو کامی!" مگر یہ بات اس نے کامران سے کہی نہیں صرف سوچ کر رہ گئی۔

چند دنوں کے بعد زیبا کے ماموں کا اپنے ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں شیئر ہو گیا۔ کامران کو بھی لاہور ہی میں ایک اچھی انجینئرنگ پوسٹ مل گئی اور اب وہ لوگ لاہور شفٹ ہو رہے تھے۔ "مجھے بھولو گی تو نہیں؟" رخصت کے وقت کامران نے اس کے کان میں کہا۔

"اپنی زندگی کو بھی کوئی بھول سکتا ہے؟" وہ ذرا دور کھڑے بزرگوں پر نظر ڈال کر دھیمے سے بولی۔

"خط لکھو گی مجھے؟" وہ تمام باتیں ابھی پکی کر لینا چاہتا تھا۔

"تم لکھو گے تو ضرور جواب دوں گی" وہ مسکرائی۔

"گویا تم پہلے نہیں لکھو گی؟" اس کا لہجہ شکی ہونے لگا۔

"میں پہلے کس طرح لکھ سکتی ہوں، جب تم جا کر پتا بھیجو گے تب ہی تو لکھوں گی۔"

"اوہ...... مگر ہاں...... پتا تو تمہیں امی یا پاپا کے خط سے بھی مل سکتا ہے۔"

"اچھا اچھا، میں ہی پہلے لکھ دوں گی" وہ اسے جاتے وقت خفا نہ کرنا چاہتی تھی۔ سب ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ کامران بے حد اداس ہو رہا تھا۔ زیبا خود بھی جدائی کے خیال سے اداس تھی اور کامران نے جب شکستہ لہجے سے خدا حافظ کہا تو وہ اداسی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

ان لوگوں کو رخصت کر کے سب گھر آئے تو وہ اپنے کمرے میں جا کر سسک پڑی۔ پورے کمرے میں کامران کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ پھر اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ ماضی کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے تابندہ شوخ رنگوں کے ساتھ گھومنے لگیں۔ کامران کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ اس کے دل میں کسک پیدا کر رہا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا... ضدی تھا، غصیلا تھا، اپنی منواتا تھا، پر تھا تو اس کے قریب۔ ابھی وہ انہیں خیالوں میں گم تھی کہ ریاض نے چونکا دیا "آپی، بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔"

"کیا......!" وہ سب کچھ بھول گئی۔ بھاگتی ہوئی گئی ریڈیو سے کان لگا کر بیٹھ گئی۔ بھارتی درندے پاکستانی جیالوں سے برسرِ پیکار تھے۔ "خدا رحم کرے" خبریں سن کر وہ بے ساختہ بولی۔

کچھ روز بعد مغربی حصے میں بھی جنگ شروع ہو گئی اور پھر گھمسان کی جنگ پورے ملک میں شروع ہو گئی۔ زیبا اس قدر مصروف رہتی کہ اسے سانس لینے کے لیے بھی فرصت نکالنی پڑتی، وہ نرسنگ ٹریننگ بھی لے رہی تھی۔ ڈیفنس ٹریننگ بھی لے رہی تھی۔ اس کے اس قدر حوصلے کو دیکھ کر ریاض میں بھی بے حد ہمت عود کر آئی تھی، اس نے رضا کاروں میں اپنا نام لکھوا دیا تھا۔ زیبا تو جیسے اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔ بس اسے ایک ہی دھن تھی کہ دشمن کو زبردست شکست ہو۔ اسے جب بھی وقت ملتا، اپنے جیالے بھائیوں کے لئے دعا گو ہو جاتی۔ اس دوران میں کامران کے دو خطوط آئے۔ جن میں شکوہ تھا کہ اس نے وعدہ کے باوجود خط نہیں لکھا۔ اس نے کامران کی خفگی کا مختصر سا جواب دیا کہ میں تو آج کل بہت مصروف ہوں کامی! اس لیے وقت نہیں۔ تم ملک کے لیے کیا کر رہے ہو؟ اسے سب سے پہلے اپنے وطن سے محبت تھی پھر کسی اور یعنی کامران کا یا اس کی ذات کا نمبر آتا تھا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ سب اپنے اپنے فرائض میں مشغول تھے کہ پڑوس کا بچہ آیا اور زیبا سے کہا، آپ کی ٹرنک کال ہے۔ وہ گئی تو کامران کا فون تھا۔

"کیسی ہو زیبی!" کامران کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں کامی! بس مشرقی پاکستان کی ہر دم فکر ہے۔ اپنا ریڈیو اور ٹی وی کچھ کہتے ہیں اور بیرونی ممالک کچھ اور بتاتے ہیں، میں تو بہت ڈیپریس ہو رہی ہوں" اس کی آواز میں ڈوبتے انسان جیسی لرزش تھی۔

"اوہ زیبی! تم بے حد حساس ہو، اتنا مت سوچا کرو میری جان! کچھ اپنا بھی خیال کرو، اتنا سوچو گی اور کڑھو گی تو تمہاری صحت پر برا اثر پڑے گا" کامران اس کے لیے پریشان تھا۔

"کامی! تم میری فکر نہ کرو، مجھے کچھ نہیں ہو گا اور اگر کچھ ہو جائے تو مجھے پروا نہیں، ہاں ملک کو کچھ نہ ہو" وہ بہت دل

www.Paksociety.com

گرفتہ تھی۔

"بھئی دیکھو زیبو رانی! جو کچھ ہونا ہوگا وہ تو ہوگا، اچھا یا برا۔ میں نہیں چاہتا میری حساس زیبی یہ سب سوچ سوچ کر پریشان ہو...... اچھا یہ بتاؤ میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟"

کامران کی سوچ ان حالات میں بھی صرف اپنے تک محدود تھی۔ یہ دیکھ کر زیبا کا دل اور کڑھا۔ وہ کامران کی خودغرضی پر حیران رہ گئی پھر بھی ضبط سے بولی۔

"مجھے فرصت کہاں ہے کامی کہ تمہیں خط لکھوں۔ اگر لکھوں گی بھی تو وہ میری ذہنی پریشانی کی عکاسی کرے گا پھر تم کہو گے اس میں محبت کی چاشنی نہیں تھی" وہ بولی۔

"نہیں، میں کچھ نہیں جانتا، مجھے جلد خط لکھو اور اب میری خاطر مسکرادو۔"

"کامی، مسکرایا نہیں جاتا" وہ کرب سے بولی۔

"میری خاطر مسکرادو، تمہیں مجھ سے محبت نہیں" کامران نے کہا۔

"مجھے تم سے زیادہ وطن سے محبت ہے" اس نے کہا۔ کھٹ سے آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔ وہ گھر آگئی، اس کا ذہن آج کل صرف ایک ہی سوچ میں تھا مگر کامران نے اس میں انتشار پیدا کردیا تھا۔ وہ چند سیکنڈ کامران کے بارے میں سوچتی رہی پھر سر کو جھٹک کر اس فکر سے آزاد کر بیٹھی "بعد میں مناؤں گی دیکھا جائے گا" اس نے اپنے آپ سے کہا اور مطمئن ہوگئی۔

جنگ ہوئی، پاکستان کو رسواکن شکست ہوئی۔ جس روز ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ مشرقی پاکستان کی صورت حال سنگین ہوگئی ہے۔ زیبا کا دل جیسے ڈوب ڈوب گیا۔ اس پر ایک دم افسردگی کا طوفان جیسے ٹوٹ کر چھا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ آنکھوں میں کچھ ایسی جلن ہو رہی تھی جیسے دماغ میں ابلنے والا لاوا آنکھوں کے راستے بہنے کی ٹھان رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بھینچ لیں۔ مگر آنکھیں بھینچنے سے کہیں لاوے رکتے ہیں۔ آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر بہت دیر تک روتی رہی۔

یہ کیا ہوگیا؟ کیوں ہوگیا؟ یہ سوالات تھے جو ہر ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ بہرحال پاکستان کو شکست ہوئی تھی اور وہ بھی بدترین۔ بیالوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے اور ہزاروں غیر بنگالی مشرقی پاکستان میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

آہستہ آہستہ قوم سب کچھ بھلانے لگی۔ لڑکوں نے پھر سرِ راہ لڑکیوں کو چھیڑنا شروع کردیا۔ ریڈیو سے "پھر شیرِ خدا جاگے" کی جگہ دوبارہ "سن وے بلوری اکھ والیا" نشر ہونے لگا۔ ٹی وی، اخبار غرض سب اپنی پرانی روش پر آگئے۔ کلب اور سنیماؤں کی رونق برقرار ہوگئی۔ مگر ہزاروں حساس دل اب بھی ایسے تھے جن کے دل اور روحیں اب بھی غم سے بے قرار تھیں۔ انہیں میں زیبا بھی تھی۔

انہیں دنوں میں اسے کامران کا پھر ایک خط ملا۔

"سویٹ زیبی، خوش رہو!

مجھے علم ہے تم بے حد حساس ہو اور اس سانحے نے تم پر برا اثر ڈالا ہوگا۔ تم یقیناً آج کل بہت ہی افسردہ ہوگی۔ مگر زیب، میں ڈیئر، تم سے التجا کرتا ہوں کہ خدا کے لیے پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اب آئندہ کی تیاری ہمیں کرنی چاہیے تاکہ ہم دشمن کو شکست دے سکیں۔ پچھلی باتیں سوچ سوچ کر کڑھنے سے فائدہ۔ پھر ویسے بھی تم نازک سی ہو۔ بھئی، میں نہیں چاہتا کہ میری زیبی اداس و افسردہ رہے۔ چلو مسکرادو۔ (اور زیبا کی آنکھوں سے ہزارہا آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے دھندلی دھندلی نگاہوں سے آگے پڑھا) مسکرادیں نا...... شاباش! امید ہے اب تم مجھے فوراً خط لکھوگی۔ آخری وارننگ دے رہا ہوں...... تمہارا اپنا، کامی!"

زیبا نے خط تہ کرکے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس کا دل و دماغ ہی ٹھکانے نہ تھا تو لکھتی کیا۔ اسی دوران میں عیدالاضحیٰ بھی آگئی۔ زیبا تو اس وقت چونکی جب اسے کامران کا عید کارڈ ملا "اچھا تو آج عید ہے" اس نے سوچا۔ بہت خوبصورت اور قیمتی عید کارڈ تھا۔ کامران نے لکھا تھا۔

"زیبی ڈیئر! عید مبارک!

نہ جانے کیوں اس بار میں تم سے طویل عرصہ کے لیے خفا نہیں رہ پارہا۔ میری طرف سے تمہیں بہت بہت عید مبارک۔ خدا کرے آئندہ عید ہم ساتھ ساتھ منائیں۔ تب صحیح لطف آئے گا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جس وقت تم میرا کارڈ وصول کروگی، اسی وقت مجھے تمہارا عید کارڈ ملے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے بے حد شکوہ ہوگا زیب! اگر تم نے اب تک مجھے خط نہیں بھیجا ہے تو یہ کارڈ ملتے ہی لکھو۔ میں نے حساب لگالیا ہے۔ جس روز تمہارا خط آنے کا دن ہوگا، میں شدت سے منتظر رہوں گا۔ زیبی تمہیں خدا کی قسم مجھے آج ہی خط لکھو ورنہ مجھے ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھوگی۔ پھوپی جان اور ریاض کو بھی میری طرف سے عید مبارک ...... ابھی خط لکھو ورنہ...... تمہارا کامی!"

اچھا کامی، تم نے ربُ العزت کی قسم دے کر مجھے مجبور

کردیا ہے کہ ایک خط تمہیں لکھ ہی دیا جائے۔ ادھر لاہور میں متوقع روز کامران کی بے قراری دیکھنے والی تھی۔ آج زیبی کا خط آئے گا۔ صبح سے ہی اس کے ذہن میں یہی بات تھی...... ضرور آئے گا۔ آفس میں اس کا دل ہی نہ لگ رہا تھا۔ یار دوستوں نے اس کی حالت دیکھی تو ٹوکا بھی "یار، کیا ہوگیا ہے، کیا بھابی آنے والی ہیں" لنچ آورس میں اس نے دردسر کا بہانہ کیا اور گھر آگیا۔ ٹیکسی میں راستہ بھر وہ زیبا کے ہی خیالوں میں گم رہا۔ "میں نے ایسی دھمکی دی ہے کہ محترمہ کو لکھتے ہی بنے گی۔" وہ سوچ رہا تھا۔

ٹیکسی سے اتر کر وہ بے قراری سے گھر میں پہنچا "امی پوسٹ مین آگیا!"

"ہاں، ابھی ابھی دو خط ڈال کر گیا ہے۔ دونوں تمہارے ہیں، مگر تم اس وقت کیسے؟"

ماں نے کہا مگر وہ کچھ جواب دیے بنا، بے قراری سے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ پہلا خط جو اس نے اٹھایا وہ اس کے کسی دوست کا تھا، اس نے اسے ایک طرف اچھال دیا اور زیبا کا لفافہ اٹھالیا۔ لفافہ کافی دبیز تھا۔ وہ مسکرایا۔ تمام گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگی ہوگی۔ اس نے لفافہ کھولا۔

"کامران...... آداب!

"چمن......" یہ میں کامی سے کامران کب ہوگیا؟ وہ شدید حیران تھا۔

اس دوران میں تمہارے دو خطوط ملے مگر پہلے تو مصروفیت کے باعث نہ لکھ سکی اور اس کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کے صدمے سے نڈھال تھی۔ کسی کا ایک بازو کٹ جائے تو وہ کھوکھلے سینے میں جینے کی تمنا کہاں سے بیدار کرے۔ میرے دل کی تو ہر تمنا، ہر آرزو دم توڑ چکی ہے۔ تمہارے شوخی بھرے خطوط آتے تھے تو پڑھ کر حیران رہ جاتی تھی۔ کیا واقعی تمہیں ملک کے تغیر پذیر حالات کا علم نہ تھا۔ یا تم اس قدر بے حس واقع ہوئے ہو کہ کسی بات سے متاثر ہی نہیں ہوپاتے۔ تمہارا لاابالی پن اکثر میرے دل میں ننھے سے وسوسے پیدا کردیتا تھا کہ کہیں اس لاابالی پن کی وجہ سے میں تمہیں کھو نہ بیٹھوں اور وہی ہوا، آج جب تمہارا عید کارڈ بھیجنے کا ارمان پورا ہوا تب مجھے عید کی آمد کا احساس ہوا۔ میں تو سر سے لے کر پیر تک کانپ کر رہ گئی۔ تم ان حالات میں بھی خوشیاں منارہے ہو۔ عزت و وقار کی قربانی دینے کے بعد عید پر شاندار خوشیاں منانے والے بے حس کامران! تم کب جاگو گے؟ یا یونہی خواب غفلت میں پڑے رہوگے۔ اس بار عید کا چاند نکلا تو مگر یوں جیسے کسی بیوہ کی ٹوٹی چوڑی اور پھر عید

ایک بار شریفِ مکہ کا ایک قاصد ہماری خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے ہمیں ایک عرضی دی۔ کعبے کا غلاف پیش کیا اور شریفِ مکہ کی جانب سے نہایت مخلصانہ جذبات ظاہر کیے۔ ہم نے اُسے ہدیے کے طور پر پانچ لاکھ درہم عطا کیے اور اسی وقت شریفِ مکہ کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کے قیمتی ہندوستانی تحفے بھیجنے کا حکم جاری کردیا۔

جہانگیر کی خود نوشت تُزکِ جہانگیری سے

بالاحصار میں ہمارے سامنے ایک آڑو لایا گیا۔ اتنا بڑا آڑو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کم و بیش ایک انسان کے سر کے برابر تھا۔ ہم نے حکم دیا کہ اسے تولا جائے۔ اُس کا وزن ساٹھ تولے نکلا۔ اُس کا گودا نہایت باذائقہ تھا اور نہایت شیریں تھا۔ کابل میں ہم نے اس سے بہتر پھل نہیں کھایا۔

کی افسردہ اداس اداس سی صبح خوشیوں کی بہاریں نہیں ناکامیوں اور آرزوؤں کے مدفن لے کر آئی مگر۔ اپنے عزیزوں کی یاد میں جانے کتنی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ننھے ننھے بچے اپنے ابا کے منتظر تھے۔ دشمن کی قید میں پھنسے مجبور قیدی...... ان سب کا خیال آتا ہے تو عید کی خوشیاں منانے کا خیال کہیں دور اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے، ان حالات میں تم مجھ جیسی حساس لڑکی سے امید رکھتے ہو کہ وہ بھی خوشیاں منائے۔ کامران، میں تو تمہیں اپنا اور ملک کا محافظ سمجھے بیٹھی تھی مگر جس کے پاس احساس کی دولت نہ ہو، وہ کسی کا محافظ نہیں بن سکتا۔ یاد رکھو، احساس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ میں تمہیں بے حس تو سمجھا کرتی تھی مگر اس حد تک نہیں۔ اگر پاکستان میں احساس کی عدالت ہوتی تو میں تمہیں اس بے حسی کا بدترین مجرم ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیتی۔ تم احساس کے بہت بڑے مجرم ہو کامران!

تم مجھ سے الفت و محبت کے دعوے کرتے ہو۔ مگر کامران، میں یہ کہتے ہوئے دکھی ہوں کہ تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی بلکہ تم نے کسی سے بھی محبت نہیں کی۔ تم نے ہمیشہ صرف اپنے آپ سے محبت کی ہے۔ اپنی ذات کو چاہا ہے اور نہ آئندہ تم کبھی کسی سے محبت کرسکوگے۔ تم ہمیشہ صرف اپنے آپ کو چاہوگے۔ تم نے اپنی ذات کو ایک خول میں بند کرلیا ہے۔ اور تم کبھی بھول کر بھی اس میں سے باہر نہیں نکلتے، باہر نکلنا تو درکنار، کبھی اس میں سے جھانک کر بھی یہ نہیں دیکھتے

www.Paksociety.com

کہ تمہارے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔

سوال صرف یہ نہیں کہ تم مجھے پالو یا سوال صرف زندگی کا نہیں، احساس کا ہے اور احساس کیا ہے، یہ اپنے اپنے نقطہ نظر کی بات ہے۔ ابھی تک تم زندگی کے دائرے سے باہر تھے۔ خواب کی دنیا میں۔ میں چاہتی ہوں، تم زندگی کی حقیقت کو پہچان لو تا کہ کل پھر تم کوئی خواب نہ دیکھنے لگو۔ اس بے حقیقت خواب کو جھنجوڑ دو۔

یقیناً عظیم ہیں وہ لوگ جو کسی مقصد کے لیے جیتے ہیں یا مرتے ہیں۔ جنہیں صرف اپنے آپ سے محبت نہیں ہوتی۔ جو بلند ہمتی اور بلند عزائم کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں اور تم......!

تم نے فون پر پوچھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ تم اپنے آپ کو میرا سہارا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ کیوں، مجھے تمہارے بے حس بازوؤں کے سہارے کی ضرورت کیوں ہونے لگی۔ میں اپنا سہارا آپ ہوں۔

دن، شاید یونہی گزر جاتے اگر تم مسلسل محبت بھرے خطوط لکھ کر مجھے ذہنی کچوکے نہ لگاتے۔ اگر دن رات اسی ایک حالت میں رہتے۔ مگر جان لو کہ دنیا کی کوئی چیز ایک حالت میں نہیں رہتی۔ تغیر سب میں ہے۔ ہر آدمی، ہر شے، حالات کے تحت بہتر یا بدتر صورت میں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر تم کیسے ہو، جس پر حالات ذرا بھی اثر انداز نہ ہوئے۔

کامران......! ہمیں اپنا کھویا ہوا وقار اور حصہ دوبارہ واپس لینا ہے اور اگر ہمیں اپنا وقار واپس لینا ہے تو ہم سب کو ننگی شمشیر بن جانا چاہیے۔ مگر کیا تم ایسا کرسکو گے؟

تم نے لکھا ہے کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤں۔ کیسے بھول جاؤں؟ ہم نے ہمیشہ یہ غلطی کی ہے کہ پچھلی کوتاہیوں کی طرف سے آنکھیں موند لی ہیں۔ جب تم ہم گزشتہ غلطیوں کو ذہن میں نہ رکھیں گے، آئندہ کوئی مثبت قدم نہ اٹھا سکیں گے۔ کوئی سبق نہ سیکھ سکیں گے۔ ہمیں ہر وقت، ہر لحہ، ہر دم اپنی تمام گزشتہ کوتاہیوں اور غلطیوں پر نظر رکھنی ہوگی، ہر لحہ......تم یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں تمہاری دھمکی سے مرعوب ہو کر یہ خط لکھ رہی ہوں بلکہ دراصل یہ آخری خط تمہیں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ تم مجھے سمجھ لو۔ تم مجھے اب تک نہ سمجھ سکے کامران۔ تم نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے تمہارے خط کا جواب نہ دیا تو تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھوں گی تو مجھے یہ لکھتے ہوئے قطعاً افسوس نہیں ہو رہا ہے کہ تمہیں کھو کر مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوگا۔ ہم تم اب ایک راہ کے راہی نہیں...... تم اور میں ایک راستے پر نہیں چل سکتے، میری تمہاری راہیں جدا جدا ہیں۔ اس لیے میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ جس کچے بندھن میں ہم دونوں کو باندھا گیا تھا۔ میں نے اسے توڑ دیا ہے۔ میں لچک دار ڈالی ہوں کامران، مجھے جھکایا جاسکتا ہے مگر جب وطن کی اور اصولوں کی بات آتی ہے تو سخت لکڑی کا روپ دھار لیتی ہوں جسے کوئی نہیں جھکا سکتا۔ اور اگر اس وقت مجھے زبردستی جھکانے کی کوشش کی گئی تو میں ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جاؤں گی، بکھر جاؤں گی، میں نہیں چاہتی میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں۔ اور پھر میرا بکھرا ہوا وجود تمہارے بھی کسی کام کا نہ ہوگا۔

چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ برسات کا پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا ہے جیسے کوئی نوجوان بیوہ چپکے چپکے رو رہی ہو۔

میں امی کو سمجھا لوں گی اور ماموں ممانی کو تم سمجھا دینا کہ انہوں نے جس لڑکی کا انتخاب تمہارے لیے کیا تھا، وہ تمہارے لیے قطعاً موزوں نہیں۔

تمہارے شوخی بھرے خطوط ملتے تھے تو میری محبت سسک سسک کر دم توڑنے لگی تھی اور جب تمہارا عید کارڈ ملا......تو محبت کی موت واقع ہوگئی۔ اگر تم صرف میرا دل توڑتے، مجھے دکھ دیتے تو میں تمہیں معاف کردیتی۔ مگر کامران، تم نے تو ملک کو دکھ دیے ہیں، تکلیف دی ہے۔ جو شخص اپنا کوٹ خود اٹھا کر نہ پہن سکتا ہو وہ ملک کو کیا دے سکتا ہے۔ تم تو وطن کے لیے ایک بوجھ ہو۔ تکلیف کا سبب ہو۔ (کارڈ ملتے ہی انگوٹھی اتار کر رکھ دی تھی، منگوا لینا)

تم مجھے اس خط کے جواب میں کوئی خط نہ لکھنا، نہ مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا۔ ناکام رہو گے۔ ہمیشہ تم مجھ سے خفا ہو جاتے تھے۔ اب میں تم سے خفا ہوں اور ہمیشہ کے لیے۔ یاد ہے، میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ اگر میں ایک بار روٹھ گئی تو کبھی نہ منوں گی۔ آج وہ دن آگیا۔ اب تم مجھے اور میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکے۔ اب میں اور تم بالکل الگ الگ ہیں۔ مجھے بھول جاؤ کامران......زیبا!''

''اوہ......!'' کامران نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے طوفان آگیا ہو۔ اسے زندگی کی البیلی راہوں پر اب کسی زیبی کی سیاہ آنکھیں نظر نہیں آئیں گی۔ بیت گئے وہ دن۔ ماضی بہت دور چلا گیا......جواب کبھی واپس نہ آئے گا...... ہائے وہ حسین ماضی......! اور پھر وہ بستر پر کسی مردے کی طرح گر پڑا۔ کبھی کبھی زندگی بھی تو موت ہو جاتی ہے نا......!